

تجھے ہر جگہ پیٹا کر

اقبال بانو



انتساب

میرے جیون ساتھی

ملک فیض رسول کے نام

جن کے ساتھ نے میری زندگی کو رنگ دیئے

----- نئے روپ دیئے -----

مجھے جینے کے ڈھنگ دیئے۔

پیش لفظ

قارئین کرام: ”تجھے ہر جگہ پکارا“ یہ میرا تیسرا ناول آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک معاشرتی ناول ہے جو کہ ہمارے ماحول کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ چونکہ میرا تعلق ملتان سے ہے۔ اس لیے میری تحریروں میں میرے علاقے کا عکس نظر آتا ہے۔ اور میری اردو تحریر میں میری ماں بولی سرائیکی کے بھی کچھ لفظ نظر آئیں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان لفظوں نے میری تحریر کے جملوں کو نکھار دیا ہے۔ یقیناً آپ بھی پسند کریں گے۔

میں محترم مبین خٹک صاحب کی بھی مشکور ہوں کہ ان کی کوششوں سے میرے ناول آپ کے ذوق کی تسکین کا باعث بنے۔

ہر لکھاری چاہتا ہے کہ اس کی تحریر کے بارے میں قارئین ضرور آرا سے نوازیں کہ پڑھنے والوں سے بہتر کوئی نقاد نہیں۔ میں آپ کی آرا کی منتظر ہوں۔۔۔ ناول پڑھ کے رائے ضرور دیجئے گا۔

خلوص مند

اقبال بانو

تیز سائرن کی یکے بعد دیگرے آنے والی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں اور ساتھ ہی دل دہلا جا رہا تھا۔ سائرن کی ہر آواز خوفزدہ کر رہی تھی۔ بہت ہی خوفناک آواز تھی۔ ساتھ ہی دریا کے پانی کا اس قدر شور تھا جیسے کئی سانپ ایک ساتھ ہی شوک رہے ہوں۔

بچی کڑک رہی تھی۔
مینہ برس رہا تھا۔ اوپر سے ابر رحمت جوش میں تھا۔ اور ادھر سے سائرن کا شور۔ دریا کے کنارے رہنے والوں میں عجیب طرح کی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہر تنفس بھاگ رہا تھا۔ افواہیں بھی تو ایسی تھیں۔
بس دریا کا پیشہ ٹوٹنے ہی والا ہے۔
سارا پانی اسی بستی میں آئے گا۔
سب کچھ بہہ جائے گا۔
ہر شے فنا ہو جائے گی۔
”بھاگو۔ فوراً چلو۔“

مختلف آوازیں وہ بھی سن رہی تھی۔ اور بارش میں بھیگی کھجور کے درخت کے تنے سے لپٹی تھر تھر کانپتے ہوئے وہ لوگوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھ رہی تھی۔ لوگ اپنے بچوں اور مویشیوں سمیت محفوظ مقامات پر روانہ ہو رہے تھے۔ فوجی جوان بھی بستی کے کینوں کی مدد کو آگئے تھے جس کا مطلب تھا کہ ”خطرہ زبردست“ ہی ہے۔ کشتیاں دریا میں ڈال دی گئی تھیں۔

یہ بستی محل باغ جو دریا کے کنارے گذشتہ دو صدی سے آباد تھی۔ اور اس بستی کے مکین تو دریا کی لہروں سے کھیلنے والے جوان تھے کئی رانی ان کا شوق اور پیشہ بھی تھا۔ رزق کا وسیلہ یہی بستی ہی تو تھی۔ دریا کی لہروں سے نہر آ رہا ہو کر تو وہ بچپن کی حد پھلانگ کر جوان ہوئے تھے۔

یہی دریا پانی لہریں تو ان کے کھلونے تھے۔ جن کے کھیلنے اور سنبھلنے ان کا بچپن بیتا تھا۔ یہی لہریں تو ان کی لگی ساتھی تھیں۔

لڑکیاں دریا کے کنارے منی کے گھر وندے بناتیں۔ دریا پر پانی بھرنے جاتیں تو اندر بھی اتر جاتیں۔ اور آج وہی لہریں ان سب کی دشمن ہو گئی تھیں۔ ہر بشر وحشت زدہ تھا۔

بچے بڑے جان بچانے کی فکر میں تھے۔ شاید انہیں پتا تھا کہ لہریں جس قدر بھی دوست ہوں جب منانا چاہتی ہیں تو پتا بھی نہیں چلتا۔ تلووں تلے سے زمین کھسکا لیتی ہیں۔ آپ آپ ہی پیروں میں بھنور آ جاتا ہے۔ اور انسان مٹ جاتا ہے۔ بھی تو آج لہروں سے دوستی کا دعو کرنے والے بھاگ رہے تھے کہ اسی میں ان کی بہتری تھی۔

”اماں۔ سب لوگ جارہے ہیں۔“ تاباں نے رو ہانسی آواز میں کہا۔

”پھر میں کیا کروں؟“

”ہم بھی چلیں۔ اماں بند ٹوٹ جائے گا۔ سب کچھ بہہ جائے گا۔“ تاباں نے اداسی سے کہا۔

”تو ہم بھی بہہ جائیں۔ تابی تو چلی جا اپنے دادا کے ساتھ۔ میں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ شاید۔

شاید۔“ اس کے لبوں پر لفظ ٹوٹ گئے۔ اور آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرانے لگی۔

”آخر تم کیا چاہتی ہو شرفاں؟“۔ بوڑھا ملاج حیات محمد اس کی طرف آتا ہوا بولا۔

”کچھ نہیں بابا۔ میں کیا چاہتی ہوں۔“ شرفاں نے اپنے چہرے سے بارش کے قطرے کو صاف کیا۔

”مجھے خود خبر نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔“

”سارے لوگ جارہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”میں نے کہا ہے نا کہ تم اور تاباں چلے جاؤ۔ میں نہیں جاتی۔“ وہ ضدی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”تجھے مرنے کا شوق کیوں ہے شرفاں؟“ وہ چڑکا بولا۔

”مرنے کا شوق۔“ وہ ہنسی اور سوچنے لگی۔ ”ہاں بابا ایک ہی تو شوق ہے اور وہ بھی پورا نہیں ہوتا

ہے۔ شاید اب ایسا ہو جائے۔“ یہی تو میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی۔ اللہ کرے بند ٹوٹ جائے۔ پانی آ

جائے اور۔۔۔ اور اس کے تیز ریلے میں۔۔۔ میں ایک بار پھر۔۔۔“

”تو اماں تم نے نہیں جانا۔“ تاباں آنکھوں میں آنسو لیے پوچھ رہی تھی۔ شرفاں نے سر کو منفی

جنبش دی۔

”تم جاؤ۔“

”میں بھی اماں تمہارے ساتھ بہہ جاؤں گی۔ نہیں جانا مجھے کہیں۔“ وہ پاؤں پیٹتے ہوئے اندر

کمرے میں چلی گئی۔ مٹی اور گارے سے بنایہ کمرہ جس پر گھاسا پھوس کی چھت ڈلی ہوئی تھی۔ اور بارش کی

وجہ سے مسلسل ٹپک رہی تھی۔

”میں بھی نہیں جاتا۔“ حیات محمد نے بھی فیصلہ سنا دیا۔ اور دھوتی سمیٹ کر چھپر تلے چوکی پر بیٹھ

گیا۔ شرفاں کو ان دادا پوتی کے فیصلے کی کوئی پروا نہ تھی۔

”بہیں کیا تاؤں بابا۔ میں تو نہ جانے کب سے موت کا انتظار کر رہی ہوں۔ آج۔ آج۔ آج موقع مل

رہا ہے اور موت صرف چند گز کے فاصلے پر ہے تو میں بھاگ جاؤں۔ کبھی نہیں۔ میں یہیں اسی گھور کے

تنے سے لگ کر موت کا استقبال مسکرا کر کروں گی۔ اگر تمہیں بھی میرے ساتھ مرنے کا شوق ہے تو بے

شک ساتھ دو۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔“ وہ دل ہی دل میں حیات محمد سے مخاطب تھی۔

”تجھی بادل زور سے کڑکا۔ لگا تھا جیسے کہیں بجلی گری ہو۔ شرفاں کا پنے لگی۔ بھی دو فوجی دروازہ دھکیل

کر اندر چلے آئے۔

”بابا۔ تم اتنے سکون سے بیٹھے ہو۔ چلو فوراً۔“ ایک نو جوان نے کہا۔

”ہم نہیں جائیں گے۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں زندگی پیاری نہیں؟۔ زبردست خطرہ ہے بابا۔“ وہ نو جوان ملاحت سے کہہ

رہا تھا۔

”وہ صاحب۔ میرا پتر حسن پور گیا ہوا ہے۔ ہمیں اس کا انتظار ہے۔“ حیات محمد نے بات بتائی۔ اور

واقعی فصل دین گیا ہوا تھا۔

”آپ بھلے ہیں۔ آجائے گا آپ کا بیٹا۔ وہ محفوظ ہی ہوگا۔ پانی کا زبردست ریلہ بس چند گھنٹوں

تک یہاں سے گزرنے والا ہے۔ بوڑگو! اٹھو چلو۔ اس بستی کو زبردست خطرہ ہے۔ لوگ چلے گئے ہیں اور تم

بیٹھے ہو اکیلے۔“

”میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری نہوں (بہو) اور پوتی بھی ہے۔“ حیات محمد نے بتایا۔

”یعنی تم اپنے ساتھ دو اور زندگیوں کی جان لینے پر تلے ہو۔“ دوسرے فوجی جوان نے حیرت

سے کہا۔

”چلو اماں۔ تم تو اٹھو۔“ ایک جوان نے کھجور کے تنے سے لپٹی شرفاں سے کہا۔ جس کی کڑھی

بھوری آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”یہ تو کوئی پاگلوں کا نمبر لگتا ہے عابد۔ تم اماں کو زبردستی لے آؤ۔“ ایک نو جوان کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

اور وہ جوان جس کا نام عابد تھا۔ وہ شرفاں کی طرف بڑھا تو وہ گرج کر بولی۔

”خبر دار۔۔۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔“ آگے بڑھتا عابد ٹھک کر رہ گیا۔ شرفاں ایک دم ہی نرم

ہوتے ہوئے بولی۔ ”پتر تو جا۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہیں مروں گی مگر بلوں کی نہیں یہاں

سے ویسے بھی اگر میری موت لکھی ہے تو کہیں بھی آ جائے گی۔ بھلا موت سے بھاگنے کا فائدہ؟۔ زندگی

ہوئی تو بہتی ہوئی نہ جانے کون سے صحرائیں جانکلوں کی۔ تم فکر نہ کرو۔“

”اماں دریا میں پانی کی سطح مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اور۔۔۔“

”مجھے سب پتا ہے۔“ شرفاں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم چلے جاؤ۔ کسی اور کی مدد

کرو۔ نہیں ضرورت مجھے تمہاری مدد کی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ میں اپنا گھر نہیں چھوڑوں گی۔“

”یہ سراسر خودکشی ہے اماں۔“ عابد کا لہجہ اب بھی ریشم جیسا تھا۔

”میری زندگی ہے اس کی تم فکر نہ کرو۔“ شرفاں نے کیلی کڑی کی طرح تنگ کر کہا۔ تو عابد چند لمحوں

تو اسے دیکھتا رہا اور پھر سر جھکائے چلا گیا۔ اس نے سوچا کیا عورت کو اپنے گھر سے اتنی محبت ہوتی ہے۔

شاید اسے خبر نہ تھی کہ گھر ہی عورت کی زندگی کی اساس ہے۔

چاہے وہ محل نما گھر ہو یا گھاس پھوس کی جھونپڑی۔

عورت کے خوابوں کی ترنم تو گھر ہی سے جڑی ہوتی ہے۔

عورت جو کڑیاں پٹلوں والی عمر ہی سے ایک گھر کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اپنے گھر کا خواب آنکھوں پر سنا بنان بن کر چھا جاتا ہے۔

گھر ہی تو عورت کی زیست کا سرمایہ ہے۔

عورت کی تو ساری زندگی ایک گھر کی خواہش کے گرد چکراتی ہے۔

اور شرفاں بھی عورت تھی۔ ایسے یہ گھر بے حد عزیز تھا۔ وہ اسی گھر میں مرنا چاہتی تھی۔ ابدی موت۔

بالکل فنا ہونے کی خواہش بھی اس کی تھی تو وہ کہیں نہ گئی۔ اس نے کسی کی بات نہ مانی تھی۔

تاہاں جو اس کے دل کا کلواٹھی۔ جس کی آنکھوں میں نمی وہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ لیکن آج اس کی انگ ریز آنکھوں کی بھی اس نے پروا نہ کی تھی۔ جو اس کے دل میں سایا تھا۔ وہی کرنا چاہتی تھی۔ اور خود کو حق بجانب سمجھ رہی تھی۔

حیات محمد برستے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

یارب پاک ہمارے گناہوں کو بخش دے۔ پانی کا رُخ موڑ دے۔

ہمارے بھتیوں اور گھروں کو آباد رکھ۔

ہم جینا چاہتے ہیں۔

طبعی موت مرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں سکا سکا کرمت مار۔

بے شک ہم عاصی ہیں۔ گناہگار ہیں مگر تیرے ہی بندے ہیں۔ اگر ہمارے گناہ بڑے ہیں تو تیرا کاشانہ رحمت بھی تو بڑا ہے۔ حیات محمد کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح رواں تھے۔

بستی لٹوں میں ہی خالی ہو گئی تھی۔ لوگ جو سامان اٹھا سکے تھے لے گئے تھے باقی گھروں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ یہ آس ہی نہ تھی کہ واپس آئیں گے۔ ابھی تو فقط جان بچانے کی جلدی تھی۔

چھ جوں مینہ برس رہا تھا۔ ہر طرف جل جھل ہو گئی تھی۔ بارش کی تیز بو چھڑا شرفاں پر یوں پڑ رہی تھی۔ جیسے یکے بعد دیگرے کی تیراں کے وجود میں چھ رہے ہوں۔ مگر اسے پروا نہ تھی۔ انجانا سا سکھ اس کے رگ دپے میں اتر رہا تھا۔ جی تو اس کے لب مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

سیٹھ جمال الدین ملک اپنے وسیع و عریض بیڑ کی اونچی سی ٹیک سے یکے "نصوری فائل" دیکھنے میں مصروف تھے۔ اور ان کے قریب ہی بیگم گل فشاں جمال ناخن فائل کر رہی تھیں۔ گاہے گاہے وہ نظر اٹھا کر شوہر کو بھی دیکھ لیتیں۔ جن پر آج کل عرصے بعد انہوں نے اس قدر بشیدگی دیکھی تھی اور نجانے کیوں وہ خود میں ہمت نہ پا رہی تھیں کہ سیٹھ جمال الدین ملک کو مخاطب کر سکیں۔

بیگم گل فشاں جمال اپنے وقت اور زمانے کی انتہائی خوبصورت اور طرحدار خاتون تھیں۔ وہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھیں جو سونے کا چچے لے کر پیدا ہوئے ہیں اور چاندی کے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ رو سا کی لڑکیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ گزرتا وقت بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

ایک تو دولت کی چمک دے ہی ان کے چہرے کو روشن کیے رہتی ہے۔ دوسرے نعمتی کریموں سے وہ چہرے کو خوبصورت اور فریش رکھنے کے علاوہ فیس لفٹنگ جیسی سہولت سے فائدہ اٹھا کر سدا جوان رہنے کا گڑ پالتی ہیں۔ ایسی ہی بیگمات میں بیگم جمال الدین بھی تھیں۔ اٹھائیس برس کی ازدواجی زندگی گزارنے اور تین جوان بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ اپنی عمر سے کچھ گھٹتی تھیں۔ حالانکہ بی اے کرتے ہی ان کی شادی سیٹھ جمال الدین ملک سے ہو گئی تھی۔ سیٹھ جمال الدین کے چہرے اور بالوں پر بڑھاپے نے دستک دے دی تھی۔ جبکہ ان کی بیگم تو شگفتہ پھول تھیں۔ سدا بہار حسن تھا ان کا۔ شہر کی معزز ترین سوشل ورکر۔

کئی فلاحی اداروں کی تاحیات ممبر۔

ہر ماہ کتنے ہی چیک ان کی جانب سے ان ان فلاحی اداروں کو پہنچائے جاتے۔ اور اگر کہیں مہمان خصوصی بلوائی جاتیں تو دس ہزار سے کم گرانٹ کا اعلان تو انہوں نے بھی نہ کیا تھا۔ اسی لیے چالیس لوگوں کا ان کے گرد ہجوم رہتا تھا۔ اور وہ اسے اپنی شان سمجھتی تھیں۔ تقریبات میں جانے کے لیے ان کے پاس

بہت وقت ہوتا تھا۔ جبکہ راج ملک خندان ملک اور رافع ملک کے لیے ان کے پاس کبھی وقت نہ ہوتا تھا۔ یوں بھی بچے تو انہوں نے اپنی ساس کی خواہش اور جمال الدین ملک کی سینکڑوں ایکڑ اراضی۔ آنکڑ ملز اور کاشن ملز کے وارثوں کے لیے شادی کے پورے سات سال بعد پیدا کیے تھے۔ اور جنہیں دنیا میں لا کر ملازموں کے حوالے کر دیا تھا۔

انہوں نے صاف کر دیا تھا۔ بچے کے لیے آپا کا انتظام کریں کیونکہ راتوں کو جاگنے سے خُسن تباہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر بچے کو ماں کی اس قدر عادت ہو جاتی ہے کہ ہر جگہ لیے لیے پھرتا۔

آیا اور ملازموں نے ان کے بچوں کی پرورش کی تھی۔ بڑے ہوئے تو انہیں گھوڑا گلی مری بڑھنے کے لیے بھیج گیا۔ اور گل فشاں جمال فارغ ہو گئیں۔ موسم گرما میں وہ سویٹیر لینڈ چلی جاتیں۔ ابھی بھی جمال الدین ملک بھی ان کے ساتھ ہوتے اور کبھی وہ تنہا ہی چلی جاتیں۔ انہیں کب شوہر کی پروا تھی۔ آسے بیگم بھوکہ یہ روش دیکھ کر کڑھتی رہتی تھیں۔ ان کی بڑی بہو ہرہ جیسی جوان کی بیٹی بھی تھی۔ کتنی گھر بیگم کی لڑکی تھی۔

کمال الدین ملک گھر میں ہوتے تو پھر کی طرح ان کی خدمتوں میں لگی رہتی۔ ساس کی خدمت کو اپنا شعار بنایا ہوا تھا۔ بچے داؤد داؤد کہتے ان کے آگے پیچھے پھرتے۔ جبکہ گل فشاں کے دماغ ہی نہ ملتے تھے۔ انہیں گاؤں بھی اچھا نہ لگا۔ کچی سڑکیں اور گاؤں کے ٹمڑی گارے سے بے گھر دیکھ کر وہ ٹھٹھن کا شکار ہو جاتیں۔

آف۔ لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں۔ بغیر اے سی کے تو وہ رہنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں۔ پھر گھر ہی میں بکری، بھینس دیکھ کر ان کا مٹی تھلا تھلا۔

جمال الدین جو اس گاؤں کے جدید پیشی زمیندار تھے۔ ان کی بڑی سی حویلی بہت شان و تمکنت سے اس گاؤں کے وقار میں اضافہ کرتی تھی۔ جہاں سکھ ہی سکھ تھا۔ کہ ماں جیسی عظیم ہستی جو وہاں پر موجود تھی جو وسیع والا انوں میں ٹہل ٹہل کر ان کا انتظار کرتی تھی۔ وہ کہیں بھی رہے تھے ماں کی یاد سے کبھی غافل نہ رہے تھے۔ اور جس روز سے وہ آکسفورڈ سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری لے کر لوٹے تو پہلے گاؤں پہنچے تھے اس وقت اگر انہیں کسی سے ملنے کی شدید ترین خواہش تھی تو وہ ان کی ماں بھی جس کا خیال انہیں کبھی نہیں بھولا تھا۔ ابھی وہ ہر ہفتے ماں کو خط لکھتے تھے۔

ماں کی آواز سننے کے خواہش مندر ہے۔ لیکن ان کے گاؤں میں ٹیلی فون جیسی سہولت نہ تھی۔ کیسا دل مسوس کر رہ جاتے۔

کیسی مجبوریاں راہ میں حائل تھیں۔

پھر انہوں نے ماں کی اجازت سے ہی لاہور میں کاروبار شروع کیا۔ ان سے بڑے بھائی کمال الدین اور جمال الدین ملک تو مشترکہ طور پر پہلے ہی ایمپورٹ ایکسپورٹ کاربنس کر رہے تھے۔ زمینوں کی تو انہیں یوں بھی فکر نہ تھی کہ ان کے جدید پیشی مزارعے کھیتوں کو آباد کیے رکھتے تھے۔ اور وہ صرف فصل ہی کے دنوں میں چند روز کے لیے چلے جاتے۔ ماں سے بھی مل لیتے اور زمینوں کے سینے پر لہلہائی سرسبز فصلوں کو بھی۔

جمال الدین نے فیروز پور روڈ پر آئل مل اور کاشن ملز بھی لگائی تھیں۔ زمینوں کی آمدنی۔ ملز کا دھن چمکتے کاروبار نے مل کو تو انہیں مصروف کرنے کے ساتھ ساتھ بے تحاشہ دھن کا مالک بنا دیا تھا۔ اور بڑے دو بھائیوں کی طرح انہوں نے بھی ماں کی پسند نورا لعین کو دیکھے بغیر ہی اپنا لیا۔ نورالعین آسے بیگم کی بھانجی

اور جمال الدین کی چھوٹی اور لاڈلی بہن گل ہما کی منہ بھی تو تھیں۔ نور العین نے جمال الدین کی خاطر خود کو مٹا دیا تھا۔

سال بھر بعد ہی ان کے ہاں ایک چاندی بیٹی عدیرہ نے جنم لیا۔ اور پھر عدیرہ کے بعد ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ نور العین کو احساس تھا مگر جمال الدین نے بھی مزید اولاد کی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا۔ انہیں نور العین کی اُداسی دکھ دیتی اور وہ کہتے۔

”دیکھو نور۔ تم دل مندانه کرو۔ اگر قدرت نے عدیرہ دی ہے تو اور بچے بھی دے سکتا ہے۔ اسی میں خدا کی مصلحت ہوگی۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“

مگر نور العین تو گھلتی چلی جا رہی تھیں۔ عدیرہ اسکول چلی جاتی تو وہ اتنے بڑے گھر میں بولائی بولائی سی پھرتیں۔ اور پھر وہ شادی کے نوسال بعد جمال الدین کا ساتھ ہی چھوڑ گئیں۔ جمال الدین کی تو دنیا ہی اندھیرا ہو گئی تھی۔ کس قدر وہ نور العین کے عادی تھے پورے چار سال تک انہوں نے نور العین کی موت کا سوگ منایا تھا۔ مگر تاکہ۔ آخر گل فشاں کی زلفوں کے اسیر ہو گئے۔ جو انہیں لاہور پنجخانہ میں پہلی بار ملی تھی۔

خوبصورت اور طر حدار گل فشاں جو ایڈیشنل جج فاروق ترمذی کی الھوتی بیٹی تھی۔ فاروق ترمذی خاندانی رئیس تھے۔ برابر کی چوٹ تھی۔ بس جمال الدین گل فشاں سے عمر میں خاصے بڑے تھے مگر یہ فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اور بیگم ترمذی اس خیال کے حامی تھے۔

”بڑی عمر کا مرد عورت کا غلام بن کر رہتا ہے“ اس لیے انہوں نے بھی اپنی حسین بے پروا سی کا نوٹ کی بڑھی لکھی گل فشاں کے انتخاب کی داد دی۔ آسیہ بیگم تو اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش تھیں۔ جبکہ۔ گل فشاں کو وہ سوہری خاتون کبھی بھی اچھی نہ لگی تھیں۔ جن سے ملنے ان کا شوہر ہر دیک ایڈ پر گاؤں جاتا تھا۔ یا جب آسیہ بیگم ان کے ہاں آ جاتیں تو جمال الدین سرشام ہی گھر لوٹ آتے اور یہ سب کچھ گل فشاں کو بہت گھٹا تھا۔

گھٹا تو انہیں بچے پیدا کرنا بھی تھا مگر۔ انہوں نے دل پر جبر کر کے تین بچے پیدا کیے تھے۔ اور آسیہ بیگم سے دور کرنے کے لیے اس نے جمال الدین کو کراچی میں سیکل ہونے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ فاروق ترمذی بھی ریٹائر ہونے کے بعد کراچی سیکل ہو گئے تھے۔ پھر گل فشاں کی بڑی بہن زرقشاں بھی کراچی میں مقیم تھی جس کا شوہر مرچنٹ نیوی میں کپٹن تھا۔

کچھ تو گل فشاں کی خواہش اور کچھ یادوں کی یلغار سے بچنے کے لیے جمال الدین نے کراچی میں رہنے کو ترجیح دی۔ وہ برسوں سے جس اداسی کے بھنور میں بھنے ہوئے تھے وہ اس سے نکلنا چاہتے تھے۔ یہاں تو قدم قدم پر نور العین کی یادیں بھری پڑی تھیں۔ عدیرہ کی معصوم باتیں ان کا دل چیرتی تھیں۔۔۔ یہ یادیں تو زہر ہوتی ہیں جو وقت بے وقت رگوں میں پھیل جاتا ہے۔ اور اداسیاں منی پلانٹ کی طرح دل کی دیواروں پر تیزی سے چڑھتی چلی جاتی ہیں۔

بس انہی یادوں سے بچنے کے لیے تو وہ کراچی چلے آئے تھے۔ انہیں کسی نے بھی نہ روکا تھا۔ اور بھلا روکتا بھی کون؟۔ یوں بھی بھائیوں اور ماں کا خیال تھا کہ جوان کے ذہن میں سما گیا ہے وہ کب اس سے ملیں گے۔

فاروق ترمذی کے ساتھ انہوں نے مل کر اپنے کراچی آفس کی شاخ کھول لی تھی۔ اور پھر جلد ان کے اس آفس کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ سائٹ ایریا میں ٹیکسٹائل اور فلور ملز نے انہیں بہت جلد

کراچی کے حلقوں میں ”سیٹھ“ کی حیثیت سے متعارف کرا دیا تھا۔ اور اب وہ سیٹھ جمال الدین ملک تھے۔ گل فشاں نے بچوں کو مری بیچ کر خود کو آزاد کر لیا تھا۔

اتنا بڑا گھر تھا جہاں ہر کمرے میں اٹلی اور ہالینڈ کے بڑے بڑے فانوس جلا کرتے تھے۔ وہ اپنے گھر کی ڈیکوریشن کے لیے جرمنی، امریکا اور فرانس سے ڈیکوریشن پس لاتی تھیں۔ ان کی خواب گاہ کسی ملکہ اور شاہ کی خواب گاہ کا منظر پیش کرتی تھی۔ بہت کچھ تھا سب کچھ تھا۔ مگر کچھ نہ تھا تو دل کا سکون نہ تھا۔ جمال الدین کا دل نا آشنا اداسیوں کی قبر میں اتر رہتا۔ وہ تنہائی سے ڈرتے تھے۔

اندھیرے سے انہیں خوف آتا تھا۔ کہ سوچوں کے اڑدے انہیں نکلنے کو بے تاب ہو جاتے تھے۔ پریشانیاں ان کے دل کے گرد گھیر ڈال لیتیں۔

جبکہ گل فشاں کو ان کی کسی پریشانی کی پروا نہ تھی۔ وہ تو ان کے دل تک شاید پہنچی نہ تھیں۔ جو ان کے دل کی اداسیوں اور پریشانیوں کو شیر کرتیں اور بھیتیں۔

وہ کبھی بھی گل فشاں کا نور العین سے مقابلہ کرتے۔ نور العین۔ جو ان کی ماں کی پسند تھیں۔ مگر اس نے ان کی زندگی میں نور ہی نور وشنیاں ہی

روشنیاں کھیر دی تھیں۔ جبکہ گل فشاں خالفتا ان کی اپنی پسند تھی۔ مگر ان کی زندگی میں خوشی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

نور کی کوئی کرن ان کے دل کی گلیوں کے اندھیاروں کو ختم نہ کرتی۔ کوئی خوشبو ان کے دل کا احاطہ نہ کرتی۔

شاید اسی کا نام زندگی ہے۔ یہی مقدر ہے۔ وہ مہینوں بعد گاؤں جاتے تو آسیہ بیگم کی مہربان گود میں سر رکھ کر گھنٹوں ماں کی۔ بھین بھین خوشبو اپنے اندر اتارتے رہتے اور وہ دکھ جن کی زبان نہ تھی۔ خود بخود ہی آسیہ بیگم کے اندر اتر جاتے۔

ماں جسے شاید الہام ہوتے ہیں۔ جو اولاد کے دکھ کھنکے جان جاتی ہے۔

اولاد کے دل پر لگے تیر کی جھن وہ اپنے وجود کے ہر حصے میں محسوس کرتی ہے۔

”ماں جی شاید میں غلط راہ پر چل نکلا ہوں۔“ جمال الدین دھمے سے بتاتے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے۔

”نہیں پتر۔“ وہ کہتیں۔

”آپ نے بھی مجھے نہیں روکا تھا۔“ وہ شکوہ کرتے۔

”کیسے روکتی بیٹی۔ تم کوئی بچہ تو نہ تھے۔ اپنا برا بھلا جانتے تھے سمجھتے تھے۔ اتنا شعور تھا تم ہیں۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اپنے فیصلے پر تم بعد میں پچھتاؤ گے۔ پینتیس برس کی عمر کم تو نہیں ہوتی۔ اپنے بارے میں فیصلے کرنے کے لیے۔“

”پتا نہیں ماں جی۔ دکھ تو یہ ہے کہ نور نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اور۔۔۔ اور۔۔۔“

”اسے دکھ بھی تو ایسا ملتا تھا جمال۔ وہ بھلا کیسے زندہ رہتی۔“ آسیہ بیگم دکھ بھرے لہجے میں کہتیں۔

”کیا میں زندہ نہیں۔ وہ دکھ مجھے نہیں ملا۔ میں نے نہیں سہا وہ غم۔“

”تم مرد ہو جو بہت مضبوط ہوتا ہے۔ اور عورت تو بہت ٹوٹ کر ہوتی ہے۔ پتر ایسا پھول جو ذرا

نی گرامش پاکر کھلا جاتا ہے اور نور العین بھی دکھوں اور غم کی آگ کی تپش نہ سہہ سکی۔ عورت بہت کم حوصلہ

ہے۔“ آسہ بیگم کہتی رہتیں اور جمال الدین ماں کی گود میں سر رکھتے روتے رہتے۔

ایسے آنسوؤں سے وہ روتے جو نظر نہیں آتے۔ مگر اندر ہی اندر دل کے آنگن میں گرتے۔ جیسے درختوں سے خشک پتے گرتے ہیں تو ڈھیر لگ جاتا ہے۔ بالکل یہی جمال الدین ملک کے آنگن دل کا بھی تھا۔ کہ قمر طاس دل سے تو ابھی نورالین کی یادیں مٹی ہی نہ تھیں۔ اور نہ گل فشاں نے انہیں سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ انہیں تو نت نئے ملبوسات زیورات ہی سے فرصت نہ تھی۔ وہ ہر دم ہر ساعت سر ہے جانا چاہتی تھیں۔ تقریبات میں اس طرح وہ بین سنور کر جاتیں کہ ہر کوئی ان کی تعریف کرتا۔ اور کچھ بیگمات تو جل سڑ جاتیں جو وہ صاف محسوس کر لیتی تھیں۔ اپنی تعریف کروانا ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور لوگ دوست احباب ان کی اس کمزوری سے واقف تھے۔

”بھی بیگم جمال الدین۔ آپ کہیں سے بھی تین بچوں کی ماں نہیں لگتیں۔“

”کیا آفت میگر ہے آپ کا۔“

”کس طرح آپ نے خود کو میٹھین رکھا ہے؟“

”بس یہ تو قدرت کی دین ہے۔“ وہ نہایت تفاخر سے کہتیں۔ اور کبھی انہوں نے یہ ”مگر“ کسی کو نہ بتایا تھا کہ وہ روزِ پنج پورا ایک گھنٹہ مختلف مشینوں کے ذریعے ایکسر سائز کرتی ہیں۔ ڈائٹ کنٹرول کرنے کے علاوہ ہفتے میں ایک بار پورے دن کا فائدہ بھی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ صبح سویرے موسمی پھلوں کا جوس پینا ان کی بچپن کی عادت ہے۔

اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے بھی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ ریاضت انہی جیسی شہ محفل ہی کر سکتی تھی۔ سچی تو پچاس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود تیس برس کی لگتی تھیں۔ اور جب کسی کو پتا چلتا کہ ان کی شادی کو اٹھائیس برس بیت چکے ہیں تو وہ بے یقینی سے کہتا۔

”بیگم جمال۔ یقین نہیں آتا۔ لگتا ہے جیسے چند ماہ قبل ہی آپ کی شادی ہوئی ہو۔“

تب وہ بہت خوبصورت قہقہہ فضا میں اچھال دیتیں۔ اور پھر وہ جمال الدین کو آکر بتاتیں کہ کس طرح وہ اپنی عمر کے بارے میں لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ اس سے گل فشاں جمال الدین کو بہت ہی خود پسند اور مضحکہ خیز عورت لگتی۔ جس میں ذہانت نام کو نہ تھی۔ وہ گل فشاں کی ایسی باتوں سے نہ خوش ہوتے اور نہ ہی امیر لیں ہوتے تھے۔

بلکہ انہیں لگتا جیسے گل فشاں کہہ رہی ہو کہ۔۔۔ دیکھو جمال الدین تم تو بوڑھے ہو گئے ہو مگر میں سدا بہار ہوں۔ میری عمر ٹھہر گئی ہے بلکہ میں نے اپنی کوششوں سے اس عمر کو ٹھہرایا ہے جبکہ تم نے وقت کی لگاموں کو ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ مگر وہ وقت کی لگاموں کو ڈھیلا نہ چھوڑتے تو گل فشاں کی سیاحت کیسے ہوتی؟

کس طرح۔۔۔ اپنے اونچے اسٹیٹس (Status) کو ظاہر کرنے کے لیے وہ دوسروں پر رعب ڈالتیں۔

اس لیے یہ ضروری تھا کہ وہ خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیتے اور ایسا انہوں نے کیا تھا۔ بہت مطمئن تھے مگر گذشتہ چند روز سے ان کے دل کی عجیب حالت تھی۔ بیٹھے بیٹھے چونک جاتے۔ نا آشا سادرد دل کی تہوں میں اٹھتا جو پودے وجود کا احاطہ کر کے انہیں پریشان کر دیتا۔ یکا یک دل میں ہوتا درد انہیں بے حال کر دیتا۔

ادھر سے گل فشاں کی لں ترانیاں انہیں دکھ دیتی تھیں۔ اب بھی وہ کئی روز سے جمال الدین ملک

کے پیچھے بڑی تھیں کہ وہ سیاست میں حصہ لیں۔

”آپ الیکشن میں کیوں نہیں کھڑے ہوتے؟“

اور وہ انہیں مناسب طریقوں سے ٹال رہے تھے مگر گل فشاں روز ہی بات بے بات موضوع چھیڑ دیتیں۔ جب سے پنجاب میں سیلاب آیا تھا تب سے تو گل فشاں نے اور بھی اپنی خواہش کے رنگ تیز کر دیے تھے۔

”جمال۔ آپ الیکشن میں کھڑے ہوں تو یقیناً جیت جائیں گے۔ سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کریں۔ اخبارات میں پبلٹی کروائیں۔ جہاں بھی جائیں اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر ساتھ لے جائیں پتا کہ آپ سیلاب زدگان کی جو مدد کریں فوٹو گرافر کیمرے میں محفوظ کرے گا۔ اور رپورٹر اچھی سی خبر نمایاں جگہ پر اخبار میں لگا دے گا۔“ گل فشاں نے انہیں شہرت کے نت نئے طریقے بتائے۔

”پھر کیا ہوگا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بھئی۔ آپ جہاں سے بھی کھڑے ہوں گے آپ کے ووٹ کیے ہوں گے۔ یوں بھی جمال ہمارے پاس دولت کی کمی تو نہیں ہے لٹا دیں۔ بہت کمالیں گے۔ پھر اگر کوئی وزارت مل گئی۔ ہائے جمال آپ کا دل نہیں چاہتا جھنڈا لگی گاڑی میں بیٹھنے کو۔ باوردی اسٹے سے لیس گاڑی ہو۔ گھر پر پہرہ ہو۔ جمال یہ میرا خواب ہے۔ دیکھنا مسز تابش تو جل سڑ جائیں گی۔ جو اپنے شوہر کے میسر ہونے پر اکڑتی پھرتی ہیں۔“

”تو تم مسز تابش کو نچا دیکھنا چاہتی ہو۔ اس سے مقابلہ کر رہی ہو۔“

”مقابلہ نہیں“ میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کی کیا دلیو ہے۔ بس آپ الیکشن لڑیں۔ آپ کے آبائی علاقے کی سیٹ تو آپ کی ہے ہی دوسری سیٹ آپ ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کر کے اصل کر سکتے ہیں۔ میں بھرپور ساتھ دوں گی آپ کا۔ کنوینٹنگ کروں گی آپ کی۔ اور پتا ہے جمال۔ میں نے سوچ لیا ہے بہت سادہ سے کپڑے خواؤں گی۔ جس علاقے سے الیکشن کے لیے کھڑے ہو گئے پیدل ال کا دورہ کروں گی۔ ہائے جمال آپ سوچیں تو۔“

”گل فشاں۔ تمہارے نازک پیروں میں چھالے پڑ جائیں گے۔ وہ کام کرو جو سدا کر سکو۔ کیوں صوم لوگوں کو دھوکا دینا چاہتی ہو؟“

”بس کہہ دیا۔“ وہ ادا سے بولیں۔

”اچھا سوچوں گا۔“ انہوں نے پیچھا چھڑایا۔ مگر پیچھا کہاں چھوٹا تھا۔ گل فشاں کا بس نہیں چل رہا کہ جمال الدین ملک سے لمحوں میں ہائی بھر وائیں۔ اب بھی وہ جمال الدین ملک کے بہت ہی قریب ناخن فائل کر رہی تھیں۔ اور وہ فائل میں مستغرق تھے۔

جب کوئی دیر تک جمال الدین ملک نے ان کی طرف توجہ نہ دی تو بالآخر وہ بولیں۔

”آپ نے کیا سوچا پھر؟“

”سوچ لوں گا۔“

”کب سوچیں گے جب وقت گزر جائے گا؟“

”ابھی تو الیکشن میں وقت پڑا ہے۔“

”وہ تو سچ ہے لیکن ہمارے پاس قطعاً وقت نہیں ہے جمال۔ دیکھیں سیلاب اگر ختم ہو گیا تو تب نے فیصلہ کیا تو خاک مزا آئے گا۔ جو کچھ کرتا ہے آج ہی بلکہ ابھی کریں۔ میرا تو خیال ہے ہم کل ہی

لاہور چلے جائیں۔

”مگر تم سوچو گل۔ کہ میں کس منہ ہے جاؤں۔ مجھے کراچی میں رہتے ہوئے پندرہ برس ہو۔ ہیں۔ اور انکسٹن میں وہاں جا کر لڑوں۔ فرض کرو میں جیت بھی گیا تو جو لوگ مجھے دوٹ دیں گے وہ لاج یہ چاہیں گے کہ میں نے ان کے کام بھی آؤں۔ تو بتاؤ وہ اپنے معمولی سے کام کے لیے مجھے کراچی تلاش کرتے پھریں گے۔“

”سب ہی ایسا کرتے ہیں اور پھر آپ تو اسلام آباد میں رہیں گے۔ یوں بھی ایم این اے اور پی اے کو یہی کام تو نہیں رہ گیا کہ لوگوں کے چھوٹے کام کرتے پھریں۔“ وہ نخوت سے بولیں۔ ”وہ چھوٹے کام جن کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے وہ ان کے لیے بہت بڑی اہمیت حامل ہوتے ہیں۔ آئی سمجھ۔“ انہوں نے اس کم عقل عورت کو سمجھانا چاہا۔ مگر وہ کب خود کو کم عقل سمجھتی تھیں ان کا تو خیال تھا ان جیسی عقلمند عورت تو روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔ وہ تو ہر صورت منشر کی بیگم بننا چاہتیں۔ اور گل فشاں کے مجبور کرنے پر وہ ہار گئے۔

انہیں پتا تھا وہ ساری عمر انہیں طعنے دیں گی۔ حالانکہ انہوں نے کس قدر سمجھایا تھا۔ ”گل۔ تم یقین کرو میرے خاندان میں آج تک کسی نے سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ ہم لو دیہاتی لوگ ہیں۔ سیاست کی الف ب سے بھی واقف نہیں۔“

”تو آپ کا کیا خیال ہے۔ یہاں جو لوگ سیاست میں آتے ہیں وہ واقف ہوتے ہیں سیاست سے۔ جی نہیں جناب یہاں آدھے تیز آدھے شیر ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات بہت کم قافہ وان ہوتے ہیں۔ یوں بھی سیاست کا اب کیا معیار رہ گیا ہے۔ ادا کاڑ کھلاڑی اور تو اور انگوٹھا چھاپ لہ بھی سیاست دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پھر آپ تو اتنے پڑھے لکھے ہیں۔ ضرور کامیاب ہوں گے۔“ فشاں دھوکے سے بولیں۔

”اگر تم نے ساتھ دیا تو۔“ وہ مسکرائے۔

”یوں بھی ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔“ گل فشاں نے خوشی سے ہنس کر کہا۔

ان کے لیے جی غور تھا اپنی بات منوانے کا۔

فخر تھا شوہر کو سیاست میں دھکیلنے کا۔ پھر اہر بھی تو ہموار کر لی تھی۔

موقع بھی تھا سیلاب زدگان کی مدد کے ڈھیروں ہمدردیاں لی جائیں پھر۔ اسی امداد کو نارا گریہ کر ان سے دوٹ لینے پہنچ جاتے اور سادہ سے لوگ اپنے محسنوں کا احسان ایک دوٹ کی پرچی پر اُتار

کی سہی کرتے۔

جمال الدین ملک نے طویل سانس لے کر فائل بند کر دی۔ اور اسے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے۔

”گل۔ لائٹ آف کر دو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”اتنی جلدی جمال۔ آپ لائحہ عمل تو تیار کریں۔“

”وہ بھی تم کرو۔“

”کمال بھائی کو فون کر کے بتا دوں کہ ہم کل آ رہے ہیں؟“

”پہلے بیڈ تو کنفرم کرواؤ۔“

”وہ بھی کروالوں گی۔ اپنا طاہر کس روز کام آئے گا۔“ انہوں نے قہار سے کہا اور پھر لائٹ

کر کے خواب گاہ سے نکل گئیں کہ لاہور۔ جانے کی تیاری بھی تو کرنی تھی۔

☆☆☆

پری پیکر نگارے سرو قد لالہ رخسارے

سرایا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

وہ میز پر آنکھیں موندے بیٹھا تھا اور جو بھی غاشیہ اس کے قریب سے گزرتی تو وہ یہ شعر گنگنا تے لگتا۔

پری پیکر نگارے

سرایا آفت دل بود

وہ لہراتی، بل کھاتی ہوئی کمرے سے نکل جاتی۔ پھر وہ کسی کام سے کمرے میں آتی تو وہ پھر حسب معمول گنگنا تے لگتا۔ مگر وہ بھی تو جان بوجھ کر بار بار آ رہی تھی۔

بلکہ دل اسے دھکیلتا تھا جہاں وہ دشمن جاں بیٹھا تھا۔

روح کا چین اور دل کا قہار۔

مگر وہ کل سے اس سے خفا تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے منائے اور۔۔۔ وہ منانے کی۔۔۔ کوشش ہی میں تو شعر گنگنا رہا تھا۔ اسے پتا تھا وہ یہ سب اسی کو سن رہا ہے۔ مگر کھلی اتنی جلدی ختم نہیں کی جا سکتی تھی۔

”اتر و میز سے۔ مجھے صاف کرنی ہے۔“ غاشیہ نے کہا۔ تو وہ سنی ان سنی کر کے بولا۔

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شان بے نیازی!

تم مانگتے پھرو گے اپنا غرور ہم سے

وہ ذرا زک زک کر شرارت سے کہہ رہا تھا۔

تم مانگتے پھرو گے

اپنا غرور ہم سے

”تم اس قابل ہو کہ تم سے کچھ مانگا جائے اللہ دینا ہی پڑ جاتا ہے۔“ غاشیہ بھلا کہاں چوکنے والی تھی۔

”دیکھو غاشیہ کمال الدین۔“ وہ چھلانگ لگا کر ڈانٹنگ ٹیبل سے اتر اور اس کو سر تاپا غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

ایک ذرا سی میری ہار پر مت جاؤ۔ بس پتا نہیں تمہیں دیکھ کر کم بخت دل کو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔“ غاشیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

تم میں کون سی بات ہے ایسی!

اتنے اچھے کیوں لگتے ہو؟

”فضول شعر مت پڑھا کرو۔ تمہیں کتنی مرتبہ میں نے منع کیا ہے وہاں احمد مجھے بالکل پسند نہیں،“ و ہ ترخ کر بولی۔

”اے لڑکی۔ شعروں کو برا مت کہنا۔“ اس کی فطری شگفتگی عود کر آئی تھی۔ ”میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ یہ شعر ہی تو ہیں جو مدعا بنانے کرنے کا وسیلہ ہیں ورنہ میں تو انظہار محبت کرتے ہوئے جملوں میں لفظوں کو ترتیب دیتے دیتے ہی بوڑھا ہو جاتا۔ اور تم کسی اور کی ذولی میں بیٹھ جاتیں۔“

”ذرا اچھے نہیں۔“ غاشیہ اس کی نظروں کی تیش سے پھل گئی۔

”اب تو مجھ سے خفا نہیں ہے نا؟“۔ وہاں احمد نہایت لگاؤ سے پوچھ رہا تھا۔
”اگر تم نے آئندہ فون پر کسی لڑکی کو بے وقوف بنایا تو قسم سے میں تم سے کچی کچی خفا ہو جاؤں گی۔“

”سچ بتاؤ، تم جیلس تو نہیں ہوتیں۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولا۔
”میری جوتی کی نوک پر۔“ وہ ہنرک اٹھی۔ اور مشتاقی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ مگر وہاں احمد کو پتا تھا کہ وہ معصوم سی لڑکی اس سے کبھی خفا نہیں رہ سکتی۔
اور بات ہی ایسی تھی کہ اس کا خفا ہونا لازمی تھا۔ کل جب وہ اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا تو غاشیہ قریب ہی تھی۔ وہاں کے دوست کا نام فرحت تھا۔ اور وہ اس کا نام لے لے کر بات کر رہا تھا۔
ہاں یار فرحت۔ نہیں یار۔ چھوڑو یار۔
اسے خبر ہی نہ تھی کہ بدگمانی غاشیہ کے دل میں اتر گئی تھی۔ غاشیہ بھی تو بے وقوف تھی صرف نام پر ہی بدگمان ہو گئی تھی۔ یہ نہیں سنا تھا کہ حملوں کا صفیہ کیا ہے۔ ”فرحت“ نام ہی نے اس کے تلووں میں آگ لگا دی تھی۔

وہاں کہیں نہ جانا چاہتا تھا مگر فرحت کا اصرار تھا راوی جانے پر۔ تاکہ سیلاب کی صورتحال کا جائزہ لیا جاسکے۔ فرحت کو ”سیلاب“ دیکھنے کا شوق تھا۔ جبکہ وہاں کو کوئی ایسا شوق نہ تھا۔ اسی سیلاب نے ہی تو اس کے خاندان کو ایک ایسا بھی نہ بھولنے والا زخم دیا تھا کہ جو برسوں گزر جانے کے باوجود بھی نہ بھرتا تھا۔
ٹیسیں دیتا رہتا تھا۔ ناسور بن کر بہتا رہتا۔
اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا۔
فرحت میری کھلکی کا احساس کر کے جب وہ تیار ہو کر بایک کی چابی بھلا تاہو ابابا آیا تو وہ سنتھے کی باڑھ کے پاس کھڑی باڑھ کو درست کر رہی تھی۔
”ارے تم نے پانی گیری کب سے شروع کر دی۔“
”کہیں جارہے ہو؟“ غاشیہ نے اس کے مذاق کو نظر انداز کیا۔
”ہاں ذرا۔“ وہ کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے کہنے لگا۔
”فرحت کی طرف۔“ غاشیہ نے جملہ اچک لیا۔
”ہیں تمہیں کیسے پتا؟“ وہاں کو واقعی پتا نہ تھا کہ غاشیہ نے اس کی باتیں سنی ہیں۔ اور وہاں کی دیدہ دلیری پر وہ سلگ ہی تو گئی۔

”چوری اور سینہ زوری۔“ وہ باڑھ پھلانگ کر روش پر اس کے قریب آ گئی۔
”کیا مطلب؟“۔ وہاں حیران تھا۔
”کون ہے یہ لڑکی؟“۔
”اوہ۔“ ایک اطمینان بھر سانس وہاں کے لبوں سے نکلی اور اس کی رگ شرارت پھڑکی۔
”بتاؤ۔ کون ہے؟“۔
”یار تم سے کیا چھپانا غاشی۔ وہ دیکھو نا۔ وہ رانگ نمبر پر دوستی ہو گئی تھی۔“ وہاں شرمندہ شرمندہ سا بول رہا تھا۔
”کیا؟“۔

”ہاں۔ اب دیکھو نا، تم تو باہر کہیں میرے ساتھ گھومنے پھرنے نہیں جاتیں تو میں کیا کروں۔ آخر

میں بھی بندہ ہوں۔ پتا ہے میرے دوست اپنی فرینڈز کے ساتھ روز شام کو ڈیٹ مارتے ہیں اور میں یہاں تمہاری ایک نظر کے لیے سوکھتا رہتا ہوں۔“ وہ نہایت معصومیت سے کہہ رہا تھا۔ جیسے کہ واقعی اس پر بہت ظلم ہو رہا ہو۔

”تو تم نے یہ راہ نکالی۔؟“ وہ پھاڑ کھانے کے سے انداز میں بولی۔
”پھر کیا کروں۔ یوں بھی فرحت کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیاں ہیں۔“ وہاں نے نور جمائی۔
”وہاں۔۔ میں کیساں رہی ہوں؟“
”سچ کہہ رہا ہوں یقین کرو میں تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ آخر میرا بھی دل ہے اس میں ارمان ہیں۔“ وہاں نے کہا اور وہ تو کم صم سی رہ گئی تھی۔ اے پتا بھی نہ چلا تھا کہ وہاں بایک اشارت کر کے گھر سے نکل گیا تھا۔
اور مارے ڈکھ کے غاشیہ کی تو آنکھیں ٹلکے لگیں۔ وہ تقریباً دوڑتی اپنے کمرے میں آئی۔ دروازہ بند کر کے دروازے سے ٹیک لگا کر بے تحاشا ضبط کے باوجود بھی رو دی۔

کتنی کمینہ ہے۔
رزیل۔۔
بد بخت۔۔
میں اس کے ساتھ گھومنے نہیں جاسکتی تو یہ باہر دل بہلاتا ہے۔ خدا کرے تم مر جاؤ وہاں۔
نہیں۔ غاشیہ کا دل چیخ اٹھا۔
میں مر جاؤں۔ اس کے لب پھڑکے۔ ہاں میں ہی مر جاؤں تو صبح ہے۔
وہ۔۔ بد بختوں کی طرح کا پتی رہی اور روتی رہی۔
یا خدا یہ کون سا مقام ہے۔
میرے رب میں کیسے یہ سب برداشت کر پاؤں گی۔
وہاں تو ڈال ڈال پرمنڈلانے والا بھنورا ہے۔
میں نے تو اپنے من کے خالی کاغذ پر صرف اسی کا نام لکھا اور اس کا تو پورا پنڈا داغ داغ ہے۔
یا خدا مجھے موت دے دے۔
وہ روتی رہی اور خود کو بد دعائیں دیتی رہی۔

وہاں رات کو دیر سے آیا تھا۔ جب گھر کے سب کمین سو چکے تھے مگر اندھیرے کمرے میں وہ تو جاگ ہی رہی تھی۔ بایک کی آواز سن کر وہ تیزی سے دریتچے میں آئی۔ وہاں نے ایک نظر اس کے دریتچے کی طرف دیکھا تھا پھر مسکرا کر برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ غاشیہ کا خیال تھا کہ وہاں نے اسے نہیں دیکھا۔ مگر وہ تو اسے محسوس کر لیتا تھا۔ رات بھی اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اب تک جاگ رہی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور شاید سوچتی چکا تھا۔ مگر غاشیہ کو تو نیند ہی نہ آئی تھی۔ محبوب کے بے وفائی کا خیال دل میں گڑ جائے تو نیند کی میناڑ جاتی ہے۔
ساری رات ہی وہ اول فول باتیں سوچتی رہی تھی۔ صبح جب وہ اٹھی تو زہرہ جیس ناشتے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”کم از کم احساس تو کر لیا کہ غاشی تو میرا۔“ وہ ڈکھ سے بولیں۔
”سوری امی۔ رات ٹھیک سے نیند نہ آئی تھی۔“

”کوئی خاص وجہ؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بس یونہی۔“ غاشیہ نے ٹالا۔

”تو بھی کیا کرے۔ سارا دن تنہائی کے کوڑے سہتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کوئی ایسا نیک بندہ ملے جو گھر داماد بن جائے۔ تو چلی گئی تو یہ گھر مجھے کاٹ کھائے گا۔“

”میں امی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”یعنی گھر داماد تلاش کر دو گی۔“ وہاں نے شاید یہ بات سن لی تھی۔ تبھی تو اندر آتے ہوئے بولا تھا۔ مگر اس نے وہاں کو دیکھا نہ تھا۔

”مت تنگ کیا کرو بیٹا۔“ زہرہ جیسں مسکرائیں۔

”مامی جی۔ آپ نے بات کی میں نے اس سے پوچھ لیا۔ تو یہ تنگ کرنے والی بات نہیں ہے۔“

وہاں نے سعادت مندی سے کہا۔

”بس بیٹا۔ کبھی کبھی میں ہی بے نگاہی کرتی ہوں۔ بیٹیاں تو اپنے ہی گھر میں اچھی لگتی ہیں جیسے آصفہ اور آمنہ ہیں۔ کبھی کبھی آتی ہیں تو رونق بڑھ جاتی ہے۔ بہوئیں اصل رونق ہوتی ہیں مگر۔“

زہرہ جیسں کی آواز بھر گئی۔

”پلیز امی۔ آپ رویا مت کریں۔“ غاشیہ نے ماں کا سر کندھے سے لگا لیا۔“ بھابیوں کا کیا قصور ہے۔ بس ہمارے بھائی ہی ایسے ہیں۔“

”ایک امجد ہے۔ ایسا گیا کہ لوٹ کر ہی نہ آیا۔ احد اور ساجد کو تو اب کبھی فرصت ہی نہیں ملتی جو ہمارے پاس آ کر ہی بیٹھیں۔ میں تو کمال سے کہتی ہوں یہ گھر چھوڑ دیں۔ کسی چھوٹے سے گھر میں رہیں مگر وہ مانتے ہی نہیں۔ تنہائی کا کرب لیے وہ کہہ رہی ہیں۔ اور ان کے دکھ پر غاشیہ کا دل تو کٹ ہی رہا تھا ساتھ ساتھ وہاں کا دل بھی غم کے دھوئیں سے بھر گیا۔ اس نے غاشیہ کی سمت دیکھا جو چائے بنا رہی تھی پھر اس نے ایک کپ زہرہ جیسں کو دیا اور دوسرا کپ بغیر دیکھے وہاں کے سامنے رکھ دیا۔ وہاں کا دل چاہا اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھوڑ ڈالے۔“

آخر میری طرف کیوں نہیں دیکھتی۔؟

اسے اس کی جھکی آنکھوں پر غصہ آ گیا۔ غاشیہ کے چہرے پر کرب انگیز سوز تھا۔ جیسے کوئی درد بھری بانسری کی لے پھیر دے۔

جیسے نوحوں کی درویش ڈوبی آواز۔

پھر زہرہ جیسں ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ جوان کی پناہ گاہ تھا۔ اور ان کے جانے کے بعد غاشیہ بھی کام میں لگ گئی کہ ملازم ہونے کے باوجود گھر کی صفائی تھرائی خود ہی کرائی تھی۔ اس طرح ایک تو مصروف رہتی اور تنہائی کے عذاب سے جان چھوٹی رہتی۔ یوں بھی لی بی اے کا گزیرام دے کر وہ بالکل فارغ ہی تو تھی۔ کبھی کبھار نہیں اور بھابیوں آ جائیں تو گھر میں رونق لگ جاتی اور دل بہل جاتا تھا۔

آج تو وہ خفا تھی اور وہ کئی بار ڈانٹنگ ہال میں آئی تھی۔ وہاں میز پر چڑھا بیٹھا تھا اور مسلسل اسے ”منا“ رہا تھا۔

وہ جب بھی اس سے خفا ہوتی، وہ شعر میں اپنا دم عیاں کرتا تھا۔ مگر وہ آج بہت خفا تھی مگر اب راضی ہو گئی تھی۔ اور وہاں اسے ”سچ“ بتانا چاہ رہا تھا۔

”سنو غاشی۔“

”مجھ سے کوئی بات بے نیکی مت کرنا۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”تمہیں پتا ہے فرحت کون ہے؟“

”نام مت لو اس کا۔“ غاشیہ کو غصہ آ گیا۔

”بھئی۔ کیوں نام نہ لوں وہی تو۔“ وہ مزہ لیتا ہوا بولا۔

”تم پھر شروع ہو گئے؟“ غاشیہ نے اُسے گھورا۔

”یار۔ وہ فرحت منیر ہے میرا دوست اب تم نام کی وجہ سے شک میں پڑ گئیں۔“ وہ ہنسا۔

”کیا۔؟“ غاشیہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”جی جناب۔ میں اسی کے ساتھ تو ڈیٹ مارتا ہوں۔ پھر یہ دیکھو کہ مجھے تم جیسی تک چڑھی ماموں زاد بھلا کہاں ملے گی۔ مجھے تو تیرے جیسی کوئی لگتی ہی نہیں۔“ تم سے اگر تو نہ ملی تو سچ غاشی۔ میں بھی شادی نہیں کروں گا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”بارڈلے ہو گئے ہو؟“ غاشیہ نے پیار سے کہا۔

”یہ تو پرانی بات ہے۔“ وہ لہک کر بولا۔ ”پھر ایک اور کہانی مشہور ہو جائے گی۔ میں بھی اسجد کی طرح بن باقی لے لوں گا۔“

☆☆☆

”خدا نہ کرے۔“ غاشیہ نے بے قرار ہو کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور وہاں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ غاشیہ کو لگا جیسے وہ جنگلوں کی زد میں آ گئی ہو۔ اسے لگا اس کی سانسیں رک جاسں گی۔

دھڑکن ٹھہر جائے گی۔

”مت اتنا چاہ مجھے غاشی۔ میں کسی روز ایسی ویسی حرکت کر بیٹھوں گا تو تو روتی پھرے گی اور۔“

وہاں نے اس کے قریب ہو کر سر گونگی کی۔ غاشیہ کا دل مارے خوف کے بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

اور وہ بھاری لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”مجھ سے خفا بھی نہ ہوا کہ۔ جوگی بن گیا تو ڈھونڈتی پھرے گی۔ پکارے گی مگر میں جنگلوں میں اپنے گیان میں مست ہوں گا۔ پھر نہیں سنوں گا تیری پکار۔ میری خفگی کو آواز مت دے۔“

وہ سنسنیل گئی تھی۔

پھر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

”خوں کے طلسم سے آزاد ہو گئی تھی۔“

”بس ہو گئے شروع تم اپنے پسندیدہ ٹاپک پر۔“ غاشیہ نے اسے چڑایا۔

”کہتے ہیں جوانی ہے ہی ایسی شے ہر لمحہ بندہ سلگتا ہے۔ دل میں جذبے اُدھم پچاتے ہیں اور۔۔۔ اور مجھ پر بھی جوانی آئی ہوئی ہے نا؟“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر مست لہجے میں بولا۔

”شرم کر۔ ہمیشہ تمہارے دماغ میں خناس بھرا رہتا ہے۔“

”دیکھ تو میرے سچے اور کوئل جذبوں کی تو بین نہ کیا کر غاشی۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا ہو گا؟“ غاشیہ نے اسے دیکھا۔

”میری محبت اور بھی شدید ہو جائے گی۔“ وہاں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

تجھی فون کی گھنٹی بجی۔ وہاں فون سننے چلا گیا اور غاشیہ برتن سیٹنے لگی۔

وہ کچن میں برتن رکھ کر باہر آ رہی تھی کہ وہ دروازے میں ڈٹا کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔

”بیگم جمال الدین ملک آ رہی ہیں۔“

”یعنی چاچی۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”آگے بھی تو سنو۔ وہ بیسٹن ٹھہریں گی۔ ماموں جی بھی ساتھ ہیں۔“ وہاں جتا کر پلٹ گیا۔ اور غاشیہ ماں کو اطلاع دینے کے لیے ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

”اماں۔ بارش بہت تیز ہے۔ اندر آ جا۔“ تاباں اس کے قریب کھڑی کہہ رہی تھی۔ جب ہم نے مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اپنے کمرے ہی میں سریں۔“ تاباں کی آواز بھر آئی۔

مگر وہ کہہ بیٹھ کر رہی تھی۔

اسے تو لگ رہا تھا جیسے جگ بیت گئے ہوں۔ وہ تو یہیں بیٹھی ہے۔

ٹھنڈے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

دل بھی دھڑک رہا تھا۔

مگر انجانے سے خوف نے اس کے ذہن کو جکڑا ہوا تھا۔

پانی کا ریلہ آئے گا۔ بہت بڑا ریلہ آئے گا۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہوگا۔ اور سب بہہ جائیں گے۔ کچھ نہیں بچے گا۔ سرفاں سوچوں میں غرق تھی۔ اس کے لب سٹے ہوئے تھے اور آنکھوں میں عجیب سی وحشت زدہ۔۔۔ کیفیت تھی۔ کتنے ہی گھنٹوں سے وہ یونہی بیٹھی تھی۔

ہر کسی سے بے پروا۔

ہر کسی سے بے گانہ۔

آج تو اس کی سوچیں بھی اپنی نہ رہی تھیں۔

”تابی۔ یہ سیلاب ہر شے کو ہنس نہیں کیوں کر دیتا ہے؟“۔ شرفاں نے اپنی بے تحاشا اداس نظروں سے اسے دیکھا۔

”اماں۔ سیلاب ہے ہی ایسی چیز۔“ تاباں کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں کے سوال کا کیا جواب دے۔ وہ سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی دو تین ماہ کے فلسفیانہ سوال کو سمجھ ہی نہ پاتی تھی۔

”اندر آ جانیک بخت۔“ حیات محمد اسے آوازیں دے رہا تھا۔ تب وہ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی کہ کافی دیر سے اس طرح بیٹھے بیٹھے اس کے گھٹنے ٹٹل ہو چکے تھے۔ جیسے بت کی طرح ساکت ہو گئی ہو۔ وہ تاباں کا سہارا لے کر کمرے میں آ گئی۔ اور چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بابا۔۔۔ تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟“

”میں بھی تیرے سے خفا ہوا ہوں؟“ حیات محمد کے لہجے میں ڈکھل گیا۔

”مگر شاید تاباں خفا ہو گئی ہے۔“ اس نے تاباں کی طرف دیکھا۔ جو نیچے پیٹھی گیلی مٹی میں تنکے سے لکیریں ڈال رہی تھی۔ اس کے کان تو شرفاں اور اپنے دادا کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ مگر اس نے ماں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور شرفاں کہہ رہی تھی۔

”بابا۔ اگر ہم یہاں سے چلے بھی جائیں تو موت آنی ہے تو کہیں بھی آ سکتی ہے۔ فرشتہ تو ہر جگہ روح قبض کر سکتا ہے۔ موت سے بھاگنے والے تو بزدل ہوتے ہیں بابا۔“

”بات موت کی نہیں شرف پتر۔“ حیات محمد کو جب شرفاں پر بے حد پیار آتا تو وہ اسے شرف کہتا تھا اور یہ تین حرفی نام شرفاں کو بہت اچھا لگتا تھا۔

”مسئلہ یہ ہے کہ اگر یہاں پانی آ گیا اور ریلہ شدید ہوا تو ہم بیٹوں بہہ جائیں گے۔ مختلف سمتوں میں۔ پھر پتا نہیں مل سکیں یا نہیں۔ جان نکلے بھی یا۔ تو بات ہے پھڑنے کی۔ سارا خوف ہے پھڑ جانے کا۔

جو نظروں کے سامنے مر جائیں ان کے پھڑنے کا ڈکھ انسان رو دھو کر بھول جاتا ہے۔ اور جو جیتے جی پھڑ جائیں۔ ان کے کے ملنے کی آس روز دھکی کرتی ہے۔ تمہیں کیا پتا پھڑنے کا ڈکھ۔“ حیات محمد نے حقے کی

نے لبوں سے لگا کر حقہ گڑا کر شروع کر دیا۔ اور شرفاں بی بی نے نہایت حیرت اور کرب آمیز احساس کے تحت اسے دیکھا۔ اس کے اندر ایک لچل لچل گئی۔

”ارے بابا۔ مجھے پتا نہیں ہے۔ پھڑنے کے ڈکھ کا۔“

اسی ایک ڈکھ کا تو پتہ ہے۔ بانی سارے دکھوں سے مادرا ہو چکی ہوں۔ عرصہ ہوا اسی پھڑنے کے ڈکھ کی گھڑی سر پر اٹھائے پایادہ مسافر کی طرح روہی دھرتی کے ریگستانوں میں پھر رہی ہوں۔ کھونج رہی ہوں۔ تلاش کر رہی ہوں۔

کسے۔۔۔؟

یہی سمجھ نہیں آتی مجھے۔ کہ آخر کس کی تلاش ہے؟

کسے کھوتی ہیں میری آنکھیں۔

سامعین کس کی آہوں کی منتظر رہتی ہیں۔ یہ پھڑنے کا ڈکھ ہی تو ہے جس نے میری آنکھوں میں انتظار کے دے روشن کر رکھے ہیں۔

برسوں گزر گئے مگر ان دنیوں کو میں نے نہیں بھجنے دیا۔ شاید۔ شاید کوئی آ جاے۔ ان ریگستانوں میں۔ اُڑتی ریت کے دریا کو پھلانگ کر۔ جن پر قدموں کے نشان بھی مٹ جاتے ہیں تلاش کرے مجھے۔

ان تپتے ہوئے نموں پر۔ اور اپنی ڈاچی (اڈنی) پر بٹھا کر مجھے لے جائے۔ میں تو اپنے سانول کی منتظر ہوں۔

”ہشت لنگی۔“ شرفاں کے دل نے اسے جھڑکا۔ اس عمر میں اور تیرا سانول۔ دماغ تو خراب نہیں تیرا۔ اور وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہو گئی۔

تجھی پانی میں شڑاپ شڑاپ کرتے وہی فوجی ان کے گھر میں داخل ہوئے جنہوں نے چند گھنٹے پہلے پورا گاؤں خالی کر لیا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی شرفاں شیریں کی طرح ہچک چار پائی سے کھڑی ہوئی اور

دوسرے لمحے وہ آنگن میں تھی۔ اور ان پر برس رہی تھی۔

”کہہ جو دیا ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ تم پھر آ گئے ہو۔“

”اماں۔ آپ واقعی کہیں نہ جائیں۔ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ کہ خدا کا شکر ہے سیلاب کا بڑا ریلہ گزر گیا ہے۔ دریا کے سارے بند اور پستے محفوظ ہیں۔ اب کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ نوجوان نے

شرفاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کہا۔

”واقعی۔ اب سیلاب نہیں آئے گا۔“ تاباں نے بے غرار لہجے میں پوچھا۔

”نہیں بی بی۔ آپ لوگ بے فکر ہو جائیں۔ اماں کا مضبوط عقیدہ کام آ یا ہے۔ اور دیکھیں قدرت خدا کی کچھ بھی نہیں ہوا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ شرفاں پیروں کے بل نیچے بیٹھ گئی۔ اور پھر وہ گھنٹوں پر سر رکھ کر

”تم دس بجے تک سو کر اٹھ جاؤ گی؟“ جمال الدین بولے۔
 ”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ اٹھلا کر بولیں۔ ”کیوں نہیں اٹھ جاؤں گی۔ بس آپ بھی یہاں کے مقامی سیاستدانوں سے مل گئیں۔ اور میرا تو خیال یہ ہے کہ کسی جماعت میں شرکت کا اعلان کر دیں۔ اس سے بھی بیک مضبوط ہوتی ہے۔“

”دیکھوں گا۔“ جمال الدین نے نہایت آہستہ سے کہا۔
 ”ویسے آپ بھی صبح چلیں نا۔“
 ”میں پھر چلا چلوں گا۔ تم نے سب کچھ کر لیا ہے نا؟“
 ”ہاں آج سارا دن یہی تو کرنی رہی ہوں۔ تقریباً ایک ہزار خشک خوراک کے پیکٹ لے جاؤں گی آج تیار کروا لیے ہیں سب۔ غاشیہ تم نے چیک کر لیے نا؟“
 ”جی آئی۔“ غاشیہ نے روبروٹ کی طرح جواب دیا۔
 ”تمہارے ساتھ کون کون جائے گا؟“ جمال الدین ملک نے پوچھا۔
 ”ماموں جان۔ میں اور غاشیہ ہوں گے۔ وہاں نے جلدی سے بتایا۔“
 حالانکہ پروگرام میں غاشیہ کا نام نہیں تھا۔ مگر وہاں اسے ساتھ گھیننا چاہتا تھا۔ ویسے بھی وہ کون سا اس کے ساتھ بھی نہیں گئی تھی۔ اس طرح پہنی تو رہتی۔ ورنہ وہ تو بور ہی ہو جاتا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ انہیں بھلا کیا اعتراض تھا۔ البتہ اعتراض تو غاشیہ کو تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔
 ”غاشیہ۔ تم کوئی سادہ سے کپڑے پہننا۔ اچھا نہیں لگتا کہ ہم غریبوں کے آنسو پونچھنے جا رہے ہیں نا۔ گل فشاں نے اسے سمجھایا۔

”جی آئی۔“ غاشیہ نے آہستگی سے کہا۔
 وہاں کا دل چاہا کہ ”آپ خود کو سمجھائیں۔“ مگر وہ ہونٹ بھیٹے بیٹھا رہا۔ اور دوسرے روز وہ بیگم جمال الدین ملک کے ساتھ ان کے ”مشن“ پر روانہ ہوئے تھے۔ یونیورسٹی تو وہ گیا تھا کہ کوئی بھانہ بھی نہ کر سکتا تھا۔
 بیگم جمال الدین نے غریب لوگوں میں غذا کے پیکٹ تقسیم کیے تھے۔ ساتھ نقد رقم بھی دی تھی اور فوٹو گرافر نے اپنا ”حق“ ادا کیا تھا۔ بھی کسی میلے پھیلے کپڑوں میں ملبوس عورت کو بیگم جمال الدین نے گلے لگا کر تصویر بنوائی تھی۔
 بھی لاغر سے تنگ دھڑنگ بچوں کے گال تھپہپا کر پیار کیا تھا۔ اور فوٹو گرافر نے وہ لمحے کیمرے میں محفوظ کر لیے تھے۔

اور ایک جگہ تو بیگم جمال الدین نے حد ہی کر دی تھی۔ پانی سے گزر کر وہ مصیبت زدہ لوگوں تک پہنچی تھیں۔ لامحالہ وہاں اور غاشیہ کو بھی ساتھ دینا ہی پڑا تھا۔ ساتھ ہی کریم بھی تھا جو غذا کے پیکٹ اٹھائے اٹھائے ان کے ساتھ تھا۔

”یار لگتا ہے ہم سیلاب زدگان ہیں“ وہاں نے غاشیہ سے سرگوشی کی تو اس نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر ہنس دی۔ وہ شلوار کے پانچے اونچے کیے ہوئے تھا۔ پاؤں گیلی مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ پھرے ہوئے بال۔ بیزار چہرہ۔ وہاں کی حالت دیکھ کر غاشیہ ہنس دی۔

وہ لوگ تقریباً سب پھر کو واپس لوٹے تھے۔ بیگم جمال الدین لوگوں کو بے وقوف بنا کر بے حد خوش تھیں۔ اور وہاں سوچنا رہ گیا۔

سیلاب نہیں آیا تھا مگر۔ اس کی آنکھوں کی دہلیز پار کر کے آنسوؤں کا ریلواڈ آیا تھا۔ پتا نہیں یہ آنسو تشکر کے تھے یا پھر سیلاب کے نہ آنے کے۔ کہ وہ تشدد سے سیلاب کی منظر کشی اور وہ نہایت چپ چاپ کوئی چیخڑ چھاڑ کے بغیر گزر گیا تھا۔

☆☆☆

بیگم جمال الدین ملک اپنی ٹیم کے ہمراہ ایک گاؤں کے کینوں کے درمیان موجود تھیں جو سیلاب سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ ان میں غذا کے پیکٹ بمعہ جھوٹی تسلیوں کے تقسیم کر رہی تھیں۔
 بیگم جمال الدین ملک کی ٹیم میں مشہور مقامی اخبار کے ایک صحافی اور فوٹو گرافر کے علاوہ وہاں اور غاشیہ بھی تھے۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ وہاں جرنلزم میں ایم کر رہا ہے تو وہی ان کے ”دورے“ کی رپورٹنگ کرے۔ اخبارات میں خبریں دے۔ مگر وہاں نے کہا تھا۔
 ”میں انڈر ٹریننگ ہوں۔ پھر آپ جیسی مشہور سماجی خاتون کے کام کا صحیح احاطہ نہیں کر سکوں گا ماما جی۔“

”واٹ ماما جی۔“ گل فشاں ترخ گئیں۔ ”مجھے یہ آؤٹ آف فیشن الفاظ بالکل بھی پسند نہیں ہیں۔“ ان کی پیشانی پر کئی شکنیں تھیں۔
 ”جی۔“ وہاں واقعی کچھ نہ سمجھا تھا۔ وہ حیرت سے اس مغرور عورت کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
 ”بھئی سیدی طرح آئی کہو۔۔۔ مجھے نہیں پسند ماما جی چاچی کہلوانا۔“ گل فشاں نے ایک دم ہی نرم لہجے میں کہا۔ وہاں نے غاشیہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”بہتر آئی۔“ وہاں ہار گیا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خاموش ہو گیا تھا کہ رات ہی تو اسے اس کے ماموں نے کہا تھا۔ (جب انہیں پتا چلا کہ گل فشاں کے ساتھ وہ بھی جائے گا تو انہوں نے چند جملوں میں اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا)۔
 ”دیکھو بیٹی۔ گل فشاں شہر کی ماری عورت ہے۔ اس کی کسی بات کا برا نہ ماننا اگر برا لگے بھی تو مجھے سامنے رکھ لینا۔ وہ تمہاری ماں نانی سے بے حد مختلف عورت ہے۔ مبر وقامت رتی بھر بھی اس کے پاس نہیں ہے امارت کے سکنوں کی چکا چونڈ سے اس نے ذہن کو روٹن کیا ہوا ہے۔ جبکہ ذہانت کی معمولی سے رمق بھی نہیں ہے اس میں۔“

”مگر آپ یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟“ وہاں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”اس لیے کہ مجھ سے زیادہ تمہارا واسطہ اسی سے بڑے گا۔ اب کل سے تم اس کے ساتھ سماجی دوروں میں شریک رہو گے۔ اور وہ کئی باتیں ایسی کریں گی کہ تمہارا دل و ذہن کھول کر رہ جائے گا مگر تم میری خاطر درگزر کر دینا۔“ کتنی لاجب تھی۔ جمال الدین ملک کے لہجے اور جملوں میں اور۔ وہاں انہیں دیکھ کر رہ گیا تھا۔

پھر واقعی بہت جلد وہاں کو احساس ہو گیا تھا کہ اوپر سے اُجلی بیگم جمال الدین اندر سے بہت میلی ہیں۔ اپنی غرض کی میلی تھیں اس کے دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔
 شواہد کی ماری عورت تھیں وہ۔

کل آتے ہی انہوں نے اخبار کے رپورٹر کو بمعہ فوٹو گرافر انگیج کر لیا تھا۔ اور کہا تھا وہ صبح دس بجے پہنچ جائیں۔ گھر کا ایڈریس نوٹ کروا کر انہوں نے۔ فون کریدل پر رکھ کر فاتحانہ نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

”پلیز وجہی۔“

”یار یہی ایک موقع تو ہے جو تم میرے ساتھ باہر بھی جا رہی ہو۔ تم نہیں جاؤ گی تو اپن بھی بہانہ کر دیں گے۔ ٹاپتی رہ جائیں گی بیگم جلال الدین ملک۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولا۔

”مگر میرے جانے کا فائدہ ہے کوئی؟“ غاشیہ نے پوچھا۔

”مجھے تو فائدہ ہے۔“ وہاں کے لہجے میں جذبہ بولنے لگے۔

”کیا۔؟“ غاشیہ نے اسے دیکھا۔

”اطمینان قلب میسر ہوتا ہے۔ جب تم ساتھ ہوتی ہو۔“ وہاں نے مسکرا کر کہا۔ غاشیہ نے کچھ کہنا

چاہا لیکن وہ اسے بولنے کا کوئی موقع دے بغیر بولا۔ ”چلی چلو نا“۔ اس نے کچھ اس طرح کہا کہ غاشیہ کا چہرہ پھر سرخ ہو گیا اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔



اگر کوئی امیر شخص کسی غریب کی مدد کرتا ہے تو کسی مطلب کے بغیر نہیں کرتا۔

”کاش۔ کاش ہم ایسے ہوتے کہ بغیر مطلب کے ہی کسی کی مدد کرتے“ اجرو ثواب و جزا کا سارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتے مگر بندہ بہت بے صبر ہے۔ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو فوری اس کا انعام چاہتا ہے۔ اب تو لینے کا معاملہ خدا پر نہیں چھوڑا جاتا بلکہ بندوں سے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔

دوسرے روز۔۔۔۔۔ اخبارات میں شہر کی خبروں والے صفحے پر بیگم جمال الدین کی تصاویر نظر آ رہی تھیں اور ان کا یہ بیان بھی نمایاں سرخی سے شائع ہوا تھا۔

”وطن عزیز کے سارے شہر ہمارے اپنے ہیں۔ اور یہاں کے رہنے والے بھی تو اپنے ہی ہوئے۔ ہم سب ایک جسم کے مانند ہیں۔ سوئی جسم کے کسی حصے میں جیسے تکلیف پورنم کو ہوتی ہے۔ لاہور سے میرا ایک دلی اور ذہنی تعلق ہے۔ میں نے اپنی عمر کا ایک حصہ اس شہر میں گزارا۔ اور جب یہاں کے ارد گرد کے دیہاتوں میں سیلاب نے تباہ کاری کی۔ تو میرا اندر ہل کر رہ گیا۔ میں اپنوں میں آئے ان سے ملنے کے لیے بے قرار ہو گئی۔ مجھے شہر نہیں چاہیے میں تو صرف اور صرف اپنوں کے دکھ یاٹنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”نرا جھوٹ۔“ وہاں نے اخبار پر بے پھینک دیا۔ اور غاشیہ سے بولا۔

”یہ۔ یہ صحافی ہیں۔ غاشیہ۔ جنہیں پتا ہے کہ بیگم جمال الدین نے انہیں خود بلایا ہے۔ فون کر کے

اور پھر بھی وہی لکھا جو بیگم جمال الدین نے چاہا۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم کیوں دھکی ہوتے ہو۔“

”مگر میں تو ایسا نہیں کروں گا۔“ اس نے کاٹا سلاکس میں پھنسا دیا۔ جیسے وہ سلاکس نہ ہو بیگم جمال

الدین ملک کا دل ہو۔

”اچھا دیکھیں گے“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

”دیکھ لینا غاشیہ۔“ وہاں پتھر پلے لہجے میں بولا۔

”وہاں تمہیں مجبور کر دیا جائے گا کہ اپنے اخبار کی پالیسی کے مطابق لکھو۔“ غاشیہ کا لہجہ دھک سے

بھر پور تھا۔

”تو۔۔۔ تو مجھ میں اتنی جرأت ہے کہ اپنی انگلیاں کاٹ دوں گا۔ قلم توڑ دوں گا۔“ وہ جوش میں

بول رہا تھا۔

”سب ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ جب آئے وال کا بھاؤ۔ پتا چلتا ہے تو۔“ غاشیہ نے چھیڑا۔

”تم تو ساری عمر ساتھ رہو گئی دیکھ لینا۔“ وہاں نے مسکریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”دیکھوں گی۔“ غاشیہ نے سر جھٹکا۔ مگر اس کی بات پر غاشیہ کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔

”یہ وعدہ ہے میرا تم سے کہ سبھی قلم کو جھوٹ کے لیے استعمال نہیں کروں گا۔ اور ایسی برساتی مینڈکی

بیگمات کو تو بھی نہیں چھاپوں گا۔“ وہاں نے بیگم جمال الدین کی تصویر کی طرف اشارہ کیا تو غاشیہ کو ہنسی آ

گئی۔ اور وہ بولی۔

”چھوڑو تم کیوں دل مند کر رہے ہو۔ جلدی سے ناشتا کرو اور پھر روانہ ہو جاؤ اپنے مش پر۔“

”تم نہیں جاؤ گی؟“ وہاں نے پوچھا۔

”وجہی۔“ سچ ہے کہ آئی کے دو غلے پن پر کل مجھے بے حد شرم آئی تھی۔ میں روز روز شرمندگی کی

دلدل میں نہیں اتر سکتی۔“ غاشیہ نے نہایت سچائی سے کہا۔ اس لیے آج میں کوئی بہانہ کر دوں گی۔“

”تم نہیں جاؤ گی تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔“ وہاں نے فیصلہ سنا دیا۔

اترنے کو تیار ہوگی۔ پانی کی روانی اس کی راہ میں رکاوٹ نہ تھی۔
میرا۔ میرا سائل۔ میں آتی ہوں۔ اس کے لب کا پنے اور ایک معصوم سی بھوک اس کی آنکھوں
میں لپکتی لگی پانے کی بھوک رگ میں دوڑنے لگی۔
آؤ۔ آؤ۔

سرگوشیاں اس کے کانوں میں اتر رہی تھیں۔
میرا سائل۔ وہ بیقرار ہو گئی۔ اس کی حالت بے خودی کی سی تھی۔ اسے تو اپنے ارد گرد کا ہوش ہی نہ
تھا۔

ذہن منجمد سا ہو گیا تھا۔
دریا میں اترنے کے لیے اس نے پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ تاباں کی گھبراہٹی ہوئی آواز پاؤں سے زنجیر
بن کر لپٹ گئی۔
”لتاں۔ لتاں۔“

شرفاں نے ایک دم ہی پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ شگے پاؤں ہی بھاگتی ہوئی اس کی جانب آ رہی تھی۔
مگر وہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ”اپنوں“ کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ بچی مگر سارے چہرے غائب ہو
چکے تھے۔
وہ مسکراتے لب اور چمکتی آنکھیں پھیلے بازو پانی کی سطح پر نہیں تھے۔ وہ حشت زدہ سی نظروں سے
بہتے پانی کو دیکھ رہی تھی۔

تاباں اس کے پاس پہنچ کر اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر بولی۔
”اماں۔ تجھے کتنی مریخ متعج کیا ہے دریا پر نہ آیا کر۔ میرا تو دم ہی نکال دیا تو نے۔“ تاباں کا سانس
پھولا ہوا تھا۔

”تو کیوں آگئی یہاں؟ دیکھنا وہ چلا گیا۔“ شرفاں نے نہایت معصومیت سے کہا۔
”جب بھی دریا میں پانی پڑھتا ہے تیرا دماغ ہی غائب ہو جاتا ہے۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔“
”ہاں ہے آج وہ مجھے لینے آیا تھا۔“
”اماں۔ تو تو جھلی ہے تیرا وہم ہے کوئی نہیں آیا۔“
”میں نے خود دیکھا ہے۔“

”خیالوں میں بسنے والے کبھی کبھی سامنے آ جاتے ہیں اماں کہ تصور میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ
انسان جو دیکھنا چاہتا ہے اس وہی دکھاتا ہے۔ خدا کے واسطے اماں تو یہاں نہ آیا کر۔“ تاباں نے اسے
دونوں بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
”اگر اماں دریا میں اتر جاتی تو۔“ یہی خیال اس کے بدن میں سردی لہر دوڑا گیا۔
”میں کب تک انتظار کروں گی تاباں؟“ اس نے پوچھا تو تاباں صرف دیکھ کر رہ گئی۔ حالانکہ وہ کہنا
چاہتی تھی۔

”اماں، بعض لوگوں کے مقدر میں رب سائیں صرف انتظار ہی لکھ دیتا ہے۔“
”میں کتنی آوازیں دیتی ہوں تاباں! کوئی نہیں سنتا۔“ شرفاں کہہ رہی تھی۔
”لگتا ہے تیری پکار میں اثر ہی نہیں ہے اماں۔ ویسے اماں اگر کوئی تجھے لینے بھی آیا تو میں تجھے
نہیں جانے دوں گی۔“

دریا کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا انجانی منزل کی جانب تیزی سے رواں دواں تھا۔ بالکل شریچوں کی
طرح اچھلتا کودتا ہوا دریا کے کناروں کو چھوتا ہوا۔ یوں تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ جیسے اس کے پاس
وقت ہی نہ ہو جلد از جلد کسی سے ملنا چاہتا ہو۔ ہر کسی کے پاس وقت کا ہی تو فقدان ہے اس جہاں کا رزار
ہستی میں۔ تا حد نظر پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔

ابھی چند روز قبل کیسا خشک تھا یہ دریا۔ دور دور تک دریا کے اندر جنگلی پودے اور گھاس اُگی ہوئی تھی
اور دریا کے کنارے رہنے والوں کے مویشی یہاں آ کر چرتے تھے۔ مگر اب پانی نے اپنا علاقہ واپس لے
لیا تھا۔

ہر کوئی اپنی شے واپس لے لیتا ہے۔
اپنا حق نہیں چھوڑتا۔ چاہے برسوں بعد۔ جب بھی موقع ملے اپنا حق لے لیتا ہے۔
پھر۔ پھر وہ مجھے لینے کیوں نہ آیا؟ شرفاں نے انگلیاں جھٹلاتے ہوئے سوچا۔
آؤ نا مجھے لینے۔ تم۔ تم مجھے پکارو میں خود ہی آ جاؤں گی۔ میں برسوں سے تمہارا انتظار کر رہی
ہوں۔ آ جاؤ نا! اس کا اندر سکنے لگا۔ اور اس کی نظریں دریا کے غما لے پانی پر جمی ہوئی تھیں۔
پھر اس پانی کے بھنور۔۔ میں چہرے ابھرنے لگے۔ بے شمار ہاتھ اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔
کھلی بانیں اسے سمیٹنا چاہتی تھیں۔
شرفاں حیران حیران سی آنکھیں کھولے ان سب کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ انجانی سی خوشی اس کی
رگوں میں دوڑنے لگی تھی۔

سب ہی تو اس کے اپنے تھے۔ اسے بے حد پیارے تھے۔ مگر ان سب چہروں میں ایک چہرہ ”جان
سے پیارا“ بھی تو تھا۔ وہ خوبصورت متعجب چہرہ۔ جس کے خواب اسے سونے ہی نہ دیتے تھے۔ وہ خواب
چہرہ اس کے عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوا تھا۔ گھنی مونچھوں تلے خون چھلکاتے لب جن کی مسکان سے
دورا چہرہ مسکراتا تھا۔ چمکتی آنکھیں روشن پیشانی پر پڑے گھنگھرے بالوں کا گچھا جو ہوا کے زور سے
بلکورے لیتا۔ پیشانی پر نہایت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ان سب چہروں کی طرح مسکراتا ہوا اسے بلارہا تھا۔
اتنے چہروں میں وہ چہرہ ہمیشہ کی طرح اسے اپنا اور پیارا لگا۔ وہ اس تک پہنچنے کی خاطر دریا میں

”کیوں؟“

”میں تیرے بغیر کیسے رہوں گی بھلا؟“

”میں اسے کہوں گی وہ تجھے بھی ساتھ لے چلے۔ دیکھنا تابی انسان جہاں رہتا ہے وہاں سے کوئی نشانی تو لے کر جاتا ہے تا کہ بتا سکے کہ وہ کہاں گیا تھا۔“

”تو میں بھی نشانی ہوں؟“

”ہاں۔“ شرفاں سر ہلا کر بولی۔ ”میں اپنے سانول سے کہوں گی وہ تجھے بھی ساتھ لے کر جائے۔“

”اگر وہ نہ مانا تو۔“ تابی نے شرارت سے کہا۔

”کیسے نہیں مانے گا بھلا۔“ شرفاں نے جلدی سے کہا۔ ”وہ مانے گا اسے ماننا پڑے گا کہ تو میرے وجود ہی کا حصہ ہے تابی۔ اور میں اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہوں مگر بدن کا کوئی حصہ بھی الگ نہیں کر سکتی۔“ شرفاں نے اسے لپٹا لیا۔

”تو اپنے دادا کو نہ بتانا کہ میرا سانول آ گیا ہے مجھے لینے۔“

”بہ سائیں کے واسطے اماں تو گھر چلے۔“ تابی کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔

”شاید وہ پھر آ جائے۔“

”اماں۔۔۔ نہ کیا کر خیالوں کی باتیں انہونی باتیں۔ مت زبان پر لایا کر اپنے تصورات کو تبھی تو ا

تجھے۔“ تابی نے ایک دم ہی لب بھینچ لیے۔

”تیرا ابا تو بے ایمان ہے خیانت دار ہے۔ وہ اسے مار ڈالے گا تابی۔ دیکھنا کتنا جی دار ہے وہ۔“

”ہوگا یقیناً ہوگا۔“ تابی نے سر ہلا کر کہا۔ ”وہ ماں کی ذہنی کیفیت سمجھتی تھی۔ بہت بچپن ہی سے وہ

ماں کے تصورات اور خیالات کو جاننے اور سمجھنے لگی تھی۔ ان دنوں جب دریاؤں میں طغیانی آئی تھی تو شرفاں کا ذہن اپنے آپ میں نہ رہتا۔ وہ اپنے تصورات کو زبان دے دیتی۔ فضل دین تو اسے دھتک کر

رکھ دیتا تھا۔

”اسے آنا ہوتا تیرے محبوب نے تو آ گیا ہوتا۔ کرتی رہ تا گھ (انتظار)۔ مرے گی تو تب بھی مٹی

ڈالنے نہیں آئے گا۔“ وہ شرفاں کو مارتا تو حیات محمد ہی بہو کے چہرہ بنا اور بیٹے کو سمجھاتا۔

”نہ مارا کر اس بد بخت کو۔۔۔ نصیبوں والی ہوتی تو ادھر کیوں آ جاتی۔“

”کیوں لیتی ہے یہ وہ نام جو میں سننا نہیں چاہتا۔“

”زندہ رہنے کے لیے اسے کوئی سہارا چاہیے فضل۔۔۔ اور۔۔۔“

”سہارا۔ تو ہیں نہیں سہارے۔“

”اسے خوابوں کی دنیا میں رہنے دے فضل۔ جس روز اس کے خوابوں کے گھر وندے ٹوٹے تو یہ مر

جائے گی۔“

”اچھا ہے مر جائے۔“

”نہیں پتر نہیں۔ تجھے تو یوں مل جائے گی پرتابی کو ماں نہیں مل سکے گی۔“ حیات محمد تڑپ کر کہتا اور

تبھی سے تو تابی کو یہ ادراک ہوا تھا کہ شرفاں نہ رہی تو اسے پھر ماں نہیں مل سکتی۔ اسی لیے تو وہ شرفاں کو

نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔

”بچپن ہی سے وہ ماں کا سایا بنی رہی تھی۔

وہ دریا پر پانی بھرنے جاتی تو ساتھ ہی جاتی۔

بکریاں چرانے جاتی تو تب بھی وہ ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھی رہتی اور شرفاں اپنی سوچوں میں غرق رہتی۔

جوں جوں تابی بڑی ہوتی گئی۔ اسے اپنے آپ ہی بہ خبر ہو گئی کہ جیسے ہی دریا میں طغیانی آتی

ہے۔ بستی میں سیلاب کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو شرفاں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ بہت سارے خواب اس

کی آنکھوں میں کودنے لگتے ہیں اور وہ اپنے جن تصورات کی دنیا میں رہتی ہے اس کو لفظوں میں بیان

کرنے لگتی ہے۔ عجیب غائب دماغی کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ تب وہ شرفاں کا خیال زیادہ سے زیادہ

رکھنے لگی تھی اور جب وہ بڑی ہو گئی تھی گھر کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی بلوریں گلاس کی طرح

سنبھال کر رکھتی تھی۔

آج بھی اسے پتا نہ چلا تھا کہ شرفاں گھر سے نکل آئی تھی۔ تابی کو جب اس کی غیر موجودگی کا

احساس ہوا تو اسے جوں جوں پاؤں میں ڈالنے کا ہوش بھی نہ رہا۔ وہ دریا کی جانب دوڑی اور اگر اسے چند

منٹوں کی تاخیر ہو جاتی تو شرفاں طوفانی لہروں کی گود میں چکولے کھاتی نہ جانے کہاں چلی جاتی۔ تابی کے

رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ماں کو ساتھ چپکائے ہوئے گھر میں داخل ہوئی تو حیات محمد حقہ تازہ کرتے

ہوئے بولا۔

”کہاں تھی تیری ماں؟“

”کہیں نہیں بابا۔ وہ چا چا خیرو ہے نا اس کا گھر رات کی بارش میں گر گیا ہے نا تو وہی دیکھ رہی تھی۔

شکر ہے کہ وہ لوگ چلے گئے تھے رات کو چھت گری ہے۔ خیرو چا چا کے تو بچے بھی بہت سارے ہیں۔ ورنہ

آج تو بستی میں گہرام چا ہوتا ہے۔“ تابی نے ماں کو چار پانی پر بھاتے ہوئے کہا۔ اور شرفاں حیرت سے

بیٹی کو دیکھ رہی تھی جو نہایت اعتماد سے ایک جھوٹ کو بچ بنا کر پیش کر رہی تھی۔

پھر یہ سچ بھی تھا کہ خیرو کے مکان کی چھت اور دیواریں کر گئی تھیں۔ مگر شرفاں کو بھلا اس سے کیا

دبچسپی؟ مگر شاہد وہ ماں کو دادا کے سامنے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”اماں۔ رونے لے آؤں نا؟“ تابی نے محبت سے پوچھا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ اور تابی اس کے

لیے کھانا لینے چلی گئی۔

”تابی۔ تو ہی تو ہے جس کے بارے میں بھی ہیں سوچتی ہیں۔ میرے خوابوں اور خیالوں میں

”اُس“ کے ساتھ ساتھ تو بھی تو آئی ہے۔

مگر تو بڑی خراب ہے۔

مجھے سینوں سے جگا دیتی ہے۔

”مجھے حواسوں میں لے آئی ہے۔“

شرفاں کی آنکھوں کی سطح کیلی ہونے لگی۔ اس نے گہرا کر حیات محمد کی طرف دیکھا جو حقے کی چلم

پر دھکتے انگارے رکھ رہا تھا۔ ایسے ہی دھکتے انگارے ہر لمحہ میری دل کی چلم پر بھی تو پڑے رہتے ہیں جو مجھے

جلاتے ہیں۔

سلاگاتے ہیں۔

تڑماتے ہیں۔

مگر کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی۔

”اماں۔۔۔ لے پراٹھا اور مکھن۔“ تابی کی آواز اسے خیالوں کے گرداب سے کھینچ لائی۔ تابی

نے اس کے سامنے چنگیر رکھ دی۔ اور خود بھی وہیں چار پائی کی پٹی سے ٹنگ گئی۔

☆☆☆

جب ستونوں سے لپٹی بیلوں والے پورچ میں "بحیرہ" آ کرڑکی تو آواز سن کر گل فشاں ملک جلدی سے باہر آئیں۔ مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہاں جمال الدین ملک کو سہارا دے کر جیب سے اتار تھا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

جمال الدین ملک کا چہرہ زرد تھا اور وہ انتہائی مضطرب نظر آ رہے تھے انہوں نے ایک نظر گل فشاں کو دیکھا تو وہ ہر کرہ گئیں۔ لہو رنگ آنکھیں تھیں جن میں انگارے دبک رہے تھے اور وہ نظر نہ آنے والا آگ گل فشاں کے سیمیں بدن کے سلگانے لگی۔ انہوں نے شوہر سے نظریں چرا لیں۔ اور وہاں سے کھینچ لگیں۔

"کیا ہوا نہیں؟"

"مجھے پتا نہیں آئی۔" وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"تم تو ساتھ تھے۔"

"جی۔" وہاں نے اعتراف کیا۔ "مگر ہم ساری زندگی بھی ساتھ رہتے ہوئے کبھی کسی کی کیفیات نہیں جان سکتے۔" بہت چھٹا ہوا لہجہ تھا اس کا مگر انہوں نے محسوس نہ کیا کہ یہ جس ہی ان میں کبھی۔

"پتا نہیں کیا فلسفہ بول رہے ہو۔" گل فشاں نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ کر دوسری طرف سے جمال الدین ملک کو سہارا دیا۔ وہ دونوں انہیں کمرے میں لے آئے۔ انہیں بیڈ پر لٹاتے ہوئے گل فشاں بولیں۔

"سنو وہاں تو ڈاکٹر کو فون کر دو۔"

"میں نے ڈاکٹر کو دکھا دیا ہے۔" وہاں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جمال ملک بولے تو وہاں نے ان کی غلط بیانی پر نہایت حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"بس مجھے چند لمحوں کے لیے تنہا چھوڑ دو۔" انہوں نے نقاہت سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ گل فشاں تو بہت سیاری باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھیں۔ لیکن انہوں نے تو تنہائی اوڑھنے کی خواہش کی تھی اسی لیے وہ باہر چلی گئیں۔ وہاں بھی دروازے کی طرف بڑھا تو ان کی آواز نے قدم روک لیے۔

"یہاں آؤ وہاں۔" وہ پلٹا اور ان کے قریب پہنچ گیا۔

"کسی کو کچھ مت بتانا۔" انہوں نے گھائل نظروں سے وہاں کو دیکھا۔

"بہتر ماموں جان۔" وہاں سر جھٹکا کر بولا۔

"مجھے۔ مجھے خود پتا نہیں تھا وہاں کہ میں اس قدر کمزور ہوں۔ دیکھا تم نے۔ اگر تم سہارا نہ دیتے تو یقیناً میں نیوٹن شجر کی طرح گر جاتا۔" جمال الدین نے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔

"مگر مجھے اب تک پتا نہیں چلا کہ آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا پہلے بھی ایسا ہوا ہے؟"

"وہاں۔" بھی بھی پرانے زخم بھی تو میں دیتے ہیں نا۔ میں بھی ٹیسٹیں برداشت کرتا رہا ہوں۔ پورے تیس تیس سے ایسا کر رہا ہوں مگر جب زخم رسنے لگے تو پھر اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے جس قدر پہلی پہلی مرتبہ ہوتی ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔" ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن آنکھوں میں ایک سکتی

ہوئی کیفیت وہاں نے محسوس کی تھی۔

ان کے ڈھکے نے وہاں کا دل چیر دیا۔ مگر وہ بھی کیا کر سکتا تھا۔

"وہاں۔" جمال الدین ملک نے وہاں کا ہاتھ تھام لیا، کہتے ہیں وقت کا مراہم ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ مجھے بتاؤ وہاں میرے زخم کا وقت کے پاس کوئی مرہم نہیں جو اسے ٹھیک کر دیتا۔ اس عمر میں جبکہ زندگی بہت کم رہ گئی ہے زندگی کی شام ہونے والی ہے میرا زخم ویسے کا ویسا ہی ہے۔"

"ماموں جان۔" آپ نے شاید کبھی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ زخم مندمل ہو اور پھر میری سمجھ میں تو آتا ہی نہیں کہ وہ زخم کس طرح مندمل ہو سکتا ہے۔ بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہر سانس کے ساتھ ابھرتے ہیں اور موت ہی انہیں بھر سکتی ہے سوری ماموں جان میں سچائی سے اتنی سخت بات کہہ گیا۔

"سچ کہنے پر معذرت نہیں کرنی چاہیے وہاں۔" وہ ہنکرائے۔

"سچائی کڑی ضرور ہوتی ہے مگر امر ہوتی ہے یہی تو اس کی خوبی ہے تم مجھے بہت پیارے ہو وجہی۔" ان کے لہجے میں وہاں کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ وہاں نے ان کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

"ہما بھی مجھے بے حد پیاری تھی۔ وجہی شاید تمہیں پتا نہیں اور پتا بھی کیسے ہو سکتا ہے ہاں کی خواہش اور ضد پر ہی میں نے نورالرحمن کو اپنا ہاتھ کیا۔ بہت پیاری تھی اسے نور اور میں ہما کو چھیڑتا تھا کہ سرال جاتے ہی نندکو برداشت نہیں کر سکیں۔ جب میری شادی ہوئی تو ہما کی شادی ہوئے صرف پانچ ماہ ہوئے تھے۔ تم جان سکتے ہو کہ وہ کس قدر چڑتی ہوگی۔ میری چھیڑ چھاڑ پر وہ رو پانی ہو جاتی۔ ماں جی سے شکوہ کرتی تو ماں جی بھی مجھے ڈانٹتیں۔ کتنی خوشیاں تھیں۔ رو شنائیاں، قمقمے خوشبوئیں، بلوئی وجہی یہ سب کچھ نور کی وجہ سے تھا۔ بس اس کے جاتے ہی ساری خوشیاں نور کی خوشی کی طرح ریا بد ہو گئیں۔"

دلوں میں شگاف پڑ گئے۔

روح زخم زخم ہو گئی اور لفظ ان کے ہونٹوں پر ٹوٹ رہے تھے۔

"پلیز ماموں جان۔ زیادہ نہ بولیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور۔۔۔" وہاں نے کہا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ ہاں ماموں جان، مت بولیں زیادہ۔ آپ نے منع کر دیا ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلا لیتا تو۔"

"میرے روگ کا کسی کے پاس بھی علاج نہیں ہے وجہی۔ تم۔ تم ایسا کرو اپنی آنٹی سے کہو پیلنگ کر لیں۔ ہم آج ہی گاؤں جائیں گے۔"

"مگر۔۔۔" وہاں نے کہنا چاہا۔

"کچھ نہیں وجہی۔ کئی ماہ سے میں ماں جی سے نہیں ملا۔ میں ماں جی کی گود میں سر رکھ کر شکھ پانا چاہتا ہوں۔ میری ماں جس کی نرم چھاؤں میں میں زخم بھول جاتا ہوں۔ چند لمحوں کے لیے ہی سکون تو ملتا ہے۔ پلیز تم کہہ دو ہم آج ہی مظفر پور جائیں گے۔"

"بہتر۔" وہاں نے کہا تو انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ اور وہاں کمرے سے باہر نکل آیا۔

گیلری میں نیلی فون اسٹینڈ کے قریب بڑی راکنگ چیئر پر آگے پیچھے جھولتی گل فشاں جمال قہقہے لگاتی ہوئی فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہاں کو دیکھ کر انہوں نے ماؤ تھہکیں پر اپنی نرم قہقہے رکھ کر پوچھا۔

"جمال سو گئے؟"

"جی اور انہوں نے کہا ہے کہ آج شام وہ مظفر پور جاتا جاتے ہیں۔" وہاں نے اطلاع دی۔

”واٹ؟“ گل فشاں کی کمان بھنوں تن گئیں۔

”ہاں یہی کہا ہے آپ پیکنگ کر لیں۔“

نان سٹیس یہاں پر جوتا کا کام ہے۔

”بھئی گاؤں سے بھی تو انہوں نے الیکشن لڑنا ہے نا پھر حالات کا جائزہ تو لیتا ہی پڑے گا۔“

”اوہ۔ آئی سی۔ گل فشاں کے ہونٹ بھنور کی شکل میں ہو گئے۔

”یعنی آپ کا پرچہ جبر خالی ہی ہے گل فشاں بیگم۔ وہاں نے ہنس کر دل ہی دل میں سوچا اس نے

جاتے جاتے سنا۔ وہ فون پر کہہ رہی تھیں۔

”ہاں یار ثروت۔ وہ ملک اصل میں دوستوں پر انتخاب لڑنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں نا تو آج

شام کو گاؤں جانا ہے۔ تم جانو الیکشن کے ووٹ کی خاطر کیسے کیسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ویسے یہ غلط

طریقہ ہے۔ رائے شماری کے لیے تو اپر کلاس کو ہی حق دینا چاہیے۔ یہ غریب لوگ تو بس اپنے حال میں

مست رہتے ہیں۔ نہ ماضی کو یاد رکھتے ہیں اور نہ ہی مستقبل کی فکر کرتے ہیں۔ نہ انہیں شہرت کی ضرورت

ہے۔ مگر پتا نہیں انہیں کیوں اتنی اہمیت دی جاتی ہے جب کہ ان کی اوپر تک رسائی ہی نہیں۔“

وہاں نے پلٹ کر ایک نظر اس تکبر کی ماری عورت کو دیکھا جو کہہ رہی تھی۔

”ہاں ثروت۔۔۔ یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ دیکھو نا فیکٹری ملز وغیرہ ہم جیسا طبقہ لگاتا ہے۔ اور

رہے ہمارے مزدور تو جب جی چاہے نکال دو۔ کون پوچھتا ہے۔ بھی آخر یہ احتجاج کریں تو کس سے

کریں گے ستائی کون ہے ان کی جب عام زندگی میں ان کی کوئی اہمیت نہیں تو ان کی ووٹ کی پرچی کو پتا

نہیں کیوں اس لائق سمجھا جاتا ہے؟“

پتا نہیں گل فشاں جمال اپنی سبیل ثروت سے کیا کیا کہتی رہیں مگر وہاں کا تو بھیج ہی الٹ گیا تھا۔

گل فشاں کی باتیں اس کے دل کو لگی تھیں۔ جو پوائنٹ وہ بیان کر رہی تھیں سچ تو تھے مگر کڑوے

سچ۔

حقیقت تو تھی کہ جب غریبوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تو ان کے ووٹ کو کیوں اس قابل سمجھ لیا جاتا

ہے؟ ہر جگہ اہمیت تو انہی وڈیروں کی ہے جو در پردہ لیئرے ہیں۔ پتا بھی نہیں چلتا اور لوٹ لیتے ہیں۔

جو تک بن کر خون چوس لیتے ہیں اور خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہر کام نہایت خاموشی سے کرتے ہیں۔

شنوائی بھی انہی کی ہوتی ہے۔ ان کے سامنے حکام بالا پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ پھر۔ پھر۔ ووٹ

غریب دے اور سفارش کے لیے یہی طبقہ۔

کیا فائدہ؟ مگر پھر بھی یہ چھوٹا طبقہ ایک ذرا سی ووٹ کی پرچی سے بلند و بالا ہوتوں کو زمیں بوس

کر دیتے ہیں۔

وہاں اس طبقے سے ہونے کے باوجود غریبوں کے لیے جودل میں نرم گوشہ رکھتا تھا اس گوشے میں

درد لہریں لینے لگا۔

”کیا ہوا مار پڑی ہے؟“ غاشیہ اس کے سامنے کھڑی شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھ

رہی تھی۔ وہاں کے ستے ہوئے چہرے پر نرمی آگئی۔ آنکھوں میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔

”کسی مائی کے لال میں ہمت ہے اتنی۔۔۔؟“

”ہمت کی بات مت کرو۔ الٹا لٹکا دیں گے تمہیں بھی لوگ۔۔۔“

”کیوں۔۔۔“ وہاں کی بھنورا۔۔۔ سی آنکھیں پھیل گئیں۔

”بھئی اب تم چاچو اور آنٹی کے ساتھ رہ کر نظروں میں آ جاؤ گے۔ چاچو الیکشن جیت کر اسمبلی

میں چلے جائیں گے۔ اکثریتی جماعت سے مل ملا گئے تو وزارت بھی انہیں مل جائے گی اور تم نظروں میں آ

جاؤ گے۔“

”لو میں کیسے نظروں میں آ جاؤں گا؟“

”ایک تو تم سمجھتے نہیں ہو بھلا۔ منسٹر بن کر چاچو کب نظر آئیں گے؟ موٹر میں بھی کہیں آئیں

جائیں گے تو ایک دو پولیس کی گاڑیاں ہوں گی۔ مگر تمہارے لیے تو کوئی سیکورٹی نہیں ہوگی۔ لوگ تمہیں

پہچان کر تمہاری نیندیں حرام کریں گے کہ کام کرواؤ۔“

”یار غاشی میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں۔“ وہ گھبرانے کی ایکٹنگ کرتا ہوا بولا۔

”تو اب سوچ لو۔“

”ویسے آج آنٹی نے اپنی پرانی دوستوں سے رابطے قائم کیے ہیں الیکشن کے لیے درکار وغیرہ کے

بارے میں۔“ غاشیہ نے اطلاع دی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ ماموں جان الیکشن لڑیں۔“

”کیوں نہیں لگتا؟“

”پتا ہے غاشی آج ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔“

”کیسے؟“ غاشیہ نے نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

”تمہیں پتا ہے نا کہ ہم لوگ آج کرموں والی ہستی کے سیلاب زدگان کے آنسو پونچھنے گئے تھے۔“

”ہاں۔ ہاں۔۔۔“

”پتا ہے وہاں ایک خاتون نے روتے ہوئے چاچو کو بتایا کہ اس کے تین سالہ بیٹے کا کوئی پتا نہیں

وہ شاید بانی میں بہہ گیا ہے۔ اسی طرح کئی لوگوں نے اپنے مسائل بتائے تو چاچو کی حالت بگڑ گئی۔ میں

انہیں فوراً گھر لے آیا۔“

”اب کہاں ہیں؟“

”آرام کر رہے ہیں۔“

”ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟“

”انہوں نے منع کر دیا تھا۔ میں تو حیران ہوں کہ آنٹی کس قدر خوش خوش فون پر بگئیں مارنے میں

مصروف ہیں اور انہیں شوہر کی بیماری کا کوئی احساس ہی نہیں۔“

”احساس ذمہ دار ہی نہیں ہے۔“

”اگر تو نے بھی ایسا کیا تو میں تجھے شوٹ کر دوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ واقعی کچھ نہ سمجھتی تھی۔

”بھئی جب میں تمہارا خاوند بن جاؤں گا تو بیمار تو ہوؤں گا بس تو ہر وقت میرے پاس بیٹھی رہنا۔“

”پھر تو تم کبھی اچھے ہی نہیں ہو گے۔“ غاشیہ نے شرارت سے کہا۔

”عقل مند ہو گئی ہے۔ یار تیرے جیسی نک چڑھی ماموں زاد ہو تو پھر اچھا بھلا بندہ بھی بیمار ہونے کو

چاہے تا کہ یہ خوبصورت ہاتھ تیرا دراری کریں۔“ وہاں نے اس کا مومی انگلیوں والا ہاتھ تھام لیا۔ تو غاشیہ کو

لگا جیسے اس کا پورا وجود جھکوں کی زد میں آ گیا ہو۔ اس کی ٹانگیں کاپٹنے لگیں۔

دل کی دھڑکن وہ صاف سن رہی تھی۔

”جیہی۔ وہ۔۔ وہ۔۔“ غاشیہ بے تحاشا گھبرا رہی تھی اور وہ اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتا ہوا کہہ رہا تھا۔

”یار غاشی! میں تو تیرے شہر بڑھائی کی خاطر آیا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ یہاں ایک جادوگر نی رہتی ہے جو اپنی آنکھوں کے طلسم میں جکڑ لیتی ہے۔“

”پلیز وجہی میرا ہاتھ چھوڑو۔“ وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

”ہم ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑتے۔“ وہ لہک کر بولا۔

”میرا دل بند ہو جائے گا۔“ وہ سہمی ہوئی ہر نی لگ رہی تھی۔

”آ۔ چھا۔“ وہاں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے مسکرا کر نظریں نیچی کر لیں۔

”شرم نہیں آتی تمہیں۔“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

”لو شرم کی کیا بات ہے۔ آخر مجھے تم سے محبت ہوگی ہے۔“

”کوئی نی بات کرو۔ روز تم اپنے اس ”حادثے“ کے بارے میں کہتے ہو۔“ غاشیہ کی دھڑکنیں اعتدال پر آ رہی تھیں۔

”میں تمہیں یاد دلانا تارہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوئی ہے۔“

”ضروری ہے یاد دلانا۔“ غاشیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”بالکل۔۔“ وہ سیدہ بھلا کر بولا ”تا کہ مجھے احساس رہے کہ تو فقط میری ہے۔ اسی لیے اظہار کرنا میرا فرض ہے۔“

”احساس دلانے کے لیے ایک مرتبہ کہنا کافی نہیں۔“

”تو ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے نا۔ ذرا بدگمان جلدی ہو جاتی ہے۔“ وہاں نے جذبے لٹاتی نظروں سے اسے چھو دیکھا۔

”کب ہوئی ہوں بدگمان؟“

”بھول گئیں۔ تم نے تو فرحیت میز جیسے چھ فٹے لڑکے کو میری معشوقہ بنا دیا تھا۔“

”وہ تو نام سے غلط تھی ہوئی تھی۔“ غاشیہ جھینب کر بولی۔

”تھی تو غلط تھی ہی۔ میں نے کب کہا کہ تم سچ تھی ہو گرا ایک بات تو ظاہر ہوگئی۔“

”کیا۔؟“

”کہ تم وہاں احمد کو چاہتی ہو۔“

”بس پھر تم پڑی سے اتر گئے۔“ غاشیہ نے کہا اور جانے کو پلٹی۔ وہاں گنگنا تا ہوا اس کے پیچھے ہو

لیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے پیار ہو گیا

میں گم صم سوچتا ہی رہا

اور دل سینے سے فرار ہو گیا

”توبہ وجہی کبھی تو گائے بغیر بھی رہ لیا کرو۔“

”میں تو گائے اور جھینس کے بغیر رہ ہی رہا ہوں۔ اگر ایک کپ چائے پلوا دو تو مشکور ہوں گا۔“

”اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ غاشیہ نے اسے دھکیلا اور کچن کی جانب چلی آئی۔ مگر وہ کب رہتا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ کچن کے دروازے کے فریم میں تصویر بنا کھڑا کھڑا تھا۔

”جائے ذرا چاہ سے بنانا تا کہ نشہ دو آتشہ ہو جائے۔“ غاشیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی کیتلی چولے پر کھدی۔ مگر اس کی موجودگی سے اس کے ہاتھ ضرور کانپے تھے۔ وہ پوری کی پوری اس کی نظروں کی ریش میں تھی۔ اور اس کے ٹٹنے کا کوئی بھی چالس نہ تھا۔

☆☆☆

”اوسا میں موتیوں والو! ٹساں تے ایتھوں سارے ووٹ لے جاؤ گے۔“ یہ جمال الدین

ملک کی زمینوں کا مقرر ترین حراز اللہ وسایا تھا جو ان کے بابا جان کے زمانے سے زمینوں کا رکھتا تھا۔

جب اسے پتا چلا تھا کہ جمال الدین الیکشن لڑ رہے ہیں تو اس نے ڈھیروں دعا میں دینے کے بعد کہا تھا۔

”سرکار! میں تو خورے کب سے سوچ رہی تھی کہ ساڈے مالکانوں وی الیکشن لڑنا چاہیدا ائے۔“

”پھر تم نے کہا کیوں نہیں۔۔۔؟“ جمال الدین نے ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے نہایت دلچسپی سے اللہ وسایا کو دیکھا۔

”بس ملک جی تساں تو ایتھے آؤندے وی نہیں وڈے دوئے ملک شہر پور (لاہور) دے ہو کے رہ گئے۔“

میں بھلا کیوں کہندا۔“ اللہ وسایا نے اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اور ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا دی۔

”وسو بابا کوئی چالس ہے کہ میں جیت جاؤں۔“

”کی گل کر رہے ہو جی سرکار۔ تساں ہی ایتھوں کیا باب (کامیاب) ہووو گے۔ چوہدری ثار دی

تے ضمانت ای ضبط ہو جاوے گی۔ دیکھنا تساں۔ بہوت کری چوہدری ثار نے ممبری ہن ساڈا ملک

ہووے گا۔“ وسو نے نہایت جوش سے کہا تو جمال الدین ملک ہنس دے۔

”کتنے سادہ لوگ ہیں۔ ان میں اتنی جرأت ہی نہیں کہ میری کسی بات سے انحراف کریں۔ میری

خوشی میں خوش اور دکھ میں مجھ سے پہلے دکھی ہونے والے یہ میرے اپنے۔ اگر میں ان کے کام نہ بھی آؤں

تب بھی مجھے دعائیں دیں گے۔ گنتے بڑے دل ہیں ان لوگوں کے جن زمینوں کے کھلے سینے پر یہ بل

چلاتے ہیں ویسی ہی زمینوں جیسی وسعت ان کے دل میں بھی ہوتی ہے اور ذہنوں میں سمندر جیسا کھلا پن

ہوتا ہے۔ جو بھی رائے دیتے ہیں ہر بغض سے پاک ہو کر ہی دیتے ہیں۔“

”اللہ وسایا کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر تک جمال الدین ملک سوچوں کے انبار تلے دبے ہوئے

تھے۔ کہ گل فشاں آگئیں اور منقش کرسی پر تقریباً ڈھتے ہوئے بولیں۔

”جمال۔ مظفر پور بہت ہی خوبصورت گاؤں ہے۔“

”یہ احساس تمہیں آج ہوا۔؟“

”کہہ سکتے ہیں۔“ وہ ادا سے سر ہلا کر بولیں۔

”ہمیشہ کے لیے یہاں رہ سکتی ہو۔؟“

”نہیں بھی۔“ وہ نہایت خوبصورت انداز میں ہنسیں۔ ایسی جگہوں پر انجوائے کیا جا سکتا ہے۔

مستقل نہیں رہ سکتی میں اور یوں بھی گرمیوں میں تو آگ برسی ہے۔ پتا نہیں لوگ کیسے رہتے ہیں؟ میں تو سر

جاؤں۔“ وہ جھرجھری لے کر بولیں۔

”تو لوگوں تک اپنا پیغام پہنچا دیا ہے تم نے؟“

”ہاں۔“ گل فشاں نے چہرے پر آئے بالوں کو سر جھٹک کر پیچھے کیا اور بولیں۔ ”مجھے لگتا ہے جو ہم

چاہتے ہیں زلزلہ وہی ہوگا۔ مظفر پور میں گرلز اسکول ضرور ہونا چاہیے جمال۔ آپ اپنی تقریر میں یہ

پوائنٹ ضرور رکھیے گا اور ہاں دستکاری سکھانے کے لیے بھی ایک ادارہ قائم کرنا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں کی لڑکیاں سیکھنا چاہتی ہیں۔
”یہ کام تو تمہارا ہے۔ جب تم شہر میں فلاحی اداروں کے لیے کام کرتی ہو تو یہاں بھی ادارہ قائم کر لو۔“

”یہ تو بعد کی بات ہے جو مناسب ہوگا وہی کریں گے۔“

”پھر ایسے وعدے کرنے کا فائدہ؟“

”آپ ہمیشہ میری بات کی کاٹ کرتے ہیں۔ ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے ہیں۔“

”یہ بات نہیں گل مجھے بس پتا نہیں کیوں جھوٹ سے شدید نفرت ہے خواب صرف دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں اور اگر خوابوں کی دنیا میں جا کر رہا جائے تو بہت دکھ ملتا ہے۔ جب ہم کسی کو بغیر نہیں دے سکتے تو خواب دکھانے کا فائدہ؟“

”آپ کی تو منطق ہی زبانی ہے۔ پتا نہیں کیسے ٹھس اور ٹھنڈے انسان ہیں۔“ گل فضاں کو غصہ آ گیا اور وہ اٹھ کر چلی تو جمال بھی اٹھ کر باہر آ گئے۔ دالان ہی میں آسیہ بیگم تخت پر گراؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں اور نیچے خوبصورت خرگوش چھدکتے پھر رہے تھے۔ وہ بچوں کی مصروفیت سے خرگوشوں کو دیکھ رہی تھیں۔

ماں نے ان چیزوں سے خود کو بہلا رہا ہے۔

چار بچوں کی ماں اور اس عمر میں تنہائی کے اڑدھے کے منہ میں پڑی ہے۔ کسی سے کوئی فریاد نہیں۔ کوئی شکوہ اور شکایت نہیں کرتی۔

”ہم آجائیں تو خوشیاں اس کے چہرے کی جھریوں کو کم کر دیتی ہیں اور چلے جائیں تو جھریوں زدہ ہاتھ دعاؤں کے لیے اٹھے رہتے ہیں۔۔۔ ماں اتنی عظیم کیوں ہوتی ہے۔۔۔؟“

ماں میں رب سائیں کیوں دکھتا ہے؟

ماں تو خدا کا تحفہ ہے۔؟

”کیا بات ہے پتر جمال۔ کیا سوچ رہے ہو؟“ آسیہ بیگم نے سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔

”ماں جی۔ جمال الدین ملک ان کے فریب ہی بیٹھ گئے۔ اور ماں کے کندھے سے سر نکالتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنے لگے۔

”سوچ رہا تھا ماں اتنی پیاری کیوں ہوتی ہے آپ جیسی؟“

”پگلا! آسیہ بیگم ہنس دیں۔“ اولاد نیک ہو تو اسے ماں بھی اچھی لگتی ہے ورنہ بد اولاد کو ماں بری لگتی ہے۔

”ماں جی! وہ اولاد تو دوزخی ہے جو ماں کو برا کہے یا سمجھے۔ اتنی پیاری ماں تو رب سائیں کا انمول تحفہ ہے مجھ جیسے گناہگار بندوں کے لیے۔“ جمال الدین ملک نے آسیہ بیگم کی گود میں چہرہ چھپا لیا۔
ماں کی خوشبو نے ان کی ٹھکن کے کانٹے ہمیشہ کی طرح چن لیے۔ وہ اپنی عیسیٰ نفس انگلیاں بیٹے کے بالوں میں پھیر رہی تھیں۔ کتنے ہی بال اُر گئے تھے۔

”تجھے پتا ہے جمال تو سر میں کتنا تیل لگواتا تھا۔ اب تو دیکھ تیرے بال کیسے کر لے (کھر درے) ہو گئے ہیں۔“

”ہاں ماں۔۔۔ اب تو بال ہی نہیں رہے۔“

انہیں یاد تھا کہ وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتے تو روز شام کو ڈھیر سارے تیل کا سر میں مساج کرواتے تھے۔ یہ کام آسیہ بیگم ہی کرتی تھیں۔ ماں کی ہتھیلیوں سے محبت ان کے وجود میں اتر جاتی تھی۔
”تو نے اپنی حفاظت ہی نہیں کی تو!“

”ماں جی جب اندر کے بانگوں بانگیوں پر خزاں چھا جائے تو پھر کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔“

”یہ تجھے انکشن میں کھڑے ہونے کی کیا سوچھی؟“

”ماں جی آپ کی بہو کی خواہش ہے۔ وہ منسٹر کی بیگم کہلوانا چاہتی ہے اور اس کی خواہش پوری کرنا تو میرا فرض ہے نا۔“ آسیہ بیگم طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

”آپ نہیں چاہتے کہ۔۔۔۔۔ انہوں نے ماں کی گود میں سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”نہیں پتر۔ ضرور تم انکشن لڑو۔ آخر کچھ سوچ کے ہی تو میری نبھو (بہو) نے تمہیں کہا ہے۔ خدا

اس کی خواہش پوری کرے مگر تمہارے کاروبار کا کیا ہوا۔؟“

”وہ بھی ہے۔ ابھی تو میں اپنے منجھڑ وغیرہ کے حوالے کر کے آیا ہوں۔ بہت ایماندار لوگ ہیں۔

بہت ہی اچھے ہیں۔“

”اچھے لوگوں کو اچھے ہی لوگ ملتے ہیں۔“

”میں اچھا نہیں ہوں ماں جی۔“

”مجھ سے پوچھو تم کتنے اچھے اور پیارے ہو۔“ آسیہ بیگم کے لہجے میں محبتوں کی نرمی اور خلوص کی

خوشبو تھی۔ جمال الدین نے پھر ماں کی گود ہی میں پناہ لے لی۔

☆☆☆

کمال الدین ملک کا ”ملک ہاؤس“ تو آج کل رونقوں سے بھر پور تھا۔ جب سے جمال

الدین ملک نے انکشن میں کاغذات نامزدگی داخل کروائے تھے بھی سے ملک ہاؤس میں خاصی چہل پہل

تھی اب تو انہیں انتخابی نشان بھی الاٹ ہو چکا تھا۔ تھانوں کے تھان لٹھے کے آئے تھے۔ بینرز بنانے کے

لیے۔ گل افشاں جمال نے بینرز لکھنے والے ایک مشہور آرٹسٹ افضل خان کی مدد لی تھی۔ وہ سویرے سے آ

جاتا اور خوبصورت انداز میں بینرز لکھتا۔

دہاج کے دوست فرحت آصف اور ذہیب بھی انتخابی مہم میں ابتدا ہی سے شامل ہو گئے تھے اور

انہوں نے جمال الدین سے ابھی سے وعدہ لے لیا تھا۔ وہ انہیں روزگار دلوائیں گے۔ آصف نے تو کہا

تھا۔

”انکل اگر آپ ہمیں روزگار کی ضمانت دیں تو ہم کام کریں گے۔ اور آپ کو جوتانے میں جان کی

بازی لگا دیں گے۔“

”دیکھ بیٹا اگر میں کامیاب نہ بھی ہوا تب بھی تمہیں روزگار ملے گا۔“ جمال الدین بولے تھے۔

”بھئی میرا اتنا بڑا کاروبار ہے۔ تم تینوں کو کھپا دوں گا۔“

”نہ جی ہم اپنا حق بھی لیں گے جب آپ جیت جائیں اور انشاء اللہ آپ جیتیں گے۔“ آصف نے

کہا۔

روز ہی گھر میں ایک طوفان سا برپا ہوتا۔ یونیورسٹی سے وہ تینوں بھی دہاج کے ساتھ ہی آ جاتے

تھے۔ نئے نئے نعرے ”ایجاد“ کر کے افضل خان سے بینرز لکھواتے تھے۔

”سب کا ترجمان۔“

خادم پاکستان
فتح کا اعلان

جمہوریت کا نشان

ہمارا جمال الدین ملک

روزگار کی ضمانت۔۔۔ جمال الدین ملک۔

بیزر جب دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھے جاتے تو غاشیہ پڑھ پڑھ کر ہنسی رہتی۔

کتنّا جھوٹ ہوتا ہے یہ سب۔

بھلا چاچو نے کب ترجمانی کی ہے لوگوں کی۔؟

کب خدمت کی ہے وطن عزیز کی۔؟

کب جمہوریت کے فروغ کے لیے آواز بلند کی ہے۔؟

اسے تو یاد ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوا ہی نہ تھا۔

اس روز بھی وہ بیروز پڑھتے ہوئے ہنستے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ تبھی تین بایک آگے پیچھے گیٹ سے داخل ہوئے اور پورچ میں آ کر رک گئے۔ غاشیہ نے نہایت حیرت سے آنے والوں کو دیکھا۔ آصف، زویب اور فرحت منیر تو اس کے لیے نئے نہ تھے۔ باقاعدہ تعارف نہ تھا مگر وہ انہیں آتے جاتے ضرور دیکھا کرتی تھی۔ البتہ وہ شانوں پر پڑے لچھے والے بالوں والی لڑکی کی جس نے کھدر کا سوٹ پہنا ہوا تھا گلے میں سیاہ اسکارف نہایت بے نیازی سے بڑا تھا۔ کندھے پر بڑا سیاہ لٹک رہا تھا اور پیروں میں جو گرز تھے۔ اگر اس کے کندھے پر بیگ نہ ہوتا تو وہ اسے یقیناً لڑکا ہی سمجھتی۔ بلکہ تیسری ہی جنس سمجھتی۔ عجیب حلیے کی لڑکی تھی۔

دہان نے اسے دیکھ لیا تھا اس لیے اسی لڑکا نما لڑکی کے ساتھ اس کی طرف چلا آیا۔ جب کہ اس کے تینوں دوست اندر چلے گئے کہ اب یہ گھرانے کے لیے نیا تو نہ رہا تھا۔

”غاشیہ ان سے ملو۔ یہ ہیں عفیرہ امیر۔ میری کلاس فیلو اور ایک طلبہ تنظیم کی بڑی سرگرم رکن ہیں۔“

”الاہور کی کئی طالبات کی صدر بھی ہیں اور۔۔۔۔۔“

”گلیڈ ٹو می یوس غاشیہ۔“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی عفیرہ امیر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”Thanks for this Honour“ غاشیہ کا لہجہ خاصا تیکھا تھا۔ دہان نے نہایت

حیرت سے انہیں دیکھا اور جلدی سے بولا۔

”ارے ہمیں بھی انگریزی آتی ہے!“

”آپ کا کیا خیال ہے کہ صرف آپ کی عفیرہ امیر ہی بول سکتی ہیں۔“ غاشیہ نے اوپری ہونٹ کا گوشہ دبا کر کہا۔ اور دہان کی چھٹی جس تو الارم بجانے لگ گئی تھی۔

”تم نے غاشیہ کا تعارف تو نہیں کرایا دہان۔“ عفیرہ امیر نہایت لگاؤ آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں دہان احمد کی ماموں زاد ہوں۔“ غاشیہ نے خود ہی کہا۔

”بس۔۔۔؟“ عفیرہ نے نہایت بے باکی سے پوچھا۔

”نی الحال اتنا ہی تعارف کافی ہے تا دہان احمد۔“ غاشیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

۔۔۔۔۔ وہ چرب زبان سا دہان کچھ بول ہی نہ سکا۔

”ذرا کھانا تو لگو اور غاشیہ۔ ہم قلندروں کے لیے۔ یہ دہان انتہائی بے ایمان ہے۔ مجھے لایا ہی اس شرط پر تھا کہ جاتے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اور اب یہاں آ کر بدل گا ہے۔“ عفیرہ کہہ رہی تھی۔

”یہ ہیں ہی ایسے۔“ غاشیہ بولی۔

”اصل میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں غاشیہ کمال کہ جن کے پاس آ کر کچھلے وعدے یاد نہیں رہتے۔ کیوں دہان؟“ عفیرہ نے دہان کے کندھے پر ہاتھ مارا تو غاشیہ سلگ اٹھی۔ مگر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”آپ لوگ اندر چلیں۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔“

پھر وہ ان دونوں سے پہلے ہی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

وہ بھلا کب کی لڑکی کو دہان کے اس قدر قریب دیکھ سکتی تھی؟

ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہ سوا تھا۔

حالانکہ وہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔

لا محالہ اس کا واسطہ لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں کے ساتھ بھی رہتا تھا مگر غاشیہ کے ذہن میں یہ بات کبھی داخل ہوئی نہ تھی کہ وہ کسی لڑکی سے اس قدر بے تکلف بھی ہوگا کہ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے چھو لے۔ اس سوچ کو بھی وہ ذہن کے کسی روزن میں داخل نہ ہونے دے سکتی تھی۔

اور عفیرہ امیر کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف آتا ہوا دہان احمد سوچ رہا تھا۔

آخر محبت کے سفر میں بدگمانیوں کی پگھلنے والیاں کیوں ہوتی ہیں؟

ہم جنہیں چاہتے ہیں وہ ہم پر اعتبار کیوں نہیں کرتے۔

کیوں ذرا سی بات کدول پر لے لیتے ہیں؟

وضاحت کیوں نہیں چاہتے۔؟

خود ہی مفروضے کیوں قائم کر لیتے ہیں؟

اپنے سوالوں کے جوابات اپنی مرضی سے کیوں دیتے ہیں؟

بدگمانی کے داغ اسے کیوں نہیں دکھاتے جس سے بدگمان ہوتے ہیں؟

خود ہی اس آگ میں کیوں جلتے ہیں؟

اپنے آپ کیسے سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔

دیکھ غاشیہ تو مجھ سے خفا نہ ہوا کہ نہیں تو۔۔۔ نہایت کرب سے دہان نے سوچا تھا۔ اور سوچوں کی ڈور اس وقت ٹوٹ گئی تھی جب فرحت منیر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اور سن تو اپنے آصف کی بات دہان۔“

”کیا ہوا؟“ دہان نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”اسے محبت ہوئی ہے۔“ زویب بولا۔

”کب ہوا یہ حادثہ؟“ عفیرہ نے گولڈن سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”اے تم اسموکنگ کب سے کرنے لگیں؟“ آصف نے اس سے پوچھا۔

”یہ میرا فعل ہے۔ تم مت بولو۔ اپنی کہو۔“

”مگر تم نے آج سے پہلے تو کبھی سگریٹ نہیں پی۔“ آصف کہہ رہا تھا۔

”تم ہر وقت تو میرے ساتھ نہیں رہتے آصف کا نجو۔ جو تمہیں پتا رہے میں کیا کھاتی اور بیٹی ہوں۔“

”تمہیں پتا ہے اسموکنگ۔“

”مت دہلاؤ مجھے خطرناک بیماریوں کے ناموں سے۔“ عقیفہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”ہماری زندگی کے جو مسائل ہیں وہ ان بیماریوں سے بھی زیادہ مہلک ہیں۔“

”پھر بھی غفی! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ زویہ بیب نے آہستہ سے کہا۔ ان تینوں کو واقعی دکھ ہوا تھا کہ عقیفہ جیسی ٹیلینٹڈ لڑکی اسموکنگ جیسا ”جرم“ کرتی ہے۔ مگر انہیں کیا پتا تھا کہ اس ہر دم تھکے پھیرتی لڑکی کا اندر کس قدر زخمی تھا۔ دل کے اٹھنے والی درد کی لہروں کو وہ سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا دیتا جتنی بھی کچھ لوگوں کے لیے تو فکروں سے آزاد ہو جاتی تھی۔ اس کے سانس لڑکے (کہ لڑکیوں سے تو اس کی دوستی ہی نہ تھی) اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ سوائے اس کے کہ وہ باسل میں رہتی تھی۔ پنجاب کے دیہی علاقے سے اس کا تعلق تھا۔ اور شام کو وہ ایک مقامی ”ماہنائے“ کے لیے کام کرتی تھی۔ فخری لانسر تھی۔ ہر ماہ اس کے آرٹیکل چھپتے تھے اور پورے ڈیپارٹمنٹ میں وہ زبردست چیز مانی جاتی تھی۔ اس کے قلم میں خاصی کاشت تھی۔ جو دل کو چیر دیتی تھی۔ پتا نہیں اس کا اپنا دل کہاں کہاں سے چیرا ہوا تھا۔

”ہاں تم بتاؤ تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے آصف کا نجو۔؟“ عقیفہ نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے پوچھا۔

”ضروری ہے تمہیں بتانا۔“ وہ تڑخ کر بولا۔

”ارے کہیں تمہیں مجھ سے تو محبت نہیں ہو گئی۔؟“ عقیفہ نے نہایت شرارت سے کہا۔

”ابھی میں انتخاب لگ نہیں ہو گیا۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔

”ہونا بھی نہیں۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں مل گا۔“ عقیفہ ہلا پروائی سے بولی۔

”مگر کچھ پتا تو چلے کہ کس کا نصیب پھوٹا ہے۔“ وہاں نے شرارت سے پوچھا۔

”دیکھو وہاں تم دشمنوں کے ساتھ مت ملو۔“ آصف نے وارننگ دی۔

”بھئی پوچھنا جرم تو نہیں نا۔؟“

”میں چلا جاؤں گا ابھی۔“ آصف نے دھمکی دی۔ تو نہایت حیرت سے وہاں نے اسے دیکھا۔

اب آصف اسے کیا بتاتا کہ یہی بدترین لڑکی جو نہایت بے شکے پن سے فلور کشن پر لیٹی نہایت تیزی سے سگریٹ کے مرغولے چھوڑ رہی ہے عقیفہ امیر۔ اس کی دھڑکنوں میں بس گئی ہے۔

وہ جو لڑکیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتی تھی وہی آصف کا نجو کی آنکھوں کا خواب بن گئی تھی۔

آصف کو اپنی سانسوں سے اسی کی خوشبو آتی تھی اس کی ہنسی کا جلت رنگ سماعتوں میں نغمگی بکھیر دیتا تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچتا۔

اس کھر در سی لڑکی کی ہنسی میں اس قدر سوز کیوں ہے۔ جیسے کوئی پائل بج اٹھے۔

جیسے جھمنا پھوٹ پڑے۔! وہ کئی روز سے عقیفہ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر عقیفہ سے تو کچھ نہ کہہ

سکا البتہ فرحت اور زویہ بیب کو بتا بیٹھا تھا۔

شاہد اس طرح پیغام پہنچانا مقصد رہا ہو۔

مگر انہوں نے تو آگے کچھ بھی نہ سنا تھا نہ نام نہ پتا بس وہاں اور عقیفہ کے گوش گزار کر رہا تھا۔

”اے محبت ہو گئی ہے۔۔؟“ (مگر اس طرح بھی عزت رہ گئی تھی)

پھر وہ سب کتنا پوچھ رہے تھے مگر آصف کا نجو نے عقیفہ کی طرف اشارہ بھی نہ کیا تھا۔

پتا نہیں کیوں عقیفہ کا آج کاروپ دیکھ کر اسے دکھ ہوا تھا۔ اور وہ ایک بار پھر خود کو ٹوٹنا چاہتا تھا۔

پھر اپنا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔

”شاید میں غفلت پر ہوں۔ اور صبح فیصلہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو راہ بدلنے میں آسانی ہوگی اور اگر

میں عقیفہ کے بغیر نہیں رہ سکوں گا تو پھر اسے اس کی تمام تر خامیوں سمیت اپنالوں گا۔“ یہ سوچ کر وہ نہایت مطمئن ہو گیا تھا۔

”صاحب کھانا لگ گیا ہے۔“ کریم نے آکر اطلاع دی تو وہ چاروں تیزی سے اٹھ کھڑے

ہوئے۔ عقیفہ نے بھی سگریٹ ایش ٹرے میں میلا اور بولی۔

”آج وہاں بہت بھوک لگی ہے۔ میں تو تجھی تھی کہ تمہاری وہ خوبصورت ماموں زاد ڈاؤج دے گئی۔“

”وہ بھی ڈاؤج نہیں دے سکتی۔“ وہاں مٹھار لہجے میں بولا۔

”دھیان رکھنا لڑکیوں کی قوم کا کوئی بھروسہ نہیں۔“ عقیفہ نے ہنس کر کہا۔

بظاہر اس نے عام سے لہجے میں ایک عام سی بات کی تھی مگر وہاں اپنے دل کا کیا کرتا جہاں غاشیہ کی

ذرا سی بے رخی بھی گھاؤ ڈال دیتی تھی۔ میں ایسا تو نہ تھا۔ میں تو بڑی بڑی بات چیل جانے کا عادی ہوں۔

پھر غاشیہ کی بے رخی تو میری سائیس روکنے کا موجب بن جاتی ہے۔ یا خدا میں اس لڑکی کا اس قدر عادی

کیوں ہو گیا ہوں۔؟

وہ انہیں ڈائیننگ ہال میں چھوڑ کر غاشیہ کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ وہ اسے منائے بغیر ایک نوالہ

بھی حلق سے نہ اتار سکتا تھا۔ بغیر دستک دیے وہ غاشیہ کے کمرے میں گھس گیا۔ غاشیہ اپنی الماری میں کھسی

نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

”غاشی۔!“ وہاں کے لہجے میں نرمی اور محبت تھی۔ سننے کے باوجود غاشیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں نے تجھ سے لپٹی بار کہا ہے کہ مجھ سے ناراض مت ہوا کر۔“

”مجھے کیا حق ہے تم سے ناراض ہونے کا۔“ غاشیہ نے چیخ کر کہا۔

”سارے حقوق تو میں نے تجھی کو دیے ہیں۔ جس میں ناراض ہونے کا حق بھی شامل ہے۔“ وہ

مسکرایا۔

”پھر وہ کس حق سے تمہارے کندھے پر ہاتھ مار مار کر باتیں کر رہی تھی۔“ غاشیہ نے پلٹ کر

پوچھا۔

”وہ عقیفہ کی عادت ہے ایسی تو۔“

”ایسی عادت والی لڑکی تمہاری دوست ہے۔!“ غاشیہ نے اس کی بات کاٹی۔

”یہ بات نہیں۔ اب کلاس فیلو کی حیثیت سے دوستی ہے۔ تم الٹ مطلب مت لو۔“

”اسے لانے کا مقصد کیا ہے؟ کیوں آئی ہے یہاں۔؟“

”ذرا تیز لڑکی سے۔“ چاچو کے لیے کنوینینس کرے گی۔“ وہاں نے سچائی سے بتا دیا۔

”اس کام کے لیے ان کی بیگم بہت ہیں۔ تمہیں شہر کی فکر میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اچھا یا راتو مت بدگمان ہو مجھ سے غاشی قسم خدا کی میں کس روز خود کو سزا دے لوں گا۔“

”تو دے لو مجھے کیا“۔ حد درجہ اس کا انداز جارحانہ تھا۔

”مگر سزا کا حق بھی تیرے پاس ہے“۔ وہ مصومیت سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ عاشر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”قل کر ڈالو ہمیں یا جرم الفت بخش دو“

لو کھڑے ہیں ہاتھ باندھے تمہارے سامنے

وہاں نے سر جھکا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو اس وقت وہ عاشر کو اس قدر اچھا لگا کہ اس کے انہ پر اسے ہنسی آ گئی۔

”تیرا شکریہ خدا یا“۔ وہاں نے ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں کہا۔

”بہت بُرے ہو تم۔!“ عاشر نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

”اب تو ناراض نہیں نا۔؟“

”ناں۔“ عاشر نے سر ہلایا۔ ”جاؤ تمہارے دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔“ عاشر نے اے

باہر دھکیلا۔ تو وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

فضل دین نے سلور کا گلاس لبوں سے لگایا اور غنا غٹ لی اندر اتارنے کے بعد ایک لمبا ڈکار

اور مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے قریب ہی چار پائی کی ادوائن پر بیٹھی شرفاں سے بولا۔

”میں نے سنا ہے تو سیلاب کے خطرے کو محسوس کر کے بھی یہاں سے نہیں گئی۔“

”نئی بات تو نہیں۔“ شرفاں نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

”مگر ہمیشہ اتنا زبردست سیلاب نہیں آتا۔ تجھے پتا ہے کتنی تباہی پہنچی ہے۔ گاؤں کے گاؤں پانی کر لے گیا ہے۔“

”ایسا تو کتنی واری ہوا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔“ شرفاں کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”ہر بات تیرے لیے پرانی ہے۔“ فضل دین جھنجھلا کر بولا۔ ”اگر تم لوگ بہہ جاتے تو۔۔۔“

”تو کیا ہوتا۔ کچھ بھی نہ ہوتا۔ تابی کے ابا زندگی بڑی کمینی شے ہے۔ اپنی مرضی سے ختم ہوتی ہے۔

اسے ختم کرنا چاہو تو نہیں ہوتی۔۔۔“ شرفاں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو تو میرا چاہتی ہے؟“ سوال بڑا کڑا تھا۔ تیری طرح کھا تھا۔ شرفاں کے دل میں، مگر ہمیشہ کی

طرح وہ سہم گئی تھی۔

”اپنے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوتا تو وہی ہے جو اوپر والے کو منظور ہوتا ہے۔ فیصلہ کرنے والا تو

سمات آسمانوں سے بھی پرے بیٹھا ہے۔ مرضی اس بے نیازی کی۔“

”شرفاں۔۔۔ سبھی سبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے تو وہ نہیں جو نظر آتی ہے۔“ فضل دین کا لہجہ خلاف

معمول نرم تھا۔

”آ۔۔۔ چھا۔۔۔“ شرفاں ہنسی۔ اس کی بے تحاشا اداس آنکھوں میں نئی تیر نے لگی تھی۔

”کیا اچھا۔۔۔؟“

”سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی مجھے بھی لگتا ہے میں وہ نہیں جو نظر آتی ہوں۔ یقین کرو۔ مجھے۔ مجھے بتاؤ

فضل دین میں کون ہوں۔؟“ شرفاں نے فضل دین کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر نہایت بے چارگی سے

پوچھا۔

”مجھے بتاؤ میری پہچان کیا ہے۔ میں کون ہوں۔؟“ شرفاں کی آواز بھرا گئی اور زندگی میں پہلی

بار فضل دین کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔

ایسا بھلا کب ہوا تھا۔؟ کہ فضل دین جیسا پتھر بھی نرم ہو جائے۔ وہ بھی شرفاں جیسی عورت کے

لیے جسے وہ بالکل کہتا تھا۔ پھر وہ حرکتیں بھی تو ایسی کرتی تھی۔

مگر آج فضل دین کے دل کی زمین پر شرفاں کے آنسو گر کر اسے گیلیا کر کے نرم کر گئے تھے مگر وہ

یہ کیا کہہ رہی تھی۔

”تم کیا بتاؤ گے فضل دین۔ بھلا چور کب بتاتے ہیں کہ۔“ شرفاں نے کہنا چاہا تو اس سے پہلے کہ

اس کا جملہ پورا ہوتا فضل دین کا بھاری ہاتھ اٹھا اور شرفاں کے گال پر بڑا۔ پھر تو اس نے ہتھکڑوں کی بارش

کر دی۔ لمحہ بھر میں ہی نرم گوشہ ہتھکڑوں سے بھر گیا تھا۔ مجھے تو چور پتی ہے۔ ذلیل عورت۔ میں چور

ہوں۔ مارے غصے کے وہ کانپ رہا تھا اور وہ چار پائی پر بڑی سسک رہی تھی۔

فضل دین کے شور کی آواز سن کر تباہاں بھی کھڑکی کمرے میں آئی۔

”ایسا۔۔۔ ایسا۔۔۔“ تباہاں فضل دین کا بازو دھکیلتی رہی تھی۔ مگر وہ مرد تھا۔ اس کی مردانگی پر شرفاں نے

ضرب لگائی تھی۔ وہ بھلا کس طرح اسے معاف کر سکتا تھا؟“

”مجھے چور کہتی ہے۔“ فضل دین نے کہا۔

”ابا خدا کے واسطے۔ یہ تو جھلی ہے۔“ تباہاں لڑبڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں اس کا سارا جھلا پن آج نکال دوں گا۔“ فضل دین نے شرفاں کے بازو پر گھونسا مارا۔ وہ کسی

طرح بھی سببجھل نہ رہا تھا۔

”بابا۔۔۔ بابا۔۔۔“ تباہاں نے حیات محمد کو آوازیں دیں۔ مگر شاید وہ گھر میں نہ تھا۔ تب وہ ماں کو

پجانے کے لیے اس پر گر گئی۔ ماں کا سائبان بن گئی تھی۔

”میری ماں کو مت مارو ابا۔ مت مارو۔۔۔“ تباہاں کہہ رہی تھی۔ اس کی تو پہلے ہی بوٹی

بوٹی زخمی ہے پہلے ہی روح کھاکل ہے۔ مت لگاؤ اس کے بدن پر زخم۔۔۔ نہیں سہہ سکتی یہ سب کچھ۔۔۔“

فضل دین نے مٹھیاں بچھتے لیں۔ ”اے سمجھالے کسی روز میرے ہاتھوں ختم ہو جائے گی۔“ فضل

دین تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

تباہاں نے شرفاں کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر انگلیوں کے نیلے نیلے نشان تھے اور اوپر ہی

ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ جس سے خون رس رہا تھا۔ تباہاں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے خون صاف کیا اور

بولی۔

”اماں تو کوئی ایسی بات کیوں کرتی ہے کہ ابا آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔“

”تیرا باپ سچائی برداشت نہیں کر سکتا تابی۔ سچ سننے کے لیے بھی بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی

ہے۔ حرام کی طرح سچ بھی ہر کوئی ہضم نہیں کر سکتا۔“ شرفاں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے ہونٹ لرز

رہے تھے۔ اور چہرے پر کرب انگیز سوز کھڑا ہوا تھا۔

”اماں! تو میری خاطر سچ سے باز نہیں آ سکتی۔“

”تیری خاطر۔“ شرفاں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”ہاں اماں۔“ میری خاطر تو اس سچ کی شمع کو بجھا دے یہی سچ ہمیشہ تیرے بدن پر پھٹ ڈالتا ہے۔

میری خاطر تو اس مشعل کو بجھا دے۔“

علم تھا کہ غاشیہ ”کیوں“ وہاں سے ایک دم خفا ہو جاتی ہے۔ تبھی تو اس نے احتیاط کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ نہ ہی وہاں کے ساتھ بائیک پر بیٹھتی۔ اور نہ ہی زیادہ فریگ ہو کر گفتگو کرتی۔ خصوصاً ہاؤس“ میں جب آتی تو بہت احتیاط برتی۔

راتوں کا آرام اور دن کا چین داؤ پر لگا کر ان سب نے ہمال الدین ملک کے لیے کام کیا تھا۔ ان کا پیغام گھر گھر پہنچایا تھا اور بقول عفریہ امیر کے۔

”جس قدر جھوٹ بول سکتے تھے بولے تھے۔“

”جھوٹ کیا بولا ہے؟“ زوہیب نے تڑخ کر کہا۔

”یار! لوگوں کو خواب دکھنا کس قدر اچھا لگتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہاں اس کے معنی خیز انداز پر چونکا۔

”مطلب چند دنوں تک پیہ چل جائے گا جب ہم لوگوں سے منہ چھپائے پھریں گے۔“

”بکومت“ وہاں نے کہا۔

”مشکل اچھی نہ ہو تو بات بندے کو اچھی کرنی چاہیے۔“ آصف منہ بنا کر بولا۔

”مشکل تو میری بہت اچھی ہے اس کی تو تمہیں خبر ہی ہے ورنہ تم اس بوٹھی پر عاشق کیسے ہوتے؟“

عفریہ نے اپنی ٹھوڑی پکڑ کر آصف کی آنکھوں میں دیکھا۔

”خوش نہیں ہے تری۔“ آصف نے ہاتھ نیچا یا۔ مگر وہ حیران تھا کہ اس کا دل کاراز کیسے عیاں ہو گیا۔ وہ

تو ہونٹوں تک اس راز کو لایا نہ تھا۔ مگر اسے یہ علم نہ تھا کہ عورت مرد کی ہر اچھی بری نظر کو فوراً پہچان لیتی ہے۔

عفریہ تو کتنی ہی دیر تک خوبصورت انداز میں ہنس ہنس کر آصف کو جلاتی رہی تھی۔ آخر وہاں نے

”سیر فائر“ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”جہی کام کرو۔ یہ سب باتیں اور جھگڑے پھر بھی ہو سکتے ہیں۔ بیٹھ کر معاملے طے کیے جاسکتے

ہیں۔“

”مگر تم تو ہر معاملہ فوراً طے کر لیتے ہو۔“ عفریہ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”کیسا معاملہ۔“ وہاں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

”وہ تمہاری ماموں زاد اور اٹھا ہوا جاتی ہے تو جب تک تم اسے منانہیں لیتے تمہارے چہرے پر بارہ

بکے رہتے ہیں۔“

”تمہیں تو بکواس کرنے کی عادت ہے۔“ وہاں نے کشن اٹھا کر اس پر دے مارا تھا۔ تبھی بیگم گل

فشاں آگئیں اور وہ معرکہ درمیان ہی میں رہ گیا۔ اور انہیں باتوں میں مشغول دیکھ کر تیوریاں چڑھاتے

ہوئے بولیں۔

”جہی تم لوگوں نے ابھی تک کارڈ نہیں بنائے۔ وقت بہت کم ہے۔ آخر تقسیم بھی کرنے ہیں۔

کیسے ہوگا۔۔۔؟“ قالین پڑھیر سارے کارڈ بکھرے تھے جو وہ لکھ رہے تھے۔ دو ٹنگ لٹ میں سے

دیکھ دیکھ کر۔

”آئی آپ فکر نہ کریں۔“ فرحت نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

”کیسے نہ کروں۔“ وہ سخت ہجوان میں مبتلا تھیں۔ ”تم لوگ ذرا کبھی سیریس نہیں ہو۔ احساس ذمہ

داری ہونا چاہیے تم لوگوں میں۔“

عفریہ مزے سے چیونگم چباتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”اگر یہ مشعل بجھ گئی تو۔“ تو کچھ بھی نہیں رہے گا تابی۔ یہی مشعل تو مجھے راہ دکھاتی ہے۔ وہ نشان جو ریتلے پلوں پر سے مٹ گئے ہیں میں اسی مشعل کے ذریعے انہیں تلاش چاہتی ہوں۔ چاہے فصل دین مجھے مار ڈالے۔“

”اماں تو نہ رہی تو یقین کو تیری تابی بھی مر جائے گی۔“ تاباں کی آنکھوں کے کنورے پھلکے پڑے۔

شرقاں نے نہایت حیرت سے اپنی خوبصورت بلی کو دیکھا۔

”ہاں اماں! تو کہتی ہے تاکہ میں تجھے بہت عزیز ہوں تو عزیز لوگوں کی بات مانی جاتی ہے تاکہ تو بے

شک سچ کی مشعل نہ بجھا مگر اماں کے سامنے اس مشعل کو نہ رکھا کروہ برداشت نہیں کر سکتا۔“ تاباں نے اُس

کے چہرے پر آئے بالوں کو ہنساتے ہوئے پیار سے کہا۔

”کم ظرف جو ہوا۔“ شرفاں نے کہا۔ اُس کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔ اور یہی زہر تو اس کی رگ

رگ میں اترا ہوا تھا۔ تاباں ماں کو دیکھ کر رہ گئی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ماں کو کس طرح سمجھائے کہ وہ ایسی کوئی بات نہ کیا کرے کہ فضل دین

اُسے مارنے سے باز رہے۔ یہ آج ہی کی بات تو نہ تھی تاباں تو بچپن سے یہ تماشہ دیکھتی آ رہی تھی اور بچپن

ہی سے وہ ماں کی ڈھال بنتی تھی۔ حیات محمد بہو کے لیے چھپر بننا تھا۔ بیٹے کو ڈانٹنا تھا۔ بہو کو سمجھانا تھا۔ کم

نہ ہی شرفاں سچ کہنے سے باز آتی تھی اور نہ ہی فضل دین سچ برداشت کرنے کا حوصلہ خود میں پیدا کر سکا

تھا۔

☆☆☆

بیگم گل فشاں جمال سمندر کی بیکراں موجوں کی طرح سرخ روش پر ٹہل رہی تھیں۔

اصل میں جب انسان کوئی امتحان دیتا ہے اور اسے رزلٹ کے دن کی خبر ہوتی ہے تو اور دن گزر

جاتے ہیں۔ مگر وہ مخصوص دن پہاڑ سا ہو جاتا ہے۔ لمحہ لمحہ صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے ساعتیں گھنٹوں میں

بدل جاتی ہیں۔

جمال الدین ملک تو نہایت آرام سے کمرے میں لیٹے میگزین پڑھ رہے تھے۔

انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ اس امتحان کے رزلٹ کی جس پر لا کھوں روپیہ خرچ کیا تھا۔

نیشنل اسمبلی کی دو نشستوں کے الیکشن پر پانی کی طرح بیگم گل فشاں نے روپیہ بہایا تھا۔ وہ چاہو

تھیں کہ ہر صورت جمال الدین جیت جائیں۔ کتنے ہی خواب انہوں نے اس صورت حال سے دیکھا

ڈالے تھے کہ وہ منسٹر کی بیوی ہیں۔

کتنی انہوں نے چاہا تھا کہ جمال الدین کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو جائیں اور ان کے ٹکٹ

لڑیں۔

مگر یہاں جمال الدین نے ان کی ایک نہ سنی تھی پھر وہاں اور اس کے دوستوں کا بھی خیال تھا کہ

آزاد امیدواروں کا بہتر ہے۔ ہار جاؤ تو شرمندگی تو نہیں ہوتی۔ پھر سیاسی پارٹی کے ٹکٹ سے ہار جاؤ تو ہمیشہ

کے لیے شکست کا شیعہ لگ جاتا ہے۔ کوئی بھی اعتبار نہ کرتا۔ آئندہ ٹکٹ ہی نہیں دیتا۔

وہاں اور اُس کے دوستوں نے بہت محنت کی تھی۔ رات دن ایک کر دیا تھا اور عفریہ امیر نے

ان سب کا ساتھ دیا تھا۔ بس عفریہ کی بے اٹکلی سے غاشیہ خفا ہو جاتی تھی۔ جسے وہاں منٹوں میں منالیتا

اور عفریہ سوچتی۔

غاشیہ کتنی خوش نصیب ہے کہ وہاں جیسا اکھڑا اس کی خفگی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ عفریہ کو

یہ بیگمات ٹاپ کی عورتوں کو رعب جھاڑنے کا کس قدر شوق ہوتا ہے۔ کچھ نہ کر سکوں رعب ہی تو وہ گل فشاں کے جانے کے بعد کہہ رہی تھی۔
 ”وہاں یہ تمہاری آنٹی جو ہیں نا ذرا بھی تمہارے ماموں کے ساتھ سوٹ نہیں کرتیں کہاں گریں گل فشاں سا بندہ اور کہاں یہ سٹی سی عورت۔ مجھے ایسی عورتیں نہ ہر گز ہیں جو۔“
 ”زبان کو لگام دیا کرو۔ وہاں نے عفریہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”اے اتنے کلوز نہ ہوا کرو تمہاری ماموں زاد نے دیکھ لیا تو۔“ عفریہ نے اس کا ہاتھ جھٹکے سے پرے کیا اور وہاں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

یونہی لڑتے جھگڑتے ایکشن کا دن بھی آ پہنچا تھا۔ مظفر پور کا تو سارا انتظام جمال الدین کے کٹڑ وغیرہ کے ساتھ ساتھ رابع ملک اور خنداں نے سنبھالا تھا۔ جبکہ شہر کی نشست کے لیے ساری باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جیسے جمال الدین ”شیطان پارٹی“ کہتے تھے۔ اور بے تحاشہ انہیں چاہتے تھے۔ گل فشاں سے چوری وہ صبح وہاں کو نوٹوں کی گڈی دیتے تھے۔ ان پانچوں کے ذاتی اخراجات کے لیے۔ اور وہ بھی تو در در بقول عفریہ ”کتوں کی طرح پھرتے تھے“ رات کا پہلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ کچل بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مگر گل فشاں کی بے قراری میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ابھی وہ گاؤں کی ڈوریاں کسے ہوئے باہر آئے اور بولے۔

”گل! تم تو آرام سے بیٹھو۔ جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ تم اپنے نازک پاؤں کیوں تھکا رہی ہو ابھی بہت چلنا ہے۔“

”جمال! آخر وہاں کو کچھ تو بتانا تھا کاؤ تنگ میں اتنی دیر تو نہیں ہوتی۔“
 ”بھئی تم ہی وی برنٹا ج سنے بیٹھ جاؤ ابھی تک کوئی بھی رزلٹ اناؤٹس نہیں ہوا۔“
 ”اچھا۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ یہ سہولت بھی ہے۔“ گل فشاں شوہر کر دالان ہی میں چھوڑ کر اندر دوڑیں۔ اور جمال الدین مسکرا کر رہ گئے اور بس اسی لمحے وہاں کی بائیک گیٹ سے اندر داخل ہوئے غاشیہ اچک کر اتری اور وہاں نے بائیک موڑی جس کا مطلب تھا کہ وہ غاشیہ کو چھوڑنے آیا تھا۔
 ”سنو وہاں۔“ انہوں نے پکارا۔

”ماموں جان آپ فکر نہ کریں۔ کئی ہزار روٹوں سے آپ جیت رہے ہیں۔ میں تو غاشیہ کو چھوڑا آیا تھا۔“ جلدی جلدی کہہ کر وہ ہوا ہویا۔
 ”ہاں چاچو! آپ فکر نہ کریں۔“ غاشیہ نے جمال الدین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 ”یہ بات تم اپنی آنٹی سے کہو۔ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔“ وہ مسکرا کر بولے اور غاشیہ بھی مسکراتی ہوئی زہرہ جبین کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

صبح چار بجے کا مکمل تھا جب یکے بعد دیگرے بائیک ”ملک ہاؤس“ میں داخل ہوئی تھیں۔ اتنا شور مچا۔ وی برنٹا ج سنسٹیں اٹھیں گل فشاں جمال باہر کو لپکیں۔
 ”کانگریجویشن سبز جمال۔ آپ کے شوہر بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے ہیں۔“ عفریہ۔ آگے بڑھ کر کہا۔

”بھینکس گاڈ۔“ گل فشاں نے یوں طویل سانس لیا جیسے عفریہ نے ان کی سزائے موت ختم ہونے کا حکم سنایا ہو۔



کہتے ہیں خوشی نظر نہیں آتی۔ یہ تو ہوا کی مانند ہوتی ہے خوشبو جیسی ہوتی ہے جو چہار سو پھیل جاتی ہے۔ اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ہوا اور خوشبو کو محسوس کیا جاتا ہے۔ مگر چھوہیں سکتے تھے میں بند ہیں کیا جاسکتا۔ کہ ہوا اور خوشبو کو کس نے روکا ہے۔

یہی حال خوشی کا بھی ہوتا ہے۔ جو نظر نہیں آتی۔ مگر جب آگن دل میں چپکے سے اترتی ہے تو اسے بڑے کی طمانیت سے صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آنکھوں کی چمک اس خوشی کو بیان کر دیتی ہے جو آگن ل میں شہک کا نور کی مانند پھیل ہوئی ہوتی ہے۔
 خوشی تو نور ہے۔ جو آنکھوں میں چمک بن کر دکھتی ہے۔
 خوشی روشنی ہے۔ جو چہرے پر منعکس ہوتے رنگوں سے صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔
 خوشی تو خوشبو ہے جو لبوں پر مسکان کی صورت پھیل پھیل جاتی ہے۔

پھر خوشیاں تو آسمان سے برستا ہیں۔ جیسی اور کسی کی کورب سائیں یہ اس قدر بہتات سے عطا رہتے ہیں کہ شکر ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔ اور یہ خوشیوں کے جگنو جب دل کی ٹٹھی میں بند رہتے ہیں تو چہرے پر ایسی طمانیت ہوتی ہے کہ نظریں نہیں ٹھہرتیں۔ آنکھوں کی چمک مقابل کی نظروں کو راہ کرنے سے بھی نہیں چوکتی۔ لگتا ہے جگنو آنکھوں میں بھی بھر گئے ہوں۔ اور آج ایسے ہی جگنو تھے جو گل مال جمال کی آنکھوں میں بھی رہ رہے تھے۔

لجھے میں خوشیاں چمک رہی تھیں جیسے بے شمار چوڑیاں بج رہی ہوں۔
 یوں بھی ان کی آنکھیں بے تحاشہ چمکتی تھیں۔ لہجہ کھنک دار تھا جو مخاطب کو گویائی سے محروم کر دیتا۔
 بے کھی وہ اپنے سامنے کسی کو کب بولنے دیتی تھیں۔ جمال الدین ملک نے ہمیشہ ان کے سامنے ہر بات رجھکا یا تھا البتہ جس بات میں وہ اپنی بہت زیادہ توہین محسوس کرتے وہ ڈنکے کی چوٹ پر اس سے انکار دیتے اور گل فشاں مل لکھا کر رہ جاتیں۔

کل ہی تو جمال الدین ملک اپنے بچوں اور گل فشاں کے ساتھ کراچی آئے تھے۔ قومی اسمبلی کے ریکی حیثیت سے انہوں نے حلف اٹھایا تھا اور حلف کی تقریب میں گل فشاں جمال بہ نفس نفیس شریک تھیں۔ خوش تو وہ بے حد تھیں مگر کہیں سے ایک کانٹا ان کے سینے میں ضرور گڑا ہوا تھا۔ اور جب بھی

اسے کانٹے کی چیچن محسوس ہوتی تو بچانے کیوں وہ پھین ساری خوشی پر حاوی ہو جاتی تھی۔

لگتا ساری خوشیاں ہی مرگئی ہوں۔

اور اسی رات مالوں میں برش کرتے ہوئے گل فشاں بولی تھیں۔

”کہا بھی تھا کہ کسی جماعت میں شامل ہو جائیں مگر۔“

”لیکن جماعت میں شامل ہونے سے کیا ہوتا؟“ جمال الدین ملک نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”کوئی وزارت تو مل جاتی۔“

”فرض کرو میں حزب اقتدار والی پارٹی کی بجائے حزب اختلاف میں شامل ہو جاتا تو؟“

انداز خاصا چھتا ہوا تھا

”انسان کو اتنی خبر ہونی چاہیے کہ کس جماعت کا زور ہے۔ اسی پارٹی میں شامل ہو جائے۔“

فساں بے نیازی سے بولیں۔

”میرے پاس الدین کے چراغ کا جن نہیں تھا جو مجھے بتاتا نہ ہی میں علم نجوم پر دسترس رکھتا

کہ مجھے خبر ہوئی کون سی پارٹی برسر اقتدار آئے گی۔“ جمال الدین ملک کا اندر گلنے لگا تھا۔ ایسا ہی ہوا

جب گل فشاں کی کوئی بات ان کے دل کو نہ لگی تو وہ ایک نجانی سی آگ میں جلنے لگتے تھے۔ لگتا دل

رکھا ہو۔

”میں سیاسی بندہ نہیں ہوں گل فشاں بیگم۔ کہ ہواؤں کا رخ دیکھوں اور یہ عزت کیا کم ہے کہ

کی مقدس پارلیمنٹ کا ممبر ہوں۔ اس جگہ جا کر بیٹھا ہوں جہاں میرے آباؤ اجداد میں بھی کبھی کوئی

گیا۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ رب کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اتنی عزت دی۔ ورنہ میز

قابل تھا؟ ہمارے بزرگ تو۔“ جمال ملک کی آواز میں گزرے دنوں کی تشنگی تھی۔

”ہر بات میں بزرگوں کو فالومت کیا کریں۔“ گل فشاں ناک چڑھا کر بولیں۔ ”بزرگوں

کرنے والے پیچھے رہ جاتے ہیں ان کے زمانے کے جو تقاضے تھے انہوں نے وہ نبھائے اور جو آج

زمانے کی ڈیمانڈ ہے آپ وہ پوری کریں ہمیشہ لکیر نہیں پیٹتے رہنا چاہیے۔“ گل فشاں کے لہجے میں نا

تھی۔

”خیر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“ وہ صلح جوئی سے بولے۔

”اب کہنے کا کیا فائدہ؟“ گل فشاں کا لہجہ تھکا ہوا تھا۔

”دیکھو گل! تمہارے کہنے سے میں نے۔“ لیکن لڑا ہے۔ ورنہ بچ پوچھو تو قطعاً خواہش نہ تھی

اگر تمہیں مجھ سے پھر بھی کوئی شکوہ ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پتا نہیں تمہاری کیا ڈیمانڈ ہے اتنا عرصہ

میں تو وہ بھی نہیں جان سکا۔“ جمال ملک کے لہجے میں دکھ گھلا ہوا تھا۔ انہوں نے قبل سینے تک مھینچ

بولے۔ ”لائٹ آف کر دو۔“ مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“

گل فشاں نے ان کے لہجے کی بیزاری صاف محسوس کی تھی مگر کچھ نہ بولیں کہ فائدہ کوئی نہ تھا

بھی تھا کہ اگر جمال ملک کا موڈ خراب ہوتا تو گل خاموشی ہی میں عافیت سمجھتی تھیں۔

بس کبھی انہوں نے یہ محسوس کرنے کی تکلیف نہ کی تھی کہ آخر جمال ملک کا موڈ کیوں آف

ہے۔ یا وہ بیزاری کیوں ہو جاتے ہیں؟

اگر یہ بات ان کی سمجھ میں آ جاتی تو کبھی بھی ٹھہریلی سی باتیں نہ کرتیں۔ مگر انہوں نے تو

سوچنے کی تکلیف ہی گوارہ نہ کی تھی۔ اور نہ ہی ضرورت سمجھی تھی کہ شوہر کن باتوں پر خفا ہوتا ہے۔ جس

کو یہ پتا نہیں ہوتا وہ بہت ہی سچی عورت ہوتی ہیں اور کبھی بھی شوہر کے دل کی عمیق گہرائیوں میں نہیں اتر

سکتی۔ مگر پھر بھی مرد کے ساتھ رہتی ہے۔ کہ سمجھو تو میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

محبت اور سمجھوتے میں یہی فرق ہوتا ہے۔

دل کے تقاضے اور جذبول کی شوریدہ سری محبت کو ختم دیتی ہے۔ گزرتے دن اور راتیں محبت کی

تجدید پر ہمہرثبت کرتے ہیں۔ جبکہ سمجھوتا تو مجبوری کے تحت کیا جاتا ہے اور مجبور یوں کی زنجیریں اپنی مرضی

سے پہن لی جا میں تو پھر اتاری نہیں جاتیں۔ اور یہی حال جمال الدین ملک کا بھی تو تھا۔

گل فشاں بھی ان کی مجبوری تھیں۔ پھر بچوں کی وجہ سے وہ اس مجبوری کا ہر کہا حکم سمجھ کر مانتے تھے

انہیں پتا تھا کہ اولاد کے بغیر ایک ماں کیسی بچی ہو جاتی ہے بالکل خزاں رسیدہ درخت کی مانند اور وہ گل

فساں جیسی عورت پر خزاں نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ اسے تو خود پر اپنے حسن پر ناز تھا پروہ سچی ذہنیت کی

عورت یہ جانتی تھی کہ اس کا سارا حسن جمال ملک کی وجہ سے ہے اور تمام تر سکھ بچوں کی وجہ سے میسر ہے۔

مگر یہ اس کا بھی قصور نہ تھا اصل میں وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں تو صرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں

ماں نے ورثے میں دکھ درد دیا ہی نہ تھا جو وہ کبھی محسوس کرتی۔ اس لیے جمال الدین ملک اسے نا سمجھ سمجھ

کر چھوڑ دیتے تھے معاف کر دیتے تھے۔

معاف کر دینے کا حوصلہ بھی کب ہر مرد میں ہوتا ہے۔

مگر جن کا ظرف سمندر جیسا اور حوصلہ پہاڑوں۔۔۔ کی طرح بلند اور مضبوط ہوتا ہے وہی لوگ

معاف کر دینے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ ”معافی“ یہ پانچ حرفی لفظ بہت معمولی سا لفظ ہے مگر اپنے اندر

سمندر جیسی گہرائی رکھتا ہے اور بہت سی ٹھوکروں کے بعد ظرف کا سمندر بھی جمال الدین ملک کے اندر

ٹھا نہیں مارنے لگا تھا۔ اور گل فشاں جمال کی تمام تر زیادتیاں وہ اس سمندر کی لہروں کے حوالے کر کے پر

سکون ہو جاتے تھے کہ اس کے سوا کیا چارہ تھا۔ بھلا۔؟

اسلام آباد سے واپسی پر وہ ایک روز مظفر پور ٹھہرے تھے کہ رافع ملک اور خندان ملک وہیں تھے اور

انہیں ساتھ لے کر کراچی لوٹ آئے تھے۔

گل فشاں نے تو آتے ہی اپنی بیگمات ٹائپ دوستوں کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور شام

کو انہیں یہ خبر دی تھی۔

”حل شام میں نے کچھ دوستوں کو انوائٹ کیا ہے۔“

”اتنی جلدی کیا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بھئی ہر کسی کی خواہش ہے کہ۔“

”جیسی مرضی۔“ جمال ملک ہار سے گئے تھے ہمیشہ کی طرح۔

اور آج کی ذوقی شام میں ان کے دیسی بدیسی پھولوں سے مہکتے لان میں دن کا سا سماں تھا۔ سرج

لائٹوں سے درخت تک جگہ گارے تھے۔ لگتا تھا روشنی کی نہریں نکل رہی ہیں۔ کپڑوں اور زیورات کی چمک

دک سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ فضا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی مگر احساس ہی نہیں تھا۔ کہ خوشی تو گل

فساں کے خوبصورت چہرے پر چھلی ہوئی تھی۔ وہ جھلمل کرتی سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھیں اور جمال الدین

ملک کے ساتھ گیٹ پر مہمانوں کو ریسیو کرتے ہوئے شوہر کی دونشتوں پر شاندار کامیابی حاصل کرنے

پر مبارکباد وصول کر رہی تھیں ان کا چہرہ ہنستا ہوا تھا۔ اور آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

آنے والے مہمان تو گل فشاں ہی کو مبارکباد دے رہے تھے۔ جیسے کہ سب کو پتا ہو پیشل اسمبلی تک

”پہنچانے“ میں کس کا ہاتھ ہے۔

اور جب سیٹھ ابراہیم موتی والا نے جمال الدین سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔
”سیٹھ اپن کوکھوسی (خوشی) ہے نی جوتم جیسا سرپ (شریف) آدی بھی استہلی میں چلا گیا۔ بہت مبارک ہو“

”ارے سیٹھ موتی والا۔ مبارکباد کی اصل مستحق تو میری گل ہے آپ گل کو مبارکباد دیں۔“

”ماں بھئی ہر مردکی کامیابی کے باجوس میں کس عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے زیادہ اہم کام تو لیدی جمال ا ہے نی۔ کانگر کولیشن لیدی جمال۔“

”دھینکس سیٹھ موتی والا“۔ گل فشاں نے اپنے مہندی لگے سرخ بالوں کے گچھے کو جو پیشانی پر آ ہوا تھا۔ جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے کہا تو سیٹھ ابراہیم موتی والا کا دل پسلیوں کے درمیان پھدکنے لگا تھا۔ اس نے فوراً ہی دل پر ہاتھ رکھ لیا کہیں باہر ہی نہ نکل آئے اور گل فشاں کے قدموں میں لوٹنے لگے کہ بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی جمال الدین ملک کی بیوی کے ٹھہرے ہوئے حسن کا عاشق تھا وہ سامنے ہوتی تو نظریں اس کا طواف کرتیں۔ اور دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگتیں۔

خنداں اور رافع سیٹھ موتی والا کو مہمانوں میں لے گئے اور اس کی نشست تک اس کی راہنمائی کی۔ سفید براق ایسی وردیوں میں ہیرے مشروبات کی ٹرے لیے لہراتے پھر رہے تھے اور جو بھی مہمان آتا اسے مشروب پیش کرتے۔ پولیس کے آدی ٹریفک کنٹرول کرنے میں مصروف تھے۔ کاریں بھڑک ہوتی آ رہی تھیں اور خالی ہو کر پارک ہو رہی تھیں۔ خنداں اور رافع، سیٹھ موتی والا کو شامیانے میں بٹھانے کے بعد پھر گیٹ پر آ گئے تھے بھئی مسز بلال آئیں۔ مسز بلال خاصی فریبہ تھیں جبکہ بلال بخاری بڑے مخمخ سے تھے۔ اور بیگم بلال اندر ہی اندر گل فشاں سے بے حد جلتی تھیں مگر منہ پر اتنے بیٹھے انداز سے ملتیں جیسے ان جیسا ملنا تو دنیا میں بھی کوئی نہ ہو۔

”ہائے گل فشاں تم بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔“ مسز بلال نے چٹ سے گل فشاں کا گال چوم لیا۔

”ارے یہ خندی ہے۔ بھئی بالکل بری لگ رہی ہے اس لباس میں تو۔“ بیگم بلال نے محبت باثر نظروں سے خنداں کو دیکھا جو واقعی پلوٹو شکل کے دہرے گھیر کے گھاگھرے اور ڈھکی ڈھالی چولی میں نہایت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے چھہ دار بال پیٹھ کو ڈھکے ہوئے تھے۔ بغیر میک اپ کے چہرہ دمک رہا تھا۔ گل فشاں خود تو ڈھیروں میک اپ کرتی تھیں بدیس کی کریمیں یوز کرتیں مگر خنداں کو سوائے باڈی لوشن کے کچھ اور استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔

”چھوٹی عمر میں میک اپ کے استعمال سے جلد خراب ہو جاتی ہے۔“ وہ کہتیں اس عمر میں تو جوانی کی ایک الگ آگ ہوتی ہے۔ اپنی ملائمت ہوتی ہے اسکن میں پھر فائدہ اسکن کو خراب کرنے کا۔۔۔؟ گلیسرین اور عراق گلاب کا لوشن خنداں کے لیے وہ تیار کر کے بھیجا کرتی تھیں۔ اسے نصیحت تھی کہ صبح نہاد منہ ایک لیو پانی میں نیچوڑ کر ضرور پیار کرے اور خنداں ماں سے دور رہتے ہوئے بھی اس کی نصیحت پر عمل کرتی تھی۔ جیسے اگر ماں کا کہنا نہ مانتا تو اسے پتا چل جائے گا۔ ویسے بھی اسے خود بخود دیاوارک ہو گیا تھا کہ ماں اس پر وہی تجربے آزار ہی ہے جنہوں نے اسے اس عمر تک بھی ریتوا زہ رکھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی ماں کی طرح زیادہ عمر کی ہو جانے کے باوجود ”جوان“ نظر آنے کی خواہش مند تھی اور یہ خواہش تو ہر عورت ہی میں ہوتی ہے اور خنداں تو ابھی صرف اٹھارہ برس ہی کی تو تھی۔ اور سینئر کیمرج کر رہی تھی۔

سب مہمانوں کے آنے کے بعد گل فشاں اور جمال الدین ملک بھی مہمانوں کے بیچ آ گئے۔ خواتین اس جوڑے کو رشک سے دیکھنے لگی تھیں۔ گل فشاں کی گردن نخر سے تنی ہوئی تھی اور جمال الدین ملک انکساری کا مجسمہ بنے ہوئے تھے۔

”سردی تو آ ہی نہیں چلتی“۔ بیگم آفاق نے شال تہ کر کے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے بیزار ی سے کہا۔
”واقعی کراچی کے لوگ تو بہت بد قسمت ہیں کہ ٹھنڈ کو ترستے ہیں۔ بیچ اسلام آباد کا موسم ایک دم آفت ہے پتہ چلتا ہے کہ موسم ہے۔“

”تم تو اب وہیں رہو گی؟“ ایک اور مہمان خاتون نے رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”جمال سے کہا تو ہے میں نے کہ وہاں کو بھی لے لیں۔ اب آنا جانا تو لگا رہے گا۔ یہ تو ہاسٹل میں رہیں گے میں کہاں ہوسٹل میں رہتی پھروں گی۔“

”آپ کا جانا بھی ضروری ہے۔“ تابندہ نے پوچھا۔

”ظاہر ہے جمال اکیلے پریشان ہوں گے۔ گل فشاں خوبصورت تہہ لگا کر بولیں۔“

”ارے بات ہو رہی تھی ٹھنڈ کی اور موضوع کدھر چلا گیا۔“ مسز معین نے ایک دم بات پلٹی۔
”اب یہی دیکھو میں کرکٹ میچ دیکھنے شارچہ لگی تو گرم پکڑوں کی خوب شاہجک کی بے سود۔ اتنے شوق سے لیے ہیں اور الماری میں پڑے ہیں دیکھ کر صرف آہ بھرتے رہ جاؤ۔“

”میں بھی لندن اور سوئیٹزر لینڈ سے گرم شالز اور سویٹرز لاتی ہوں مگر ہمیشہ خندی کو بھیج دیتی تھی۔“
”خندی کو آ جاتے تھے۔“

”بھئی کتنا فرق ہے؟ اور بیچ پوچھو تو خندی اور گل فشاں کہیں لگتی ہیں۔“ سلی نے نہایت ستائشی انداز میں کہا۔

”اب اب اتنا بھی نہ بناؤ۔ خندی واقعی میری بیٹی ہے۔“ گل فشاں خوش ہوتے ہوئے مصنوعی خنکی سے بولیں۔

”گل میری گل کہاں ہو۔“ جمال الدین ملک انہیں آوازیں دیتے ہوئے آ گئے۔

”جی۔“

”جانم کھانا لگواؤ۔“

”انھی لگوانی ہوں“ گل فشاں ایک دم ہی ”معذرت کرتے ہوئے اٹھ گئیں۔“

”توبہ ہے کس قدر زن مرید بندہ ہے۔“ بیگم بلال نے آہستگی سے اپنے قریب بیٹھی بیگم حمیدی سے کہا۔

”بس جی قسمت کی بات ہے۔“ بیگم حمیدی آہ بھر کر بولیں۔ گل فشاں کا نصیب ہی اتنا روشن ہے۔“

پھر کھانا لگنے پر سب لوگ اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل پر چلے گئے۔ جہاں ہیرے کھانا لگانے کے بعد مستعد کھڑے تھے۔ بیگم جمال ملک مہمانوں سے کھانے کے دوران باتیں بھی کر رہے تھے۔

خاصے دلچسپ ماحول میں کھانا ختم ہوا تھا تو سبز تہوے کا دور چلا جو خاصی دیر تک جاری رہا۔ رات نوٹے لگی تھی۔ تارے بکھر رہے تھے اور خنکی ڈھکتی رات کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ مہمانوں نے رخصت چاہی اور مسکراتے ہوئے انہوں نے مہمانوں کو رخصت کیا تھا۔ گل فشاں بے حد خوش تھیں کہ آج وہ اپنی حلقہ کی تمام خواتین میں خود کو بہت بڑا اور معتبر سمجھ رہی تھیں۔ اور ان سے یہ خوشی سنبھالے نہ سنبھال رہی

تھی۔ ”سے کوئی مجھ جیسا؟“ ان کا جی چاہتا تھا بھری محفل میں بار بار اعلان کریں مگر ضبط کی لگا میں انہوں نے تھام لی تھیں۔ اور جب تھک کر وہ دونوں خواگاہ میں آئے تو گل فشاں تو میک اپ اتارنے میں لگ گئیں جبکہ جمال ملک بستر پر ڈھے گئے کہ وہ بہت تھک گئے تھے۔

☆☆☆

میں ڈھونڈتا ہوں جن کو راتوں کو خیالوں میں وہ مل سکے نہ مجھ کو دن کے حسیں اجالوں میں آصف کا نجو گنگنا تا ہوا پارکنگ کی طرف جا رہا تھا کہ سڑک پار کرتے ہوئے ایک آواز پردہ ٹھٹھک گیا۔

”آصف کا نجو۔ کو ذرا“۔

اس آواز پر اس کا دل لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ اس نے گردن ترچھی کر کے دیکھا۔ عفیہ امیر تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی۔ کاش عفیہ امیر میں تم جیسی سچی اور کھری لڑکی سے وہ تین حرفی جملہ کہہ سکتا۔ جس پر زندگی کا اساس ہے۔

جو زیست گزارنے کا حوالہ ہے۔

مگر وہ ایک جملہ کہہ کر میں اپنے لیے وہ آسان راستہ نہیں پاسکتا۔

پتا نہیں کیسے ہوتے ہیں وہ حوصلہ مند لوگ جو بے دھڑک دل کے جذبے اپنے محبت پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ میں نے تو ایسا جب بھی سوچا راہ میں سوطر کی دیواریں کھڑی نظر آتی ہیں۔

کاش میں اپنے جذبوں کے بیچ بھی دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا۔ یا پھر مجھ میں اتنا حوصلہ ہوتا سب کچھ کہہ دینے کا۔

”اے کیا سوچ رہے ہو؟“ عفیہ کی آواز نے اس کے خیالوں کی ڈور توڑ ڈالی تھی۔

”کہاں سے آرہی ہو؟“ آصف نے پوچھا۔

”ذرا چوک باز اربک لگی تھی“ عفیہ نے جواب دیا۔

”آج تم نے کوئی کلاس بھی نہیں لی“ آصف نے کہا۔

”مجھے پتا ہے مہم یاد دلاؤ“ وہ ہونٹ کھلتے ہوئے بولی۔

”مجھے کیوں روکا ہے؟“ وہ سلگ کر بولا۔ (مجال ہے یہ لڑکی کبھی تو ڈھنگ سے بات کرے ہمیشہ

بارود کی پوری بنی رہتی ہے)

”دہان کہاں ہے؟“

”وہ لاہور میں بیٹھا ہے“۔

”اور تم کہاں جا رہے ہو؟“ عفیہ نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

”ضروری ہے نہیں بتانا“۔ وہ بھی منہ بنا کر بولا۔

”نہ بتاؤ؟“ عفیہ نے کندھے اچکائے۔

”میں کسی کے ساتھ ڈیٹ مارنے جا رہا ہوں پھر“ آصف کو غصہ آ گیا۔

”تم اور ڈیٹ“۔ وہ زور سے ہنسی۔ ”کیوں مذاق کرتے ہو یا را؟“

”دیکھو عفیہ امیر میرا تم سے مذاق کا کوئی رشتہ نہیں“ آصف نے اسے وارنگ دی۔

”ہاں یہ بھی درست ہے“۔ وہ سر ہلا کر بولی۔

”آئندہ احتیاط رکھنا“ آصف نے بتایا۔

”تو تم جاؤ ڈیٹ مارنے“ وہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں کون ہے وہ بد نصیب۔ جو تم پر مارنے لگی ہے“۔ وہ جاتے جاتے پھر رک گئی تھی۔

”ہاں جا رہا ہوں تم کیوں جلتی ہو؟“ آصف پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔

”ویسے آصف کا نجو لڑکیوں کے بارے میں تو سنا تھا ایک طرف محبت کا کھیل کھیلتی ہیں۔ خود ہی ظالم ہوتی ہیں اور خود ہی مظلوم۔ اپنی ہی آگ میں سلگتی ہیں جلتی ہیں لڑھکتی رہتی ہیں“۔

”یہ سب مجھے بتانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟“ آصف نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

”بہی کہ تم بھی تو یکطرفہ آگ میں چپکے چپکے سلگ رہے ہو؟“

”مگر یہ پیش تم تک کیسے پہنچی؟“ آصف نے پوچھا۔

”بھئی تم میرے دوست ہو اور دوستوں کی وارداتوں کی خبر مجھے نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ دعویٰ دوستی پر لعنت ہے“۔

”تم پر بھی“۔ ایک دم ہی آصف نے ہونٹ بھیج لیے۔

”اے زبان سنہال کے میں پسند نہیں کرتی کسی کا فری ہونا“ عفیہ نے ہونٹ کا اوپر کی گوشہ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔ اور اس سے وہ آصف کا نجو کے دل کے سارے فیس پردے ہٹا کر پھر دل کے مکان میں گھسنے لگی تھی۔ اور وہ اس اچانک حملے سے بچنے کے لیے بولا۔

”مجھے کیوں روکا تھا؟“

”دہان کا پوچھنا تھا“۔

”وہ میں بتا چکا تھا“۔

”تو جاؤ“۔ وہ بولی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

”ذرا کمزور چھو کر نہیں گزری اسے“ آصف تلملا کر رہ گیا۔ کبھی جو اس لڑکی نے نرم لہجے میں بات کی ہو جب دیکھو لٹھ مارنے کے انداز میں بات کرتی ہے۔ ہے جو پینڈو۔ ایل میٹرڈ۔

آصف کو جب غصہ آتا تھا تو اس کا جی چاہتا تھا عفیہ امیر کی گردن مروڑ دے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔ جیسے اس کی محبت نے اسے توڑا تھا۔ وہ اپنے آپ کو جوڑنے کی سعی کرتا مگر دل ناداں کی ادا میں۔

دل عفیہ سے دستبردار ہونے کو تیار ہی نہ تھا۔ جس روز اس نے عفیہ کو سگریٹ پیتے دیکھا تھا ذہن نے اُسے اور غلاما شروع کر دیا تھا۔

سگریٹ۔ ایک ایسا جرم جو عورت پہ تو نظروں سے گر جاتی ہے جبکہ یہی سگریٹ مرد پہ تو کہا جاتا ہے کیا اسلکش طریقے سے پیتا ہے۔

سگریٹ جو مرد کے لیے جائز ہے اور عورت کے لیے ناجائز۔

عورت کی مخرمٹ انگلیوں میں سلگنا سگریٹ ہو تو وہ مجرم گردانی جاتی ہے۔ جبکہ مرد پر ایسی کوئی دفعہ نہیں لگتی۔

ویسے عفیہ ہر لحاظ سے آصف کا نجو کو پسند تھی بس اس کا دل ڈانوا ڈول صرف اسی لیے رہتا تھا۔ گہ اسے یقین تھا اس جھکی منہ پھٹ لڑکی اس کے گھر والوں کے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں کر سکتی۔ پہلے تو اس کا ارادہ تھا اسے سمجھا بھالے کا بھی تو وہ فرحت اور ذہیب کو اپنے راز میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ عفیہ کے دل میں جذبوں کی کھیتی اگانے کو خواہش مند تھا مگر ایک دم ہی اسے ”سگریٹ“ پینے جیسا ”جرم“ کرتے دیکھ کر

اس کے جذبات بھی دھواں ہو گئے تھے۔ مگر وہ صرف لمحوں کی بات تھی۔ اس نے عفیرہ کے بارے میں بہت سوچا تھا اور ہر سوچ کے کنارے پر اس کا دل عفیرہ سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ عفیرہ جب برلا آصف کے دل کی وارداتوں کا اظہار کرتی تو اس سے آصف کو غصہ آتا تھا۔ اور سوچتا۔

آخر اسے کیوں اور کیسے خبر ہو جاتی ہے۔ کیا سب کچھ میری آنکھوں اور چہرے پر رقم ہوتا ہے۔ چہرے اتنے بچے ہوتے ہیں۔ کیا آنکھیں حقیقت اگتی ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر محبت کو دیکھ کر کیوں پر فطرت کیوں لگ جاتے ہیں؟ لفظوں کے پرندے دل کی چوٹیوں سے اڑتے ہیں تو لیوں تک آتے آتے ان کے پر کیوں ٹوڑ جاتے ہیں۔

اپنی کیفیت پر کبھی اسے غصہ آتا اور کبھی خود پر ترس آ جاتا۔ وہ جو شہر جانا چاہ رہا تھا جانے۔ بجائے لاہور ہی چلا آیا کہ یہ حرکت اس سے بے اختیار ہی ہوئی تھی۔

یہ تو اسے بعد میں پتا چلا تھا کہ دل نے اسے دھکیلا تھا۔ وہ ریڈنگ روم میں آیا تو کوئی کی مخصوص میز پر عفیرہ تنہا بیٹھی چوکم چباتے ہوئے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سیاہ چمکدار آنکھیں جو وہ پور آنکھیں کھول کر بات کرتی تو ایسا لگتا کہ مخاطب ان آنکھوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو۔ وہ چمکتی آنکھیں جو آصف کا نجو کے اندر تک گڑ چکی تھیں۔

کتنی چمک تھی عفیرہ امیر کی آنکھوں میں جیسے چہار سوا جیہارہ ہو جائے۔ عجیب مدہوش کر دینے والی آنکھیں تھیں۔

ان آنکھوں کی طرف دیکھ کر لگتا جیسے ہوش و حواس انہوں نے سب کچھ چھین لیا ہو۔ اس کی سار شخصیت اس کی آنکھوں اور اس کے لہجے کی صاف گوئی میں چھپی ہوئی تھی۔

بلارا وہ آگے بڑھا چلا گیا۔ اسے قریب دیکھتے ہی عفیرہ اپنے لمبے ناخنوں سے میز بجاتے ہو۔ گنگنا لگی۔

ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ دیرانے گئے۔

”وہاں کہاں ہے؟“ آصف اس کی لن ترانی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”کاؤنٹر پر دیکھو وہ اور فرحت کتاب ایٹو کروا تے نظر آ جائیں گے۔“

”تم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات نہیں کر سکتیں۔“ آصف تڑخ کر بولا۔

”کیا کروں میری عادت ہے؟“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”کون سی عادت؟“ فرحت نے کتاب میز پر تقریباً پٹختے ہوئے کہا۔

”دیکھو یہ ہیں آج کل کے طالب علم علم کی مقدس کتابوں کو ایسے پٹختے ہیں جیسے کتے کو روٹی کھڑا۔“

”تم تو ہر بات کا الٹ مطلب لیتی ہو۔ میں نے تو صرف کتاب رکھی ہے۔“ فرحت مزید چلبہ کر بولا۔

”مگر میری اصطلاح میں اسے پٹختا ہی کہتے ہیں۔“

”کسے سچ دیا۔ کہاں ہوا تھا دنگل۔۔۔؟“ وہاں بھی آ گیا تھا اور اس نے عفیرہ کا آخری جملہ سُر لیا تھا۔

”دنگل تو اب ہوگا۔“ عفیرہ نے وہاں کو آتے دیکھ کر کہا۔

”تم صبح سے غائب کہاں تھیں پتا ہے سرز کی نے آج بہت اہم لیکچر دیا تھا۔“ وہاں نے اطلاع ڈانٹنے کے انداز میں دی۔

”آج وہ تیاری کر کے آئے ہوں گے۔“ وہ بے نیازی سے چیونگم پر ستم ڈھالتی رہی۔

”کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”بھی سیدھی سی بات ہے جس روز وہ لیکچر دینے کی تیاری نہیں کرتے اس روز کلاس میں ہر ایک پر نظر رکھتے ہیں کوئی گردن ذرا ترچھی بھی کر کے کسی کو دیکھ لے تو ڈانٹتے پھنکارتے ہیں اور جس روز ان کی تیاری ہو تو پھر لیکچر اور صرف لیکچر۔ مجھے یقین ہے آج انہوں نے کسی کو نہیں ڈانٹا ہوگا۔“ عفیرہ نے آنکھیں نہچاتے ہوئے کہا۔

”ہاں واقعی ہم نے تو کبھی غور نہیں کیا۔“

”یہ عورت کی نظر ہے جو گہرائیوں میں بھی دیکھ سکتی ہے چھپے ہوئے رازوں کا پتا چلا سکتی ہے دلوں میں اتر کر۔۔۔۔۔؟“ عفیرہ نے آصف کا نجو کی طرف عور سے دیکھا تو وہ گڑا کر رہ گیا۔ اور کیوں عفیرہ کو اس پر ترس آ گیا۔ اور اس نے بات بدلتے ہوئے وہاں سے کہا۔

”سنو تھوہارے چاچو کہاں ہیں آج کل۔۔۔؟“

”کیوں؟“ وہاں نے پوچھا۔

”مجھے جاب دلوائیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔ آخر ہم نے ان کا کام کیا ہے تو اب۔۔۔

”جواب تو تم کر رہی ہو۔۔۔؟“ فرحت بولا۔

”اسے میں نے چھوڑ دیا۔“ حد درجہ بے پروائی تھی عفیرہ کے انداز میں۔

”وجہ؟“ وہاں نے پوچھا۔

”انتہائی جاہل ہے وہ ایڈیٹر۔“ وہ بمشکل مزید القابات سے خود کو روکتے ہوئے بولی۔

”تمہارے آرٹیکل سے اختلاف کیا ہوگا بھی یہ اہم خطاب دیا ہے تم نے اُسے۔“ فرحت مزید نے ہنس کر کہا۔

”ہاں۔ میں نے سوچ لیا ہے اس کے ہاں نہیں لکھنا کل میں استعفیٰ دے آئی ہوں۔“ عفیرہ نے اطلاع دی۔

”مگر ہوا کیا تھا۔۔۔؟“ وہاں جانا چاہتا تھا۔

”بھی دیکھو وہاں حکومت کتنی ہے پریس بالکل آزاد ہے جو لکھو گے وہ چھپے گا۔ اور یہ لکھنے والے کو بھی چاہیے کہ شہرت کے زینے پر چڑھنے کے لیے جھوٹ کا راستہ نہ پنائے۔“ تھا قیاس کوخ نہ کہ آرزو کی کا مطلب یہ تو نہیں کہ جھوٹ کا بازار گرم کر کے حقیقت سے بھی نظریں چرا لو۔ میں نے طلبہ تنظیموں پر سے پابندی ہٹانے کے فیصلے پر آرٹیکل لکھا ہے اور میرے خیال میں وہ انتہائی مربوط آرٹیکل ہے مگر خطی صاحب اس میں تبدیلیاں چاہتے تھے میں نے کہہ دیا آپ انتہائی جاہل آدمی ہیں یہ میرا نقطہ نظر ہے ضروری نہیں ہے ہر کوئی شفیق ہو۔ جس کا جی چاہے جواب دے تو خطی صاحب کہنے لگے آپ بحث و تکرار کا راستہ کھولنا چاہتی ہیں۔ میرے بچوں کو بھوکا مروانا چاہتی ہیں یہ وہ۔۔۔ آخر میں نے استعفیٰ لکھ دیا۔“ عفیرہ نے گالوں پر جھوٹی لٹ کو انگلی پر لپیٹے ہوئے تفصیل بتائی۔

”اور تمہارا وہ مضمون۔۔۔!“ فرحت نے مزید معلومات چاہی۔

”حلی صاحب نے نہیں دیا۔ مگر میں لے لوں گی۔ کسی صورت وہ ”فلک“ میں نہیں چھپے گا مجھے بھی ضد ہوگئی ہے۔ آج صبح اخبار میں ایک اشتہار دیکھا تھا تو وہیں گئی مگر بات بنتی نظر نہیں آ رہی۔“

”کیوں؟“ وہاں نے پوچھا۔

”مجھے ایڈیٹر پسند نہیں آیا۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”کام کرنا ہے تم نے اور ایڈیٹر کو پسند کرنا ضروری شرط ہے۔“

”بھئی تاپسندیدہ بندے کے ساتھ میں فٹ پاٹھ پر بھی چلنا پسند نہیں کرتی یہ تو اکٹھے کام کرنے کی بات ہے۔“

”لعلت ہے تمہاری ذہنت پر۔“

”چھوڑو تم مجھے یہ بتاؤ کب آئیں گے تمہارے چاچو۔“

”جلد آئیں گے تو میں بات کروں گا۔ ویسے ایم۔ اے کے بعد ہی تم جاب کرنا۔ کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورتیں بتانے سے انسان بہت چھوٹا ہو جاتا ہے وہاں احمد اور میں تم لوگوں کے سامنے چھوٹی

نہیں بننا چاہتی۔ ابھی تو ایم۔ اے کرنے میں پورا سال پڑا ہے۔“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔

”آئندہ مینیجنگ ایگزیکٹو ہیں تم یکسوئی سے تیاری کرو۔“

”کر لوں گی تم اس کی فکر نہ کرو۔“

”اے تم کیوں نہیں سمجھتی الیکشن لڑیں۔“ وہاں نے پوچھا۔

”بالکل نظر آتی ہوں۔“ وہ بچکی طرح چمک کر بولی۔

”جیسی چاچا ایک سیٹ چھوڑیں گے تم اس پرائیکشن لڑو۔ چاچو ضرور مدد کریں گے۔ اور مجھے یقین

ہے تم ممبر اسمبلی بن جاؤ گی۔“

”میں بے اختیار ممبر بننا نہیں چاہتی کہ ہر اچھی بات پر ڈیک بجاؤ اور جس سے اختلاف ہوواک

آؤٹ کرلو۔ مجھے کوئی شوق نہیں اور پھر فائدہ بھی تو کوئی نہیں۔“ عفریہ نے منہ بنا کر کہا۔

”تم ہر بات میں فائدہ اور نقصان ضرور سوچا کرو۔“ فرحت ہنسا۔

”سوچ پر تم پابندی نہیں لگا سکتے۔“ عفریہ نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

”میں چاچو سے کہہ دوں گا۔ ویسے جب تک تم کمال ماموں کی ٹریولنگ ایجنسی میں کیوں نہیں کھپ

جاتیں۔“ وہاں بولا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں مگر۔“ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

”مگر کیا۔“ وہاں نے پوچھا۔

”تم اپنی ماموں زاد سے اجازت لے لو۔“ عفریہ کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔

”وہ کیا کہے گی بھلا۔“ فرحت نے پوچھا

”یہ پوچھو کہ کیا نہیں کہے گی۔“ عفریہ نے لہک کر کہا۔

”تم فضول کی باتیں مت کیا کرو۔“ وہاں بری طرح تھپک گیا۔

”کیا کہے گی عفریہ تم بتاؤ نا۔“ فرحت جاننا چاہتا تھا۔

”بتا دوں۔! عفریہ نے وہاں کو دیکھا۔

”تم فضول کا سہنس پیدا کر رہی ہو یونہی۔ ایسی کیا بات ہے بھلا۔! وہاں سہٹا گیا تھا۔

”بھئی محترمہ غاشیہ کمال بلا شرکت غیرے وہاں احمد کو اپنی ملکیت سمجھتی ہیں اور موصوف اس کی خشکی برداشت نہیں کر سکتے آخر وہ غالباً کیا یقیناً مستقبل کی بیگم وہاں ہی تو ہیں۔ ویسے وہاں تمہارے لیے زندگی عذاب ہو جائے گی۔ غاشیہ بے حد شکی لڑکی ہے محبوب سے جب تم شوہر بنو گے تو اسے ہر دم منانے کی ادا تمہیں بری لگے گی پھر کیا کرو گے۔ ابھی سے اسے سیدھا کرنے کی مشق کرو۔ مجھے تو شک ہے کہیں تمہارا حشر بھی تمہارے گریس فل چاچو جیسا نہ ہو۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ غاشیہ بے حد معصوم لڑکی ہے۔“ وہاں کا لہجہ نرم تھا۔

”ہر عاشق اپنی محبوبہ کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہے۔“ کیوں آصف۔“ اس نے خاموش

بیٹھے آصف کی طرف تیر پھینکا۔ آصف نے اسے کھور کر دیکھا مگر کوئی بھی اس طرف متوجہ نہ تھا۔ اور عفریہ

کہہ رہی تھی۔ ”پتہ نہیں وہ مرد جب محبوب سے شوہر بنتا ہے اور لڑکی محبوبہ سے بیوی میں تبدیل ہو جاتی ہے تو

وہ معصومیت نجانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔“

”تم اپنے خیالات خود تک محدود رکھو مہربانی ہوگی۔“ وہاں جل کر بولا مگر نجانے کیوں عفریہ کی

باتیں اس کے دل میں اتر گئیں تھیں۔ سچی باتوں کی۔ یہی تو خونی ہوتی ہے کہ وہ سیدھی دل میں گڑ جاتی ہیں۔

مگر ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ وہاں نے بھی کتابیں اٹھائیں اور وہاں سے چلا آیا کہ مزید عفریہ کی ”سچی باتیں“

برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تو تاباں نے دروازہ کھولا سامنے ہی ماسی بختاں کھڑی تھی۔ وہ جگت

ماسی تھی ہر چھوٹا بڑا اسے ماسی ہی کہتا تھا۔ بستی کی عورتوں کے دکھ درد میں شریک رہنے والی ماسی بختاں کے

خلوص و محبت کی وجہ سے پوری بستی کے لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔

”آؤ ماسی بخت۔ کیسی ہو؟“ تاباں نے دروازے سے ہٹ کر راستہ دیا۔

”ٹھیک ہوں پتر۔ بس ذرا نظر کم آتا ہے۔“ حسب معمول ماسی بخت نے اپنی یہ خامی بتائی۔ ”تیری

ماں کدھر ہے؟“

”وہ بیٹھی ہے۔“ تاباں نے بتایا۔ شرفاں کچی دیوار سے ٹیک لگائے چار پائی پر بیٹھی دھوپ سینک

رہی تھی۔ تاباں اسے لیے شرفاں کے پاس چلی آئی۔

”اماں ناسی آئی ہے۔“ تاباں نے بتایا تو شرفاں نے گھٹنے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کے لبوں پر

مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آؤ ماسی خیر تو سے نا بیٹھو۔“ ماسی بخت کے بیٹھے ہی تاباں نے کہا۔

”ماسی چائے تو بیوگئی نا۔“ میں نے گلوکی چائے بنائی ہے۔ اور پتہ بادام بھی ڈالے ہیں۔“

”لے آؤ۔“ ماسی نے گھٹنے سیکر سینے سے لگا لیے اور چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھک لیا۔ تاباں

بیالوں میں چائے لے آئی تھی۔ اور ماسی کو دے کر خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔

”تیری ماں کی زبان کے تالے ابھی تک نہیں ٹوٹے۔“

”ارے نہیں ماسی میری ماں خوب بولتی ہے۔“ تاباں نے ہنس کر کہا۔

”جب سے یہ اس بستی میں آئی ہے چپ غپ ہی رہی۔“ حیات محمد اسے میرے پاس ہی لایا

تھا۔ ماسی نے تاباں کو بتایا۔

”میں کون ہوں ماسی؟“ کیکپاتی ہوء آواز میں شرفاں نے پوچھا۔

”کاش مجھے بھی پتا ہوتا۔“ ماسی نے کہا۔

”مجھے پتا کیوں نہیں۔ میں کہاں سے آئی ہوں؟ بابا کو بھی نہیں پتا کہ مجھے کہاں سے لایا تھا؟“ لفظ شرفاں کے لبوں پر ٹوٹنے لگے تھے۔

”اسے خود خبر نہیں کہ تو کون ہے۔ پر شرفاں یہ بات ماننے والی ہے اس نے تجھے بالکل بیٹی کی طرح پالا ہے۔“

”میں کب انکار کر رہی ہوں اس بات سے۔ لیکن مجھے اپنی بھی تو خبر ہونی چاہیے نا؟“ شرفاں کا لہجہ دکھ کا غماز تھا۔

”اس کو پتا ہوتا تو وہ ضرور تجھے ان کے پاس لے جاتا جن کی تو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار تھی۔ مگر اس نے تو تجھے اپنے کلیجے سے لگا کر رکھا۔“ ماسی کے لہجے میں سچ ہی سچ تھا۔

”اس احسان کا بدلہ بھی تو لے لیا۔ میں تو بابا کے احسان کو سودر سودا کر رہی ہوں۔“ شرفاں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی یہ ایسی مسکان تھی جو کتنے ہی دکھوں کا سینہ چیر کر لبوں تک آئی تھی تاہاں کا دل کٹنے لگا۔

”میں تو کمزور ہی کرتی رہتی ہوں فضل کے دیئے گئے زخموں پر۔۔۔ ماسی اسے تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس کی مار بھی مجھے میری خیالی دنیا سے کھینچ کر نہیں لاتی۔ وہاں تک اس کی مار نہیں پہنچتی۔ کتنی بھی ٹھوکریں مجھے مارے مگر میں اپنی یادوں کا شیش گُل بچا لیتی ہوں۔“

”پھر مارا ہے کیا۔۔۔؟“ ماسی نے پوچھا۔

”یہ کوئی نئی نہیں بت تو نہیں روز کا معمول ہے۔“ شرفاں مسکرائی۔

”ماسی! قصہ ماں کا ہے اور نہ ہی ابا کا۔ میں اماں کو سمجھاتی ہوں کہ ابا سے نہ الجھا کر۔“

”ماسی یہ مجھے کیوں روکتی ہے کہ میں فضل کو شیشہ نہ دکھاؤں۔ کیوں نہ کروں ایسا۔؟ شرفاں پوچھ رہی تھی۔ ابا کو شیشہ دکھاتے دکھاتے اپنے دل کے وجود کا شیشہ چمکنا چور کروا لیتی ہوا ماں۔ مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اور خود بھی دکھی ہوتی ہو۔“

”میرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے بس۔ بس۔۔۔ شرفاں کے ہونٹوں پر لفظ ٹوٹنے لگے۔ انجانے سے احساس اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اور چہرہ ہنستا ہوا تھا۔

”بہت افسوس ہوتا ہے مجھے تاہاں میری ماں یہ۔۔۔“

”ہم افسوس کے علاوہ کبھی کیا سکتے ہیں۔“ تاہاں کی آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی۔

”ماسی اگر مجھے ان کا پتا ہو کہ جن کو میری ماں بھل کی گرم ریت پر پکارتی پھرتی ہے۔ دریا کی طغیانی میں ان چہروں کو تلاش کرتی ہے اسے ان لوگوں کے پاس لے جاؤں۔ میری ماں کے دکھ تو کٹیں۔“

”دکھ تو سانس سے بندھے ہوئے ہیں تاہاں پتھر۔ سکھ تو پرندوں کے پروں پر سوار ہوتے ہیں پلک چمکنے میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔“ ماسی نے آہ بھر کر شرفاں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”یہ ایسی نہیں تھی تاہاں۔ تیری ماں چپ رہتی تھی پراتنی غائب دماغ کبھی بھی نہ رہی تھی جیسی اب ہے۔ فضل سے شادی کے بعد ہی اس کا دماغ الٹا تھا۔ میں نے حیات محمد کو منع بھی کیا تھا کہ فضل اس کے لائق نہیں ہے۔ یہ تو پھولوں کی ڈالی ہے میت اسے کانٹوں میں پھینک۔۔۔ مگر۔۔۔“

”مگر کیا ماسی۔“ تاہاں نے بے تابی سے پوچھا۔

”اس کا بھی قصور نہیں فضل ہی چاہتا تھا شرفاں سے شادی کرنا۔ اسے مفت کی جوتل رہی تھی نا

”اتنی ارزاں تھی میری ماں۔۔۔۔“ تاہاں سکی۔

”بس یہی سمجھ لو۔ بستی کے کتنے ہی لوگ اپنا نا چاہتے تھے۔ کتنے دلوں کا خواب تھی شرفاں پر تیرا دادا ہی نہیں مانتا تھا۔ ہر ایک کو یہی کہتا اگر اس کے مالک آگئے تو۔۔۔ میں تو امانت دار ہوں اور امانت واپس کرنی ہوگی۔ سب کہتے ہیں اصل میں اس نے فضلو جیسے نکلے بیٹے کی دودھی بنانے کا سوچا ہوا تھا۔“ ماسی تاہاں کی طرف جھگی رازداری سے بتا رہی تھی۔

”فضلو شروع ہی سے ایسا تھا۔“

”پھر اماں کیوں مانی تھی؟“ تاہاں جاننا چاہتی تھی۔

”یہ کب مانی تھی۔ بول تو سکتی ہی نہ تھی۔ وہ تو جب پیدا ہوئی تو ممتا کے شدید جذبے کے تحت اس کی گویائی واپس آئی تھی پورے چودہ سال تک اس کی زبان کو چندرے (تالے) لگے رہے تھے۔“

”نہیں۔“ تاہاں کے لیے واقعی یہ انکشاف تھا۔ اب تو شرفاں کس طرح فضل دین کے سامنے پڑ پڑ بولتی تھی۔ اسے سچائیوں کی راہ دکھانی تھی۔ سچ کو بے نقاب کرنے کا حوصلہ نبانے کیسے اور کب اس کے اندر اتر آیا تھا۔

”کاش اماں تو گوشتی ہی رہتی۔ تیری زبان پر صبر کے تالے لگے ہی رہتے تو زندگی کتنی سکھی ہوتی۔“ ماسی بختاں کہہ رہی تھی۔

”حیات محمد نے اس کی فضل دین سے شادی کی تب بھی اس نے کوئی احتجاج نہ کیا تھا۔“

”پھر اب کیوں کرتی ہے احتجاج۔؟“

”تالی۔۔۔“ شرفاں کے لب زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑائے۔ میں کب تک چپ رہوں۔ آخر اپنی سزا کے بارے میں کیوں نہ پتا کروں۔ مجھے کب رہائی ملے گی۔“

”اماں تمہیں کچھ یاد نہیں۔!“

”سب۔ سب دھندلا سا ہے۔ بس اتنا یاد ہے بہت بڑا سا گھر تھا اس میں ایک خوبصورت سی عورت تھی جو مجھے بہت پیار کرتی تھی لگتا جیسے پھولوں نے پیشانی کو چھو لیا ہو۔ اب بھی میں اپنی پیشانی پر ان ہونٹوں کی زماہٹ محسوس کرتی ہوں۔ اور۔ اور۔“

”اور کیا اماں۔۔۔“ تاہاں بے تابی سے بولی۔

”بس اس سے آگے مجھے کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ میں ذہن پر بہت زور دیتی ہوں تو پردے پر ایک ہی صورت ابھرتی ہے۔ میرے سانول کی صورت سب بھول گئی ہوں سانول مجھے یاد ہے اس کے پیچھے تار کی ہے کچھ پتا نہیں۔“ شرفاں کے ہونٹ کانپے۔

”اماں جب تمہیں خود پتا نہیں تم کون ہو۔؟ تو پھر تمہیں اور کوئی کیا بتائے گا تم کیوں فضول میں ابا سے بدگمان رہتی ہو۔۔۔“ تاہاں نے کہا۔

”تم کیوں باپ کی طرف داری کرتی ہو۔“ شرفاں نے گھورا۔

”لو اماں الزام میرے سر کب میں نے ابا کی طرف داری کی ہے؟ سن رہی ہو ماسی۔؟“ تاہاں نے شکوہ کیا تو ماسی بختاں دکھ سے آہ بھر کر رہ گئی۔

”تجھے فضل دین گھر میں داخل ہوا اُس کے ہاتھ میں ٹرانسٹر تھا۔ جس سے بڑا درد بھرا گیت فضاؤں میں بکھر رہا تھا۔ ممتاز خانم کی آواز فضاؤں میں رچ بس گئی تھی۔ چولستان کی بولی کا دلوں میں اترتا ہوا گیت

سوہنا سانولا مکھ نہ موڑیں
لگی ہوئی پریت جانی توں نہ توڑیں
ہولے ہولے زخماں کوں تو نہچوڑیں
بدن ڈھک دے مریضاں دے
کڈن ولسو سوہنا سانول آ
وطن اساڈے غریباں دے

(ترجمہ: اے میرے محبوب مجھ سے رُخ نہ موڑنا اور یہ جو محبت کی ڈور ہے اسے نہ توڑنا۔ تو میرے زخموں کو ختم کرنے کا عہد کیا تھا تو ذرا آہستہ آہستہ ان زخموں کو صاف کر کے مریضوں کے بدن دکے ہیں۔ اور مجھے بتاؤ تم کب میرے وطن آؤ گے۔)
شرفاں نے وحشت زدہ نظروں سے پہلے فضل دین کو دیکھا پھر ٹرانسپیر سے نکلتی ہوئی آواز
۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی سی رچ بس گئی تھی۔ فضل دین ان کے قریب ہی آ کر دوسری چار پائی بیٹھے ہوئے بولا۔

”کیسی ہو ماسی۔۔۔؟“

”ٹھیک ہوں پتر کہاں سے آرہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”دریا پر گیا تھا۔ سردیوں میں دریا پار جانے والی سواریاں ہی نہیں ہوتیں۔ نہ ہی دریا کی سر کرنے لوگ آتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں شہر چلاؤں گا۔“
پتا نہیں ماسی بختاں نے کیا جواب دیا تھا شرفاں نہیں سن رہی تھی اس کی سماعتیں تو گیت پر لگی ہوئی تھیں۔

سوہنا سانولا کیتھوں گھنوں چل
رو رو اکھیاں دے جانی تھی گھنیاں چھل
تیڈی مرضی دل بھانویں نہ دل
او اسال جھیٹرا نصیباں تے
کڈن ولسو سوہنا سانولا
وطن اساڈے غریباں دے

(ترجمہ: میرے محبوب تمہیں میری کون سی بات بری لگی ہے جو تم خفا ہو گئے ہو اور میری آنکھیں روتے روتے سیلاب بن گئی ہیں تمہاری مرضی ہے آؤ یا نہ آؤ میں نے تو یہ بات نصیبوں پر چھوڑ دی ہے پھر بھی بتاؤ تم کب مجھے غریب کے وطن آؤ گے۔)
”نہیں۔۔۔ نہیں۔“ شرفاں وحشت زدہ ہو کر چیختی اور اٹھنا چاہا۔

”کیا ہوا پتر۔۔۔“ ماسی بختاں نے اسے سنبھال لیا۔

”میں نے نصیبوں پر بات نہیں ڈالی اسے آنا پڑے گا۔ ہاں ماسی میرے انتظار کی عمر اور طویل نہیں ہوگی اور۔۔۔“ وہ بکھر گئی۔

”پھر تو نے بکواس شروع کر دی،“ فضل دین تلملا کر بولا۔

”وے پتر حیا کر۔“ ماسی بختاں نے فضل دین کو سمجھانا چاہا۔

”اے جیانیوں جوان بٹی کے سامنے ایسی بے غیرتی کی باتیں کرتی ہے۔“ وہ گر جا۔
”کرنے دے تیرا کیا جاتا ہے۔ خوابوں کی بات۔“ ہارنے دے اسے خوابوں کے شیش محل میں۔
تجھے بھی تو خبر ہے کہ یہ صرف خواب ہے حقیقت نہیں۔ پھر کیوں ضد کرتا ہے۔“
”اگر یہ حقیقت ہوتی تو آج یہ زمین میں گڑی ہوئی ہوتی۔“ مارے طیش کے فضل دین کے لبوں سے لفظ بھی سچ نہیں نکل رہے تھے۔

”ابا تم اندر جاؤ۔“ تاہاں نے ہمیشہ کی طرح جھگڑا ختم کرتے ہوئے کہا۔
”تیرا لحاظ ہے مجھے تاہاں نہیں تو۔۔۔“ فضل دین نے شرفاں کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کچا چا جائے گا۔ اور ریڈ یو اٹھا کر اندر چلا گیا۔

تاہاں بھی باپ کے پیچھے پیچھے چلی گئی تھی۔ شرفاں کی بچی بچی نظریں اور ماسی بختاں کی محبت پاش نظریں اس کے سر اُپے پر جمی ہوئی تھیں۔ ماسی نے کافی دیر بعد کہا۔

”تیری کتنی سیانی بٹی ہے شرفاں۔ تو اسی کا لحاظ کر لیا کر پتر۔۔۔“
”میں کیا کروں اختیار نہیں ہے مجھے خود پر۔۔۔ ماسی تمہیں کیا پتا کہ میرا احساس کس قدر زخمی ہے۔ میرا دماغ بھی صدمے سے جوہل ہے۔ میری یادیں ذہن کے کسی گوشے میں بڑی سسکتی رہتی ہیں۔ مگر مجھے دکھائی نہیں دیتیں دھند ہی دھند چھائی ہوئی ہے۔ چمکتے سورج بھی اس دھند کو ختم کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ میں۔۔۔ پاگل ہو گئی ہوں سوچ سوچ کر اپنی پہچان نہیں مجھے۔ مجھے بتاؤ ماسی میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔؟“

میری زندگی اتنی بے شرم کیوں ہے؟ میں کسے دکھاؤں اپنے سینے کے وہ زخم جو لو دیتے ہیں تو مجھے ہی لگا تے ہیں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ مگر میں راہک ہو جاتی ہوں۔“ شرفاں سسک پڑی۔ اور ماسی بختاں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”نصیب کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔“

نہ ہی تیرے دکھوں کو، کوئی دور کر سکتا ہے۔ برسوں ہوئے تھے روتے ہوئے ابھی تک تجھ پر آسمانوں پر بیٹھے خدا کو ترس نہیں آیا۔ شاید تیرا امتحان ابھی ختم نہیں ہوا؟ کوئی نہ کوئی راز ضرور ہے۔ نہ رو شرفاں مقدر کی تحریر آئسوؤں سے نہیں دھلتی۔“ اسے خاموش کراتے کراتے ماسی بختاں خود بھی رو دی۔

☆☆☆

وہاج احمد نے صوفی کی پشت کو مضبوطی سے تھام لیا۔ مارے ضبط کے وہ بہت مشکل سے خود کو قابو میں کیے ہوئے تھا۔

”پھر تمہارا کیا خیال ہے؟“۔ چوہدری سراج احمد نے رنگین پایوں والی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
”میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا سراج بھائی۔“ وہ ہونٹ چبا کر بولا۔

”تیری ماں تو راضی ہے۔“ وہ بولے۔

”میری ماں کیا آپ کی ماں نہیں ہے؟“ وہاج کا لہجہ تنق جیسا تھا۔

”ہے کیوں نہیں ہے۔“ وہ دھیمے پن سے بولے۔ ”مگر ایک خانہ ہوتا ہے سگہ اور سوتیلے کا خانہ۔“
”آپ یہ بھول رہے ہیں کہ میری ماں کو یہ اعزاز حاصل ہے وہ میرے باپ کی پہلی بیوی ہے۔“

وہاج نے فخر سے کہا۔

”اور میری ماں سرادر پور کے پہلے وارث کی ماں تھی تمہیں بھی یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ اور

زمینداروں کے ہاں اسی عورت کی اہمیت ہوتی ہے جو وارث کو جنم دیتی ہے۔ ورنہ عورتیں تو حویلی میں اور جانی ہی رہتی ہیں۔“ چوہدری سراج احمد: ”مجھ کو مرڈتے ہوئے کہا۔

”میری ماں معمولی عورت نہیں ہے سراج بھائی وہ مظفر پور کے جاگیردار کی بیٹی ہے۔ جیسے پور احترام سے یہاں خلفت کی موجودگی میں لایا گیا تھا وہ ان عورتوں میں سے نہیں جو اس حویلی میں رات تارکی میں لائی جاتی اور سپیدہ نمودار ہونے سے پہلے رات نہ کر دی جاتی ہیں۔“ وہاں نے تپے تپے لہجے کہا۔

”تو میری ماں بھی ان عورتوں میں سے نہیں۔“ خون سراج احمد کی رگوں میں کھولنے لگا۔

”خدا نہ کرے کہ میں ایسی بدزبانی کروں آپ کی والدہ بھی میرے لیے اتنی ہی قابل احترام جس قدر مجھے جنم دینے والی ماں کا احترام ملحوظ ہے۔ مگر میں زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں کسی صورت بھی آپ کو یہ حق دے نہیں سکتا کہ آپ میری زمین ان مزارعوں سے چھین لیں جو برسوں سے اس پر کا رہے ہیں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”اوپر وقف ہم اکٹھی زمین مستجاری دیں گے تو بہت منافع ملے گا۔“

”مجھے منافع کی ضرورت نہیں ہے سراج بھائی۔ میں اتنے بہت سے لوگوں کے منہ سے نوالہ چھین سکتا۔“ وہ حتیٰ لہجے میں بولا۔

”انہیں کہیں اور کامل جائے گا۔“ چوہدری سراج احمد نے کہا۔

”پھر بھی میں کسی صورت انہیں بے دخل نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی زمین کے مختار کل ہیں جو کریں۔ وہ لوگ میرے بابا کے زمانے سے ہماری زمینوں پر کام کر رہے ہیں اور میں کبھی انہیں بے کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ وہاں آہستہ سے بولا مگر اس کا عزم لفظوں میں پوشیدہ تھا۔

”جبکہ بڑی ماں مان گئی ہیں۔“ سراج احمد نے اطلاع دی۔

”مام کو میں سمجھا لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات سے انحراف نہیں کریں گی۔“

”وہاں! میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ اور میں اچاہتا ہوں کہ تم وہی کرو جو میں چاہتا ہوں یوں زمینوں کے بارے میں تمہارا تجربہ صفر ہے۔ میں تو ان میں رہتا ہوں مجھے پتا ہے کہ کیا کرتا ہے۔“

”آپ کا بڑا پین میں تسلیم کرتا ہوں سراج بھائی مگر آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا۔“ وہاں رسائی سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے کہ تمہارا مختار نامہ بڑی ماں کے پاس ہے کہ تمہاری تعلیم کی تکمیل تک وہ مختار تمہاری زمینوں اور باغوں کی“

”عالم ہے مجھے۔ مگر میں اپنی ماں کو کبھی یہ اجازت نہیں دوں گا کہ وہ اس مختار نامے کا غلط استہا کریں۔“

”تم انہیں کیسے منع کرو گے۔ وہ مختار ہیں۔“ چوہدری سراج احمد لفظ ”مختار“ پر زور دیتے ہو بولے۔

”یہ میں جانتا ہوں کہ انہیں کس طرح منع کیا جا سکتا ہے۔“ وہاں کے سکون میں کوئی فرق نہیں تھا۔

”مجھ میں یہ حوصلہ نہیں کہ مزارعوں کو بے دخل کر دوں۔“

”یہ تم نہیں تمہاری تعلیم بول رہی ہے وہاں اچھا ہے میں کالج میں نہیں پڑھا۔ ورنہ میں بھی تمہا طرح بزدل ہو جاتا۔ پتا نہیں زیادہ پڑھے لکھے لوگ اتنے بزدل کیوں ہوتے ہیں؟ ہر بات میں اگر

ضرور کرتے ہیں۔“

”بھائی جان آپ مجھے لفظوں کے کتنے ہی طمانچے ماریں میں لڑکھڑانے والا نہیں ہوں جبار ہوں گا اپنی جگہ پر۔“

”جاؤ بڑی ماں سے مشورہ کرو۔“ چوہدری سراج احمد نے کہا۔

”مجھے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھائی جان آپ اپنی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعوں کے ساتھ جو بھی سلوک کریں میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”تم نہ کیا کہہ سکتے ہو۔“ سراج احمد اس کی بات کاٹ کر گرجے۔ ”میری زمینیں ہیں میں جو چاہے کروں۔“

”اتنی دیر سے میں بھی آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہاں کے لبوں پر زہر خند پھیل گیا۔

”ابھی تو اتنا بڑا نہیں ہوا کہ چوہدری سراج احمد کو سمجھائے۔“ وہ تڑخ کر بولے۔

وہاں کا دل تو چاہا کہ وہ دے عقل عمر کی محتاج نہیں ہوتی۔ مگر اس نے لب بھیج کر لبوں سے نکلنے والے اس پتھر لیے جیلے گوردک لیا۔ جو نکلتا تو سیدھا سراج احمد کے دل پر لگتا اور وہ بلبل کر رہ جاتے پھر نجانے کیا کر بیٹھتے۔ ابھی تو وہ نہایت محل کا مظاہرہ کر رہے تھے اور یہ خلاف توقع ہی بات تھی۔ ورنہ چوہدری سراج احمد جیسا اکھڑ شخص جس سے نرم انداز کی توقع ہی بے سود ہے۔ مگر کوئی نہ کوئی ”وجہ“ تھی جو وہ نہایت ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے اور وجہ یہ تھی کہ چوہدری احمد سردار مرحوم نے اپنی آدھی جائیداد وہاں احمد کے نام کی تھی۔ اور سراج احمد کی نرمی کی وجہ یہی تو تھی۔

”تم سوچ لو۔“ سراج احمد نے پھر کہا۔

”کتنا بھی سوچوں گا پھر بھی میرا فیصلہ یہی رہے گا بھائی جان اور اس فیصلے میں مضبوطی ہی ہوگی نرمی کی کوئی گنجائش نہیں۔“

”جاؤ بڑی ماں سے بات کر لو۔“ پھر شام کو بات ہوگی۔“ چوہدری سراج احمد نے کہا تو وہاں حزیں کچھ بھی نہ بولا کہ کہنا فضول ہی تھا۔ چوہدری سراج احمد اس کی بات سمجھ ہی نہیں رہے تھے یا پھر وہ سمجھنا نہ چاہتے تھے۔ وہاں سر جھکا کر ڈیرے سے نکل آیا۔

چوہدری سراج احمد نے اسے فوری طور پر اسی لیے بلوایا تھا۔ ورنہ وہ ایگزیم کی تیاری میں اس قدر مصروف تھا کہ جلد گاؤں آنے کا سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ مگر یہاں آ کر تو اس کا دماغ ہی الٹ گیا تھا۔

بھلا وہ اپنی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعوں کو کس طرح بے دخل کر سکتا تھا؟ یہ تو ناممکنات میں سے تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچا کرتا تھا جب وہ اپنی زمینوں کا مختار کل ہوگا تو ساری کی ساری ایسی مزارعوں میں بانٹ دے گا۔ جو برسوں سے اس کی زمینوں کی راہگی کر رہے تھے اور خود اپنی خواہ میں گزارا کرے گا۔ حالانکہ اس کی یہ سوچ انتہائی بچکانہ ہی تھی۔ بھلا اس کے بھائی کبھی ایسا کرنے دیتے۔

جونی کو تاج بنانے کی اجازت وہ نہیں دے سکتے تھے۔

وہ بھائی جو وہاں احمد کے والد چوہدری احمد سردار ہی کے بیٹے تھے مگر وہاں احمد اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ حالانکہ اس کی ماں چوہدری کی بڑی بیوی تھی۔ اور قدرت نے نکل جیسا کہ گود میں وہاں احمد کو اس وقت ڈالا تھا جب نہ نکل ہا کو اور نہ ہی چوہدری احمد سردار کو والد کی خواہش رہی تھی۔ نہ ہی امنگ کے کرم کی بی بی سے احمد سردار کے چار بیٹے تھے۔ اُن کی ہزاروں ایکڑ اراضی کے وارث۔ آؤ اور مجھوروں کے باغات کے

مالک۔ اور جب زندگی کی شام ہو چکی تھی۔ سانسیں مدھم اور زندگی کا سورج ڈھلنے کے قریب تھا۔

خواہشوں کے شیشے پروقت کی دھول بڑھ گئی تھی۔

تب باکسی آرزو کے قدرت نے ظل ہما جیسی سوچی ٹہنی کو ہرا کر دیا تھا۔ تھا نا یہ بھی کرشمہ قدرت۔

اپنے کرم کا چشمہ جاری کیا تو کس وقت جب پیاسوں کی پیاس ہی ختم ہو چکی تھی۔

قدرت کی اس فیاضی پر ایک لمحہ کے لیے تو ظل ہما اور احمد سر دار کو یقین ہی نہ آیا تھا۔

کیا یہ وقت مقرر کیا تھا کہ تب تقدیر نے میری خواہش کی تکمیل کے واسطے۔؟

وہ سر جھٹک جھٹک کر سوچتے۔

مگر کوئی ندانہ آئی۔

ظل ہما سے شادی کے بعد انہوں نے پورے دس سال تک اولاد کا انتظار کیا تھا۔

ظل کی محبت کے دریا میں اتر کر اولاد والی خواہشوں کا گلا گھونٹا تھا۔ حالانکہ وہ چار بہنوں۔

اکھوتے بھائی تھے اور ماں کے ساتھ ساتھ بہنوں کی بھی تمنا تھا۔ ”پھوپھو“ کہلوانے کی۔ مگر وہ ظل ہما

سوکھ جیسا بوجھ نہ ڈال سکتے تھے۔ ظل ہما تو بہت نازک سی تھی۔

لوگوں نے کتنے ہی لفظوں کے تیر چلائے تھے۔ انہوں نے سب اپنے چوڑے سینے پر سہے تھے۔

شادی کے بعد اولاد کتنی ضروری ہو جاتی ہے؟ جس جھولی میں یہ پھول نہیں گرتا تو اس جھولی وا۔

کو ترحم امیر نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور بھی دلا سوں والے لفظوں والی چھریاں کلیجے میں اُٹارنی پڑ

ہیں۔ کہنے والے لمبی تو کچھ سوچے سمجھے بغیر کہتے ہیں۔ ویسے بھی بھلا وہ درخت کب اچھا لگتا ہے جس

کوئی میوہ نہ ہو۔ وہ پودا ہی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک جاتا ہے جس پر پھول نہ لگیں۔ یہ تو زیست کا اصول ہے

چوہدری احمد سر دار نے اس اصول کی نفی کی تھی۔ ماں اور بہنوں کی خواہش کو رد کر دیا تھا کہ وہ ظل ہما

آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکتے تھے۔

بہت چاہا تھا انہوں نے ظل ہما کو جو ان کی بیوی ہی نہیں محبوبہ تھی۔ جس کی محبت ان کے رگ رگ

میں دوڑتی تھی۔ جوانی میں بھی جب رگوں میں خون بھی آگ بن کر اُبلتا ہے تب بھی انہوں نے ظل

کے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ جوانی کے کسی تقاضے سے وہ مجبور نہ ہوئے نفس کا سانپ کچلا

کے لیے ظل ہما کی محبت زبردست بھالا تھی۔ شادی سے پہلے تنہائی میں ظل ہما کا تصور ان کے ساتھ رہتا تھا

اور شادی کے بعد ظل ہما نے ان کی تنہائیاں بانٹ لی تھیں۔ اولاد کی خواہش ضرور ان کے دل میں پھول

مارتی تھی مگر ظل ہما کے دکھ کا سوچ کر یہ خواہش اُس کے دکھ پر حاوی نہ ہوتی۔ مگر قدرت کے ہاں دیر

شاید۔ سردار پور کا چوہدری بے اولاد مرنے لگا تھا۔ ظل ہما کو بھی گوارا نہ تھا۔ کبھی تو وہ بھی کبھی کسی ضد کرتیں۔

احمد! تم دوسری شادی کرلو۔

”نہیں۔“ وہ ضبط کے بلے صراط سے گزرتے ہوئے کہتے۔ ”اولاد ہوئی تو تم ہی سے ہوگی ورنہ

اولاد دنیا بہتر ہے۔ ہاتھ بھی نہیں چاہئیں کہ ہماری محبت کی کوئی بونٹی ہوئی نشانی ہو۔“

”میں تو بہت سی بونٹی ہوئی نشانیاں چاہتی تھی مگر قدرت کو منظور نہ ہو تو ہم کیا کریں؟“ ظل ہما کی آ

واز بھرا جاتی۔ ”تم دوسری شادی کرلو۔“

”ہماریا ممکن ہے۔“

”احمد وہ تمہارے بچے تو ہوں گے نا؟“

”یہ درست ہے مگر میرے بچوں کو صرف تم جنم دوگی۔“

”لیکن۔“ ظل ہما نے کہا نا چاہا مگر آواز گھٹ گئی تھی۔

”خدا سے مایوس ہونا کفر ہے ہما۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق ہم فٹ ہیں تو اُس کا انتظار کرنا

چاہیے جب اللہ منظوری دے۔“ احمد سر دار سمجھاتے مگر ظل ہما ضد کرتیں اور شوہر سے تھا ہو کر میکے چلی

جاتیں۔ مگر دوسرے روز ہی احمد سر دار انہیں لینے مظفر پور پہنچ جاتے تھے۔ اور ظل ہما کسی شکوے کے بغیر اُن

کے ساتھ لوٹ آتیں کہ وہ احمد سر دار کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھیں۔ کتنے ریشم کی طرح نرم تھے

وہ۔

ظل ہما ناراض ہوتیں تو وہ صرف ایک جذبوں سے بھر پور پتی ہوئی نظر اُن پر ڈالتے اور وہ موم ہو

جاتیں۔

آخر یہ رسہ کشی جاری رہی مگر ایک کمزور ہولچہ ایسا بھی آیا جب چوہدری احمد سر دار کو ماں سمیت سب

کی بات ماننی پڑی۔ احمد سر دار کے چچا زاد بھائی نے منصوبہ بنا رہے تھے کہ ان کی ساری جائیداد ضبط کر لی

جائے انہیں مارنے کے بعد اور کوئی پتا نہ تھا کب ان کا تیر نشا نے پر لگ جائے پھر میری ماں اور ظل ہما کا کیا

ہوگا۔؟

اُن کے ہاں خواتین کو جائیداد میں سے حصہ دینے کا کوئی رواج نہ تھا۔ بھلا عورت ذات کہاں

”لیغروں“ کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

بس یہی سوچ کر ظل ہما کی پسند کرم بی بی کو انہوں نے اپنا لیا تھا۔ کرم بی بی کو انہوں سے اُوڈوں

سے خریدا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کرم بی بی نے بھی ظل ہما کو اپنی سوکن نہ سمجھا بلکہ ہمیشہ ”مالکن“ سمجھا۔ جب

شادی کے گیارہ ماہ بعد چوہدری سراج احمد پیدا ہوا تو کرم بی بی نے اُسے ہما کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”بی بی! آے آپ ہی پائیں یہ کاہے۔“

اور ظل ہما نے اظہارِ شکر سے غم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ ”سردار پور“ کے وارث کی ماں بن

جانے کے باوجود کرم بی بی کے چہرے پر پھر وغرور کی چمک نہ تھی۔ سراج دو سال کا تھا کہ معراج پیدا ہوا۔ وہ

بھی ظل ہما کی گود میں ڈال دیا گیا۔ پھر تیس احمد اور تیس احمد جڑواں پیدا ہوئے تھے بقول لوگوں کے۔

چوہدری احمد سر دار کو تو کرم بی بی نے وارثوں سے رجا دیا تھا۔ زندگی میں ایک دم ہی خوبصورتی پیدا ہو گئی تھی

گھر میں چار بچوں کی چمکاریں جو ملی کے درد یوار کو بھی جھومنے پر مجبور کر دیتیں۔ وقت کا چھٹی بج رہا تھا۔

چاروں بیٹے کرم بی بی سے زیادہ ظل ہما کو چاہتے تھے۔ اپنی ہر فرمائش ظل ہما کے گوش گزار کرتے۔ اور کرم

بی بی سوچتی۔

”اس حویلی کی اصل مالک تو ظل ہما ہی ہے مجھے تو صرف وارثوں کی پیدائش کے لیے قدرت نے

احمد سر دار کے پلے باندھ دیا تھا۔ کبھی بھی اُس کا جی چاہتا یہاں سے چلی جائے۔ واپس اپنوں میں اپنے

قبیلے میں۔

جانے کے لیے قدم بھی اٹھاتی لیکن اُسے لگتا جیسے کوئی اُس کا دل نوچ رہا ہو۔ اُس کے پیروں میں

بیڑیاں پڑ جاتیں۔ بھلا اپنے بچوں کو وہ کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ جنہیں اُس نے جنم دیا تھا تخلیق کا درد دہا تھا۔

بس یہی درد تھا جو اُسے روک لیتا۔ اپنوں کی محبت بچوں پر حاوی نہ ہوتی۔ ظل ہما نے بیٹوں کی تربیت میں

کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور انہیں ابتدا ہی میں بتا دیا تھا وہ اُن کی صرف ”بڑی ماں“ ہے اصل ماں تو چھوٹی

ماں ہے۔ مگر اُن چاروں کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اُن کی ماں کون ہے؟ اُن کے لیے تو وہ دونوں ہی

برابر تھیں۔

ظل ہما۔ سراج احمد کے اکھڑ مزاج سے کبھی کبھی پریشان ہو جاتیں کہ سراج بے حد ضدی تھا۔ یہ ضد اور اکھڑ پن اُس میں اسے لیے بھی تھا کہ اُسے بے تحاشا چاہا گیا تھا۔ پہلی اولاد جو تھا۔ سردار پور کا پہلا وارث شاید اس کا اُسے بھی احساس تھا۔

فرسٹ ایئر میں فیل ہونے کے بعد اس نے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہی وہ دن تھے جب ظل ہما کی گود میں وہاں احمد ہوکا ہوا تھا۔ وہاں صرف تین روز کا تھا جب چوہدری احمد سردار پر دل کا پہلا دورہ پڑا۔ ظل ہما کانپ کر رہ گئی تھیں۔

”خدا میا میرے بیٹے پر باپ کا سایہ رکھنا“۔ مگر ایسا نہ ہوا تھا۔ دعاؤں کا وقت گزر چکا تھا۔ چوہدری احمد سردار نے باپیل ہی میں ویل کو بلوا کر وصیت کے کاغذات تیار کروائے تھے۔ اپنی زندگی ہی میں زمینوں کی تقسیم کی تھی اور اپنی آدھی جائداد وارث ظل ہما کی کوکھ سے جنم لینے والے گیارہ روز کے وہاں احمد کو بنایا تھا۔ اور باقی آدھی جائداد کرم بی بی سے جنم لینے والے چاروں بیٹوں میں تقسیم کی تھی۔ تفرقہ کا پہلا بیج انہوں نے بویا تھا۔ مگر ظل ہما نے اپنی حکمت عملی سے پھوٹ نہ پڑنے دی تھی بلکہ نہایت خاموشی سے انہوں نے وہاں احمد کی زمینوں کا مختار نامہ اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ جس میں شرط یہ بھی کہ جب تک وہاں احمد بچیں برس کا نہیں ہوگا تب تک زمینوں کے انتظامی امور کی نگرانی ظل ہما ہی کی اُن کے بعد چوہدری سراج احمد کو یہ اختیار حاصل ہوگا۔

چوہدری احمد سردار کی وفات کے تیسرے ہی دن ایک سادہ سی تقریب میں سراج احمد کی دستار بندی کی گئی اور اُسے باپ کی پگ پہنا کر سردار پور کا چوہدری بنادیا گیا۔ ظل ہما بھی کبھی سوچیں۔ قدرت جو کرتی ہے بہتر ہی کرتی ہے ہم قدرت کے چھپے ہوئے رازوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ شاید کا تب تقدیر نے میری تقدیر کے صفحے پر ہی رقم کیا تھا کہ میری گود بھرے اور سرے چادر اتر جائے۔ قدرت نے یہ رقم کیا کہ مجھے جوانی میں بیوہ ہونے سے بچالیا۔

والہی رب بہت بڑا ہے۔ وہ بہت عظیم ہے۔ اپنے بندوں سے وہ حقیقتاً ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ نماز کے بعد اُن کے سجدے اتنے طویل ہو جاتے کہ پیروں گزر جاتے۔ اور جب وہ سر اٹھاتیں تو جاء نماز اُن کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہوتی۔

وہ دن بھی اُن کی یادوں میں زندہ تھا جب انہوں نے سراج احمد کے سر پر سہرا سجا لیا تھا اور خرا کو بیہ کر لائی تھیں۔ حرا خالہا اُن کی پسند تھی۔ جسے سراج احمد نے اپنی پسند بھی بنالیا تھا۔ باقی بیٹوں نے بھی ظل ہما کی پسند سے اتفاق کیا تھا۔ جبکہ وہاں احمد کو تعلیم کے سلسلے میں ہمیشہ انہوں نے خود سے دور رکھا تھا۔ وہ اُس وقت سے ڈرتی تھیں کہ کہیں اُن چاروں پر وہ وہاں کو ترجیح نہ دے بیٹھیں۔ اور احتساب کا خوف اُن کی رگوں میں خون جمند کر دیتا تھا۔ اسی لیے وہاں بورڈنگ اور ہاسٹل میں رہا تھا۔ چھٹیوں میں حویلی آتا تھا اور جب وہ کھینٹوں کی سیر کر کے لوٹتا تو ماں سے ضرور پوچھتا۔

”نام! آخر لوگ ہماری زمینوں پر کام کیوں کرتے ہیں۔ زمینیں ہماری ہیں ہم خود کام کیوں نہیں کرتے؟“

”یہ برسوں سے کام کر رہے ہیں بیٹا۔ اگر ہم نے خود کام کرنا شروع کر دیا تو پھر یہ کہاں جائیں گے؟“

اور بہت بچپن ہی سے ماں کی یہ بات وہاں احمد کے ذہن و دل میں گھر کر گئی تھی کہ اگر وہ خود زمینوں

پر کام کرنے لگے تو پھر مزارعوں کا کیا ہوگا؟ گریجویشن کے بعد وہ اپنے بڑے ماموں کی خواہش پر ”ملک ہاؤس“ ہی میں رہنے لگا تھا۔ ورنہ تو وہ گزشتہ چار سال سے لاہور میں تھا مگر ہاسٹل میں رہتا تھا۔ کمال الدین ملک کے بیٹے شادی کے بعد علیحدہ ہو گئے تھے اسی لیے انہوں نے بھانجے کو گھر میں رکھ لیا تھا۔ اور بیہوش غاشی جیسی معصوم مگر شک کی ماری لڑکی بھی تھی۔ جو بہت جلد وہاں احمد کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ اُسے دیکھ کر وہاں احمد کا برسوں سے سنبھالا ہوا دل ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔

مگر جذبے کی شکست پر بھی وہ خوش تھا۔ جو اب غاشیہ نے بھی تو اُسے ویسے ہی جذبوں سے نوازا تھا۔ جیسے جذبوں کو وہ اُس پر بچھا د کرتا۔ نظروں اور لفظوں کے ذریعے۔

یہ درست تھا کہ غاشیہ نے کبھی اُس کی طرح منہ پھاڑ کر اظہار نہیں کیا تھا مگر غاشیہ کی آنکھوں سے چھلکتے جذبوں سے اُس نے ضروری پی تھی۔ زندگی میں کتنا سکھ ہی تھا۔ وہ مطمئن تھا اور اُس نے سوچا ہوا تھا۔ ایم۔ اے کرتے ہی وہ ماں کو غاشیہ کے بارے میں بتا دے گا گھر ہی کی تو بات تھی۔ اور اب ایک دم ہی چوہدری سراج احمد نے اُسے سردار پور بلوا بھیجا تھا یہاں پر جو اُسے کہا گیا تھا اُس کا بھیجا ہی الٹ کر رہ گیا تھا۔ چوہدری سراج احمد زمینوں کو مستاجر (ٹھیکہ) پر دینا چاہتے تھے اور یہ بات انہوں نے اُس سے ڈیرے پر کی تھی۔ مگر سراج احمد کی بات وہ کسی صورت بھی نہیں مان سکتا تھا وہ اپنے مزارعوں سے نوالہ چھین کر فرعون نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

”مام! بے شک آپ بھائی جان کی بات مان لیں مگر میں کسی صورت نہیں مان سکتا۔ آپ مختار ہیں کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ مجھے اس تکلیف دہ منصوبے میں شامل کیوں کیا ہے؟“ وہاں کی آواز میں سرد مہری تھی۔ ظل ہما نے اپنی بے تحاشا اداس نظروں سے اُسے دیکھا اور بولیں۔

”تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ ان زمینوں کے اصل مالک تم ہو۔“

”میں ہوں نا پھر میں نے فیصلہ نہادیا ہے۔ میں کسی صورت بھائی جان کی بات نہیں مان سکتا۔“

”تمہیں بتا ہے کہ تمہارا یہ سخت لہجہ اور یہ انداز کتنے مسائل کو جنم دے گا۔“ وہ بولیں۔

”تو اُن مسائل سے بچنے کے لیے میں ایک غلط بات پر منظوری کی مہر لگا دوں۔ آپ یہی چاہتی ہیں۔ ہمارا کسان جو برسوں سے زمینداروں کے فیصلے کی وجہ سے پس رہا ہے مزید پسے لگے۔ وہاں کی آواز دھیمی تو تھی مگر لفظ بہت سخت تھے۔ ظل ہما مسکرا دیں اور بولیں۔

”مجھے فخر ہے کہ میرا بیٹا اتنی سمجھ رکھنے لگا ہے۔“

”مام یہ انصاف کا تقاضا ہے۔“

”مگر انصاف اور طرح بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ رسائی سے بولیں۔

”کیسے؟“ وہاں احمد نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

”وہ اس طرح کہ تم سراج کی بات مان لو۔“

”مگر کیوں مام میں مان لوں۔؟“ وہاں کی آواز تیزی ہوئی تھی۔

”اپنی شرط رکھو اور وہ شرط یہ ہے کہ بے شک وہ زمین مستاجر (ٹھیکہ) پر دے دے مگر کسان یہی رہیں گے۔ اُن زمینوں پر ہی کام کریں گے پھر دو سال کی تو بات ہے گزرتے تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔“

”بھائی جان مان جائیں گے؟“ وہاں نے پوچھا۔

”تم بات تو کر کے دیکھو مجھے یقین ہے وہ مان جائے گا۔ اس طرح اس کی بات بھی نہ جائے گی“

اور تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“

”مام! واقعی یہ فیصلہ بہت خوبصورت ہے۔“ وہاج نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ”میری بصیرت اتنی گہرائی میں نہیں دیکھ سکتی۔“ وہاج نے ماں کے گلے میں بازو پرو دیے اور وہ مسکرا دیں۔

اسی طرح اُسی شام کھانے کی میز پر یہ فیصلہ ہو گیا تھا۔ اور سراج احمد نے نہایت خوشی سے نکل ہمارا وہاج کی شرط مان لی تھی۔ ظاہر ہے مستاجری پر زمین لینے والوں کو بھی کیا اعتراض ہوتا تھا۔ مگر ایک دکھ کا کاٹنا وہاج کے دل میں چبھ رہا تھا۔

یعنی اب ہمارے مزارعے ٹھیکیدار کے ملازم ہیں۔ یعنی ہم نے اپنے منافع کی خاطر زندہ لوگوں کا سودا کر لیا ہے۔ آخر ظلم کب تک ہوگا۔ وہ سوچتا رہا اور اُس کے دل کے درد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔



ایک دم ہی حیرتیں اس کی آنکھوں کی مہمان ہو گئی تھیں۔ آپ و آپ ہی بانیک کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ وہ حیران و ششدر رہ گیا تھا۔ اس نے مرر میں دیکھا (کہ پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی اور نہ ہی حوصلہ تھا۔) نہایت غور سے وہ سو فیصد وہی تھی، شک کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

مگر اس کا یہاں کیا کام؟

شاید کسی کام سے آئی ہو، ہے تو سر پھری، جو ذہن میں سما جائے، وہی کرتی ہے، تم کیوں فضول میں سوچتے ہو، اس کے بارے میں آصف کا نجوہ؟ اس کے ذہن نے جھڑکا تو وہ تمللا کر رہ گیا، بالکل اسی طرح جیسے عفریہ امیر اس کی بات سے انحراف کرتی تھی، تو وہ سلگ کر رہ جاتا تھا۔

حالانکہ عفریہ امیر کے تصور ہی سے تو اس کے ذہن کی دنیا آباد تھی۔ اور عفریہ امیر کے تصور ہی سے آصف کا نجوہ کی راتوں کی نیند زخمی ہوتی تھیں۔ وہ اپنے دل کو بہت سمجھا تھا۔

گنتی ہی دلیلیں دیتا۔

مگر یہ چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا، جس میں پوری کائنات آباد تھی، عفریہ امیر سے دست بردار ہونے کا سوچنے پر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا۔ وہ سوچتا۔

جس راہ نہیں جانا اس کے کوس گنتے سے بھلا کیا فائدہ؟

وہ خود سے یہ عہد کرتا کہ وہ کسی نہ کسی طرح خود کو عفریہ امیر کے حصار سے چھڑا لے گا، مگر وہ تو دن بدن دھنستا ہی چلا جا رہا تھا۔

ہمیشہ وہ اس کی سوچوں میں درآتی تھی۔

اس کے خیالوں میں عفریہ امیر کی پرچھائیاں لرزتی تھیں۔ اور عفریہ امیر کا نام ہی آصف کا نجوہ کی دھڑکنوں کو اٹھل پھل کر کے رکھ دیتا۔

وہ اپنے دل و ذہن کو سمجھتا تھا۔

کیوں سوچتے ہو اس کے بارے میں جس سے ناتا جوڑنا ہی نہیں؟

ایسی منہ پھٹ لڑکی کا تہارے خاندان کے ساتھ کب گزر ہو سکتا ہے؟
وہ جو چار بندوں کے سامنے تمہاری ایسی بے عزتی کرتی ہے کہ تمہیں منہ چھپانے کے لیے جگہ ہی نہیں ملتی۔ اور تب تم چاہتے ہو، اس کی گردن مروڑ دو۔
پھر بھی؟

اب جبکہ وہ یہاں کھڑی ہے تو تم کیوں پریشان ہو، لڑا پنا راستہ، کھڑی رہے وہیں۔ لور لور پھرتی ہے پورے شہر میں۔

وہ خود کو دلیلوں سے سمجھا رہا تھا، مگر اس کا دل اسے پیچھے ہی دھکیل رہا تھا۔

جاؤ پوچھو اس سے کہ وہ کورٹ کیوں آئی تھی؟
شاید کوئی پریشانی ہو۔ کچھ نہ سمجھتے تھیں، مگر ایک اچھا دوست وہ ضرور سمجھتی ہے، ایک دوست کے ناتے اس کی پریشانی شیر کر لو آصف۔

آصف کا نرم دل موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھلنے لگا تھا۔ تبھی تو وہ کورٹ روڈ کا پورا پھر لگا کر پھر اسی روڈ پر آ گیا۔ وہ اب بھی وہیں کھڑی تھی آف وائٹ کھدا کا سوٹ پہنے گلے میں سیاہ دوپٹہ بے پروا انداز میں پڑا تھا اور بڑا سا بیگ کندھے پر لٹک رہا تھا، جس میں بے شمار کاغذ ٹھسے ہوئے تھے وہ بھٹنے ہوئے پنے کھا رہی تھی۔ آصف نے اُس کے قریب ہی بائیک روک دی اور آنکھوں پر سے عینک اتارتے ہوئے بولا۔

”ارے تم یہاں؟“ آصف کے لہجے میں حیرتیں تھیں جیسے اچانک عفریہ کو دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو۔؟“ اُس نے اُلٹا سوال کیا۔

”میں تو یہاں سے گزر رہا تھا کہ تم پر نظر پڑی“
”اچھا!“ وہ استہزائیہ انداز میں کہی تو آصف کا نگو لگا جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو تبھی تو وہ بات بناتے ہوئے بولا۔

”پہلے بھی میں یہاں سے گزرا تھا تو تمہارا ہلکیکھا ہوا اس لیے پلٹ کر آیا ہوں۔“
”سچے لوگ اچھے ہوتے ہیں آصف کا نگو۔“ عفریہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اب کہاں جاؤ گے؟

”تم نے جانا ہے؟“

”ہاں یار۔ کتنی دیر ہو گئی ہے رکشہ ہی نہیں مل رہا۔“ وہ محسوسیت سے بولی۔

”کہاں جاؤ گی؟“

”اپنے جو بارے یعنی ہاسٹل۔“ عفریہ مسکرائی۔

”آؤ چھوڑ دوں گا۔“

”شاید تم بھی شادمان جا رہے ہو۔“ عفریہ کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی

”ہاں۔ ہاں۔“ آصف نے بنا سوچے سمجھے سر ہلا دیا، مگر جب عفریہ کے چہرے پر نظر پڑی، جہاں ”بوتی“ مسکراہٹ یہ بتا رہی تھی کہ تیرنشانے پر لگا ہے اور وہ عفریہ کے قرب کے خیال سے شادمان جانے کا کہہ رہا ہے، جبکہ حقیقت تو یہ تھی وہ ایبٹ روڈ جا رہا تھا۔
”چلو مجھے بھی چھوڑ دینا۔“ عفریہ اپنے دوپٹے کو گردن کے گرد لپیٹ کر گرہ لگاتے ہوئے بولی۔

”بٹھو۔“ آصف بائیک اشارت کرتے ہوئے بولا۔ تو وہ اچک کر بیٹھ گئی۔

”تم نے مجھے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا تو روکا کیوں نہیں؟“ آصف نے پوچھا۔

”مجھے پتا تھا تم خود ہی آؤ گے۔“ وہ لہک کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ آصف نے گردن موڑ کر اُس کی طرف دیکھنا چاہا تو بائیک لہرا گیا۔

”سامنے نظر رکھو میں ابھی مرنا نہیں چاہتی وہ بھی تمہارے ساتھ۔“ عفریہ نے مشورہ دیا۔

”عفریہ! میر۔“ میں اتنا بڑا بھی نہیں کہ تم میرے ساتھ مرنا بھی قبول نہ کرو۔“ آصف کے لہجے میں

یاسیت بھری ہوئی تھی۔

”بات اتنی بے بسی کی نہیں ہے، بس مجھے خبروں میں آنا پسند نہیں اب یہی دیکھو اگر ایکسڈنٹ ہو

جائے تو پتا ہے کیا رپورٹ ہوگی ایک لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ جا رہی تھی کہ حادثہ کا شکار ہو گئی اور۔“

”بکواس بند کرو۔“ آصف نے بائیک کی سپیڈ بڑھادی اُس کی باتوں پر وہ ہمیشہ کی طرح کھول کر

رہ گیا تھا۔

”سبھی جو یہ لڑکی ڈھنگ کی بات کرے ہمیشہ فضول باتیں سوچتی ہے۔“

”جیسے تم سوچتے ہو؟“

اُس کے اندر ہی کوئی ہنسا۔

عفریہ لنگھتی رہی تھی آصف نے غور سے سنا۔

جرم کی طرح محبت کو چھپا رکھا ہے!

ہم گنہگار نہیں یہ بتائیں کس کو!

خاصی اونچی تھی اُس کی لنگنہاٹ۔

آصف کا دل پیکر میں زور زور سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

کیا یہ سب کچھ جانتی ہے؟

میرے جذبول کو جھتی ہے؟

میری خواہشوں کی خیر اسے کیسے ہوگی؟

میرے رتنگول کی اطلاع کس نے کی اسے؟

کون ہے وہ مخبر؟ کس سے یہ نادانی ہوئی ہے؟

میں تو اپنے جذبول کو دل کی تہوں میں سینت سینت کر رکھے ہوئے ہوں میری خواہشوں کے پر تو

خیالوں کے طور ہی جلادیتے ہیں۔

اور میری راتوں کی نیندیں تو اس کے تصور ہی میں رنجی ہوتی ہیں اور وہی زخم سرخ ڈوروں کی

صورت آنکھوں میں لہراتے ہیں۔

کاش عفریہ امیر تم مجھے نہ ملی ہوتیں۔ اگر ملی تھیں تو میرا دل تمہاری تمنا نہ کرتا کہ تمہارے پاس

میرے کا سہل دل میں ڈالنے کو کچھ بھی تو نہیں ہے، تم تو جذبول کو بھی شاید کھیل بھتی ہو ان کی سچائی سے

واقف نہیں ہو شاید جو میں چاہتا ہوں تم وہ دے نہیں سکتیں۔

اور شاید جو تمہاری ڈیمانڈ ہو وہ میں بھی نہ دے سکوں کہ جس قدر آزاد تم رہتی ہو میرے خاندان کی

لڑکی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی، تم تو ایسا آزاد پتھی ہو جس کے لیے آسمانوں کی نہکی ہے اور نہ ہی یہ

رکاوٹ کہ تم نہیں نہ جاسکو جبکہ مجھ میں یہ حوصلہ کب ہے؟

نہی یہ ظرف۔ کہ مرد کا ظرف تو بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔

جسے پایا ہی نہیں اُسے کھونے کا تصور بھی دل کو ایسے چیرتا ہے جیسے آ رہے سے کسی شجر کو چیرا جائے۔
”اے سنو زار روک۔“ عفریہ نے آصف کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ تو آصف کے خیالوں کی ڈروٹ لگی ایک دم ہی اُس نے بریک لگا لیے عفریہ ہائیک سے اُتری۔
”میں ذرا خط پوسٹ کر لوں۔“

آصف کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پوسٹ بکس کی طرف گئی تھی، کئی لوگ نہایت حیرت سے اُسے دیکھنے لگے تھے اور آصف خواخوہ کلائی چل کر رہا تھا۔
وہ لفافہ سپرد ڈاک کر کے اُسی طرح واپس آگئی تو سانس پھولا ہوا تھا اور اُس کی چھوٹی سی ناک پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔
”آہستہ نہیں جاسکتی تھیں؟“ آصف غرابا۔

”سنو مجھ پر زیادہ زعب نہ ڈالا کرو، میں تمہیں کچھ بھی نہیں سمجھتی۔“ بغیر کسی لحاظ کے عفریہ نے اُس سے زیادہ غراہٹ سے کہا۔

”بیٹھو۔“ آصف تماشا بنانا چاہتا تھا۔
”میں رکشہ سے چلی جاؤ گی۔“ وہ خنمی پچیوں کی طرح روٹھ گئی تھی۔

”کیوں؟“ آصف نے تار ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔
”بس تم جاؤ۔“ وہ دھڑکی ہوئی کھڑی تھی اور اُس سے بھی وہ آصف کا بنجو بہت اچھی لگی غصے کے باوجود وہ ہنس دیا۔ اور بولا۔

”چلو دوستی کر لیتے ہیں۔“
”تم نے مجھے ڈانٹا کیوں؟“ وہ اب بھی ماننے کو تیار نہ تھی۔

”اپنا سمجھ کر ڈانٹا ہے۔“ آصف ملائمت سے بولا۔
”مگر میں تمہیں اپنا نہیں سمجھتی۔“ اُس کی آواز ترخھی ہوئی تھی۔

تر-تر-تر۔

آصف کا بنجو لگا جیسے ڈھیر ساری گولیاں تر تراتی ہوئی اُس کے سینے سے پار ہو گئی ہوں۔

”تم نہ سمجھو میں تو سمجھتا ہوں۔“ وہ خود کو سنبھال کر بولا۔
”تمالی تو دونوں ہاتھوں سے جتنی ہے سسر۔“ عفریہ نے آنکھیں نہچائیں۔

اب اُس کی آنکھوں میں غصے کی جگہ شرارت کی چمک تھی۔
کیا ہے یہ لڑکی پل میں تولہ پل میں ماش۔

”اچھا ابھی تم میری کچھ نہیں بس۔“ اب بیٹھو بھی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح ہار گیا۔ کبھی وہ اُس سے اپنے جذباتوں کی شوریدہ سرسری۔۔۔ کی وجہ سے ہارتا تھا اور کبھی اُس کی جرب زبانی سے۔

”تو جاؤ۔“ ایک غیر لڑکی کو کیوں آفر کر رہے ہو۔“ عفریہ راہ دینے والوں میں سے نہ تھی
آصف کا پیچھا اپنے بال نوچ لے آیا اُسے کچا چبا جائے۔

”تم بہت تنگ کرنی ہو عفریہ۔“

”مت ہونگ۔“ وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

”ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے۔“ آصف نے آخر ہار مان لی اور ہائیک کو کنگ لگائی۔

”پارٹنر ذرا سی بات پر خفا ہو گئے بس اتنا ہی حوصلہ ہے۔“ اُس نے آصف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہایت لگاؤ سے کہا۔ آصف کو لگا جیسے اس کا دل بند ہو جائے گا رگوں میں خون چمکنے لگا تھا۔ اور وہ بنا کسی ہٹ کے پھر ہائیک پر بیٹھ گئی تھی اور اچھی طرح نیچے سے سیٹ کو پکڑ لیا تھا۔

”کچھ کھاؤ گی۔“ لبرنی سے گزرتے ہوئے آصف نے پوچھا۔
”ویسے بھوک تو بہت زور کی لگی ہے۔“ کر دو یہ احسان بھی صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا ایک روپے کے پنے کھائے ہیں لیکن۔“

آصف نے چاٹ کی دکان کے سامنے ہائیک پارک کی پھر وہ دونوں اندر چلے آئے۔ آرڈر دینے کے بعد آصف نے ذہن میں بلبلاتا سوال کر رہی دیا۔
”ہائی کورٹ کس سلسلے میں گئی تھیں؟“

”بہت دیر بعد یہ سوال کیا تم نے۔؟“ وہ میز پر رکھا گلاس گھمانے لگی۔
”بھئی وقت دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔“

”آج پیشی تھی۔“ عفریہ نے طویل سانس لے کر کہا۔
”کس کی۔؟“ سجانے کیوں آصف کا دل دھڑک اٹھا۔

”میرے ماما کی۔؟“

”کس قسم کا مقدمہ ہے؟“

”قتل کا۔“

”قتل۔۔“ آصف نے حیرت سے پوچھا اُسے لگا جیسے عفریہ ہذا ق کر رہی ہے مگر وہ تو سنجیدہ تھی۔
”حیران مت رہو۔ میرے ماما نے اُس فرعون کو قتل کر کے پتا نہیں کتنے لوگوں کی موت کا بدلا لے

لیا ہے۔“ عفریہ جوش سے بولی۔

”مگر کسے قتل کیا۔؟“ آصف پوچھ رہا تھا۔

”گاؤں کے چوہدری کو۔“

”کیوں؟“

”بس۔“ اُس نے سر جھٹکا۔“ فرعون کے لیے قدرت موسیٰ ضرور پیدا کرتی ہے۔ اور میرا ماما بھی چوہدری مراد حسین جیسے فرعون کے لیے موسیٰ ثابت ہوا۔“ عفریہ کا لہجہ اپنے ماما کی جیتوں سے بھرا ہوا تھا۔

اور چاٹ کھانے کے دوران وہ نہایت خاموشی سے چاٹ کھا رہی تھی کوئی بھی بات نہ کی تھی تب آصف نے پوچھا۔

”اب آج کیا ہوا۔؟“

”ہمیشہ کی طرح پیشی تھی۔ گواہ بھگتے گئے ہیں پچھلے تین سال سے یہی ہو رہا ہے ہمارے ہاں عدالتیں انصاف کب کرتی ہیں۔؟ عفریہ کے لہجے میں کاٹ تھی۔

”تمہارے گھر سے اور کوئی نہیں آتا۔“ آصف نے بات پلٹی۔

”نہیں۔ سب نے ماما کا ساتھ چھوڑ دیا ہے کہ وہ چوہدری سے خوفزدہ ہیں۔“

”تم نے نہیں چھوڑا۔“

”میں حق کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی پھر ماما شری محمد کب انکاری ہے اپنے جرم سے وہ تو کہتا ہے سولی پر جڑھا دیا جائے اُسے مگر اُس سے پہلے گاؤں بھمیر کے چوہدریوں سے بھی حساب لیا جائے جو جرم انہوں

نے کیے ہیں اور پانی کی طرح پیہر بہا کر فائلیں بند کروادی ہیں دوبارہ سے تفتیش کرائی جائے گاؤں کے چوہدریوں کے جرائم کی تو پوری ایک طویل فہرست ہے جبکہ میرے ماما کی زندگی کی کتاب صرف یہی ایک جرم ہے مگر یہ بھی جرم نہیں ہے۔ وہ خاموش ہوئی۔

”یہ تو تم کہتی ہونا؟“ آصف نے کہا۔

”تمہیں پتا ہے آصف کا بخوبیوں کو مجرم کون بناتا ہے؟ یہ سرمایہ دار یہ وڈیرے لیرے غم لوگوں کو مجرم پر کساتے ہیں ایک بار ہاتھ اور دل اٹھل جائے تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں رہتی مجرموں کی پناہی یہی زمیندار تو کرتے ہیں جہاں وہ اُن کا ساتھ چھوڑنے کا سوچتے ہیں فوراً وہ پکڑوا دینے کی دے دیتے ہیں اور مجرم مزید جرائم کی دلدل میں دھستا چلا جاتا ہے صرف قانون کی زد سے بچنے کے تم کیا جانو آصف کا بخوبی میرے شیر جیسے ماما نے صرف چوہدری مراد حسین کا خون نہیں کیا بلکہ جرائم کی فیک کو تباہ کیا ہے۔ مگر قانون کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ خیر یہ تو وقت بتائے گا کہ کون سچائی پر ہے پور ایک عدالت اور پر بھی تو ہے جو حق اور حقیقی فیصلہ کرتی ہے جہاں کوئی سفارش نہیں چلتی عفریہ ہولے ہو کہہ رہی تھی اور اس کا ہر جملہ آصف کا نجو کے اندر اتر رہا تھا بالکل عفریہ کی شخصیت کی طرح۔

”سنو! یہ ویاہ کب تک آئے گا؟“ وہ بات بدلتے ہوئے بولی۔

”پتا نہیں ابھی چار روز تو ہوئے ہیں اُس نوگاؤں گئے تمہیں کوئی کام تھا کیا؟“

”یونہی۔ تجھے بھلا کیا کام۔ ویسے بھی میں اپنے کام خود کرنے کی عادی ہوں اپنے مسائل کرنے کی پرانی عادت ہے مجھے۔“ وہ ہنسی۔

واپس بر آصف نے اُسے ہاسٹل کے گیت پر اتارا تو وہ بولی۔

”بہت شکریہ آصف کا نجو۔ کاش میں تمہاری محبتوں کا جواب محبتوں سے دینے پر خود کو مجبور نہ کرتی۔“

پھر اُس کا جواب سُنے بغیر وہ تیزی سے ہلٹی تھی اور ہاسٹل کے کھلے گیٹ میں داخل ہو گئی آصف ہی دیر تک سوچوں میں گم کھڑا رہا۔

☆☆☆

بالوں میں رولر لگاتے ہوئے گل فشاں جمال نے شوہر کی طرف دیکھا جو سرگاہ کے کش لے ہوئے ٹی۔ دی دیکھنے میں مصروف تھے۔

”جمال۔“ گل فشاں نے دھیرے سے پکارا۔

”ہوں۔“ انہوں نے دیکھے بغیر ہنکارا بھرا۔

”منعم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”خیال پوچھنے کی وجہ؟“ بدستوران کی نظریں اسکرین پر تھیں۔

”وہ زری نے ذکر کیا تھا خندی کو وہ بیٹا بنا چاہتی ہے اور۔“

”ابھی خندی بہت چھوٹی ہے۔“ جمال الدین ملک تڑخ کر بولے۔

”اتنی جلدی تو نہیں ہے ہم دو چار سال بعد شادی کریں گے۔“ گل فشاں بولیں۔

”مگر تجھے پسند نہیں کہ میں خندی کو زنجیروں میں جکڑ دوں۔“

”یوں کہیں آپ کو منعم۔۔۔ ہی پسند نہیں ہے۔“

”مجھ جکی ہو تو درست ہے۔“

”کیا برائی ہے اُس میں؟ ایم بی اے کر کے اُس نے عبداللہ بھائی کا سارا برنس سنبھالا ہوا ہے پتا ہے آپ مجھ سے کتنے سال بڑے ہیں۔“ گل فشاں نے تاک کر نشا نہ پھینکا تھا جسے انہوں نے ہمیشہ کی رنجش سے یادداشت کیا۔ گل فشاں کے ساتھ رہ کر وہ برداشت کرنا سیکھ چکے تھے۔

”مجھے یہ بھی پتا ہے کہ میں تمہاری پسند تھا ہم دونوں کے بندھن میں بزرگوں کی خواہشات کی گرہ بن گئی ہوئی خنداں کا معاملہ بالکل جدا حیثیت کا حامل ہے اور پھر میری خواہش ہے کہ خندی مزید تعلیم اہل کر لے اُسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار ہو ہم اُس کے راستے کی دیوار نہیں بنیں گے۔ نہایت تمہارا ہوا لہجہ تھا اُن کا۔

”یہ تو کوئی بات نہیں۔ ہماری اولاد ہے اور ہمیں یہ حق ہی حاصل نہ ہو۔“ گل فشاں نے دہکتے ہوئے کہا۔

”کچھ بھی ہو تم زرفشاں سے کہو وہ کوئی اور دھکے کھائیں۔ عبداللہ بھائی کے خاندان میں بہت زکایاں ہیں۔ وہاں بات کریں میری بیٹی کو اس نظر سے دیکھنے کی اجازت نہیں۔“ ان کا لہجہ پھر پھیلا تھا۔

”آپ چاہتے ہی نہیں میرے خاندان میں خندی بیانی جائے۔“

”بہت سمجھ دار ہو۔“ وہ مسکرائے۔

”اور یہ شہ آپ کو اماں نے دی ہوگی۔“ گل فشاں نے ساس کے بارے میں یہ جملہ کہا تھا اور جمال الدین ملک کا تو داغ غی الٹ گیا تھا، مگر وہ ضبط کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتے ہوئے بولے تھے۔

”میرے معاملات میں بولنے کا حق میری ماں کو بھی نہیں ہے۔ میں کل مختار ہوں اپنی اولاد کا آئندہ کسی معاملے میں بھی میری ماں کا نام لینے کی کوشش نہ کرنا، گل فشاں ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی میں اپنی ماں کے خلاف ایک جملہ نہیں سن سکتا۔“

”جمال۔۔۔ ہماری شادی کو اٹھائیس برس گزر چکے ہیں مگر آپ میری سمجھ میں نہیں آئے آخر کیا ہیں آپ۔؟“

”تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ وہ دکھ سے مسکرائے۔

”میں نے تو بہت چاہا مگر آپ ہی کو پردوں میں چھپے رہنے کا شوق ہے۔“ گل فشاں کو نجانے آج کیوں شہر ہو کر جانے کی پڑی تھی۔

”چلو جہاں اتنے عرصہ تک پردے نہیں اٹھے اب بھی نہ سہی۔ ہو سکے تو میرا ایک تیار کر دو گل میں ننگا پورا جا رہا ہوں۔“

میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

”ضروری ہے جانا۔! جمال الدین نے بیوی کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھا۔

”حرج ہی کیا ہے؟“

”بچے آئے ہوئے ہیں تم ان کے ساتھ ہو۔“ جمال الدین نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ تو گل فشاں بس نہیں دیکھ کر رہ گئیں کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہ رہا۔

☆☆☆

عاشیہ نے نہایت غصہ سے اخبار پڑھا۔

”امپوٹیل۔“

”یہ۔۔۔ یہ میرا زلٹ نہیں ہو سکتا۔“

”میرے پیچڑا تے خراب تو نہیں ہوئے تھے کہ سیکنڈ ڈویشن آتی۔“
مارے دکھ کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے بالکل اسی طرح جیسے پہلی بار مجبوتوں کے خواہوں میں اترے تھے۔
خواہوں اور آنسوؤں کا کوئی بھی وقت مقرر نہیں ہوتا، بے وقت ہی آنکھوں میں سیرا کر بغیر اجازت ہی کے۔
”نیکیم صاحبہ بٹا رہی ہیں جی۔“ اکرم نے اُسے اطلاع دی تھی۔
”آئی ہوں۔“ عاشیہ نے مٹھیاں بھیج کر آنکھیں رگڑیں، مگر آنسو تھے کہ اُنڈتے ہی چلے گئے، مگر پھر بھی اُس نے ضبط کر لیا۔
دہان ہوتا تو کم از کم اس تکلیف دہ فضا سے تو مجھے نکالتا۔ اُس نے سوچا اور زہرہ جیوں کے میں چلی آئی۔

”سننا ہے تمہارا رزلٹ آیا ہے۔“ زہرہ جیوں نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

”آپ کو کس نے بتایا۔؟“

”ابھی آمنہ کا فون آیا ہے اُس کی نند نے بھی تو تمہارے ساتھ ہی امتحان دیا تھا۔“

”نشو کی کیا ڈویشن آئی ہے؟“ عاشیہ نے پوچھا۔

”آمنہ بتا رہی تھی سیکنڈ ڈویشن آئی ہے اور وہ تو خوب رورہی ہے۔ بھی جتنی محنت کی جاتی ہے شرماتا ہے، رونے کا فائدہ۔“ زہرہ جیوں نے کہا۔

”تمہاری کون سی ڈویشن ہے؟“

”وہ ہی سیکنڈ۔“ عاشیہ کی آواز بھرا گئی۔

”چلو کوئی بات نہیں دل مندا مت کرتا۔“ زہرہ جیوں نے اُسے گلے لگا لیا۔

”گھر کی ذمہ داری بھی تو تم پر ہے۔“

”مگر امی! میرے پیچڑ بہت اچھے ہوئے تھے۔“ عاشیہ منمنائی۔

”ہر طالب علم یہی کہتا ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

”آج شام کو آمنہ اور آصف آئیں گی خانساں سے اپنی نگرانی میں کھانا تیار کروانا۔“

”بہتر۔“ عاشیہ نے سر ہلایا۔

”اور ہاں یہ دہان کا کوئی فون تو نہیں آیا؟“ وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولیں۔

”سر دار پور میں یہ سہولت کب ہے؟“ عاشیہ کا منہ بن گیا۔

”پتا نہیں سراج نے اُسے کیوں بلوایا تھا۔ میرا تو کئی روز سے دل ہول رہا ہے تقریباً پانچ رات گئے ہیں تا اُسے گئے۔“

”جی۔“ عاشیہ نے سر جھکا لیا۔

”آج کل تو سگوں کے خون سفید ہو گئے ہیں پھر سراج تو سوتلا ہے، انتہائی اکھڑ مزاج کا شخص دہان کی عادت ہے خدا کرے کہ نہیں اُس کے منہ نہ لگا ہو۔ ہمارے کچھ نہیں کرے پائے گی۔“ زہرہ جیوں نے رعبیں اور عاشیہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ رورہ کر زہرہ جیوں کا جملہ اُس کے کانوں میں گونجتا رہا۔

آج کل تو سگوں کے خون سفید ہو گئے ہیں پھر سراج تو سوتلا ہے۔

سراج تو سوتلا ہے۔

سوتلا ہے۔

یہ لفظ ”سوتلا“ اُس کے ذہن پر ہتھوڑے کی مانند برس رہا تھا اور رگوں میں دوڑتا خون بار بار منجمد جاتا۔ دہان کی محبت تو جیسے اُس کی رگوں میں خون بن کر گھل گئی تھی۔

خدا کرے وہ بھی تم جہاں نہیں بھی ہو خیریت سے ہو۔

تمہارے دامن میں خوشبو بھری رہے۔

موسموں کے فرشتے تمہاری نگہبانی کریں میری روح۔

میرے حصے کی ساری خوشیاں تمہارے نام۔

میری زندگی کے سارے سنگھ تمہارے نام۔

جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔

وہ بار بار صدق دل سے دعا کرتی۔

خدا خواستہ امی جی کا خدشہ درست تو نہیں، یہ سوچ اُس کی روح کو کپکپا کر رکھ دیتی مگر وہ خود کو تسلی دیتی۔

اگر ایسی بات ہوتی تو پورے خاندان میں یہ بات پھیل جاتی۔ یہ دلا سا بھی دل کو اعتدال پر نہ لاتا۔ لڑل بھلاک جھوٹی دلیلوں سے قابو آتا ہے۔

جھوٹے دلا سوں کو نہیں مانتا۔ یہ تو محبوب کو سانپنے پا کر ہی مطمئن ہوتا ہے۔ ورنہ تو خود بھی مضطرب ہوتا ہے اور بندے کو بھی بے قرار رکھتا ہے۔

شام کو آصفہ اور آمنہ میرے اپنے بچوں کے ”ملک ہاؤس“ کو رونق بخشنے آ گئیں، وہ عاشیہ کے پاس لانے کی خوشی میں تحائف لائی تھیں، آمنہ نے تو گلاب کے پھولوں کے دھتے ہوئے گجرے اُس کی کلائی سے باندھے تھے، اور اُسے لپٹا کر خوب پیار کیا تھا، تب اتنی محبت پر ایک ڈھک کا احساس عاشیہ کے دل کی پیادوں سے سانپ کی مانند لپٹ گیا۔

کاش اس دم احد بھائی اور ساجد بھائی بھی ہوتے تو شاید خوشیاں دو بالا ہو جاتیں۔

وہ جو سب سے چھوٹی تھی اور گھر بھر کی لاڈلی بھائی، بہنوں کی شادی کے بعد اتنے بڑے ”ملک ہاؤس“ میں تنہا رہ گئی تھی، ابھی تو تنہائی کا احساس کم کرنے کے لیے وہ زیادہ تر گھر کے کاموں میں مصروف تھی، لان میں پھولوں، پودوں کو پانی دیتی، کچن میں خانساں کے ”سر“ پر سوار رہتی، مگر وقت تھا کہ پھر بھی گزرتا تھا۔ زہرہ جیوں نے اُسے تنہائیوں سے لڑتے دیکھ کر گواہ کر تیں کہ وہ تو بے چین روح کی طرح ”ملک ہاؤس“ میں چکراتی پھرتی تھی۔ البتہ جب بہنیں آ جاتیں یا مظفر پور سے کوئی مہمان آ جاتا تو اُس کی خوشی اس کے لیے چمک سے ہی محسوس کی جاسکتی تھی۔

پچھلے سال جب دہان مستقل ”ملک ہاؤس“ آیا تو عاشیہ کے گھر کے ساتھ ساتھ آگن دل میں بھی شیشوں اور روشنیوں کے قافلے اتر آئے کہ محبت بھی تو روشنی ہے اور دہان کی محبت بھی کسی دہی کی طرح شیشے کے دل میں اترتی تھی۔

کبھی کبھی وہ حیران ہو کر سوچتی۔

کیا محبت سے بڑھ کر کوئی حسین شے کوئی خوبصورت احساس اس دنیا میں ہے؟ وہ دیوانوں کی مانند شیشے کی طرف دیکھتا تو عاشیہ کے دل کے دیوانوں میں خوشبوئیں پھیل جاتیں۔

اُس کی آنکھوں میں خواہوں نے ڈیرا بجالایا تھا، اور چہرے پر مستقل رنگ لہراتے تھے، اب

تو بھائیوں کی کج ادائی بھی اُسے دیکھی نہ کرتی۔ وہ وقت جو گزرا اُسے نہ گزرتا تھا اب وہاں کے تو پرندے کے پیروں پر ہوا کی مانند اڑ جاتا۔

وہاں کی طرف سے ذرا سا بھی دل میں بال آتا تو پریشان ہو ہو کر وہ جھل جھل نہ رہا تھا۔ اور پھر جب وہ اپنے لہجے میں دنیا جہان کی بجاہت بھر کر معافی مانگتا، اُس کی جانب سے کدورتیں پل بھر میں مٹ جاتیں۔

وہ بار بار روٹھتی۔ اور وہاں بار بار مانتا۔
”دیکھ غاشی تو مجھ سے خفا نہ ہوا کر۔“

اُس کا بھی ایک جملہ سننے کی خاطر تو غاشیہ کا دل چاہتا وہ اُس سے روٹھے اور وہ مانتا پھرے کے دل میں خوشیوں کا آجالا نکھیرتا رہے۔
وہاں کے لہجے کا گداز اور آنکھوں کا سوز وہ غاشیہ کی آنکھوں میں انڈیل دیتا تھا اور غاشیہ شرماتی تھی۔

وہ جو اس کی خوشی کا علمبردار تھا۔

جس کے حوالے سے غاشیہ بے تحاشا خواب دیکھے تھے۔
آج وہ بے طرح یاد آ رہا تھا یاد کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔
ادھر۔

اوپر وفا۔

کم از کم اتنا تو احساس کرتا تھا کہ تیری ماموں زاد پر کیا گزر رہی ہوگی، کوئی فون کال کوئی پُرزہ ہی بھیج دیتا تا کہ تیرے دل کو تراری ملتا۔

تو جو میری زندگی کے تپتے صحرا میں ٹھنڈی چھایا بن کر داخل ہوا ہے تجھے بتا ہے اس ٹھنڈی مجھے کس قدر عادت ہو چکی ہے یہ چھایا نہ ہو تو میرا وجود تپنے لگتا ہے۔

مجھے جذبول سے آشنا کرانے والے۔

میرے دل کی ٹیکٹھی میں جذبول کے شعلے دہکانے والے۔ تو کچھ تو میرا خیال کرتا تجھے میں کتنے چھوٹے دل کی ہوں پھر بھی تو نے جا کر خبر نہ بھیجی اپنی۔ میں اپنے ہی جذبول کی آگ قطرہ پھل رہی ہوں۔

مجھے پتا نہ تھا کہ محبت اتنی ظالم چیز ہوتی ہے ورنہ میں اس وادی خار میں کبھی بھی قدم نہ رکھتی۔
اپنے آپ پر پھرے بٹھالیتی۔

پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتی اپنے۔

مگر محبتوں سے بھرے پیالے کو نہ اٹھاتی۔

لیکن محبت کب سوچ کچھ کر کرنے والا جذبہ ہے یہ تو بے اختیار جذبہ ہے جو انسان کو بھی کر لیتا ہے سوچوں کی دلدل میں وہ اُن کی نجائی کہاں کہاں کی سیاست کر رہی تھی کہ زہرہ جیسے نے چونکا دیا۔

”بیٹا! کھانا تو لگو او“۔

”جی اچھا“۔

”امی! آج غاشی کوئی کام نہیں کرے گی ہم کریں گے۔“ آمنہ آ پا کہہ رہی تھیں۔

”جی نہیں آپ مہمان ہیں۔“ وہ ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

آج تو اُس نے کئی کھانے خود بنائے تھے بھلا داد لینے کا اس سے بہتر طریقہ کون سا تھا۔
آمنہ آپ کے شوہر اشفاق احمد کو کھیر بہت پسند تھی اس لیے غاشیہ نے خصوصی طور پر کھیر بنائی تھی۔
”نہیں ابو میں نے یہ آپ کے لیے نہیں بنائی۔“

”بھی یہ غلط بات ہے، میز پر موجود ہر چیز میں نہ کھاؤں۔“ وہ بچوں کی طرح منہ بسود کر بولے۔

”آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہی ہے۔“ زہرہ جہیں نے غاشیہ کی طرف داری کی۔

”اشفاق میاں! اُس چیز کی تمنا کیوں بڑھتی ہے جس سے روکا جائے بندش خواہشوں کو کیوں بھارتی ہے؟“
”آپ کھائے ابو کچھ نہیں ہوتا۔ جو بیماری ہو جائے ختم نہیں ہوتی، شوگر بھی ایسا ہی مرض ہے؟“

اشفاق احمد بولے۔

”لیکن احتیاط سے کم تو ہو سکتی ہے بیماری۔“ غاشیہ نے کہا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ چھوٹے بہنوئی حمید لغاری نے بھی سر کی حمایت کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اُس کیلئے بھر کر کھیر دے بھی دی۔ اور غاشیہ بس دیکھ کر رہ گئی کہ اُسے پتا تھا جب باپ کی طبیعت بگڑتی ہے تو سنبھالنا اسی کو پڑتا ہے مگر بہنوئیوں کے سامنے کچھ بھی نہ کہہ سکی اور سر جھکا کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

بہت بے کل تھا وہ۔ کسی پہلو بھی اُسے قرار نہ آ رہا تھا خصوصاً جب سے صبح وہ کھیتوں سے ہو کر لوٹا تھا حالانکہ وہ تفریح کی غرض سے گیا تھا مگر دل پر منوں بوجھ لے کر آیا تھا۔

گنے کے کھیتوں میں بیلے چڑھے ہوئے تھے اور بڑے بڑے کڑھاؤں میں گڑ بنایا جا رہا تھا۔ دور ہاری زمینوں میں پہل چلا رہے تھے غرض ہر کسان اُس کی زمینوں پر اپنا کام کرنے میں مصروف تھا مگر انہیں یہ پتا نہ تھا کہ صرف کاغذ کے ایک پُرزے پر جسے جدید زبان میں اسٹامپ پیپر کہا جاتا ہے اُن کی زندگی اور محنت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

یعنی وہ اتنے ارزاں ہیں۔

حاکم جب چاہے جس کے ہاتھ چاہے انہیں بیچ ڈالے بغیر اُن کی رائے معلوم کیے؟

بغیر اُن سے پوچھنے فیصلہ کر دیا جائے۔

وہ انسان تھے کوئی بھیڑ بکریاں تو نہیں کہ اُن پر مسلط ان کا زمیندار معقول معاوضے کے عوض ”سودا“ کرے اُن کا۔

آف یہ تو امن۔

یہ چھوٹے بڑے کا فراق۔

یہ تضاد آخر تک؟ وہاں احمد نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے مٹھیاں بچھتے ہوئے یہ سب سوچ ڈالا تھا۔ اُس کا جی چاہا سردار پور سے بہت دور بھاگ جائے۔

اس کی فضاؤں سے اتنی دور چلا جائے کہ چوہدری سراج احمد کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔

مگر یہ سب سوچنے کے باوجود وہ پرکٹے پرندے کی طرح بے بس تھا آج دوپہر کو وکیل آ رہا تھا۔

تمام کاغذات مکمل کر کے اور پھر وہاں احمد کے دستخطوں نے اس دل چیر لینے والے فیصلے پر مہر ثبت تھی۔ حالانکہ یہ معاہدہ صرف دو سال کے لیے تھا، مگر آزادی کی دو صدیاں بھی کم ہوتی ہیں اور سلاسل ہوتا تو گھٹنے کے لیے بھی کسی کو گوارہ نہیں ہوتا۔ مگر چوہدری سراج احمد نے تو مست جری پہ زمین کرایا کر لیا تھا، کتنے ہی غریب مزارعوں کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔
”دبئی۔“ ظل ہما کی آواز پر وہ ٹپکتے ہوئے اک دم ہی ٹھٹک گیا، اور پورنگ نظروں سے با طرف دیکھا۔

”اُس کی آنکھوں میں تیرے ڈورے اُس کے رتجوں کی کہانی سنار ہے تھے۔

میرا بیٹا! اس قدر حساس ہے، ظل ہما نے حیرت سے سوچا۔

انہیں پتا تھا کہ کئی راتوں سے اُن کا بیٹا کیوں نہیں سویا؟

انہیں بیٹے پر ترس آنے لگا۔

”جی مام۔“ انہیں اپنی طرف مسلسل دیکھتا پاکر وہ گڑبڑا گیا تھا۔

”کیوں پریشان ہو جان مام۔“ اُن کے لہجے میں حلاوتیں ہی حلاوتیں تھیں، وہ آگے بڑھ کر

دہانج کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

”بہت مت سوچو، جتنا سوچوں کے پاتال میں اتر دو گے سوائے دیکھ کے کچھ نہ بھی ملے گا۔“

”مام! آگہی اتنا بڑا عذاب کیوں ہے!“ دہانج ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

”آگہی تو روشنی ہے۔“ ظل ہما نے کہا۔

”انسان اس روشنی کے ہونے کے باوجود منزل تک کیوں نہیں پہنچ پاتا؟“ دہانج کے لفظوں

دکھتا۔

”مصلحت کی خاطر ہمیں سیاہی کو گلے لگانا پڑتا ہے جان مام۔“ انہوں نے اُسے سننے سے لگایا

”تمہیں تو میں سمجھا سکتی ہوں، ڈانٹ سکتی ہوں۔ اپنی بات منوانے کا مان ہے، مجھے مگر سراج کو

کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ وہ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھیں۔

”کیوں مام۔؟“

”اس لیے بیٹا کہ آج بھی میں بیل صراط پر چل رہی ہوں، آج بھی تلوار کی تیز دھار پر میرے

پڑ رہے ہیں۔“ وہ جیہی۔ تو ماں کی مجبوریاں نہیں سمجھے گا۔“

”مجھے پتا ہے آپ سراج بھائی کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔“

”شاید یہی بات ہو۔“ انہیں میں اتنا چاہتی ہوں جتنا کسی ماں نے اپنے بیٹے کو نہ چاہا ہوگا،

تمہاری ماں ہونے کے ساتھ ساتھ میں سراج کی بھی ماں ہوں، مگر وہاں جسے زمانہ سویلی ماں کہتا ہے

سے میں کتنی بھی زیادتی کر جاؤں کوئی کچھ نہ کہے گا، مگر سراج کی بھلائی کی خاطر اُس کی کسی بات

انحراف کر دوں تو زمانہ پتھر پھینکنے سے باز نہ آئے گا، مجھے معاف کر دینا مام کی جان کی تمہیں حق پر سمجھتے ہو

بھی میں نے فیصلہ سراج کے حق میں کیا کہ ان حالات میں یہی بہتر تھا، اُسے بھڑکانے والے بہت ہیں

بجھانے والا کوئی نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے تم وہی کرو چاہے تمہارا دل نہ مانے۔ زبان پر مصلحتوں کے قطر

لو۔“

”مام۔ کیا تو ہے وہی۔ جو میرے دل نے نہیں مانا۔“

”مجھے تم پر بہت مان ہے۔“ ظل ہما نے اسے پہنچ لیا۔

”کاش! نہیں کھ کر سکتا۔“ وہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔

”مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”جو سراج بھائی نے چاہا وہی ہو گیا۔“

”خواب کھڑ گئے۔“

کچھ بھی نہ رہا۔ وہ لڑ بھی نہ سکا، مصلحتوں کی بھاری زنجیریں زبان پر ڈال دیں۔

کاش! میں تم لوگوں کو غلامی سے بچا سکتا۔ میرے مظلوم کسانوں۔ پھر سر اٹھا کر ماں کو دیکھتا ہوا

بولا۔

”مام! میں شام کو واپس لاہور چلا جاؤں گا۔“

”کل چلے جانا۔“

”نام پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے آئندہ ماہ امتحان ہیں۔“ وہ ٹھٹک کر بولا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔ ہمیشہ تمہاری دوری کا کرب بہتی رہی ہوں۔“

”مام! بس ایک سال کی تو بات اور ہے پھر میں بھی آپ سے دور نہیں رہوں گا، آپ میرے ساتھ

رہیں گی لاہور میں۔“

”نہیں میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔“

”واہ کیوں۔ نہیں جائیں گی، آپ کو میرے ساتھ رہنا ہوگا۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

”ساری جوانی اس حویلی میں گزاری ہے اب بڑھاپے میں کہاں جاؤں گی؟ پھر تمہارے بابا کی

روح بھی تنہا ہوگی کہ اُن کے بڑے بیٹوں کو اکیلا چھوڑ دیا ہے۔“ وہ بولیں۔

”ایک تو ہمارے معاشرے میں زندہ لوگوں سے زیادہ مردہ لوگوں کی خواہشات کو بہت اہمیت دی

جاتی ہے۔“ وہ منسلک ہی تو گیا تھا۔

”ماں واری تم نہیں سمجھو گے لوگ کہیں گے بڑے سوتیلے بیٹے تھے تو اسی لیے میں چھوڑ کر اپنے بیٹے

کے پاس چلی گئی ہوں۔“

”آپ کو لوگوں کی بہت فکر ہے۔“ دہانج نے ماں کے چہرے کو دیکھا۔

”اس دنیا میں رہ کر لوگوں کی فکر کرنی پڑتی ہے۔“

”ضروری ہے یہ۔“

”یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آنے کی۔ اس لیے کہ تمہاری عمر وہ نہیں جس میں سوچ کا دخل ہوتا

ہے، اچھا چلو تم ناشتا کرو۔“ وہ محبت سے بولیں۔

”مام! آپ میری بات سننا ہی نہیں چاہتیں۔“

”درست سمجھو ہو، کیونکہ تمہاری بات سن لوں گی تو ماننے میں کئی مصلحت کی دیواریں سامنے کھڑی

نظر آئیں گی، مجھے ماننے میں تامل ہوگا اور تمہیں دکھ۔ کچھ بھی ہو، میں تمہیں دکھی نہیں کر سکتی، وہ جیہی۔ یہ یاد

رکھنا۔“ ظل ہما نے پیار سے کہا تو وہ ماں کو دیکھ کر رہ گیا، کتنی عظیم ہے ماں۔ اس کا روال روال پکار رہا تھا۔

☆☆☆

صبح کا ٹیلا اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا جب جمال الدین ملک نماز پڑھنے کے بعد لائ

میں طے آئے۔ کہ سویرے سویرے شبنم سے تر گھاس پر ٹہلنا انہیں پسند تھا، بچپن سے ہی انہیں عادت تھی

رات کو کتنی ہی دیر سے کیوں نہ سوئے صبح موذن کی پہلی ”اللہ اکبر“ کی پُرسوز آواز پر اُن کی آنکھ پٹ سے

کھل جاتی۔ گل فشاں تو سوئی ہوئی تھیں آرام سے دن چڑھے اٹھتی تھیں۔
بھی بھی جمال ملک سوچتے۔

اس عورت کی کمر نہیں دکھتی اتنی دیر سونے سے۔

کبھی انہوں نے گل فشاں کو نماز پڑھتے نہ دیکھا تھا۔

پتا نہیں پھر بھی خدا ایسے لوگوں کو کیسے ساری خوشیاں اور دنیا جہاں کی مراعات دیتا ہے جو اُس کی عبادت میں بھی بخل۔۔۔ سے کام لیتے ہیں۔
”نور۔ کیسے صبح صبح مجھے جگانے لگی تھی؟“

”جی! انہیں نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ صبح اپنے رب کا شکر ادا کرنے سے شروع کرنی چاہیے۔
خدا کو یاد کیا جائے تو سارا دن بہت اچھا گزرتا ہے۔“ نور العین نے سفید ملل کے دوپٹے کی بکھل اس طرہ ماری ہوئی ہوئی، کہ صرف اس کا خوبصورت صبح چہرہ ہی نظر آتا۔ چمکتی آنکھیں دل میں جذبول کا طوفان اُٹھاتی تھیں۔ مگر وہ ان جذبول کی شوریدہ سرلہروں سے اپنے دل کی نیا کو بچا لیتے۔ نہا کر وضو کرتے اور خ کے حضور سب سے جود ہو جاتے۔

نور العین نے تو عذیرہ کو بھی بہت چھوٹی عمر میں نماز بھی پڑھنا سکھا دی تھی۔ عذیرہ پانچ سال کی تھی جب ماں کے ساتھ نماز پڑھتی۔ نور العین کہتی تھی۔

”جب اتنی عمر میں بچہ اسکول کی کتابیں پڑھ سکتا ہے تو نماز بھی پڑھ سکتا ہے“ کوئی مہمان اُن کے ہاں آتا تو عذیرہ انگلیں پونٹری کے بجائے آئینہ آئینہ یا چاروں قل نہایت عقیدت سے سناتی تھی کہ لوگ رشک کرتے۔

نور العین کا تو خیال تھا کہ اُن کی عذیرہ کو لوگوں کی نظر لگ گئی تھی، تبھی تو وہ گم ہو گئی۔ کتنا تلاش کیا وہ انہوں نے۔ مگر عذیرہ نے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ اور بیٹی کی گمشدگی کا دکھ نور العین کی جان لے گیا۔

عذیرہ تو گم ہوئی تھی۔ نور العین نے جمال ملک کو بھی تنہائیوں کی قبر میں اتار دیا۔

بے شک گل فشاں نے بیگم جمال بن کر اُن کی خوابگاہ کی رونق بڑھائی تھی، مگر دل کے نصیب میں لگتا تھا، جو تنہائی لکھی گئی تھی۔ وہ اس کا سفاک ہو گئی۔ انہوں نے تو گل فشاں کو اپنی تنہائیاں بانٹنے کے لیے اپنا یا تھا، لیکن یہ پتا نہ تھا اُس کے ہو کر تو وہ اور تنہا رہ جائیں گے۔

وہ سمجھتے تھے ہر عورت نور العین ہوئی ہے۔

مٹ جانے والی۔

فنا ہو جانے والی۔

شوہر کی ابرو جنبش سے اُس کے موڈ کا اندازہ لگانے والی، مگر انہیں تو پتا چلا تھا، ہر عورت نور العین نہیں ہو سکتی۔ شوہر کو جاننے اور سمجھنے کا ادراک ہر عورت میں نہیں ہوتا۔ سچی تو ہمیں برس گزر جانے کے باوجود بھی وہ نور العین کو نہ بھلا پائے تھے تنہائی میں نور العین انہیں یاد آتی اور بے تحاشا یاد آتی۔ وہ ہمارا گل فشاں کا موازنہ نور العین سے کرتے تو ہمیشہ نور کا ہی پلڑا بھاری ہوتا۔ گل فشاں کو اپنی زندگی میں شامل کرنے انہیں ایسی غلطی لگتا جس پر وہ برسوں سے پچھتا رہے تھے اور اس کا کوئی مداوانہ تھا۔

بھی بھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان انجانے میں ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے کہ پھر نہ ہی ننگے بنتی ہے اور نہ اُگلنے۔

یہی کیفیت گل فشاں سے شادی کے بعد جمال الدین ملک کی بھی تھی۔ ہمیشہ انہوں نے بیوی کی

بات مانی تھی کہ وہ اُس کی خوشی کا کوئی موقع نہ جانے دیتے، مگر اب لگتا تھا۔
جیسے تھک گئے ہوں۔

نوٹ گئے ہوں۔

اپنا وجود انہیں دکھاتا ہوا محسوس ہوتا۔

اور ان دنوں تو انہیں خصوصیت سے نور العین اور عذیرہ شدت سے یاد آتی تھیں۔

اگر وہ دنوں ہوئیں تو میری زندگی کا یہی چلن ہوتا۔

شاید میرے لب بھی مسکراہٹ آشنا ہوتے۔ دل پھول کی مانند کھلتا۔

کیا کسی کی اتنی اہمیت ہوتی ہے؟

یہ حیثیت ہوتی ہے زندگی میں آنے والے کسی ایک شخص کی، جس کے دم سے ساری خوشیاں میسر ہوئی ہیں۔

نور۔ نور کا شتم لوٹ آؤ۔

عرصے بعد یہ خواہش اُن کے دل کے ساحل سے لگرائی تھی۔

پتا۔ ”نرم ملائم سی آواز پر وہ خیالوں کے جزیرے سے لوٹ آئے، ٹہلنے ٹہلنے رُک کر دیکھا تو گلاب کے جھنڈ کے پاس خندان کھڑی تھی، کشمیری کڑھائی والی آف وائٹ شال لپیٹے۔ ہوا کے نرم جھونکے اُس کے خوبصورت بالوں سے اٹھھیلیاں کر رہے تھے۔

”ارے میرا بیٹا اتنی سویرے اُٹھ گیا۔“ بیٹی کو دیکھ کر اُن کے دل پر سے سل جیسا بوجھ سرکنے لگا۔

”میں تو روز ہی سویرے اُٹھتی ہوں بیٹا۔“

تمہاری ماں نے تو شاید زندگی میں بھی صبح کا ڈوب کا سہانا منظر نہیں دیکھا، جب رات کی کوکھ سے سنہری سحر طلوع ہوتی ہے کتنے بد نصیب ہوتے ہیں، وہ لوگ جو قدرت کے عطا کردہ حسین مناظر سے لطف اندوز ہو کر خدا کا شکر نہیں کرتے۔

”پاپا آپ سنگاپور سے کب لوٹیں گے؟“ خندان نے پوچھا۔

”ایک ہفتہ بعد۔ کیوں؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”پاپا ایک فرمائش کرنی تھی۔“ خندان نے معصومیت سے پلکیں جھپکیں۔

”بولو جان۔“ انہوں نے محبت سے کہا۔

”میں۔ میں اب یہیں رہنا چاہتی ہوں پاپا آپ کے پاس۔ میں۔ میں یہیں پڑھوں گی۔ مما کہتی ہیں، میں کنیر ڈکالچ میں داخلہ لوں۔ لیکن پاپا میں نہیں رہوں گی وہاں۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ آہستہ سے بولے۔

”آپ ماما کو منالیں گے نا؟“ خندان کے لہجے میں شک تھا۔

”ماں میں بہرہ دوں گا اُسے تم فکر نہ کرو۔“

”خینک یو پاپا۔“ خندان نے باپ کے کندھے پر سر رکھا دیا تو انہوں نے اُسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا؟“ خندان نے چہرہ اونچا کر کے انہیں دیکھا۔

”نہیں جان پاپا۔ میں اپنی اتنی پیاری بیٹی سے ناراض کیوں ہونے لگا۔ اور اچھا ہے تم یہیں رہو

ہمارے پاس۔“ جمال ملک نے اُس کی پیشانی چوم لی۔

”پیارے“ خنداں مارے خوشی کے چل ہی توئی تھی۔
”کرم سے کہو ناشتہ تیار کرے میں نے جلدی آفس جانا ہے۔“
”آج بھی آپ آفس جائیں گے۔“ خنداں نے پوچھا۔
”ہاں۔“ وہ طویل سانس لے کر بولے۔

”پیارے آپ ربی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لگاتے؟“ آپ اپنا بوجھ کم کریں نا۔“
”ربی انجمنی تعلیم تو مکمل کرے نا۔ پھر تمہاری ماما کا ارادہ ہے وہ بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری اسٹیٹس سے حاصل کرے، ابھی تو تقریباً چار پانچ سال مزید پڑے ہیں۔“
”آپ نے سیاست میں بھی حصہ لے لیا ہے، کس طرح ہر جگہ انصاف کر سکیں گے۔“ خنداں پوچھ رہی تھی۔

”خدا ہمت دے گا۔“ وہ مسکرائے
”انشاء اللہ۔“ خنداں بولی۔ ”پیارے آپ ڈائیننگ ہال میں چلیں میں آپ کے لیے ناشتہ بناتی ہوں۔“

”تم بناؤ گی؟“ جمال ملک کے لہجے میں حیرت تھی۔
”لیں پیارے، میں انڈا بہت اچھا فرائی کر لیتی ہوں۔“ خنداں نے معصومیت سے کہا تو جمال الدین ملک زور سے ہنس دیے۔

”آپ ہنس رہے ہیں پیارے؟“ وہ خفا ہوتی ہوئی بولی۔
”ارے نہیں میں تو خوش ہو رہا ہوں، میری بیٹی انڈا فرائی کر لیتی ہے۔“ وہ اسے پکارتے ہوئے بولے۔

”میں فرخنج تو سبھی بیالیتی ہوں اور۔“ خنداں نے بتانا چاہا۔
”بس فی الحال تم مجھے ایک انڈا اور دو ٹوسٹ کا ناشتا کروادو۔ باقی تمہارے ہاتھ کے بنے ہاؤے ناشتے سے میں کسی اور روز مستفید ہوں گا۔“ جمال الدین ملک اسے ساتھ لگا گئے اندر کی طرف بڑھے۔

”ابھی لاتی ہوں۔“ خنداں چڑیا کی مانند چپکی اور تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

تانا باں آج بے تحاشا خوش تھی، اور خوشی کی وجہ یہ تھی کہ آج اس نے زندگی میں پہلی بار ماں کو خوش دیکھا تھا۔ شرفاں کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں گہرا ہنس رہا تھا۔ لمبے بالوں کی ڈھیلی سی چوٹی گوندھی تھی۔ سرخ اور ہری بوٹی والا پیلا سوٹ پہنا تھا، ساتھ ہی چاندی کا زیور بھی۔ شرفاں کی تو حجب ہی نرالی تھی۔

”میری ماں آج ساری بستی کی عورتوں سے اچھی لگے گی، شیدے کی جج (برات) میں کوئی بھی عورت ایسی نہ ہوگی۔“ تانا باں نے ماں کے نرم و نازک پیروں میں لمٹائی کھستہ پہناتے ہوئے کہا تو شرفاں بے طرح شرما گئی۔

”جج دریا پار جائے گی نا؟“ شرفاں پوچھ رہی تھی۔ ”ہاں اماں! تانا باں نے آہستگی سے کہا۔

”پھر میری جج (جوتی) خراب ہو جائے گی حیرا دادا لڑے گا۔“
”یہ جج تیرے پیروں سے زیادہ اچھی نہیں ہے انماں خراب ہوتی ہے تو ہو جائے۔ تیری خوشی سے

بڑھکر تو کچھ نہیں۔“ تانا باں نے کہا۔ ”انماں شیدہ دیکھ۔“ تانا باں نے شیدہ ماں کے ہاتھ میں تھما دیا۔
شرفاں آئینے میں بھی اپنی آنکھوں کو دیکھتی اور کبھی کانوں میں پڑے بڑے بڑے بالوں کو جو سر ہلانے سے ملنے لگتے تھے۔ ہاتھ میں چاندی کا گھنگھریوں والا چوڑا انگٹن جو دوپٹہ درست کرتے ہوئے جھننے لگتا تھا۔

”بھی حیات محمد آگیا۔“

”تانا باں پتہ تیار ہو گئے تو چلو۔ بیڑیاں (کشتیاں) بالکل تیار ہیں، پھر جگہ نہیں ملے گی۔“
”بس بابا تیار ہیں۔“ تانا باں نے اپنے بال سلجھاتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ میری دھی ہے، یعنی شرف۔“ حیات محمد نے حیرت اور محبت سے اُسے دیکھا، شرفاں بے تحاشا شرما گئی۔ اُس کی کندھی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔

”بابا میں اچھی لگ رہی ہوں نا۔؟“ شرفاں معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔
”ہاں بھی میری دھی بہت اچھی لگ رہی ہے۔“ حیات محمد نے شرفاں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر تانا باں سے بولا۔

”پتہ ذرا ماں کی نظر اتار دینا۔“

”اچھا بابا۔“ تانا باں نے پُرشوق نظروں سے ماں کو دیکھا، آج اُسے بھی ماں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اپنی عمر سے کئی سال چھوٹی لگ رہی تھی۔
اس لیے کہ آج اُس کی ماں بھی تو خوش تھی۔

آج اُن کی بستی کے ایک ملاح محمد شبیر کے بیٹے محمد رشید کی شادی تھی۔ وہ خود بھی ملاح تھا۔ برات دریا پار جانی تھی اور بستی کے سارے لوگ ہی شیدے کی خوشی میں شریک تھے۔

پہلے کوئی بھی خوشی ہوتی شرفاں شرکت نہ کرتی۔ مگر اس بار یہ کیمرے کا ایسا تھا جب وہ تانا باں کے ساتھ انٹن مہندی کی رسموں کے ساتھ ساتھ ٹٹے گانے تک میں شریک ہوئی تھی۔ اور خود کہا تھا۔
”تانی میں بھی جج کے ساتھ چلوں گی۔“

تانا باں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو خوش تھی کہ ماں اپنے خیالوں کے حصار سے تو نکلے۔

ورنہ یہی خیالوں کی دنیا میں رہنے سے اُس کے بدن پر کتنے پھٹ پڑتے تھے۔ روح بار بار سو لی پڑھتی تھی۔ وہ جا داراؤڑھ کر ماں کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آئی۔ بستی میں ملے کا سماں تھا۔ ہر طرف ہی رنگ لہرا رہے تھے، بستی کے لوگوں میں ایک ہی تو خوبی ہوتی ہے کہ وہ کسی ایک کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے ہیں، سارے ہی ایک برادری کی طرح رہتے ہیں۔

لڑکے ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے ہوئے دولہا کو لیے آ رہے تھے، مرد خواتین اور بچوں کی کشتیوں میں حفاظت سے بٹھارے تھے۔

ملاحوں نے چوہدریا میں ڈال دیئے اور برات روانہ ہو گئی۔

لڑکیوں کی کشتی میں لڑکیاں گارہی تھیں اور لڑکے بھی گارے تھے، دریا کے دوسرے کنارے دہن والے برات کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر تو دہن مختار ماں کا گھر تھا۔ یہ بھی ملاحوں کی بستی تھی۔

گھاس پھوس کی بنی ہوئی جھگیوں میں ایک جھونپڑی پر رنگ برنگے کاغذ کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں اور وہی دہن کا گھر تھا۔

تاباں مسلسل ماں سے چپکی ہوئی تھی۔ جیسے کہ کوئی چھوٹی بچی ماں کا بلونہیں چھوڑتی، یہی حالت تاباں بھی تھی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ڈھول والوں نے الوادعی دھن بجانی شروع کر دی۔ مختاراں کی رخصتی پر اُس کی ماں پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ بہنیں رورہی تھیں، اور خود مختاراں کو غش رہے تھے۔ شرفاں نہایت حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اُس کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔ وہ تو اپنی شادی پر نہ روئی تھی۔

بلکہ کوئی بھی نہ رویا تھا۔ مگر میں رخصت ہی کب ہوئی تھی۔ فضل دین کے گھر ہی میں تھی اور وہیں تو نکاح ہوا تھا۔ تو۔ تو بیٹیاں اس طرح رخصت ہوئی ہیں۔ پھر میری رخصتی اس طرح کیوں نہ ہوئی۔ کیا میں نہ تھی۔

تیرے ماں باپ تیرے پاس نہ تھے، شرفاں ورنہ تیری رخصتی پر اُن کے گھر بھی کہرام مچتا اور۔۔۔ اُس کی سوچوں پر برف پڑنے لگی۔

”یہ۔ یہ کیوں رورہے ہیں تاباں؟“

”اماں اُن کی بیٹی رخصت ہو رہی ہے نا؟“

”میرے لیے تو کوئی نہ رویا تھا،“ شرفاں کے لہجے میں حسرت تھی۔

”وہ اماں۔ چلو باہر چلتے ہیں۔“ تاباں نے جلدی سے بات پٹٹی اور پھر ماں کا ہاتھ تھام کر باہر نکل

کہ اُسے پتا تھا، شرفاں مزید وہاں رُکی تو وہ سوالات پر سوالات کرے گی اور اُس کے پاس ماں کے سوال کا جواب نہ تھا، کہ سب کچھ تاریکی میں تھا۔ بھلا وہ کیا بتائی۔

واپسی پر اتفاق تھا کہ شرفاں کو ماسی بختاں نے اپنے پاس بٹھالیا، اور تاباں دلہن کے پاس بیٹھ گشتیاں چلنے لگی تھیں۔ کہ دریا کے پتھوں بچ ایک دم ہی چھپا کے آواز پر سب چونکے۔ بختاں کی چیخ

گئی۔

”شرفاں۔۔۔“ وہ پانی کے صحن میں دیکھ رہی تھیں۔

”اماں۔۔۔“ تاباں نے دریا میں ماں کے پیچھے ہی چھلانگ لگانی چاہی مگر اُن کیوں نے اُسے پکڑا اور اُسے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ دوسری کشتیوں سے کئی مرد دریا میں پھلانگیں لگا چکے تھے۔

تاباں تو عصمت کے بازوؤں میں بے ہوش پڑی تھی اور بوڑھا حیات محمد کشتی کے ایک کونے کیکیار ہا تھا۔ ساری کشتیاں دریا کے پتھوں بچ رُکی کھڑی تھیں۔

☆☆☆

سورج کی کرنیں پردوں سے چھن چھن کر کمرے میں آ رہی تھیں اور وہ نہایت کسمندی کروٹ بدل لیتا۔ آخر روشنی سے تنگ آ کر اُس نے چہرے پر تکیہ رکھ لیا۔ اپنی ہی خوشبو اُس کے نتھنوں

گھسنے لگی اور بھی ایک نرم نرمی بیدار کرنے والی خوشبو اُس میں شامل ہو گئی۔ یہ مہک اُس کی روح کو سر کر رہی تھی۔

تو غاشیہ بیگم! اب تم مجھے نیند میں بھی بیدار کرنے آئے گی ہو۔ مجھے نیند بہت پیاری ہے۔

نہ۔ وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھا۔

یونہی لیٹے لیٹے بجانے لگی دیر گزرتی تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا تھا وہاں مارے آ

کے پڑے۔۔۔ پڑے بولا۔

”کیا بد نظیری ہے؟“

”بد نظیر تم ہو یا۔۔۔“ نرم نسوانی آواز نے اُسے جھنجھوڑی ڈالا۔ تکیہ چہرے سے ہٹا کر اُس نے دیکھا تو سامنے ہی غاشیہ کھڑی اُسے کڑے تیوروں سے گھور رہی تھی۔

”دس بج رہے ہیں اور تم ابھی تک پڑے بیٹھ رہے ہو۔ یہ نہیں کہ گاؤں سے آئے ہو تو پھوپھو کے بارے میں بتا دو۔ آتے ہی بستر میں گھس گئے تھے اب تو جاگو۔“

دہان اٹھ کر بیٹھ گیا اور تکیہ گود میں رکھتے ہوئے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں تم ہی کو کر رہا تھا یاد آؤ“

چشم ما روشن دل ماشاد آؤ

”خدا کے لیے وجہی کبھی تو سنجیدہ ہوا کرو۔“ وہ سرخ ہوتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی۔

”چلو پوچھو کیا پوچھنا ہے؟“ وہ لہک کر بولا۔

”جاگ گئے ہو۔؟“ غاشیہ نے پھینٹا۔

”ارے تم سامنے ہو تو برسوں کی نیند ٹوٹ جائے۔“ وہ ہنسا۔ ”ویسے رات میں واقعی بہت تھکا ہوا تھا۔ سوری۔“

”کیوں اور جنٹ کال کی تھی سراج بھائی نے۔“ غاشیہ نے جلدی سے کہا۔

”کچھ نہیں بس وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ دہان بچ بتاتے بتاتے ایک دم ہی پٹری بدل گیا۔

”کیا۔۔۔؟“ غاشیہ کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

”ساری تیاری کیے بیٹھے تھے۔ مگر میں نے کہہ دیا یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

”تم نے انکار کر دیا۔“ غاشیہ حیران تھی۔

”ظاہر ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”تو سراج بھائی کچھ نہیں بولے؟“ غاشیہ ایک دم نارمل ہوتے ہوئے بولی۔

”بولے تھے مگر میں ڈارہا کہ اپنی پسند سے کروں گا شادی۔“

”پھر۔۔۔“ غاشیہ نے پوچھا۔

”پھر پسند بتا دی اور پھر سے یہاں آ گیا۔“ دہان نے تکیے پر کہنیاں ٹکا دیں۔

”وجہی تم جھوٹ مت بولا کرو۔“ غاشیہ نے تنبیہ کی۔

”کیوں۔۔۔؟ کیا ہوا۔؟“ وہ پٹپٹا کر بولا۔

”جب تم جھوٹ بولتے ہو تو وہ تمہارے چہرے پر لکھا ہوتا ہے۔ بچ بتاؤ کیوں بلایا تھا۔؟“ غاشیہ

نے کڑے تیوروں سے اُسے دیکھا۔ تب دہان نے اُسے سب کچھ بتا دیا اور بعد میں بولا۔

”ویسے تمہیں کیسے پتا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”جناب جب آپ جھوٹ بولتے ہیں تو میرے دل کی وہ بات نہیں لگتی میرا دل انکار کرتا ہے اور

میں سمجھ جاتی ہوں بچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔“ غاشیہ نے تین سے کہا۔

”تمہارا دل نہ ہوا خطرے کا الارم ہو گیا۔“ دہان ہنسا۔

”جو بھی سمجھو۔ ویسے میں تمہیں ایک سچی اطلاع دے رہی ہوں۔“

”کیا۔؟“ وہاں نے ابرو چڑھا کر اُسے دیکھا۔
”اسجد بھائی آرہے ہیں۔“ غاشیہ کے چہرے پر خوشی کی سرخی تھی۔
”نہیں بھئی۔“ بے ساختہ اُس کے لبوں سے نکلا۔

”ہاں بھئی۔“ غاشیہ اُسی کے انداز میں بولی۔ اب تم جلدی سے شاہ لے لو۔ میں ناشتہ لگوا ہوں۔“ وہ کہتی ہوئی پروا کی مانند اگلے ہی لمحے دروازے سے باہر جا چکی تھی۔



زرفشاں نے اپنی قیمتی پر پل ساڑھی کا پلو شانے میں اڑسا اور اپنے بوائے کٹ بالوں میں خردلی انگلیاں پھیرتے ہوئے نخوت سے بولیں۔

”گل ڈر۔ آج تمہیں احساس ہوگا کہ تم سے کیسی زبردست غلطی ہوئی ہے۔“
”کیسی غلطی زری۔؟“ گل فشاں نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے کچھ حیرت اور کچھ تجسس سے کہا۔

”میں نے تمہیں جمال سے شادی کرنے سے اسی لئے منع کیا تھا کہ وہ کبھی بھی ہم لوگوں میں ایڈجسٹ نہیں کر سکے گا۔“ زرفشاں نے کہا۔

”اور کیسے ایڈجسٹ کرے وہ؟“ گل فشاں کو بہن کا اس طرح کہنا بہت ہی برا لگا تھا۔

”بھئی۔ اب میرے منعم میں کیا برائی ہے؟

”زری۔ تم خود سوچو، وہ ہماری خندی سے عمر میں خاصا بڑا ہے۔“

”جمال کو اس وقت احساس نہیں ہوا تھا جب تم سے اس نے شادی کی تھی۔ میرے خیال میں منعم اور خندی کی عمر میں اتنا فرق تو نہیں جس قدر تمہارا اور جمال ملک کا تھا۔“ زرفشاں کا لہجہ خاصا ٹوکیتا تھا۔
”وہ اور بات بھی زری۔“

”ہاں اپنی بیٹی کے لیے معمولی سی بات کو بھی مسئلہ بنا لیا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔

”جمال نے تو کچھ نہیں کہا۔“ گل فشاں نے دھیرے سے کہا۔

”مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عمروالافیکٹر جمال ہی نے نکالا ہوگا۔“

”میں نے جمال سے بات ہی نہیں کی۔“ گل فشاں نے نظر چراتے ہوئے جھوٹ بولا۔

”کیوں نہیں کی؟“ زرفشاں کے لہجے اور آنکھوں میں حیرت تھی۔

”خندی ابھی چھوٹی ہے زری۔ پھر وہ پڑھنا چاہتی ہے اور میں اس پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کر سکتی۔“
”خروہ گریجویٹیشن تو کر رہی ہے۔“

”سوچ لو گل ڈیر۔ تمہارا میاں اپنے خاندان کے کسی پیٹنڈو کے حوالے کر دے گا اسے اور وہ اتنی معصوم سی لڑکی تباہ ہو جائے گی۔“ زرفشاں نے اسے ڈرایا۔

”زری۔ جمال کے خاندان والے اپنے علاقے کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ پھر سب نو پڑے لکھے ہیں۔“

”بھئی سیدی سی بات ہے، یہ دیہاتی لوگ کتنے بھی پڑھ لکھ جائیں ان کے اندر کمپلیکس کبھی نہیں ہوتا۔ جمال ہمیشہ ہم لوگوں میں بس فٹ رہا ہے۔“

”زری۔ اس کے اپنے مسائل ہیں۔“ گل فشاں شوہر کی طرف داری کر رہی تھیں۔

”خیر تم اس کیسے اس کی کوتاہیوں پر پردہ ڈالتی ہو کہ وہ تمہاری چواکس تھا۔ مگر مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے منع کے پروپوزل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ بھئی دیکھو، لڑکیوں کی تو ہمیں کی نہیں ہے۔“

”میں جمال سے بات کروں گی۔“ گل فشاں نے آہستہ سے کہا۔ ان کا خیال تھا وہ ایک بار پچھلے شوہر سے بات کر کے بہن کو جواب دیں۔ حالانکہ انہیں یہ بھی پتا تھا کہ جمال الدین ملک جب بھی کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو وہ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ مگر ایک آس کی منتقلی بھی جو انہیں روشنی دکھا رہی تھی۔ شاید جمال مان جائیں۔

”ایک ہفتہ تک تو جمال سنگاپور سے آجائے گا۔“ زرفشاں بے چارے۔

”جی ہاں۔ بس فوراً جواب دے دیں گے۔ میں بات کر لوں گی۔“ گل فشاں نے کہا۔

”بھئی دھڑ سے دروازہ کھلا اور منعم عبداللہ ایک گوری چٹی سنہری بالوں والی خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

”آخا۔ گل آئی آئی ہوئی ہیں۔“ گوری کا ہاتھ چھوڑ کر وہ تیزی سے گل فشاں کی طرف بڑھا ہوا۔

ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”میری اسمارٹ گل آئی۔ لگتا ہے آپ نے تو اپنی عمر کو روک رکھا ہے۔ ایک مٹا ہیں۔“ اس۔

شرارت سے ماں کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولیں۔

”بھئی میں گل سے پورے سات برس بڑی ہوں۔“

”گل آئی تو ستر برس بعد بھی ایسی ہی رہیں گی۔“ منعم بولا۔

”نانی بوائے، مت بناؤ مجھے۔“ گل فشاں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا مگر نہ جانے کیوں انہیں آج یہ تعریف بہت بری لگ رہی تھی۔

”کم آن لیزا۔“ ایک دم ہی منعم کو اپنے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کا خیال آگیا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور لے

کو کندھوں سے تمام کران کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

”آئی۔ یہ میری دوست ہے لیزا رابرٹ۔ آج ایئر ہے نا اور لیزا کے ہاں زبردست فنکار

ہے۔ مٹا میں رات کو واپس نہیں آؤں گا۔“ منعم نے تعارف کا مرحلہ جلدی جلدی طے کیا اور پھر لے

کو ساتھ چپکے چپکے باہر نکل گیا۔

”یہ۔۔۔ منعم کی فرینڈ ہے۔ آئی مین گرل فرینڈ۔“ گل فشاں ان کے جانے کے بعد بہن

پوچھا جیسے انہیں یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

”ہاں بہت اچھی لڑکی ہے۔“ زرفشاں بے پروائی سے بولیں۔

”پھر آپ منعم کی اس شادی کیوں نہیں کرویتیں۔ مجھے لگتا ہے دونوں خاصے فریک ہیں۔“

”تم پاگل تو نہیں ہو گئیں پتا ہے لیزا کی دوسرے ڈائیورس (طلاق) ہو چکی ہے“ زرفشاں نے کچکا

کر کہا۔ ایسی لڑکیاں کسی ایک کی ہو کر کب رہتی ہیں۔“

”تو زری“ منعم چپے لڑکے کسی ایک کے ہو کر نہیں رہتے۔“

”کیا ہو گیا ہے تجھے گل ڈار لنگ۔ ہماری سوسائٹی میں تو یہ سب چلتا ہے۔ مجھے پتا ہے عبداللہ اب

تک۔“ زرفشاں سانس لینے کو زریں تو گل فشاں جلدی سے بولیں۔

”مگر میں خندی کو زری نہیں بننے دوں گی زری۔ مجھے جمال نے ایسی کوئی ذہنی اذیت آج تک نہیں

دی۔ کبھی وہ غیر عورتوں کے پاس نہیں گیا۔ اور وہ عورت بہت خوش قسمت ہوتی ہے زری جس کا مرد صرف

اسی کا ہوا اور میں تم سے بہت زیادہ خوش نصیب ہوں۔“

”اوہو غیر عورتیں۔“ زرفشاں زور سے نہیں۔ ”مجھے تو آج تک ذہنی اذیت نہیں ہوئی گل جانی۔

عبداللہ کہیں جائے آئے لوٹ کر میرے پاس ہی آتا ہے۔ اور اسے جو سکھ اس گھر میں ملتا ہے بھلا کہیں

اوارل سکتا ہے۔ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ مرد کو تو اسی عورت کے ساتھ سکھ ملتا ہے جو اس کے گھر کو بساتی ہے۔“

”یہی تو تمہاری بھول ہے زری۔ اگر عبداللہ بھائی کو گھر میں سکھ ملے تو بھلا کہیں ادھر ادھر کیوں

جائیں جس مرد کو بیوی سے سارے سکھ ملتے ہوں وہ کہیں اور نہیں جاسکتا۔“

”کیا تمہاری مڈل کلاس جیسی ذہنیت ہو گئی ہے۔ تم کتنی بے وقوفی کی باتیں کر رہی

ہو۔“ زرفشاں تسخیر سے بولیں۔

”میں آج ہی تو سچ باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے ابھی ابھی تو یہ ادراک ہوا ہے کہ میں بہت خوش

نصیب عورت ہوں۔ اپنی کلاس کی۔ میرے پاس بے تحاشا دولت کے ساتھ ساتھ اپنا مرد بھی ہے مکمل مرد

جو صرف میرا ہے

”انتالیقین۔ تم جمال کے کردار کی گواہی نہیں دے سکتیں۔“ وہ آنکھیں نچاتے ہوئے بولیں۔

”اس کے کردار کی گواہی میں آنکھیں بند کر کے دے سکتی ہوں زری۔ اور میں اپنی بیٹی کے لئے

بھی ایسے شوہر کا انتخاب کروں گی۔ جو مکمل طور پر اس کا ہو۔ وہ کہیں بھی جائے خود کو بیوی کی امانت سمجھے۔

میں نے جمال سے کبھی وعدہ نہیں لیا بھی کچھ نہیں کہا مگر مجھے یقین ہے اس نے گزرنے اٹھائیں برسوں میں

کبھی بھی خیانت نہیں کی۔ پلیز زری، تم بھی جمال سے بات مت کرنا۔ اگر وہ مان بھی گئے تو اس رشتے کی

سب سے زیادہ مخالفت میں کروں گی۔“ گل فشاں جمال صوفے سے اٹھتے ہوئے حتیٰ لچھے میں بولیں۔

”گل فیصلہ یوں اچانک نہیں کئے جاتے۔ تمہیں پتہ ہے منعم ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ کتنے لوگ بیٹیاں

طشتری میں سجا کر دینا چاہتے ہیں۔“

”تو لے لیں۔“ گل فشاں نے یوں کہا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”ہماری جان چھوڑیں۔“

”میں نہیں لینا چاہتی۔ میری خواہش ہے کہ میری اپنی بھانجی یہاں آئے۔ جو عیش ایک غیر لڑکی

کرے گی وہی خندی کیوں نہ کرے۔“ زرفشاں بہن کو سمجھا رہی تھیں۔

”نہیں زری۔ یہ عیش نہیں ہوں گے۔ میں جانتے ہو جتنے خندی کو اس دلدل میں نہیں اتار سکتی کہ

جہاں وہ سانس بھی نہ لے سکے۔“

”کیا یہ سب چیزیں تم پسند نہیں کرتیں؟۔ آزادی سب کا حق ہے گل۔“

”بے شک میں آزادی کی قائل ہوں زری۔ لیکن اتنی آزادی جہاں والدین کا احترام ہی نہ ہو

۔ میرے ربی کو آج تک یہ حوصلہ نہیں ہوا کہ اپنی کسی گرل فرینڈ کا میرے سامنے ذکر کرے۔ سامنے لانا تو

دور کی بات ہے۔ اور اور منعم کس طرح لیزا کو لے آ گیا۔“ گل فشاں جمال جھرمجھری لے کر بولیں۔

”سب چلتا ہے ڈارلنگ۔“

”نوزری۔ جہاں جس ماحول کا پروردہ ہے۔ جو روایات اس کی رگ رگ میں بھری ہوئی ہیں۔ کبھی بھی ان سے منحرف نہیں ہو سکتا۔“

”تم بھی پیٹو وغیرت بن گئی ہو جو چاہتی ہے کہ مرد اس کے گھٹنے سے لگا بیٹھا رہے۔ گل محبت بھی پیڑ بھر روٹی کے ساتھ اچھی لگتی ہے۔“

”سب درست ہے مگر ایسا نوالہ کس کام کا جو بار حلق میں اٹک جائے چاہے وہ سونے کا ہو کیوں نہ ہو“ گل فشاں تو آج مکمل طور پر ماں بنی ہوئی تھیں۔ ایک ایسی ماں جسے سوائے اپنی بیٹی کے کنگھہ کے علاوہ اور کسی شے کی تمنا نہ ہو۔

انہیں پتہ تھا کہ جن عورتوں کے مرد گھر سے باہر وقت گزارتے ہیں ان عورتوں کو کتنے بل صراط سے گزرتا پڑتا ہے۔ دل زخموں سے چور ہوں مگر لیوں پر دکھاوے کی مسکراہٹ بجا کر گڑیا ہنار ہنار پڑتا ہے۔ اور وہ اپنی بیٹی خندان ملک کو کبھی ایسے راستے کی مسافر نہ بننے دینا چاہتی تھیں جہاں ہر سمت کانچ ہی کانچ بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ اور ان کانچ پر چلنا اپنے آپ کو زخمی کرنے کے مترادف تھا۔ وہ خندان کو زخمی کرنے کا تو سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔

منعم کے ساتھ لیزا کو دیکھ کر ان کے اندر خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ جو ماں سے کہہ کر گیا تھا وہ ایلپٹر کا فنکشن اینڈ کرنے جا رہا ہے رات کو نہیں آئے گا۔ زرفشاں ماں بھی اور اس نے اجازت دے دی تھی۔ مگر بیوی بھلا یہ اجازت کس طرح دے سکتی ہے۔ گل فشاں ایسے حالات سے بھی نہیں گزری تھیں۔ مگر انہیں پتا تھا کسی کے قدموں تلے دل رکھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ خندان کا دل ہمیشہ منعم کے قدموں تلے رہے اور وہ جب چاہے اسے روندنا ہوا اپنی گرل فرینڈ کی بانہوں میں بانہیں ڈالے چلا جائے۔ اور خندان اسے روک بھی نہ سکے۔ یہی تو گل فشاں نے رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

”میں پوچھتا ہوں تو لوگ اسے لے کر گئے ہی کیوں تھے؟“ فضل دین مٹھیاں ہنپتے ہوئے لہو رنگ آنکھوں سے چار پانی پر بے سندھ پڑی شرفاں کو دیکھتے ہوئے حیات محمد سے کہہ رہا تھا۔

”کتنی بدنامی ہوئی ہے سوچا کسی نے؟“

”بدنامی کی کیا بات ہے پتر۔“ حیات محمد نے نرم لہجے میں کہا۔

”اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور۔“ مارے غصے کے فضل دین کی آواز نکل نہیں رہی تھی۔

”کہنا تاکہ یہ تو دریا دیکھ رہی تھی۔ کس کی گرتی۔“

”اور عورتیں نہیں گریں۔ یہی گری۔ بابا۔ مجھے سے جھوٹ مت بولو۔ یہ جان بوجھ کر گری تھی، مر جائے

دیا ہوتا“ کیوں نکالا اسے دریا سے۔ چلی جاتی جہاں جانا چاہتی تھی۔ میرے سر سے عذاب تو اترتا۔“

”نہ کہ اسے عذاب پتر۔ یہ تو خود نہ جانے کون سے عذابوں سے گزر رہی ہے۔ حیات محمد کی

آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے۔

”مجھے تو نے زیادہ کر دیا ہے بابا۔“ فضل دین نے سارا الزام باپ کے سر تھوپ دیا۔

”تیری اپنی منشا تھی۔ میں نے زبردستی تو نہیں کی تھی تیرے ساتھ۔ تیری ضدھی یاد کردہ وقت تو

تو شرفاں کا دیوانہ تھا۔ تو ہی تو کہتا تھا کہ اگر تجھے شرفاں نہ ملی تو مر جائے گا۔“

”مجھے کیا پتا تھا کہ اسے باکر میرے جذبے اور اُمکیں مرجائیں گی۔“ فضل دین نے منہ بنا کر کہا۔

”پتر بعض مرتبہ کی شدید محبتیں بھی بہت دکھ دیتی ہیں۔“

”بابا۔ اسے نکال یہاں سے۔“ فضل دین بولا۔

”نہیں نہیں۔“ تاباں جو گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھی تھی ایک دم ہی سر اٹھا کر بولی۔

”نہیں ابا۔ میری ماں کہیں نہیں جائے گی۔ تم چلے جاؤ کہیں بھی۔ ہاں ابا، تم دوسری شادی کر لو۔

خدا کے لیے میری ماں کو بچھ نہ ہو۔“ تاباں نے باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”میں چلا جاؤں۔“ فضل دین آنکھوں اور لہجے میں حیرت لیے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں ابا۔ اگر تم میری ماں کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتے تو چلے جاؤ۔ کیوں خود بھی دکھی ہوتے ہو

اور۔“

”میری پریشانی سے اسے کوئی دکھ نہیں ہوتا تاباں۔ یہ مکر کرتی ہے۔“

”کاش۔ یہ مکر کرتی۔“ تاباں کے ہونٹ پھڑکے۔

”تو میں چلا جاؤں؟“ فضل دین نے پھر بیٹی سے پوچھا۔

”ابا۔ اماں نے اسی طرح رہنا ہے۔ اور تم برداشت نہیں کر سکتے اس کی حالت کو تو الگ ہو جاؤ

ابا۔“ تاباں زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کیسے تمہیں چھوڑ کر جاؤں؟“ فضل دین نے کہا۔

”اگر ابا، تم میری خاطر کہیں نہیں جانا چاہتے تو ماں کی یہ حالت برداشت کرو۔ غصے کو لی لیا کرو۔

میری خاطر ابا اپنی تالی کی خاطر۔ میں تم دونوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ تاباں فضل دین کے بازو پر

ہاتھ رکھ کر گلو گری لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”ابا۔۔۔ بہت زخم ہیں ماں کے دل پر۔۔۔ ہر روز اس کے دل کا پھوڑا دکھتا ہے۔ روز زخم ہرے کر

دھتا ہے اس کے تمہارا رویہ۔ ابا میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ تم نے ماں سے نرم لہجے میں بات کی ہو۔ ہمیشہ

دھکتا رہتے ہو۔ کیا قصور ہے اس کا؟“

”تمہیں معلوم نہیں کتنی زبان چلاتی ہے اور زبان دراز عورت کا ایک ہی علاج ہے۔ وہ ہے چار

چوٹ کی مار۔“

”نہیں ابا۔ یہ تمہاری سوچ غلط ہے۔“ تاباں مضبوط لہجے میں بولی۔

”تاباں ٹھیک کہہ رہی ہے فضل دین۔ شرفاں تو کلیوں کی مانند ہے جو ذرا سی تپش برداشت نہیں کر

سکتیں اور مرجھ جاتی ہیں۔ تو نے کبھی پیار محبت سے اسے سمجھایا ہو بات کی ہو تو وہ ایسا کیوں کرے۔“

”بابا۔ یہ اس قابل ہی نہیں۔“ یہ فضل دین کی رائے تھی۔

”پھر جس قابل سے چھوڑ دے اسے اس کے حال پر چلا جا جہاں تیرا دل چاہتا ہے پتا نہیں یہ کیسے

زندگی کا بوجھ اٹھائے چل رہی ہے۔ کتنی مشکل راہ کا انتخاب کیا ہے اس نے۔“

”بابا۔ میں بھی اس کے ساتھ پتی ریت پر چلا ہوں بلکہ چل رہا ہوں۔ مگر جیسا سنگھ کے کہتے

ہیں۔ خدا گواہ ہے شرفاں کی سنگت میں ایک لمحے کے لیے بھی میں نے یہ سکھ نہیں پایا۔“ فضل دین کا لہجہ

نکست خوردہ تھا۔ ”مجھے تو شرفاں کے حسن نے جلا کر رکھ لیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ہمیشہ دکھتی ہوئی آگ

دل جو میرے بدن کے ساتھ روح کو بھی جلا دے گی۔ بابا۔ میرا جرم بتاؤ کیا ہے؟“ فضل دین نہایت

لجھی۔

”اس کا جرم بتاؤ کیا ہے؟“ حیات محمد نے چار پائی پر پڑی شرفاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”میرا خیال ہے جرم تو سارے اسی کے ہیں بابا۔ بھی اس نے میرے دل میں اترنے کی کوشش نہیں کی۔“

”تم نے کبھی ایسا رویہ رکھا کہ یہ کوشش کرتی ہے۔۔۔؟“

”بابا۔ تمہیں تو میں ہی مجرم نظر آتا ہوں۔“ فضل دین چینا۔

”اس لیے کہ تم مجرم ہو۔ اور اس میں شک کی گناہیں نہیں۔ تم نے تو اپنے جرم میں مجھے بھی شریک کیا۔ میں خود شرفاں سے شرمندہ ہوں۔ وہ کیا سوچتی ہوگی کہ میں نے ذرا سے احسان کا بدلہ اتنا بڑا لیا اسے جکڑ کر رکھ دیا۔“ حیات محمد کی آواز بھڑائی۔ نجانے کیوں اسے شرفاں سے بہت اُٹس تھا۔ خود بخود اس نے حیات محمد کے دل میں جگہ بنالی تھی۔

”کہا ہے تو چلی جائے۔ جاؤ چھوڑ آؤ اسے جہاں جانا چاہتی ہے۔“ فضل دین بھڑک ہی تو گیا ”اوائے ہو لے بول۔ اگر مجھے خبر ہوئی کہ تو اس کے ساتھ یہ سلوک کرے گا تو میں کبھی بھی بات نہ مانتا۔ چاہے تو مر ہی جاتا۔“ حیات محمد کے لفظ کیا تھے چنگاریاں تھیں جو فضل دین کا اندر دھکا تھیں۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اور تاباں حیات محمد سے لپٹ گئی۔

”بابا۔ ذرا بھی ابا کو احساس نہیں ہے۔ ہمیشہ تنگی تلوار بنا رہتا ہے۔ بابا تم ابا کی دوسری شادی اسے بیوی مل جائے گی۔ مجھے تو ماں نہیں ملے گی۔ یہی تو میری ماں ہے بابا۔“ تاباں سسک پڑی اس کے ہونٹوں پر یہی دم توڑ گئے تھے۔

”پپ۔ بابا۔“ شرفاں کی نحیف سی آواز نے کمرے کے سکوت میں ارتعاش پیدا کر دیا۔
تاباں تیزی سے آگے بڑھی اور پانی سے بھرا گلاس شرفاں کے لبوں سے لگا دیا۔ اس نے آگے بند کئے کئے ہی دو تین گھونٹ لیے اور پھر اسی طرح غنودگی کی قبر میں اتر گئی۔

گز رے تین روز سے شرفاں کی یہی کیفیت تھی۔ دریا میں سے تو اسے فوراً نکال لیا گیا تھا مگر وہ بے ہوش تھی۔ دو دن تک تو حیات محمد کے کمرے میں بستی والوں کا رش لگا رہا تھا اور فضل دین کو کچھ کہنے کا نہیں ملا تھا۔ مگر آج اس کے اندر کالا دبا ہوا آگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شرفاں کو مر جانا چاہیے تھا مگر

یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

حالانکہ وہ شرفاں کو بے توجہ چاہتا تھا۔ جن دنوں وہ گھر سے دور ہوتا تو اسے شرفاں بے تحاشہ آتی تھی۔ مگر اس کے قرب میں فضل دین کو جب اپنی شدتوں کا جواب سرد مہری سے ملتا تو اس کا جی کہ وہ شرفاں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے جو اس کی ہوتے ہوئے کسی اور کے تصور کی دنیا میں جا کر جیت تھی اور فضل دین کو زندہ دگر دگر دیتی تھی۔ یہ واقعی اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ پہلے تو حیات محمد ڈانٹ ڈپٹ کر شرفاں کو بچاتا تھا۔ مگر اب تاباں بھی جو ماں کی ڈھال بن جاتی تھی۔ وہ ماں کو ڈھکی چھپی سے اسے خود بخود دینی یہ ادارک ہو گیا تھا کہ اس کی ماں یہاں گھل مل اس لیے نہیں سکی کہ اس کی بلی بڑھی ضرور ہے مگر اس نے یہاں جنم نہیں لیا۔ اور جیٹلی زندگی کے وہ دھندلے دھندلے نقوش شکلوں میں اسے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ تاباں کو ماں پر اس قدر پیار آیا کہ اس نے ماں کی اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اور آنسوؤں کا ایک تیز ریل اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔

وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ کلاس لے کر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی عفیرہ امیر آتی نظر آئی تو وہ ٹھٹک گیا۔ عفیرہ نے ان تینوں کو دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلایا تھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

”ہیلو ایوری باڈی۔“

”ہیلو۔ کہاں عاصب تھیں؟ میڈم احسان کی کلاس بھی تم نے نہیں لی۔“ وہاں نے پوچھا۔

”میں میڈم کی کلاس لے کر کوئی احسان نہیں لینا چاہتی تھی۔“

”سوال کچھ کرو۔ جواب کچھ دے گی۔“ آصف کا نجو چلبلا کر بولا۔

”یار۔ تم نہ بولو تو ہاضمہ خراب ہوتا ہے تمہارا؟“ عفیرہ نے اسے کہا۔

”مجھ سے بات مت کرو۔“ آصف کو غصہ آ گیا۔

”تم خود ہی بات کرتے ہو۔ مجھے شوق نہیں ہے بات کرنے کا۔“ عفیرہ ترخ کر بولی۔

”چھوڑو بھی۔ کہاں سے آرہی ہو؟“ وہاں بحث سمیٹتا ہوا بولا۔

”ہاسٹل سے۔“

”جواب کہیں ملی؟“

”تم تو عاصب ہو گئے تھے۔“

”سراج بھائی نے بہت اہم کام کے سلسلے میں بلایا تھا۔“ وہاں نے جلدی سے کہا۔ مگر نہ جانے

کیوں اس کے اندر ایسا درد اٹھا تھا جو پورے وجود پر مسلط ہو کر رہ گیا تھا۔

”میں نے پھر فلک“ جو اس کی کرلیا ہے۔“ عفیرہ نے اطلاع دی۔

”تم تو لو کر آئی تھیں۔“ فرحت ہنس کر بولا۔

”بھئی پرانا ساتھ ہے حلیٰ صاحب کے ساتھ۔ انہوں نے معذرت کی تو میں نے کہا چلو نرے

دکھانے کا کیا فائدہ۔ مجھے ان کے علاوہ کوئی جھیل ہی نہیں سکتا۔“ عفیرہ نے ہنس کر کہا اور پھر وہاں کی

طرف جھٹکتے ہوئے بولی۔

”یار۔ کیا حال ہے تمہاری ماموں زاد کا؟“

”جا کر پوچھ لو۔“

”یونہی وہ شک میں مبتلا ہو جائے گی۔“ عفیرہ شرارت سے بولی۔

”کیسا شک؟“ وہاں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی کہ کہیں تمہارا مجھ سے چکر تو نہیں چل رہا۔ اور پھر تم فضول میں وضاحتوں میں وقت گنواؤ

گے۔“

”بکومت۔“ وہاں ہلش ہو گیا۔ اور عفیرہ پوچھ رہی تھی۔

”یارو بھی۔ تم اس روٹھے منانے کے سلسلے سے اب بے نہیں ہو؟“

”نہیں۔ یہی تو زندگی ہے۔“ وہاں نے جلدی سے کہا۔

”پوچھوں گی بچو۔ ذرا اسے محبوبہ سے بوی بننے دو۔“

”کیا ہوگا پھر؟“

”پھر پتا چلے گا زندگی اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔“ عفیرہ نے آنکھیں نہچائیں تو آصف کا نجو

ہنک سا گیا۔

عفیرہ کے لب تو مسکرا رہے تھے مگر آنکھوں میں نمی کے ساتھ سرخ ڈورے بھی لہرا رہے تھے کی پلکیں بھی جھپکی ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں متورم بھی تھیں۔ لگتا تھا آنکھوں کو خوب آنسوؤں کا غسل کر ہو۔

”کیوں روٹی ہے یہ؟“ آصف کا بنجوا دل کٹنے لگا۔

”یہ تو کہسار کی مانند ہے۔ بڑے سے بڑا ڈاکھ ہتے پھلتے برداشت کرنے کی ہمت ہے اس عام لڑکیوں سے زیادہ حوصلہ ہے۔“

پھر اس پہاڑ کے دامن سے اشکوں کا چشمہ کیوں اور کیسے پھوٹا؟

آصف کا بنجوا نے ایک بار پھر عفیرہ کی طرف دیکھا جو فرحت سے کہہ رہی تھی۔

”میرا کل جھنے والا آرٹیکل پڑھنا میں نے آج کل کی عدالتوں کے رویے کے بارے میں ایک دم آفت بخشی صاحب تو پڑھ کر پھرک گئے۔“ عفیرہ کا چہرہ جوش سے تپا ہوا تھا۔

”ایسے نازک موضوعات کو مت چھیڑا کر عفو۔ کسی دن مصیبت نہ ہو جائے۔“ وہاں نے دھیر سرج سے اسے سمجھایا۔

”یار جو ہونا ہے ہو جائے۔ یہ جو دنیا ہے وہاں احمد۔ یہ مکڑی کا جالا ہے جس میں بندہ پھنس کر ہے۔ اور پھر نکلنے کے لیے اتار دیا جاتا ہے۔“ وہاں نے پوچھا۔

”تو تم زندگی سے جان چھڑانا چاہتی ہو؟“ وہاں نے پوچھا۔

”شاید زندگی سے فرار اسی کو کہتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”تو پھر راوی کے پل سے کود جاؤ۔“ آصف برداشت نہ کر سکا اور بول پڑا۔

”وہ تم ہی کو زیب دیتا ہے۔ اور تمہارے ہی حالات ایسے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ آصف کا بنجوا۔ وہ ہاتھ نہ چاتے ہوئے بولی۔

”یار۔ تم کیوں ہمیشہ شمشیر برہنہ رہتی ہو۔ آصف کی بات تو تمہیں گولی بن کر لگتی ہے۔“ فرحہ آصف کی حمایت کی۔

”مجھے محبت کی زبان راس نہیں آتی نا۔“ عفیرہ ہنسی جیسے کاٹھنکھڑ گیا ہو۔

”کیا مطلب؟“ فرحت اور وہاں نے چونک کر پوچھا۔

”ارے تمہیں پتا نہیں۔“ عفیرہ پھر ہنسی۔

”کیا پتا نہیں؟“

”بھئی آصف کا بنجوا نے اپنے خوابوں میں مجھے بسا لیا ہے۔“ عفیرہ نے ترجیحی نظر سے آصف کے تپتے چہرے کو دیکھا۔

”تم اس قابل ہو؟“ آصف اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے براہ راست بولا۔

”یہ تو اپنے دل سے پوچھو۔“ وہ بھلا کب باز آنے والوں میں سے تھی۔

”واقعی آصف۔“ فرحت نے آصف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”یار بکواس کرنے کی تو اس کی پرانی عادت ہے۔ تم مجھ سے بات مت کیا کرو عفیرہ۔“ آ بس نہیں چل رہا تھا۔ اس مسکراتی ہوئی عفیرہ امیر کے ہونٹوں سے مسکراہٹ نوج لے۔

کتنا ملکہ حاصل تھا اسے خود پر سے توجہ ہٹانے کا۔ وہ چپ چاپ اپنی طرف ہر ایک کو متوجہ کر اہلیت رکھتی تھی اور جب چاہتی گیندا اپنے کورٹ سے نکال پھینکتی تھی۔ آصف کا بنجوا نے اس جیسی لا

تک نہیں دیکھی تھی۔ پل میں کچھ اور پل میں کچھ۔

”یہ ایسی کیوں ہے؟“

”ارے کیا واقعی عفیرہ صبح کہہ رہی ہے۔“ وہاں آنکھیں نہایتا ہوا اس سے پوچھ رہا تھا۔

”اس نے کبھی سچ کہا ہے کچھ جواب کہے گی۔“ آصف کچکا کچکا کر بولا۔

”اے۔“ میں ہمیشہ سچ بات کرتی ہوں اور ڈنکے کی چوٹ پر کرتی ہوں۔“ وہ اس کے سامنے تکی کھڑی تھی اور آصف کا بنجوا اسے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ ہمیشہ کی طرح وہ ہار گیا تھا۔ سچائی کا سامنا وہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کتنے ہی عہد کرتا تھا مگر سارے عہد عفیرہ کو دیکھ کر ٹوٹ جاتے تھے۔ جیسے جی مٹی کے برتن ہوں۔

”دیکھو عفو تم نے اسے خفا کر دیا۔ تمہیں پتا ہے آصف ہمارا کتنا اچھا دوست ہے۔“ وہاں کہہ رہا تھا۔ تب وہ چہرے پر آئے بالوں کو جھٹکنے سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

”پتا ہے مجھے۔ مگر اس سے کہو کہ اسے دل اور نظروں کو قافلو میں رکھا کرے۔“

”یہ تو بے اختیار جذبہ ہے عفو۔ اگر وہ تمہیں چاہتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟“

”لیکن میرا خیال ہے جو تم بھی ہو وہ بات نہیں ہے۔“ زوہیب نے پہلی بار ان کی بحث میں حصہ لیا۔

”تم مجھے چیلنج نہیں کر سکتے زیو۔ وہ عورت ہی کیا جو مرد کی نظر نہ پہچان سکے۔ اگر میرا دعویٰ غلط ہو تو اڑا دو گردن۔“

”میں نہیں مان سکتا۔“ زوہیب اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ آصف جیسے روایت پسند شخص سے مجھے یہ امید نہیں ہے۔ اسے تو بڑی ڈھکی چھپی لڑکیاں پسند ہیں عفیرہ۔ امیر وہ تم جیسی مرد مار لڑکی کو دل میں بسانے کی غلطی نہیں کر سکتا۔“

”مگر وہ یہ غلطی کر چکا ہے زوہیب جعفری۔“

”اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔“ زوہیب ڈٹا ہوا تھا۔

”یقیناً غلط ہو جاتے ہیں اندازے مگر میں نہیں مان سکتی کہ کبھی میرا اندازہ غلط ہوا ہو۔“ عفیرہ اپنی بات سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہ تھی۔

”اچھا۔ زیادہ بقرط کی خالہ مٹ بنو۔ اگر ایسی بات ہے تو تم آصف کا بنجوا محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دیتیں؟ کیا وہ تمہیں اچھا نہیں لگتا؟“

”مجھے وہ اچھا ضرور لگتا ہے۔ اب اتنا بھی نہیں کہ ساری زندگی کا ساتھ چاہنے لگوں۔ اور سچ پوچھو تو زوہیب جعفری میں تو یہ شادی وادی کو بکواس سمجھتی ہوں اور محبت میرے نزدیک سوائے فلرٹ کے کچھ نہیں۔ ہم نے فلرٹ کو محبت کا نام دے دیا ہے۔ ورنہ آج کا انسان اتنا مطلب پرست ہو گیا ہے کہ وہ سوائے اسے اور کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ یہ جذبہ میرے نزدیک دنیا کا سب سے ناپائدار جذبہ ہے۔ پانی پر بنے قلعوں کی طرح جو راسی ہوا سے مٹ جاتے ہیں۔ اور محبت بھی ایسا ہی اُبال ہے۔“

”عفو۔ یہ مت کہو۔ محبت تو کائنات کا خوبصورت ترین جذبہ ہے۔“ وہاں نے اس کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

”تم کہہ رہے ہو نا۔ محبت کو نفرت میں بدلنے نہیں دیکھا۔ اور جس روز دیکھو گے تو احساس ہوگا کہ عفیرہ امیر سچ کہتی تھی۔ پتا نہیں میں کہاں ہوں گی۔ مگر تم مجھے ضرور یاد کرو گے۔“

”تم یہیں ہوگی۔“ وہاں ہنس دیا۔ اور تبھی آصف کا نچوان کی طرف لوٹ آیا۔
”وہ تمہیں چین نہیں آیا ہمارے بغیر؟“ عقیقہ اسے جھپٹے بغیر نہ رکھی۔
”میں وہاں کو بلانے آیا ہوں۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔

”یہاں اچھے کر لیتے ہو۔“

”عقیقہ! امیر صاحب۔ آپ مجھے سے بات مت کیا کریں۔“ آصف نے کہا تو عقیقہ نے فضا
قہقہہ اچھا لتے ہوئے کہا۔ ”واہ۔ بڑے تیز دار ہو گئے ہو۔“
”میں ہاسٹل جا رہا ہوں۔“ آصف اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”زیو کمرے کی چا
تو دے دو۔“

”یار! کٹھن چلیں گے۔ سر مبارک کی کلاس ہو جائے تو۔“

”مجھے کام ہے۔“ آصف قطعاً کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”لو پھر۔“ زوہیب نے اپنی پتلون کی جب سے چابی نکال کر وہاں کے حوالے کی۔

”سنو۔“ تم اپنی چابی اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔“ عقیقہ نے شوخی سے کہا تو وہ سب ہنس دیے
آصف کا نچو اپنی ہنس نہ رک سکا۔

”بہت بڑی شے ہو تم۔“ آصف نے عقیقہ سے کہا۔ اور تیزی سے زیر اثر گیا۔ عقیقہ ہونٹوں
ہنسی دبا کر رہ گئی۔ یہاں کیوں ایسے آصف کو جلا ناٹا پانا اچھا لگتا تھا۔ جب وہ بار بار چنٹتا تھا تو عقیقہ
معلوم سے جذبوں کی تسکین ہوتی تھی اور یہی تسکین پانے کے لیے وہ اسے چھیڑ دیتی تھی۔ اپنی اس کیفیت
سے وہ خود بھی حیران تھی۔

”آخر مجھے کیوں خوشی ہوتی ہے آصف کا نچو جلا کر۔“

میں ایسی تو نہیں۔

یا میرے اندر کا کوئی جذبہ ہے؟ مگر کون سا جذبہ؟“ عقیقہ کی نظروں کے سامنے سوالیہ نشا
بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اندر ایک عجیب سا شور مچا ہوا تھا۔

”سنو۔“ مجھے چائے تو پلاؤ۔“ عقیقہ اپنے اندر کے شور کو دباتے وہاں سے بولی۔

”سر مبارک کی کلاس کے بعد۔“ وہ بولا۔

”نہیں ابھی۔ پتا ہے میں بغیر ناشتا کیے آئی ہوں۔“ عقیقہ نے بتایا۔

”تو تم ناشتا بھی کرو گی؟“

”ہوں۔“ وہ بچوں کی طرح سر ہلا کر بولی۔

”دیکھو ڈیر۔ اس کلاس کے بعد ہم فارغ ہوں گے۔“

”میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ بس چلو۔“ عقیقہ پاؤں پیچ کر بولی۔

”اچھا۔ تم کیسے میرا چلو۔“

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ صرف پانچ روپے پڑے ہیں۔ میں نے ”فلک“ کے آفس بھی جا
ہے۔“ عقیقہ نے بتایا۔

”نہیں کس نے کہا ہے کہ اپنی مالی پوزیشن واضح کرو۔“ وہاں نے ڈانٹا۔

”اس کے بغیر تم شاید نہ چلو۔“ وہ مسکرائی۔ ”یاریج بہت بھوک لگی ہے۔“

”چلے جاؤ نا۔“ زوہیب کو عقیقہ پر ترس آ گیا۔

”لیکچران سے لیے لینا۔“ عقیقہ نے فرحت اور زوہیب کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ بات نہیں ہے غنو۔ اصل میں سر مبارک اتنا اچھا لکچر دیتے ہیں کہ مٹ کرنے کوئی نہیں چاہتا۔

”نہیں پتا ہے ہفتے میں صرف ایک کلاس ہوتی ہے ان کی اور۔۔۔“

”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی۔“ عقیقہ نے کندھے سے اُچکائے مگر نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں
کے درمیان کچھ گلیے ہو گئے۔

آنکھیں تو روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں جن سے ہر دکھ سکھ کا جذبہ نہایت سفاکی سے جھانکتا ہے۔
جس جذبے کو چھپایا بھی جائے۔ اس کی بھی لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے۔ وہاں احمد کا دل دکھ کر رہ گیا اور اس
نے فوراً ہی عقیقہ کے ساتھ کیسے تک جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہاں اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”تم آنسوؤں کے نام سے واقف ہو غنو؟“

”کیا مطلب؟“ عقیقہ کچھ نہ سمجھی۔

”آج پہلی بار میں نے تمہاری آنکھوں میں نمی دیکھی ہے۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اور ہوا بہت تھی نا۔“ عقیقہ بے پروائی سے بولی۔

”تو تمہاری آنکھوں کو ہوا لگ گئی۔“ وہاں ہنسا۔

”ہاں۔ ہوا لگنے سے بھی آنکھوں میں پانی آ جاتا ہے۔“ عقیقہ نے بتایا۔

”غنو۔ تم مجھے بیوقوف سمجھتی ہو؟“

”یہ بات تو میں نے نہیں کہی۔“

”پھر کیا بات ہے تم مجھے ڈیر پسند لگ رہی ہو۔ کیوں؟“

”اے ناشتا کروانا ہے تو کراؤ“ میرے ذاتی معاملات میں دخل مت دو۔“ عقیقہ نے اسے جھڑک
دیا۔

”سنو! میں آصف کا نچو نہیں ہوں۔“ وہاں نے یاد دلایا۔

”وہ تو تم ہو ہی نہیں سکتے۔“ وہ بھرپور طریقے سے مسکرائی۔ تو وہاں اسے دیکھ کر رہ گیا۔ آنسوؤں
سے ہلکی ہلکی اس کی بھوری آنکھیں نہایت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

”کل سے مجھے فلو بھی ہے۔“ عقیقہ نے وہاں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ مگر وہاں نے اسے
کوئی جواب نہ دیا اور اس کے ساتھ چلتا رہا۔

”تم یہاں بیٹھو! میں ناشتا لے آئی ہوں۔ تم کھاؤ گے؟“ پیپل تلے پڑی سینٹ کی بیچ پر اس
نے۔۔۔ انا بیگ تقریباً بیٹھتے ہوئے کہا۔

”صرف چائے۔ میں تمہاری طرح بھوکا نہیں ہوں۔“ وہاں نے شرارت سے کہا۔ وہ ہنس کر آگے
بڑھی کہ ایک دم ہی پلٹ آئی اور ہنستے ہوئے بولی۔

”یار۔۔۔ پیسے تو دو۔“ وہاں نے اسے سو کا نوٹ دیا تو وہ تقریباً بھاگتی ہوئی کیسے میرا میں چلی گئی۔
وہاں اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ اس کے پاس بیٹھی ناشتا کرتے ہوئے کہہ رہی
تھی۔

”پچھلے دنوں مجھے تمہاری بہت ضرورت تھی۔“

”کیوں؟“ وہاں نے پوچھا۔

”وہ یار۔ میرے ماما جیل میں ہیں نا۔“

”کیوں؟۔ کب سے؟“ وہاج نے حیرت سے پوچھا۔ یوں بھی آج پہلی بار اس نے خاندان کے کسی فرد کے بارے میں بات کی تھی ورنہ کب کسی کو وہ اجازت دیتی کہ وہ کب کب سے۔
”بس ایک کیس میں چلے گئے۔“ عفیہ کے انداز میں حد درجہ سے پروائی تھی۔ وہاج سمجھ گیا کہ بتانا نہیں چاہتی اور جب اس کا جی چاہے گا خود ہی بتائے گی۔ اس کی یہ عادت وہ جانتا ہی تھا۔
”اچھا۔ تمہیں میری ضرورت کیوں تھی؟“

”اصل میں نیانجیل سپرنٹنڈنٹ آیا ہے۔ اور وہ مجھے ماما سے ملنے نہیں دیتا تھا۔“ عفیہ نے بتایا
”پھر؟“

”میں نے سوچا کہ تمہارے چاچو کی سفارش ہو جائے تو۔ مگر اب وہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔“ عفیہ ہچکچاتی ہوئے کہا۔

”کیسے؟“ وہاج جانتا چاہتا تھا۔

”بھئی میں خود اس کے آفس پہنچ گئی۔“

”اوہ۔“

”اور مجھے اندازہ ہوا کہ بڑے آفیسر کے حواریوں سے بچ بچا کر بندہ خود ڈائریکٹ آفیسر تک جائے تو کام ہو سکتا ہے۔ اور فردوس حمید صاحب نے مجھے خصوصی اجازت دے رکھی ہے۔ میں چاہوں ماما سے مل لوں۔۔۔ سفارشات کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ وہ بتا رہی تھی۔

”تم کیسی جیل جاتی ہو؟“ وہاج حیران تھا۔

”کس کے ساتھ جاؤں؟“ عفیہ امیر نے وہاج کی طرف دیکھا۔ اور وہاج کو لگا جیسے بے چاریاں ادھر ادھر بکھر گئی ہوں۔

”غفوا ایک پوچھو تم سے؟“

”ایسی بات نہ پوچھنا جس کا میں جواب نہ دے سکوں۔“ عفیہ نے حد عائد کر دی۔

”غفو۔ مجھے پتا ہے تم اندر سے بہت نرم ہو بالکل ریشم کے لپٹھوں کی مانند مگر تمہارا الجہ پتھر یلا ہے؟“

تمہارے لفظوں میں تپش کیوں ہوتی ہے۔ تمہارا انداز لٹھ مار کیوں ہوتا ہے۔ تم نے آصف کو ڈانٹا مجھے بہت برا لگا۔ مجھے پتا ہے تمہارے اندر بہت پیاری لڑکی چھپی ہوئی ہے۔“

”پتا ہے وہاج۔ میں نے اس لڑکی کو اس روز مار دیا تھا جس روز میرا ماما جیل میں آیا تھا۔ وہ سبھی اور دیو لڑکی جو اندھیرے سے ڈرتی تھی۔ تیز آندھی سے خوف کھاتی تھی۔ میں نے اسے قتل کر دیا عفیہ کا لہجہ نہایت دھیمہ مگر مضبوط تھا۔

”کیوں؟“ وہاج نے حیرانی سے عفیہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ جہاں عجیب سا اح

لہریں لے رہا تھا۔

”اگر میں اس لڑکی کو خود قتل نہ کرتی تو ہداری وہاج احمد تو اس شہر کے لوگ اسے ختم کر دیتے۔“ پاکیزگی اور معصومیت کو داغدار کر دیتے اور میں نے اس بے داغ لڑکی کو ایک رات خاموشی سے قتل کر دیا یہ کام میں نے ایک سردی تاریک رات میں کیا تھا وہاج۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج میری یہ شکل نہ ہوتی میرا وجود اس شہر کے گندھ نوچ چکے ہوتے۔ اور تم بھی بلکہ کوئی بھی مجھ سے بات کرنا گوارہ نہ کرتا۔“ عفیہ

بھی ابھی آنکھوں میں ایک انجانا سا احساس اودے اٹھا تھا۔

”پتا ہے وہاج۔ میرے اندر کی لڑکی نے بہت سارے خواب دیکھے تھے۔ پتا نہیں لڑکیاں شعور کی دلیلیں پر قدم رکھتے ہی خوابوں کی وادیوں میں کیوں اتر جاتی ہیں اور میں نے اس لڑکی کو اس کے خوابوں سمیت مار دیا۔ اب کوئی خواب مجھے تنگ نہیں کرتا کہ حقیقت کی نوکیلی چٹانوں پر چلنا اچھا لگتا ہے۔“

”یہ اذیت پسندی ہے غفو۔“ وہاج کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔

”نہیں۔ یہی سچا راستہ ہے۔“

”خواب تو روح کی جاگیر ہوتے ہیں۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے سے انسان دکھوں سے دور رہتا ہے۔“

”نہیں وہاج خواب روح کی جاگیر نہیں عذاب ہیں۔ اور پھر خواب دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ بے شک خوابوں کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے۔ مگر ان میں جا کر رہنا بے وقوفی ہے۔“

”نہیں غفو۔ تو وہی لڑکی بن جانا۔“ وہاج بھل گیا۔

”یہ۔۔۔ یہ تم چاہتے ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ آ گئی۔

”شاید ایک اچھی لڑکی کو میں مرنا نہیں دیکھ سکا۔“

”اب تو وہ مر گئی وہاج احمد۔“ عفیہ زور سے ہنسی جو خول چٹا تھا پھر جڑ گیا۔ مجھے تو میرے خاندان والے باغی کہتے ہیں۔ وہ خوش ہو کر بتا رہی تھی۔

”لیکن کیوں؟“ وہاج پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”میں سچائی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی وہاج۔ میرا ماما سچائی کی وہ مشعل ہے جس کی روشنی مجھے حوصلہ بخشتی ہے۔ روشنی کا ساتھ کوئی بد بخت ہی چھوڑ سکتا ہے۔ میرے خاندان والے کچھ بھی کر لیں۔ میں ماما کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے لہجے میں عزم جھلک رہا تھا۔

”تمت چھوڑو ساتھ مگر اس باغی لڑکی کو سمجھاؤ۔“ وہاج نے مشورہ دیا۔

”نہیں وہاج۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں غلط بات برداشت نہیں کر سکتی۔“ عفیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اور ایک دم ہی اٹھتے ہوئے بولی۔

”اب چلنا چاہیے۔“

”چلو۔“ وہاج بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں یہ لو بھائی۔“ اپنی شرٹ کی جیب سے وہ پیسے نکالنے ہوئے بولی۔

”رہنے دو۔“

”نہیں وہاج۔ لے لو۔ آج مجھے آرٹیکل کے پیسے مل جائیں گے۔“

”کہا ہے نارہنے دو۔“ وہاج نے سخت لہجے میں کہا۔

”ڈانٹ کیوں رہے ہو؟“ وہ منہ بسور کر بولی تو وہاج ہنس دیا۔ اور عفیہ نے پیسے واپس جیب میں ٹھونس لیے۔

”اب کہاں جاؤ گی؟“

”آفس۔ ذرا کام کرنا ہے۔ حلیمی صاحب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔“

”چھوڑ آؤں۔“ وہاج نے آفر کی۔

”نہیں چلی جاؤں گی احسان لینا میں پسند نہیں کرتی۔ پھر اب تو جیب گرم ہے۔“ عفیہ نے اپنی مخصوص

جون میں لوٹ آئی تھی۔ وہاں ہنس دیا اور جب رہا کہ اس طرح عفیرہ کا پردہ رہ جاتا تھا۔ وہاں اسے نہیں چاہتا تھا کہ وہ خود کو کتنا ہی ناقابلِ شہرہ سمجھتا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔

☆☆☆

عفیرہ امیر نے بے قرار ہو کر کھڑکی کے پردے سمیٹ لیے۔ اس کمرے میں گھٹن سی محسوس رہی تھی۔ کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر کا منظر روز کا دیکھا بھلا تھا۔ مگر اچھا لگ رہا تھا سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش۔ انسانی زندگی بھی تو ایسی ہی ہے۔ بندہ بھی تو ایک دوسرے سے آگے نکلتا چاہتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ کس کو روند رہا ہے۔ کون کتنی عزیز ہوتی ہے جسے وہ روندنا ہوا جا رہا ہے۔

مگر چوہدری مراد حسین تو عزیز ترین ہستی نہیں تھا جسے ماما شیر محمد نے مار ڈالا۔

وہ تو دھڑکی پر بوجھ تھا۔

وہ لیڑا تھا۔

اور اس لیڑے کو ماما شیر محمد نے مار دیا۔ کاش ماما تم سوچتے تو سہی کسی طرف تو دیکھ لیتے۔ ایک مجھے ہی دیکھتے تو شاید ایسا نہ کرتے۔ مگر تم تو کہتے ہو تم نے مجھے دیکھ کر ہی یہ قدم اٹھا لیا تھا۔

عفیرہ کو بہت اچھی طرح یاد تھا۔ جب سارے خاندان کی مخالفت مول لے کر ماما شیر محمد نے اسکول میں داخل کرایا تھا۔

اس کا باپ امیر بخش غریب باری تھا۔ اور ان کے ہاں کوئی تصور نہ تھا۔ بڑھائی کا۔ گاؤں میں اسکول کھلا تو ماما شیر محمد نے عفیرہ کو داخل کروا دیا حالانکہ وہ لڑکوں کا اسکول تھا۔ مگر شیر محمد جس کی ابھی ہی بھگ رہی تھیں لیکن بہت جی دار نو جوان تھا اور چوہدری کا خاص آدمی تھا۔ اس لیے اس کے کہ عفیرہ کو اسکول میں داخل کر دیا۔

یہی تو پہلی بغاوت کی تھی عفیرہ نے۔ پورا خاندان ایک طرف تھا کہ عفیرہ نہیں بڑھے گی۔ مگر ماما شیر محمد کا پلڑا بھاری رہا تھا کہ عفیرہ کی خواہش بھی تھی۔ اسے کتابیں اچھی لگتی تھیں۔ اگلے سال شیر محمد نے چاہا کہ میرہ یعنی گڈی کو بھی اسکول میں داخل کرادیا جائے مگر سب کی مخالفت کے علاوہ خود گڈی نے بھی انکار کر دیا۔

یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ چوہدری مراد حسین کا خاص آدمی ہونے کی وجہ سے شیر محمد چوہدری سارے چھوٹے بڑے رازوں میں شریک رہتا۔ حتیٰ کہ ایک بار چوہدری مراد حسین نے کوٹھے پر چھگڑا تو شیر محمد نے اسے تو چپکے سے نکال لیا۔ مگر خود گرفتار ہو گیا لیکن دوسرے روز ہی چوہدری مراد حسین اسے چھڑوا لیا۔

اس نے کہا تھا۔

”شیر محمد تو نہیں تھا تو مجھے لگا جیسے میرا بازو وہی کہیں کھو گیا ہے۔“ اور شیر محمد فخر سے اور اکر گیا تھا۔ یونہی وقت گزرتا رہا۔ شیر محمد چوہدری مراد حسین کے ساتھ لگ کر اپنا گھر بسانے کا خیال ہی بھولا کہ اس نے بھی گھر کی ضرورت محسوس ہی نہ کی تھی۔ اس کے گھر والے اس کی حرکتوں سے نالاں ضرور مگر کہتے نہیں تھے کہ انہیں علم تھا پشت پر چوہدری کا ہاتھ ہے۔

البتہ امیر بخش نے دے لفظوں میں کئی بار اسے سمجھایا تھا۔

”دیکھ شیرو! یہ امیر لوگ کسی کے سامنے نہیں ہوتے۔ تو اپنی راہیں الگ کر لے ان سے۔ کسی

ایسا چھپنے گا کہ رہائی نہیں ملے گی،“ مگر شیر محمد ہنس کر نال گیا۔

گھر جاتا تو سوائے عفیرہ کے کوئی بھی اس سے بات نہ کرتا۔ عفیرہ اسے اپنی بڑھائی کی بابت بتاتی۔ اپنی رائیٹنگ دکھاتی۔ اور کورس کی نظمیں سناتی تو شیر محمد خوشی سے پھول جاتا۔

وہ گھر آتا ہی عفیرہ کے لیے تھا۔ دو چار روز اسے نہ دیکھتا تو محسوس ہوتا جیسے کہ کچھ کھو گیا ہو۔ پھر ایسا ہوا کہ امیر بخش جو کہتا تھا۔

”شیر محمد! کبھی تو ایسا چھپنے گا کہ رہائی نہیں ملے گی۔“ تو ایسا تو نہ ہوا تھا۔

شیر محمد پھنس ضرور گیا تھا مگر چوہدری مراد حسین نے اسے اس طرح بچایا تھا جیسے دودھ میں سے مکھی نکال لی جائے۔

چوہدری مراد حسین کے احسانات بڑھتے جا رہے تھے اور شیر محمد کی گردن جھکتی چلی جا رہی تھی۔ مراد حسین نے اپنی شادی کے موقع پر خوش ہو کر شیر محمد کے نام ایک مربع زمین کر دی تھی۔

مراد حسین کے التفاس سب کے دل وہلا رہے تھے۔ مگر شیر محمد تو مست مورا ہوا تھا۔

وقت کے سمندر میں دن سال بن کر گرتے رہے۔ عفیرہ نے میٹرک کیا تو شیر محمد نے اسے کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ عفیرہ کی ماں کتنی روٹی تھی۔ مگر شیر محمد نے ایک نہ کی تھی۔ اور اسے لیے لاہور آ گیا تھا۔ ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر کے وہ واپس گاؤں گیا تو یہ خبر اس کے لیے دکھ کا باعث تھی کہ عفیرہ کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔ وہ تنہا ہوا اپنے بھائی دلیر محمد کے ہاں پہنچا تھا جس کے بیٹے ضمیر محمد کی عفیرہ شیکرے کی مانگ تھی اور اس نے منگنی توڑ دی تھی۔

”لاالہ! تمہیں ہمت کیسے ہوئی یہ منگنی توڑنے کی؟“

”میرا بیٹا بڑھا لکھا نہیں ہے شیرو؟ اور یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“ دلیر محمد نے رمانیت سے جواب دیا۔

”یہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟“ شیر محمد تڑخ کر بولا۔

”ہاں! وہ تو بہن کا لکا تھا۔ ورنہ میں کب سے یہ رشتہ توڑ دیتا۔ اب تو شہر جا کر لڑکی ہاتھ سے ہی نکل جائے گی۔ وہ وقت آنے سے پہلے ہی میں نے بات ختم کر دی۔ اگر سلیمہ چاہے تو گڈی دے دے۔“

”ایک بہن بڑی ہے تو دوسری اچھی ہوگی۔“ شیر محمد کچکا کر بولا۔

”وہ بڑھی لکھی نہیں ہے۔“

”یہ اضافی خوبی ہے گڈی کی“ شیر محمد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بھائی کو رگید دے۔ وہ تنہا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ پھر چوہدری مراد حسین نے اسے اپنے کسی کام سے کراچی بھیج دیا کہ وہ بی ٹیلنری لگا رہا تھا۔ اس کی مشینری جاپان سے آچکی تھی۔ وہ اس نے لینے کے لیے شیر محمد کو بھیجا تھا۔ وہاں شیر محمد کو دو دھننے لگ گئے۔ واپس آیا تو مشینری اس کی نگرانی میں فٹ کی جانی تھی۔ مزید دن گزر گئے۔ اور عفیرہ سے ملنے جب گیا تو بیڑہ ماہ گزر چکا تھا۔

”آپ تو مجھے ہاسٹل میں چھوڑ کر بھول ہی گئے بابا“ عفیرہ نے اسے دیکھ کر نہایت ہی معصومیت سے شکوہ کیا تو شیر محمد نے ہنس کر اسے گلے لگا لیا۔

”تم نے شہر کی سیر کی؟“

”ناں۔“ عفیرہ نے آنکھیں پٹیٹائیں۔

چلو آج تمہیں شہر لاہور کی سیر کرا دوں“ شیر محمد نے کہا تو وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ باب

”عفی! تیرا ضمیر محمد کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”کیا جواب چاہتے ہیں آپ؟“ عفرہ کے بندلیوں کو جنبش ہوئی۔

عقیرہ نے اپنے ماما سے جو وعدہ کیا تھا وہ نباہ رہی تھی۔ وہ جوانی کی دو قسم کی لڑکی تھی۔ اس کا دل میں بھی کوئی دوست نہ بنائی تھی۔ پڑھائی میں وہ بہت اچھی تھی۔ لڑکیاں اس سے دوستی کرنا چاہتی تھیں وہ خود ہی کسی سے گھلتی ملتے نہ تھی۔ بہت جلد ”مغزور“ کے نام سے مشہور ہو گئی۔ سب کا خیال تھا کہ وہ کے زمیندار کی بیٹی ہے بھی تو اکڑتی ہے۔ اس کی چال ڈھال نے اسے افرادی حیثیت دے دی تھی۔ نے بھی کسی کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہ کی تھی کہ وہ تو تھمیر گاؤں کے معمولی مزارع کی بیٹی ہے۔ وہ انٹر کے امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ شیر محمد اسے لینے آ گیا۔ وہ گھر پہنچی تو کئی کی شادی تیاراں عروج پر تھیں۔ گڈی کی شادی ضمیر سے ہو رہی تھی۔ عقیرہ نے بہن کی شادی میں بڑھ چڑھ کر لیا تھا۔ اس کی چٹھیاں ہی تو تھیں۔ اس لیے نہایت سکون سے وہ شادی کے ہنگاموں میں پیش پیش تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اس کو نہایت حیرت سے دیکھتیں جیسے دو سال شہر میں رہ کر وہ کوئی عجوبہ بن گئی۔ اپنی اہمیت اسے بہت اچھی لگتی پر گڈی بیاہ کر چلی گئی۔ گھر سونا گر گئی تھی۔ مگر ماں بہت مطمئن تھی اور عقیرہ دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی کر۔

”تیرہ دن ہو گئے ہیں۔“

دیا۔ وہ جو کالج جاتی تھی تو بڑی سی چادر میں خود کو چھپا کر جاتی تھی۔ دوسرے روز جب وہ ہاسٹل سے نکلی تو لڑکیوں نے اسے نہایت حیرت سے دیکھا تھا۔ سیاہ قمیض سفید شلوار اور سفید ہی دوپٹہ میں وہ باہر جا رہی تھی۔ دوپٹہ نہایت لا پرواہ انداز میں اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ کندھے پر پرس لٹک رہا تھا۔ وہ سب سے بے پروا تو لڑکیوں کے لیے بغیر جا رہی تھی کہ آج تو اس کی ٹوہری نرالی تھی سب ہی حیران تھے۔ وہ کتنی بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ وہ سڑک پر آ گئی۔ اور پھر رکشہ لے کر سینٹرل جیل روانہ ہو گئی۔



”اور آپ آج آئے ہیں بابا؟“
”کیا کریں۔ انجین ایسی رہیں۔ کل اسے یہاں جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ چوہدری کے سے اس کا بھائی فیروز حسین بھی ہمارا دشمن ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اس کا مقدمہ نہ لڑیں۔“ امیر بخش اسے بتایا۔
”کیوں بابا! اماں کا مقدمہ کون لڑے گا؟“ عفریہ نے پوچھا۔
”پتر! ہم چوہدریوں سے دشمنی نہیں لے سکتے۔“ امیر بخش نے سمجھایا۔
”اس میں دشمنی کی کیا بات ہے کہ آپ دفاع نہ کریں۔“
”تو نہیں سمجھے گی۔ ہمیں فیروز حسن زمینوں سے بے دخل کر دے گا۔ ہم سے گھر چھین لے! بزرگوں کی مٹی چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے؟“
”بابا! یہ ظلم ہے۔“
”ظلم تو اس نے کیا ہے۔ قدم قدم پر میں نے اسے سمجھایا تھا کہ چوہدریوں سے یاری نہ رکھو۔ پھنسے گا تو مٹی ہو جائے گا مگر اس نے تو ایک نہ سنی۔ اور اب بتانا بھی نہیں ہے۔“
”میں پوچھوں گی۔“ عفریہ نے کہا۔
”تجھے بتائے گا۔“
”کیوں نہیں؟“ عفریہ نے آہستہ سے کہا۔
”تو سب چھوڑ میرے ساتھ گھر چل۔“ وہ بولے۔
”میں کہیں نہیں جاؤں گی بابا۔ میرا اماں شہر میں ہے تو میں بھی یہیں رہوں گی۔“ عفریہ نے کہا۔
”بھلی ہو گئی ہے۔“ امیر بخش نے ہنسا۔
”بابا! آپ سب ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ مگر میں نہیں چھوڑوں گی۔“ عفریہ نے پُر عزم لہجے میں پھر امیر بخش نے محبت سے ڈانٹ سے اسے سمجھانا چاہا مگر پتا نہیں کیسی ضد تھی جو ایک دم ہی اس کے سے عود کر آئی تھی کہ پورے وجود پر مسلط ہو گئی تھی۔
امیر بخش کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔
میں کیسے رہوں گی؟ سب سے الگ ہو کر۔ تنہا زندگی نہیں گزاری جاتی۔
عفریہ تم تو بادل کی گرج سے ڈر جاتی ہو۔ اس دنیا کے وسیع سمندر میں کس طرح رہو گی؟
کوئی بار بار سرگوشیاں کرتا۔
اسے لگ رہا تھا۔ جیسے وہ لبق دوق صحرا میں تنہا ہو جہاں چاروں طرف ریت کے بگولے اڑ رہے ہوں۔ اور یہ ریت اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ دور دور تک اسے کہیں نخلستان کا نشان تک نظر رہا تھا۔ سوچوں نے اسے اڑھ موا کر دیا تھا۔
وہ نڈھال سی ہو گئی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا تھا۔ کتنا وقت بیت گیا تھا۔
جیسے جگ بیت گئے ہوں۔ صدیاں گزر گئی ہوں۔
اس نے کھانا بھی نہ کھایا تھا نہ ہی شام کو ٹینس کھیلا تھا۔ بے دم ہی وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوچوں نخلستان میں آبلہ پا گھوم رہی تھی۔ اس کے اندر ایک جنگ چھڑی ہوئی تھی۔
رات ہو لے ہو لے گزر رہی تھی۔
اور اندر کی جنگ میں وہ دبو سی بزدل عفریہ امیر کا قتل ہو گیا۔ اس نے خود ہی اس معصوم لڑکی کو

سرفراز احمد کو اب بھی شاید یقین نہ آیا تھا۔

”شک کی وجہ؟“ عفریہ کے ہونٹوں پر مدہم مسکراہٹ آ گئی۔

”ویسے ہی۔ کہ مجھے یقین نہیں آ رہا آپ ایک قاتل کی بھانجی ہیں۔“

”ان جیسے جی دار شخص۔۔۔ کی بھانجی میں ہی اتنی جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ تنہا اس جیل میں آ کر جیل پرنٹنڈنٹ صاحب سے ان سے ملنے کی براہ راست اجازت طلب کرے۔“ عفریہ نے اطمینان سے کہا۔

”گڈ گرل۔“ سرفراز احمد وہ معصوم سی با اعتماد عفریہ امیر ایک دم ہی بہت اچھی لگی۔ صاف شفاف چہرے پر بن کا جل کے بھوری آنکھوں میں ایک عجیب سا گداز تھا جو سامنے والے کو خواہوا ہی متاثر کرتا تھا۔

”سر میں ماما سے ملنا چاہتی ہوں۔“ عفریہ نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

”آپ نہیں مل سکتیں۔“ سرفراز احمد نے ایک دم ہی انکار کر دیا۔

”کیوں؟“ عفریہ نے وجہ جاننا چاہی۔

”ابھی وہ ریمانڈ پر ہے۔“ سرفراز احمد نے اسے بتایا۔

”یہ ریمانڈ کیا ہوتا ہے؟“ عفریہ نے بے ساختہ پوچھا تو سرفراز احمد کا جی جا با وہ زور سے ہنس دیں۔ جس لڑکی کو یہ پتا نہیں کہ ریمانڈ کیا ہوتا ہے۔ وہ بھلا اتنی حوصلہ مند کیسے ہو سکتی ہے جو اس طرح بے دھڑک آ جائے۔

”پتا ہے سر!“

”دیکھو بیٹا! تم اپنی معصومیت کو مت قتل کرو۔“ وہ بولے۔

عفریہ کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

”جن باتوں کا علم نہیں مت جانوں ان کے بارے میں کہ نہ جاننا اتنا دکھ نہیں دیتا جس قدر جاننا دکھ دیتا ہے۔“ سرفراز احمد نے سمجھایا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ واقعی کچھ سمجھی نہ تھی۔

”نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے لڑکیاں بھولی بھالی ہی اچھی لگتی ہیں۔“

”سر! جب کوئی لڑکی ایک بار باہر نکلنے کا فیصلہ کر لے تو اسے اپنے بھولپن کو خود ہی ختم کر دینا چاہیے۔ ورنہ یہ دنیا اپنی سفاکی سے اس کے بھولپن کو ختم کر دیتی ہے کہ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل تو کیا اپنی شکل آئینے میں دیکھ کر ہی ڈر جاتی ہے۔ اور میں نے بھی اپنے بھولپن کی ساری کشتیاں جلا دی ہیں۔ میں نے اپنے ماما کا ساتھ دینا ہے کہ سارے خاندان نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اس کے لہجے میں غم جھلک رہا تھا۔

”آپ اکیلی ان کا ساتھ دیں گی؟“ سرفراز احمد نے اس نازک سی لڑکی کو حیرت سے دیکھا۔

”انہوں نے بھی تو میرا ساتھ دیا ہے۔ سب کی مخالفت مول لے کر انہوں نے مجھے پڑھایا اور پھر تعلیم تو آگئی دیتی ہے علم تو روشنی ہے۔ مجھے انہوں نے روشنی دی ہے۔ پھر میں کیوں اس روشنی کے ذریعے ماما کے ارد گرد چھائے اندھیاروں کو دور نہ کروں۔ پلیز! سر! آپ مجھے اجازت دے دیں ان سے ملنے کی۔“ بات کے اختتام پر عفریہ کی آواز مدہم پڑ گئی۔

”میں نے کہا نا کہ شیر محمد کا ریمانڈ لیا گیا ہے اور ابھی اس سے کوئی نہیں مل سکتا۔“ سرفراز احمد

سینٹرل جیل کے آہنی گیٹ پر جا کر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ہٹکی۔

”گیٹ کھولو۔“ نہایت رعب سے اس نے کہا تھا اور سیاہی نے کچھ سمجھے بغیر ہی گیٹ کھول دی اور جب تک وہ کچھ سمجھتا عفریہ امیر کی گز دور جا چکی تھی۔ وہ پہلی بار یہاں آئی تھی بلکہ زندگی میں بار بغیر کسی ساتھ کے وہ ہاسٹل سے نکلی تھی۔ لیکن اس میں اتنا اعتماد تھا جیسے برسوں سے وہ اسی طرح رہی ہو۔ حالانکہ ایک روز ہی میں یہ تبدیلی اس کے اندر آئی تھی۔

”جیل پرنٹنڈنٹ سرفراز احمد۔“

نیم پلیٹ پڑھ کر وہ آگے بڑھی۔ ”سے آئی کم ان سر!“

دروازے کے پتھون سچ کھڑی وہ بڑی سی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھے شخص سے پوچھ رہی تھی

کی نظریں کسی فائل پہ جمی ہوئی تھیں۔ نسوانی آواز پر وہ ایک دم چونک سے گئے تھے۔

”جی کم ان۔“ سرفراز احمد نے کہا تو وہ مضبوط قدموں سے آگے بڑھی۔

”تشریف رکھیے۔“ میز کے سامنے رکھی کرسیوں کی جانب انہوں نے اشارہ کیا۔

”شکریہ سر!“ عفریہ نے مسکرا کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا کام ہے؟“ نہایت نرمی سے پوچھا گیا۔

”سر! میں ایک بندے سے ملنے آئی ہوں جو یہاں جیل میں ہے۔“ عفریہ نے بتایا۔

”کون ہے وہ؟“ لہجہ نرم ہونے کے ساتھ رعب دار بھی تھا۔

”گاؤں جھمیرہ کا شیر محمد۔“ عفریہ نے نام بتایا بمعہ گاؤں کے نام کے۔

”آپ کے کیا لگتے ہیں؟“ سرفراز احمد نے پوچھا۔

”میرا سب کچھ ہیں وہ۔ بہر مقدس رشتہ ان سے ہے۔ میرے ماں باپ بھائی بہن سب رشتے انہی سے ہیں۔“ عفریہ بولی تھی۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے حیرت سے عفریہ کو دیکھا۔

”وہ میرے ماما ہیں۔“ عفریہ امیر نے ایک دم ہی کہہ دیا۔

”اوہ۔“ چوہدری مراد حسین کے قاتل کی بات کر رہی ہیں وہ آپ کے ماموں ہیں۔“

نے اسے سمجھانا چاہا۔ حالانکہ یہ ان کی فطرت کے خلاف تھا کہ وہ کسی سے نرم لہجے میں بات کر پتہ نہیں ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ عفریہ امیر کو چھڑک کر اپنے آفس سے نکال دیں۔

”ریمانڈ کا مقصد کیا ہے؟“ عفریہ پوچھ رہی تھی۔

”محرم سے واردات کے بارے میں پوچھنا۔“

”یعنی آپ تشدد کر رہے ہیں۔ ان پر؟“ وہ چیخ پڑی۔

”ہمارے ہاں کی زبان میں اسے ”ڈرائنگ روم کی سیر“ کہا جاتا ہے“ سرفراز احمد کے لب کی کچھ سفید اور سیاہ موچھوں تلے مسکرائے۔ عفریہ کی آنکھوں میں کنکڑے پھینے لگے۔

”یہ کیا ریمانڈ ہے؟“ عفریہ نے کہنا چاہا تو سرفراز احمد اس کی بات کاٹ کر بولے۔

”آپ کو قانونی باریکیاں نہیں سمجھانی جاسکتیں۔“

”سر!“ عفریہ ایک دم ہی کرسی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور میز پر پھیلیاں ٹکا کر سامنے سرفراز احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”مانا نے قتل کا اعتراف کیا ہے نا؟“

”ہاں۔“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے۔

”پھر یہ کیسا قانون ہے کہ جب ایک شخص اعتراف کر رہا ہے کہ اس نے قتل کیا ہے پھر یہاں گنجائش کہاں رہتی ہے؟“ عفریہ کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ ایک لمحہ کو سرفراز احمد جیسا سویر پھنسا کر بڑا گیا۔ انہوں نے نظریں چرائیں کہ وہ چھوٹی سی لڑکی انہیں قانونی نکتے سمجھاتے ہوئے کھڑی تھی۔

”یہ اصول یہ قانون ان کے لیے ہونے چاہئیں جو اعتراف نہ کریں۔ میرے جی دار مانا۔ اس ملعون کو قتل کیا اور خود ہی قانون کے سامنے حاضر ہو گیا۔ اگر وہ چاہتا تو بچ بھی سکتا تھا۔“

”قانون سے کوئی نہیں بچ سکتا؟“ سرفراز احمد کے لب موچھوں تلے مسکرائے۔

”مگر میرا مانا بچ سکتا تھا سر! کہ چوہدری مراد حسین کا وہ ایسا دوست تھا جسے ناک ابال کہا جاتا تو غلط نہ ہوگا۔ کسی کو مانا شیر محمد پر شک ہی نہیں ہو سکتا تھا یقین تو دور کی بات ہے کہ انہوں نے چوہدری کا قتل کیا ہے۔ یہ تو مانا کا اعتراف انہیں مجرم بنا گیا“ وہ رنہ۔۔۔

”اب آپ کیا چاہتی ہیں؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”میں مانا سے ملنا چاہتی ہوں۔“ وہ اپنی بات پر جمی ہوئی تھی۔

”مگر۔۔۔ انہوں نے کہنا چاہا۔

”بس“ میں ملوں گی۔“ عفریہ نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ جیسے کوئی بچہ کسی چیز کے لیے بھرے میں ماں سے ضد کر ڈالے۔ سرفراز احمد نے ایک لحظہ کو تو حیرت سے اسے دیکھا اور پھر بولے۔

”اچھا بیٹھو۔ میں بلواتا ہوں۔“ انہوں نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ پتا نہیں کیوں انہیں امیر سے انجانا سی ہمدردی ہو رہی تھی۔ نیل کاٹن پیش کرنے پر فوراً ہی ایک سپاہی دروازے پر غم ہوا اور سلوٹ مار کر بولا۔

”نیل سر!“

”وہ جوکل ایک قاتل آیا ہے نا شیر محمد جھمبرہ کا۔“

”نیل سر۔“

”اسے لے آؤ۔“

سپاہی سلوٹ مار کر واپس پلٹا تب اس کے جانے کے بعد عفریہ نے کہا۔

”سر! آئندہ آپ میرے سامنے مانا کو قاتل نہیں کہیں گے۔“

”بھئی یہ کیا بات ہے؟“ وہ مسکرائے۔

”نیل سر! مجھے امید ہے کہ آپ میری خواہش کو رد نہیں کریں گے۔“ عفریہ نے کہا تو سرفراز احمد خاموشی سے اسے دیکھنے لگے اور پھر بولے۔

”آپ پڑھتی ہیں؟“

”جی ٹھڈا ایر میں ہوں اور ہاسٹل میں رہتی ہوں۔“ عفریہ نے بتایا۔

”گاؤں کی ہو کر آپ پڑھ رہی ہیں۔ بڑا اچھا ہے۔“

”مانا چاہتے تھے۔ میں بہت پڑھوں۔ اب پتا نہیں میں پڑھ بھی سکوں گی یا نہیں۔“ عفریہ کے لہجے میں دکھ گھل گیا۔

”کیوں نہیں پڑھ سکو گی؟ پڑھائی نہ چھوڑنا۔“ سرفراز احمد بولے۔ تھمبی بیڑیوں کی جھنکار پر عفریہ نے ایک دم پلٹ کر دیکھا تو سامنے ہی اس کا مانا شیر محمد کھڑا تھا۔

پاؤں میں فولادی سنگل اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ جن کی زنجیریں دو سپاہیوں نے پکڑ رکھی تھیں۔

شیر محمد کے بال کھڑے ہوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ و متورم تھیں۔ بو جھل پلکیں جیسے کئی روز سے نہ سویا ہو۔ چہرے پر غمناک نشان تھے۔ صاف بتا چل رہا تھا۔ اس پر خاص تشدد کیا گیا ہے۔

عفریہ کو سامنے دیکھ کر شیر محمد کی بو جھل پلکیں اٹھیں تو متورم سُرخ آنکھیں تھکتی ہی چلی گئیں۔

”عفی!“ شیر محمد کے پھٹے ہوئے منہ سے ہونٹوں سے بدنام حیرت کی لہروں کی صورت ابھرا تھا۔

”ما۔“ عفریہ جو خود کو بہت مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر کوئی دیوار ریت کی بھر بھر مٹی کی طرح گر کر چلی جا رہی ہو۔

”تو۔ تو یہاں کیوں چلی آئی عفی؟“ شیر محمد نے رُخ موڑ لیا۔ ”کیوں تو مجھے دکھی کرنے آ گئی۔ نفی! مجھے چوہدری کے قتل کرنے کا کوئی پچھتاوا نہیں۔ کوئی دکھ نہیں۔ مگر تو نے یہاں آ کر مجھے دکھی کیا کہ۔۔۔“ ان کے ہونٹ بھنج گئے۔

جیل پر نمائندت سرفراز احمد نے سپاہیوں کو اشارا کیا تو انہوں نے ہتھکڑیوں کی زنجیریں چھوڑ لیا اور باہر چلے گئے۔ تب عفریہ آگے بڑھی اور شیر محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”مانا! کچھ بھی ہو میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ چاہے ساری خدا کی ایک طرف ہو جائے سب دھڑکی فیروز حسین کے خوف سے آپ کو تنہا چھوڑ دیں۔ میں نہیں چھوڑ سکتی مانا۔“ عفریہ نے شیر محمد کی نٹ سے سر لٹکا دیا۔ ”آپ کی محبت کی قسم مانا! میں آپ کو دکھی کرنے کا تو سوچ ہی نہیں سکتی اور پھر مانا! پ نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں مجھے دکھی کیا؟“

”کیا مطلب؟“ شیر محمد پلٹا اور اس نے عفریہ کو دونوں بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ ان کے سینے سے چمکی کھڑی تھی۔

”کیوں قتل کیا آپ نے چوہدری کو؟“

”بہت مقررہ ہو گیا تھا میں۔ گناہوں کا بو جھ اتنا بڑھا کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا اور ہر شخص زندگی

چاہتا ہے میں نے اپنی زندگی کی خاطر اسے قتل کر دیا۔ میں سرخرو ہوں غمی! تو غم نہ کر پتر۔

”مگر آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ اس کا سوال وہی تھا۔

”ہر بات بیٹیوں کو نہیں بتائی جاتی۔“ شیر محمد نے کہا۔

”پھر آپ بابا کو بتادیں۔“ عقیفہ نے مشورہ دیا۔

”میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ بس کرنا تھا قتل کر دیا۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”اچانک ایک دم ہی؟“ عقیفہ نے پوچھا۔

”بعض فیصلے ایک دم ہی ہو جاتے ہیں۔“ شیر محمد مسکرایا۔

”ماما! پولیس آپ کو مارے گی۔ آپ بتاتے کیوں نہیں؟“ وہ بچوں کی طرح بولی۔

”میں نے قتل کا اقرار کر لیا ہے۔ اب چاہے کچھ بھی کریں میں کسی سے نہیں ہاروں گا۔“

میری زبان نہیں کھلوا سکے گا۔ یہ چوہدری کا اور میرا معاملہ ہے اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار

میں اپنی سزا پاؤں گا۔ غمی! مجھے یہ افسوس ہوتا ہے کہ میرے گناہ بہت ہیں اور زندگی کم۔ پھر نہ

ملے گی مجھے۔“ شیر محمد کی مٹھیاں بھیج نکلیں۔

”ماما! عقیفہ پھر شیر محمد کے سینے سے لگ گئی اور بھیک بھیک کر رودی۔

”نرو۔ نرو۔ تیری آنکھوں میں“ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔“ شیر محمد نے اس کے ہاتھ

لیوں سے لگا لیے تو فولادی زنجیریں بول پڑیں۔

”جا پتر تو چلی جا“ شیر محمد نے کہا۔

”مجھے منع نہ کریں ماما۔ میں آپ کے پاس آؤں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی۔

”غمی!“ شیر محمد نے کہا جابا تو عقیفہ جلدی سے بولی۔

”آپ کو میری قسم ماما مجھے منع نہ کریں۔“

”غمی! آئینہ تو مجھے کسی معاملے میں اپنی قسم نہ دینا۔“ شیر محمد تڑپ کر بولا۔

”اور آپ بھی آئینہ یہ نہ کہیے گا کہ میں نہ آؤں؟“ وہ بچوں کی معصومیت سے بولی تو شیر

جیل سپرنٹنڈنٹ سرفراز احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بڑے صاحب پر ہے کہ وہ ہمیں مجھ سے ملنے دیتے ہیں یا نہیں۔“

”یہ میں جانوں۔“ جیلر صاحب بہت اچھے ہیں۔“

”ہاں اچھے ہیں۔“ شیر محمد مسکرایا۔ ”تجھی تو تم یہاں نظر آ رہی ہو۔“

”ماں آپ کو پتا ہے شاید بابا اور ماما دلیر محمد آپ کا مقدمہ نہ لڑیں۔“ عقیفہ نے بات بدل

”مجھے پتا ہے۔ چوہدری فیروز حسین انہیں ایسا نہیں کرنے دے گا۔ مجھے کوئی پروا نہیں

نہایت پر اطمینان تھے وہ۔

”ماما! میں وکیل کروں گی آپ کے لیے۔“ عقیفہ نے کہا۔

”تو۔ غمی!“ شیر محمد نے نہایت حیرت سے اسے دیکھا۔ تجھے تو یہاں کے راستے بھی

نہیں پھر۔“

”ماما! جو تیرا کہ نہ ہوا ہے بھی دریا میں پھینک دیا جائے تو وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ

کنارے پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ اب میں باہر نکلی ہوں تو خود بخود سارے راستے مل جائیں گے۔“

نے کہا۔

”بہت خاردار راستے ہیں غمی!“ شیر محمد نے ڈرایا۔

”میں کائناتے جن لوں گی۔ میرے بیڑ زخمی نہیں ہوں گے ماما۔ مجھے آپ نام پتہ بتائیں وکیل کا

چوہدری کے مقدمات کے سلسلے میں آپ کورٹ پچھری تو آتے ہی رہتے ہوں گے نا۔ مجھے بتائیں۔“

”مگر میں نہیں چاہتا کہ میرا مقدمہ کوئی وکیل لڑے۔“

”کیوں؟“ عقیفہ نے حریت سے پوچھا۔

”میں نے جرم کیا ہے مجھے سزا ملنی چاہیے۔“ شیر محمد نے کہا۔

”چوہدری کے قتل کو جرم کہہ رہے ہیں آپ جیسے۔“

”نہیں۔ غمی! نہیں۔“ شیر محمد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”چوہدری کے قتل پر سزا مجھے ملنی

چاہیے۔“

”پلیز ماما! ایسا نہ کہیں۔ وہ سارے جرم تو چوہدری کے کھاتے میں جانے چاہئیں کہ اسی نے

کرائے تھے۔ وہ کل مختار تھا۔ اور آپ اس کی مشینری کا ایک معمولی پرزہ۔ وہ جہاں چاہتا آپ کو فٹ کر

کے اپنا کام کر سکتا تھا۔“

”تو تو اتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہے؟“ شیر محمد کے لہجے اور آنکھوں میں حیرت ہی حیرت

تھی اور ایک لمحہ کو تو عقیفہ خود بھی حیران رہ گئی تھی کہ اتنی مشکل فلسفیانہ باتیں اس کے لبوں سے نکل رہی

ہیں۔ پھر وہ ہنس دی اور بولی۔

”بس آپ بتائیں مجھے کسی وکیل کے بارے میں ورنہ میں خود ہی تلاش کر لوں گی۔“ اس کا لہجہ

بہت ضدی تھا۔ اور شیر محمد نے بھی جان لیا تھا کہ عقیفہ کے اندر ایک دم ہی ضد اتر آئی ہے۔

”نہ کہا۔“

”تم سردار سکندر خان لغاری ایڈووکیٹ سے مل لو۔ وہ میرا دوست ہے۔“

”آپ کا دوست؟“ عقیفہ حیران تھی۔

”ہاں جن دنوں چوہدری نے مجھے ایک مربع زمین دی تھی تو سردار سکندر خان ہی نے مجھے سمجھایا

تھا کہ میں وہ زمین اپنے نام کروا لوں۔ پھر وہ زمین اس نے بیچ بھی دی تھی۔“ شیر محمد نے مختصر آبتایا۔

”وہ کیوں؟“

”اس کا خیال تھا کہ زمین داروں کا دین ایمان پیسہ ہی ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں دولت سے ہر

شے خرید سکتے ہیں۔ اور اگر کبھی مجھ پر چوہدری التفات نہ رکھے تو وہ اپنی زمین واپس مانگ سکتا ہے۔“

”اوہ۔ تو آپ پیسے دے دیتے۔“ عقیفہ نے پوچھا۔

”ظاہر ہے اور عند تاتا تو اس کے پاس سوطر لیتے تھے لینے کے۔ تب سردار لغاری نے اس کا سودا

کروا کے مجھے لاہور میں فیروز پور روڈ پر گریڈنگ پلاٹ دلا دیا تھا۔ وہاں مارکیٹ بخولی ہے دکانیں

کرائے پر چڑھا دی ہیں۔“

”آپ نے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی؟“ عقیفہ نے شیر محمد کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ہاں صرف تجھے ہی بتائی ہے کہ تو ہی میرا سب کچھ ہے غمی اور تو نے یہ ثابت بھی کر دیا ہے کہ

میرے خونی رشتے بھی جب کہ دور ہو گئے ہیں۔ فیروز حسین کے خوف سے تو تو نے میرا ساتھ نہیں

چھوڑا۔ پھر میں تجھ سے کچھ کیوں چھپاؤں۔“

”پھر۔ پھر ماما مجھے یہ تو بتاؤ کہ۔“

”مت پوچھنا کچھ۔“ شیر محمد نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس بارے میں میں نے جب ہم کو کچھ بتانا چاہا تو وہ صرف تو ہوئی غمی۔ صرف تو۔“ شیر محمد نے اسے بازوؤں کے حلقے میں سہا اور عفیرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ”اب تو جا اور دیکھ غمی تو یہاں نہ آیا کر۔“ اس نے التجا کی ”مت روکس مجھے بس میں آؤں گی۔“ عفیرہ نے سر اٹھا کر ہیکلی آنکھوں سے شیر محمد چہرے کی طرف دیکھا۔ تو وہ مسکرا دیا۔ عفیرہ کی وجہ سے تو وہ اپنے جسم پر لگنے والے سارے زخم گیتا تھا۔

”تو سردار لغاری کا پتا تو لکھ لے۔“ شیر محمد نے کہا۔ پھر عفیرہ نے بیگ میں سے کاغذ قلم نکالا شیر محمد کے لبوں سے لٹکنے والے لفظ کاغذ پر اتارنے لگی اور شیر محمد اس کے جھکے سر کی طرف دیکھے گیا۔ ”تیرا یہ سر کسی کے آگے کبھی نہ جھکے غمی۔“ شیر محمد نے دل ہی دل میں دعا کی اگر آنکھوں میں کی اترا آئی تھی۔

”اب تمہارے ماما کو جانے دیا جائے؟“ سرفراز احمد نے عفیرہ سے پوچھا۔ ”جی سر! مگر اس شرط پر کہ آئندہ بھی مجھے ملنے دیا جائے گا۔“ عفیرہ نے بغیر کسی ڈر خوف کہا۔ ”ضرور۔ ضرور۔“ سرفراز احمد نے اثبات میں سر ہلایا اور بیل کا ٹن پیش کیا تو وہ دونوں اندر آ گئے۔

”تو اپنی پڑھائی پر توجہ ضرور دینا غمی! پڑھائی نہ چھوڑنا ورنہ میں خفا ہو جاؤں گا۔“ ”نہیں ماما! میں پڑھوں گی۔ آپ کا خواب ضرور پورا ہوگا۔“ عفیرہ نے شیر محمد کے ہاتھ تھام چوم لیے۔ پھر وہ سپاہی شیر محمد کو لے گئے۔ عفیرہ کا جی چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر اس بہت ضبط کیا۔ اپنے پھلتے دل کو قابو میں کیا۔ اور سرفراز احمد سے بولی۔ ”بہت شکریہ سر! میری خواہش پوری کرنے کا۔ آج میرے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے پولیس اتنی بری نہیں جتنی اس کی بری شہرت ہے۔“ سرفراز احمد کچھ نہ بولے۔ صرف مسکرا دیے۔ ”میں آئندہ بھی آنا چاہوں تو۔“ ””

”دیکھ۔“ ”اگر مجھے گیٹ پر ہی تو روکا گیا تو۔۔۔؟“ ”نہیں روکا جائے گا۔ آپ میرا نام لے دیجیے گا۔ میں آپ کے ماما سے آپ کو ملوا دوں گا۔“ ”تھنک یوسر۔“ عفیرہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ اس کے سارے وجود میں سکون کی خشکی دوڑ تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ اب وہ بے دھڑک اپنے ماما سے مل سکے گی۔ اہم بات تو یہ کہ وہ جب واپس ہاسٹل آئی تو اس بات پر حیران تھی کہ وہ تنہا اتنا اہم کام کر آئی ہے۔

”کیا میں اتنی بدل گئی ہوں؟“ ”اتنا حوصلہ۔ اتنی جرأت مجھ میں کہاں سے آگئی۔“

☆☆☆

سردار سکندر خان لغاری کے چیمبرز میں۔ جب وہ داخل ہوئی تو کائنات پر شام کا ٹم

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ”لغاری صاحب سے ملنا ہے۔“ عفیرہ نے ان کے اسٹینٹ حیدر علی سے کہا۔ اور حیدر علی نے ایک نظر اس برڈالی۔ سادہ سے پلین سرخ سوٹ میں سیاہ دوپٹہ بے پروا انداز سے گلے میں ڈالے وہ اپنی بے تحاشا چمکتی آنکھوں سے حیدر علی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ گڑبڑا گیا۔ ”آپ بیٹھیے۔ ابھی کچھ لوگ ان کے پاس بیٹھے ہیں۔“ حیدر علی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

تو عفیرہ کرسی پر ٹپک گئی۔ حیدر علی فائل میں پیپر ز لگانے میں مصروف تھا۔ خاصی دیر بعد آخر عفیرہ نے اسے کہا۔ ”آپ سردار صاحب کو اطلاع تو دے دیں۔“ تب حیدر علی نے انٹرکام کا ریسور اٹھا کر بٹن پیش کیا۔ ”سر! کوئی خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ ”بہتر سر۔“

”پانچ منٹ انتظار کیجئے۔“ حیدر علی نے ریسور رکھ دیا اور پھر جب وہ تقریباً دس منٹ بعد سردار سکندر خان لغاری کے آفس میں داخل ہوئی۔ تو وہ اسے دیکھ کر ایک دم ہی کھڑے ہو گئے۔ ”السلام علیکم سر!“

”وعلیکم السلام۔ تشریف رکھیے۔“ ”شکریہ۔ مجھے عفیرہ کہتے ہیں۔ عفیرہ امیر۔“ ”جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ ”جھمبہ کے شیر محمد کو آپ جانتے ہیں نا؟“ عفیرہ نے سردار لغاری کے کنپٹیوں کے سفید بالوں پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ”بالکل۔ وہ میرا دوست ہے مگر آپ؟“ ”وہ میرے ماما ہیں۔“ ”آپ اس کی وہی بھانجی تو نہیں جس کے ایڈمیشن کے سلسلے میں وہ چند روز پہلے آیا ہوا تھا۔“

سردار سکندر خان لغاری نے پوچھا۔ ”جی، عفیرہ نے گردن ہلائی۔ ”حیرت ہے وہ تمہارا ذکر اس طرح کر رہا تھا جیسے کوئی چھوٹی سی بچی ہو۔ اور میں یہی سمجھا تھا کیونکہ اس کا بوجہ اور انداز ایسے ہوتے تھے۔ ویسے عفیرہ امیر! حقیقت یہ ہے کہ تمہارے ماما تمہیں بہت چاہتے ہیں۔“ ”نو ڈاؤٹ سر۔“ وہ مسکرائی۔ ”اچھا کس سلسلے میں آئی ہو۔ مگر ٹھہرو کیا پیوگی چائے یا ٹھنڈا۔“ وہ تیز تیز بولنے کے عادی تھے۔

”کچھ نہیں سر!“ عفیرہ نے کہا۔ ”بالکل نہیں میری بھی تم بھانجی ہو۔ جس طرح شیر محمد کی بھانجی ہو۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“ سردار سکندر خان نے کہا۔

”تو پھر چائے منگوالیس۔“ عفریہ نے مسکرا کر کہا۔ تب سردار لغاری نے انٹرکام پر کہا۔
”حیدر! دو چائے۔“

”ہاں تو اب بتاؤ“ وہ عفریہ سے مخاطب تھے۔
”آپ کو بتا ہے کہ چوہدری مراد حسین کا قتل ہو گیا ہے؟“ عفریہ نے بتایا۔
”ہاں پڑھا تو تھا اخبار میں کسی حراز سے شیر محمد نے اسے قتل کیا ہے۔“ سردار سکندر خان نے کہتے کہتے ایک دم ہی چوک گئے۔ جیسے ذہن میں کوئی بلب روشن ہو گیا ہو۔
”نہیں۔“ کہیں اپنے شیر محمد نے تو۔ چوہدری کے خون سے ہاتھ نہیں رنکے۔“
”جی ایسا ہی ہوا ہے اور پھر خود ہی تھانے پہنچ گئے۔“

”اوہ۔“ سردار لغاری کے لبوں سے ٹھنڈا سانس ایسے نکلا جیسے کافی دیر سے رکھا ہوا تھا۔
”یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ چوہدری کے جال سے لپکنے کے لیے بہت ہاتھ پیر بجائے کب سے تھا۔ کہتا تھا مجھے راستہ نہیں ملتا۔ میں کیسے نکلوں اور راستہ تلاش بھی تو کیا۔“ سکندر خان لغاری نے پر مکا مارتے ہوئے پُرسوج لہجے میں خود کلامی کے انداز میں کہا۔ تب عفریہ نے انہیں ساری تفصیلات دی۔

”ماما کسی کو بھی نہیں بتاتے کہ انہوں نے قتل کیوں کیا۔“
”تمہیں بھی نہیں بتایا؟“ انہوں نے بے یقینی سے عفریہ کو دیکھا۔
”نہیں۔“ عفریہ جلدی سے بولی۔ وہ تو دلیل کرنے کی بھی مخالفت کر رہے تھے۔ میری پرانہوں نے آپ کا نام دیا۔ اب آپ ہی کچھ کریں! آپ تو وہ بھی سب جانتے ہیں جو میں بھی جانتی۔“

”کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ قتل کی سزا تمہیں پتا ہی ہوگا کہ موت ہے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“
سکندر خان کے لبوں پر لفظ ٹوٹ گئے۔

”نہیں۔۔۔ نہیں! سراسر! ماما کو سزائے موت نہیں ہونی چاہیے۔ آپ اپنا سارا علم لگا دیجیے، عفریہ لہجے میں بولی۔ بے شک عرق قید ہو جائے۔ میرا ماما زندہ ہو رہے۔ میں اسے دیکھ تو سکوں۔“ عفریہ آنکھوں کے فرش گیلے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کی جوت بچھ کر رہ گئی تھی۔

”ٹیک اٹ ایزی عفریہ! شیر محمد میرا دوست ہے اور میں ہر ممکن طریقے سے اپنی ساری کوشش کروں گا۔“ سردار سکندر خان لغاری اسے دلاسا دیتے رہے۔

”تم بہت نہ بدلتا۔ اپنے سارے دکھ سکھ پریشانیاں مجھے کہنا۔ میں صبح ہی شیر محمد سے ملوں اب تم فکر نہ کرو۔ ویسے مجھے اس سے اس بے وفائی کی امید نہیں تھی۔ رہائی کا بہت غلط راستہ نکالا اس نے۔“

”مگر ماما۔“ عفریہ نے کچھ کہنا چاہا۔
”تم نہیں سمجھو گی، ہمیں نہیں پتا کہ چوہدری شیر محمد پر اپنی عنایات میں کی طرح برسا کر اس کیسے کیسے کام لیتا تھا۔“

”مثلاً۔“ عفریہ نے سکندر خان کی طرف دیکھا۔
”بس تھے کام۔“ سردار سکندر خان نے کندھے اچکائے۔ اب وہ عفریہ کو کیا بتاتا کہ شیر محمد آپ کو کتنا بے بس پاتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے وہ چوہدری مراد حسین کا حکم بجالاتا تھا۔ اس کے مخالف

ماکر لاکار تانان کے گاؤں سے لڑکیاں اٹھا کر مراد حسین کے ڈیرے کی زینت بنانا۔ چوہدری مراد حسین نے مخالف زمیندار کی کھڑی فصلوں کو آگ لگا دینا۔ یہ سارے کام وہ برسوں سے کرتا آ رہا تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست چوہدری مراد حسین نے تیار کر رکھی تھی۔ بعد تاریخ کے اور جگہ تین چار سال سے شیر محمد مراد حسین سے الگ ہوئے کا سوچ رہا تھا۔ تو کوئی راستہ ہی نہ مل رہا تھا۔ کیونکہ جب ایک بار شیر محمد نے اسے کہا تھا۔

”چوہدری جی! بہت بوجھ ہو گیا ہے گناہوں کا اب مجھے آپ آزاد کر دیں۔“ تب چوہدری مراد حسین قہقہہ لگا کر بولا۔

”آزادی چاہتا ہے۔ میں تو آزاد کر دوں گا۔ مگر پھر پولیس تجھے پکڑے گی۔ جیل کی کالی کوٹھری تیرا مقدر بن جائے گی۔“ مجھے اعتراض تو نہیں تیری آزادی پر۔ لیکن تو سوچ لے۔“

برسوں سے شیر محمد چوہدری مراد حسین کے ساتھ تھا۔ وہ اس کے دل کی بات جان جاتا تھا۔ اب لبوں سے ادا کیے گئے جملوں کے پیچھے چھپی ہوئی کھینچاؤ کیسے نہ جان پاتا۔ بس دل ہی مسوس کر رہ گیا تھا اور یہ ساری حقیقت اس نے سکندر خان کو بتا دی تھی۔

سکندر خان سے شیر محمد نے مشورہ کیا تھا کہ وہ کوئی واپسی کا راستہ بتائے اور سکندر خان نے کہا تھا۔

”تم خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میں تمہارے بچاؤ کی پوری کوشش کروں گا۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سکندر خان! مجھے جیل سے خوف آتا ہے۔“

”تو پھر تم وقت کا انتظار کرو۔“ سکندر خان نے مشورہ دیا۔

”ہاں وقت کا انتظار۔ یہ بہتر ہے۔“ شیر محمد نے پُرسوج لہجے میں جواب دیا تھا اور۔۔۔ اور کیا وقت آ گیا۔

”اے تو جیل کی کوٹھری سے خوف آتا تھا۔ اب کیسے رہتا ہوگا۔“ سکندر خان نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ چونک پڑے۔ عفریہ کہہ رہی تھی۔

”سراسر! آپ نے بتایا نہیں چوہدری میرے ماما سے کیسے کام لیتا تھا؟“

”ارے کیا کام ہوتا تھا۔ جھوٹی گواہیاں دلوانا۔ کاغذات میں رد و بدل کرنا۔ تاکہ ٹھیک بیجانہ بیج نکلے اور کیا۔“

”یہ اتنا برا جرم تو نہیں تھا۔“ عفریہ بولی۔

”حکومت کی نظر میں تو جرم ہی ہوتا۔“ سردار سکندر خان مسکرائے۔ اور اسی لمحے بیون چائے لے کر آ گیا۔

”تم چائے پیو۔“

”آپ ماما سے پوچھیے گا کہ انہوں نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔“ عفریہ نے کہا اور چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

”ہاں پوچھنا تو ہوگا۔ وہ سر ہلا کر بولے۔ مگر ان کی آنکھوں سے سوچیں عیاں تھیں۔“

پھر یہ ہوا کہ سردار سکندر خان لغاری نے شیر محمد کا کیس لے لیا۔ عفریہ بھی کبھاراں سے ملنے جاتی تھی۔ اور تقریباً ہفتے میں دوبارہ جیل ضرور شیر محمد سے ملنے جاتی تھی۔ سرفراز احمد اس سے بہت محبت سے ملے۔ اور اپنے آفس ہی میں شیر محمد سے اس کی ملاقات کروا دیتے۔ انہیں وہ اپنی پڑھائی

کے بارے میں بتائی اور وہ بہت خوش ہوتے۔ البتہ وہ ہر ملاقات پر ضرور پوچھتی۔
”ماما! آپ نے کیوں چوہدری کو قتل کیا؟“

مگر ہر بار شیر محمد بات ٹال جاتا۔ لیکن عفریہ پوچھنے سے باز نہ آئی۔

اور پھر پورے چھ ماہ بعد پہلی بار جب شیر محمد کو جب عدالت میں پیش کیا گیا تو اس کے خاں میں سے کوئی بھی کمرہ عدالت میں موجود نہ تھا۔ سوائے عفریہ کے۔

وہ تو ہر جا قدم بہ قدم اپنے بابا کے ساتھ تھی۔ اس نے تو ماں کی خاطر سب کو چھوڑ دیا تھا۔ چھو میں بھی وہ گاؤں نہ گئی تھی۔ حالانکہ امیر بخش اسے لینے آئے تھے۔ مگر اس نے باپ کے ساتھ چا سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور انہیں کہہ دیا تھا کہ اس کا جینا مرنا بس اپنے ماما کے ساتھ ہے۔ ان شکوہ بھی کیا تھا کہ وہ کیوں کسی بھی تاریخ پر نہیں آئے۔ مگر ان کے پاس عفریہ کے سوالوں کا ایک جواب تھا کہ وہ چوہدری کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ اور عفریہ نے کہہ دیا تھا کہ وہ بھی نہیں جا گی۔ ایسی بغاوت کب اس کے اندر اتری تھی۔ مگر اب وہ باغی ہو گئی تھی۔ پھر وہ سردار سکندر خان کو کی خواہش پر ان کے ہاں آگئی تھی۔ کیونکہ ہاشل خانی ہو چکا تھا۔ گاؤں وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ شیر محمد سے اجازت لے کر وہ سکندر خان کے ہاں چلی گئی تھی۔

اور وہیں ایک روز اخبار میں اس نے ایک ہفتہ روزہ کے لیے اشتہار دیکھا تو سکندر خان کو ”فلک“ کے آفس گئی۔ ایڈیٹر حسی صاحب کو وہ پٹاخ پٹاخ بوتلی لڑکی بہت ہی اچھی لگی اور انہوں نے اسے سب ایڈیٹر کے طور پر رکھ لیا۔

اور جب اس نے سکندر خان کو بتایا تھا۔

”ماما! مجھے جاب مل گئی ہے۔“

(شیر محمد کے دوست کے ناٹے وہ انہیں ماما ہی کہتی تھی پھر یہ سکندر خان کی خواہش بھی تھی)

”گڈ۔ اس کا مطلب ہے کامیابیاں تمہارا مقدر ہیں۔“

”انشاء اللہ!“ عفریہ کے لب کاٹے۔

”مگر ضرورت کیا ہے نوکری کی؟“ ذکیہ سکندر کو عفریہ کا جاب کرنا پسند نہ آیا تھا۔

”آئی! میری خواہش ہے۔ میں فالتو نہیں رہ سکتی۔“

”تم پڑھا کرو۔“ انہوں نے کہا۔

”اب ہر وقت پڑھا بھی نہیں جاتا۔ اچھا ہے نازندگی میں چمنج ہوگا۔ مجھے دنیا کا پتا چلے گا۔“

”اور شیر محمد کو کتنا دکھ ہوگا؟“ ذکیہ سکندر نے کہا۔

”انہیں ہم بتائیں گے ہی نہیں۔“ سکندر خان بولے۔

”ہاں ہم نہیں بتائیں گے۔ تو پھر ماما کو دکھ بھی نہیں ہوگا۔“ عفریہ نے ہنس کر کہا تو ذکیہ سکندر اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

پھر وہ دوسرے روز سے ”فلک“ کے آفس جانے لگی تھی اور اس کا دل بہت جلد وہاں لگ

تھا۔ آفس میں بھی وہ اپنی مرضی کی آپ مالک تھی۔ اور حسی صاحب اس پر بے حد اعتماد کرتے تھے

اور جب اس نے پہلا مضمون ”سیاسی جماعتوں کے کردار“ کے عنوان سے لکھا تو وہ اتنا بھر پور اور

تھا کہ حسی صاحب کو ایک لمحہ کے لیے یقین ہی نہ تھا کہ یہ عفریہ امیر حسی لا ابالی لڑکی نے لکھا ہے۔

زبردست تجزیہ کیا تھا اس نے سیاسی پارٹیوں کے بارے میں کہ وہ حیران تھے۔ آخر انہوں نے

مضمون ”فلک“ میں چھاپا تو کتنے ہی لوگوں نے اعتراض کیا۔ پھر ایک مضمون اس نے حکومت کی پالیسیوں۔۔۔ پر لکھا۔ جس نے پچھل مجاہدی۔ اور حکومت نے اس شارے کی تمام کاپیاں ضبط کر لیں لیکن اس سے یہ ہوا کہ پرچے کی پیلٹی ہو گئی اور آئندہ ہفتہ جو پرچہ چھاپا وہ ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ کہ دوسرا ایڈیشن چھاپنا پڑا تھا۔ اس سے دگنا منافع ہو گیا تھا۔ پھر بھی حسی صاحب نے اسے سمجھایا تھا۔

”انتہا تحت مت لکھا کرو۔“

”سچ کہتی ہوں۔“ وہ خسر سے بولی۔

”سچ میں ششاس بھی تو ہو سکتی ہے۔“ حسی صاحب بولے۔

”نہیں سچ میں ششاس بھی نہیں آ سکتی سر۔ آپ کو اتنا بھی آج تک پتا نہیں چلا حالانکہ میری عمر سے زیادہ آپ کی عمر ہے۔“ عفریہ نے کہا تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔

عفریہ نے حسی صاحب سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہاں کام کرتے ہوئے اسے نئے تجربے ہوئے اور وہ ایک دم ہی اپنی عمر سے بڑی ہو گئی تھی۔ اس کے آئیڈیلز کی دھوم مچ جاتی۔

اور ایک بار جب حسی صاحب نے اسے کہا تھا کہ وہ انٹرویو کرنا شروع کر دے تو اس نے ان کی بات مان لی تھی۔ اس کے لیے گئے انٹرویو بہت پسند کیے جاتے۔ وہ شخصیت کو گھما کر رکھ دیتی تھی۔ کسی پہلو سے بھی اس کا انٹرویو تشنہ نہ ہوتا تھا۔ یہی کامیابیاں تو تھیں جنہیں نے اسے حوصلہ بخشا تھا۔ اور اس نے سوچ لیا تھا۔ کہ وہ جرنلزم میں ایم۔ اے کرے گی۔ یہ بات سکندر خان نے اس کے ذہن میں ڈالی تھی۔

بی اسے کے انگرام سے فارغ ہو کر وہ پھر سکندر خان کے ہاں آگئی تھی کہ اس نے بھی ملے کر لیا تھا۔ جب کالج کھلے ہوتے وہ ہاشل چلی جاتی اور چھٹیاں ہوتیں تو سکندر کے گھر کو روٹن بخشتی کہ سکندر خان نے اتنے بڑے گھر میں وہ دو جی تو تھے ذکیہ اور سکندر خان۔ ان کی شادی کو سات برس گزار چکے تھے اور ابھی تک ان آے انگن میں کوئی پھول نہ کھلا تھا۔ بھی نہیں تو عفریہ حیران ہو کر سوچتی۔

”آخر سکندر خان کس نیچر کے ہیں۔ ہمارے دیہاتوں میں جن کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہوتا وہ بھی اتنا انتظار نہیں کرتے۔ اور اولاد نہ ہونے کو وجہ بنا کر کھٹ دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ پھر سکندر خان کے پاس تو سب کچھ ہے۔ دولت عزت شہرت نام مقام پھر بھی وہ ذکیہ کے ساتھ گزارہ کر رہے ہیں بھی اسے اولاد نہ ہونے کا طعنہ نہیں دیتے۔ کس قدر خوش رہتے ہیں دونوں۔ کیا مرد بھی ایسے ہوتے ہیں۔“

”ہاں ایسے شریف النفس مرد بھی ہوتے ہیں۔“

کوئی اس کے اندر چپکے سے کہتا اور وہ ہنس دیتی۔

کبھی کبھی اسے بابا۔ اماں اور گڈی بے تحاشا یاد آتے تو وہ تکیوں میں منہ چھپا کر رو دیتی۔ اس

طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ جب سے اس نے ”فلک“ جو اُن کیا تھا اس کے انداز میں نمایاں

تبدیل آگئی تھی۔ اس کے حلقہ احباب میں مردوں کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ سب سے بولتی تھی ان کے

باتوں کا جواب گولی کی طرح تر سے دیتی۔ مگر آج تک کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ کہ عفریہ امیر کا ہاتھ

تھام کر اس سے کوئی ڈائیلاگ ہی بول سکے۔ بہت مضبوط حصار اس نے اپنے گرد باندھ رکھا تھا۔ جسے

توڑنا کسی کے اختیار میں نہ تھا۔

پھر اس نے ایم اے جرنلزم میں داخلہ لے لیا تھا۔ جس روز اس نے شیر محمد کو اطلاع دی شیر محمد نے اسے پلٹا کر اس کا سر چوم لیا تھا۔ مارے خوشی کے شیر محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور یہی وقت تھا جب عفریہ نے کہا تھا۔
”ماما! آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے ساتھ میں پورے شہر کی سیر کروں مگر۔۔۔ عفریہ کی آواز بھرا گئی۔

”اب ایسی خواہش مت کیا کر عفری۔“ شیر محمد نے ہولے سے کہا۔
”خواہشوں پر پابندی تو نہیں ماما۔“ عفریہ آنسوؤں کے سچ مسکرائی۔
”ایسی خواہشیں کرنے کا فائدہ جو پوری نہ ہوں جو صرف دکھ دیں۔“ شیر محمد بے ہوش کا دانتوں تلے دبایا۔

”ماما کاش آپ میری جانب تو دیکھ لیتے اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے۔“
”تیری طرف تو دیکھا تھا۔ بھی تو یہ قدم اٹھایا۔“ ایک دم ہی شیر محمد کے ہونٹوں سے یہ جملہ ہی پھسل گیا۔

”کچھ نہیں عفری۔ کچھ مت پوچھنا۔ تو۔۔۔ تو نہ آیا کر میرے پاس۔ میں تجھے دیکھ کر کمزور لگتا ہوں۔ میرے حوصلے ربیلی مٹی کی طرح ڈھنے لگتے ہیں۔ تو نہ آیا کر عفری! مجھے کمزور کرنے کو۔“
”ماما!“ عفریہ نے کچھ کہنا چاہا تو شیر محمد نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
”کوئی سوال نہ کر۔ کچھ نہ پوچھ۔“

”سکندر ماما بھی پریشان ہیں۔ وہ بھی کہتے ہیں۔ آپ سچ بتا دیں تاکہ مقدمہ تو چلے۔“
”چل تو رہا ہے مقدمہ“ شیر محمد کے لبوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھینچ گئی۔

”ہر تاریخ پر بھولے گواہ آتے ہیں۔ اور۔۔۔ اور آپ کچھ بھی نہیں بولتے۔ یہ کیا قفل آپ کی زبان پر لگ گیا ہے۔ ماما! کتنی تاریخیں بھولی ہیں۔ کتنی بحث بھولی ہیں۔ کتنی بحث ہوئی دونوں وکیلوں میں سکندر خان اپنے علم اور تجربے کا کافی سارا زور لگا دیتے ہیں۔ مگر مقدمہ واپس جہاں سے ابتدا ہوئی تھی۔ آپ کو کس نے منع کیا ہے کہ نہ بولیں۔ سچ کیا ہے آپ بتاتے کیوں نہیں عفریہ نے شیر محمد کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”عفری!“ شیر محمد اس طرح بولا جسے اس کی آواز کنوئیں میں سے آرہی ہو۔

”سچ کیا ہے یہ مجھے معلوم ہے۔ میرے خدا کو یا پھر اس خلیفہ کو جسے میں نے جہنم رسید کیا خدا کے سوا کوئی گواہ نہیں ہے۔ اور خدا آسمانوں سے اتر کر گواہی کے لیے تو آنے سے رہا نہ تو کاٹے دوسرا۔ یہ تو میرے جرائم سے کم ہے۔“

”ماما! آپ بتائیں تو یہی شاید آپ کو عدالت حق پر سمجھے اور۔۔۔“

”نہیں عفری! میں کبھی نہیں بتاؤں گا کہ میں نے جو بدی کو کیوں قتل کیا ہے۔ ہاں عفری! میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر جو بدی کو دس جہنم بھی ملیں تو میں ہر بار اسے قتل کروں گا۔ پھر بھی میرے انٹہ آگ ٹھنڈی نہیں ہوگی۔“ شیر محمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں لہو اتر آیا تھا۔ بہر بعد اس نے خود کو قابو کیا۔ اور بولا۔

”دل لگا کر پڑھنا عفری! مجھے شکوہ کا موقع نہ دینا۔ اس دنیا میں مرد بن کر زندہ رہنا ہے تو میرا فخر ہے میرا غرور ہے عفری! اور میرا غرور قائم رکھنا۔“ بہت سی امیدیں اس کے لہجے میں بولی

نہیں۔ ”آپ کا فخر قائم رہے گا ماما!“ عفریہ نے اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور پھر بے تحاشا چومنا شروع کر دیا۔

ہر کوئی شیر محمد کو قاتل کہتا تھا۔ مگر عفریہ کا دل کہتا تھا۔ اس کا ماما قاتل نہیں ہے۔ اور اپنے دل کی بات پر اسے بھروسہ تھا۔ یونیورسٹی میں بھی اس نے اپنی کسی کلاس کی لڑکی سے دوستی نہ کی تھی۔ حالانکہ کئی لڑکیوں نے ابتداء میں۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر وہ تو اس جذبے سے ہی نا آشنا تھی۔ ”فلک“ میں جب کوئی آرٹیکل چھپتا تو پوری کلاس میں چرچا ہوتا۔ اس کے اساتذہ تک اس کی تحریر پڑھتے اور پھر اسے مشورہ بھی دیتے تھے۔ یہ اور بات کہ وہ کسی کے مشورے پر عمل نہ کرتی تھی۔ اگر مشورے پر عمل کرنے کی بات ہوتی تو وہ حلیمی صاحب کا مشورہ کیوں نہ مان لیتی۔ بارہا ان سے وہ بحث کرتی تھی اور کہتی تھی۔

”چھاپنا ہے تو چھاپیں ورنہ مجھے واپس کرویں۔“ اور حلیمی صاحب اس کے اس جملے سے بار جاتے۔ کئی بار وہ انہیں دھمکی دے چکی تھی کہ وہ ”فلک“ کو چھوڑ دے گی۔ حلیمی صاحب کہتے۔

”سب کچھ چھوڑ دو“ ”فلک“ کو نہ چھوڑو۔“
انہیں بتا تھا۔ اس جیسی مخلص اور ہارڈ ورکر انہیں نہ مل سکے گی جو بہت سے کام کرتی تھی۔ اور وقت پر پُر عمل کر دیتی ہے اور اس کی خامیوں پر اس کی خوبیاں حاوی تھیں۔

اور پھر بتا نہیں کیسے وہ ”وہاج گروپ“ میں خود بخود ہی شامل ہو گئی تھی۔ ڈیپارٹمنٹ میں ان چاروں لڑکوں کا گروپ اسے سب سے مختلف نظر آ رہا تھا۔

وہاج جیسا شوخ مگر متلون مزاج لڑکا زوہیب فرحت میر اور آصف کا نجو کا لیڈر تھا۔ لڑکیوں پر چلے کنا۔

کلاس میں ہر پروفیسر سے بحث کرنا۔ یہ ان چاروں کا کام تھا۔ مگر کبھی بدتمیزی نہ کی تھی۔

ابتداء انہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ جب ایک روز عفریہ کلاس میں داخل ہوئی تو حسب سابق اس کا پرس کاغذوں سے بھرا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

”سنو! کیا تم کاغذ چن کر آرہی ہو؟“ وہاج نے اس کے قریب آ کر نہایت بے تکلفی سے پوچھا۔

”کیا؟“ ایک لمحہ کے لیے تو وہ بولڈی عفریہ امیر واقعی گڑبگڑا گئی تھی۔
”آپ کے بیک کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔“

”آپ چلیں گے میرے ساتھ کاغذ چنے بہت اچھا روزگار ہے۔“ عفریہ نے نہایت سنجیدگی اور رازداری سے کہا۔ تو اب وہاج کے گڑبڑانے کی باری تھی۔ وہ جھینپ مٹانے کے لیے زور سے منہ دیا اور عفریہ بھی مسکرا دی۔ پس یہ ابتداء تھی ان کی دوستی کی۔ جب وہاج سے دوستی ہوئی تو پھر اس کے تینوں دوستوں سے بھی وہ بے تکلف ہو گئی تھی۔

وہ بے دھرمک باتیں کرتی تھی۔ سامنے والے کے لفظی حملے کا جواب ترے دیتی۔ اور جب سے اس نے آصف کا نجو کی نظروں کے بدلے بدلے انداز محسوس کیے تھے۔ تو تب اس کا جی چاہا تھا۔ وہ آصف کا نجو کو روک کر کہے۔

”اتھ لڑکے مت بڑھو میری طرف کہ راستہ بہت پر خار ہے۔ تم زخم زخم ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری زخم زخم پاؤں۔۔۔ سے کانٹے بھی نہ چن سکوں گی“۔ مگر وہ کبھی وہ آصف کا نبوسے یہ سر کہہ سکی۔ اور آف کا بچو دل بہ دن اس کی محبت کی دلدل میں اترا تا چلا گیا۔ عفریہ اس کی کیفیت اور دل ہی دل میں خوب ہنستی تھی۔

اور بھی دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے چھیڑ دیتی تو وہ تھلا کر رہ جاتا۔ عفریہ سوچتی آصف کا نبوسے ضرور کہے گی۔

”آخر تم سچ برداشت کیوں نہیں کرتے؟“

”تم میں جوصلے کا فقدان کیوں ہے؟“

”اگر مجھے چاہتے ہو تو سب کے سامنے اعتراف کیوں نہیں کرتے۔ وہ کون سا خوف ہے تمہیں اعتراف کرنے سے روکتا ہے۔“

”تم نظروں کے ذریعے جذباتوں کی کندیں مجھ پر پھینکتے ہو اور میں بچ نکلتی ہوں۔ آصف کا براہ راست تو کہہ کر دیجو۔“

”سنو آصف کا نبو! مجھے چاہئے والا شخص اتنا بزدل نہیں ہو سکتا۔ جو بھی مجھے چاہے وہ جرأت ہو۔ ڈنگے کی چوٹ پر چاہے۔ چھپ کر محبت کرنا محبت کی توہین ہے۔“

”میں بہت زخم زخم ہوں آصف اور تم جیسے بزدل شخص کو چاہ کر میں مزید زخمی نہیں ہونا چاہتا۔ میں تو ایسے شخص کی پناہ میں جانا چاہتی ہوں جو اپنی جرأت مندانہ محبت کے پھاہے میرے زخم زخم دل رکھے۔ میرے زخمی پوروں کو اپنے ہونٹوں کے لمبی سے ٹھیک کر دے۔ تجھے کڑیوں سے بچا۔ آندھیوں میں میری حفاظت کرے اور۔۔۔ اور ایسے شخص پر میں اپنا آپ وار دوں گی۔“

”مت بڑھو میری جانب تم۔“

”کہ تمہیں یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے ٹھوکروں کے۔ کیوں زخمی۔۔۔ ہوتے ہو۔ آصف کا نبو تم مجھے بہت عزیز ہو۔ اس لیے کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ اور جو بھی مجھے چاہے میں اسے اپنا پیاروں میں شامل کر لیتی ہوں۔ مگر کیا کروں کہ تمہارے پردوں میں چھپے جذباتوں کو میں قبول نہیں کر سکتی کہ میں ایک بچی اور کھری لڑکی ہوں۔ اور جس سے بھی محبت کروں گی۔ نہایت سچائی سے اور ڈنگے کی چوٹ پر کروں گی۔“

”ارے عفریہ امیر! اب تم کیا محبت کرو گی بھلا وہ عمر تو رہی نہیں۔ جب خلوت دل کی خواہش چھین ہی نہیں لینے دیتیں۔ خواہشوں کے قافلے آپوں اب ہی دل کی سر زمین پر بےسرا کر لیتے ہیں۔ ہاں وہ عمر تو آئی ہی نہیں۔ یا پھر اتنے چپکے سے گزر گئی کہ مجھے بتا بھی نہ چلا۔ عفریہ زور سے اور اپنی ہلکی کی آواز پر ہی وہ چپک گئی تھی۔ اس نے حیرت سے خود کو دیکھا جانے کب سے وہ کھڑی میں کھڑی تھی۔ اور کھڑے کھڑے برسوں پرانے راستوں پر جا کر لوٹ بھی آئی تھی۔

یہ تصور بھی کتنا زور آور ہوتا ہے۔ بندہ جس کے زور پر گزرے دنوں اور مستقبل کے سنہری دنوں کی سیر کر سکتا ہے۔ اور وہ بھی اپنے تصور کے تھ پر سوار ہو کر کہاں کہاں کی اپنے اندر کی عقل کچھ محسوس ہو رہی تھی اور وہ خود کو خاصا ہلکا ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ وہ اپنی سیٹ پر آگئی۔ اور اس نے اپنے پر نظریں جمادیں۔

جن سے کھلتے تھے ساتوں دروازے
اسم وہ سارے پار تھے لیکن
میرے رستے میں آئیں دیواریں

آصف کا نبو نے کروٹ بدلی اور نیلے کوٹھا کر دوںوں کے حلقے میں لے لیا۔ اسے کسی کل بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ زوہیب ٹیبل ٹیپ کی روشنی میں صدیق سالک کی کتاب“ میں نے ڈھا کا ڈوبے دیکھا۔“ پڑھ رہا تھا۔ جو اس نے آج ہی ریڈنگ روم سے اور نائٹ ایٹو کروائی تھی۔

یہ ریڈر لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے ہاں ادیب کی پذیرائی مرنے کے بعد ہوتی ہے جس کی پبلک ریلیٹیز ہوں تو اس کی پبلٹی تو اور زیادہ ہوتی ہے پھر اگر وہ اعلا عہدے پر فائز بھی رہ چکا ہو۔ ہر کوئی اس سے اپنا تعلق جوڑنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

یہی تو ہوا تھا۔ ریڈنگ روم صدیق سالک کی شہادت کے بعد سترہ اگست کے المناک حادثے میں جب وہ بھی اور فوجی افسران اور سربران مملکت کے ساتھ شہید ہوئے تو ہر اخبار کے ادبی ایڈیشن پر ان کے بارے میں مضامین شائع ہوئے۔ ان کی تصاویر کتبوں کے نام اور جنہیں نہیں بھی پتا تھا کہ صدیق سالک ایک فوجی ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے ادیب بھی تھے۔ تو انہیں بھی پتا چل گیا اور ان کی کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ایسے ہی قارئین میں زوہیب جعفری بھی شامل تھا۔ وہ جن جن کر صدیق سالک کی کتابیں لاتا۔ اور ایک ہی رات میں پڑھ ڈالتا۔ اب بڑی مشکل سے کئی ماہ بعد اسے ”میں نے ڈھا کا ڈوبے دیکھا۔“ ملی تھی۔ تو اب۔ ٹیبل ٹیپ جلائے کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

”پارا تم لائٹ آف نہیں کر سکتے۔“ آصف نے سلتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے روشنی ہے کب؟ بلب تو آف ہے۔“ زوہیب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”روشنی ہے تبھی تو مجھے نیند نہیں آ رہی۔“

”روشنی کے بجائے کیا گپ اندھرا کر دوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ زوہیب نے جلیبلا کر کہا اور بلب کا مٹن دیا۔ تو کمرہ روشنی سے نہا گیا۔

”زوہیب! تم تنگ مت کرو مجھے۔ یقین کرو مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی۔“

”تم جانتے ہو۔ آصف زچ ہو کر بولا۔

”میں تو یہ جانتا ہوں کہ اب تمہاری نیندیں اڑ گئی ہیں۔“ زوہیب مسکرایا۔

”کیا مطلب؟“ آصف اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہ مطلب تم عفریہ سے پوچھتے تو وہ تمہیں صحیح طرح سمجھا دیتی۔“

”مت لو اس کا نام۔“ وہ مزاح کر بولا۔

”کیوں دل کی رگیں ٹوٹتی ہیں؟“ زوہیب چھیڑنے سے باز نہ آیا۔

”کبواس نہ کرو ایک وہ کم سے اوگی ہوگی بانٹنے کے لیے جو تم بھی شروع ہو گئے۔“

”تم اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے سچ ہے۔“

”میں کیوں غلط باتوں کا اعتراف کروں۔ عفریہ کو تو شوق ہے توجہ حاصل کرنے کا اور اس طرح جھوٹ کہہ کر وہ سب کو متوجہ کر لیتی ہے۔ آصف لفظ چبا چبا کر بولا۔

”آصف تم سب کچھ کہہ لو مگر اسے جھوٹا نہ کہو۔“ زوہیب نے کہا۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“
 ”دیکھو تم بے شک عفرہ کو نمک جتنا چاہتے ہو مگر میرے بھولے یار تم یہ بھی جانتے ہو کہ اگر کسی کھانے میں نمک تیز ہو جائے تو اسے زہر بنا دیتا ہے اور پھر وہ کھانا کھو کھانا پڑتا ہے۔ کروا جھٹ برداشت نہیں ہوتی بظاہر نمک معمولی چیز ہے مگر بہت اہم شے ہے۔ اسی طرح عفرہ بھی تمہاری زندگی میں بہت ہی خاص قسم کی اہمیت رکھتی ہے۔ چاہے تم مانو نہ مانو۔ آج میں تمہارے اندازے سب کچھ جان گیا ہوں۔ یہ جو تم بڑھ بڑھ کر اس کی مخالفت کر رہے ہو یہ مخالفت نہیں اندر کا کوئی اور ہی جذبہ ہے جس کو تم دبانے کی سعی میں جیتنے چلاتے ہو۔ سچ کیا ہے وہ جو تمہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے اوہم چاہتے ہو کہ تم بھی عفرہ کو اسی طرح توڑ ڈالو۔“ زوہیب کی باتیں اس کے دل میں اتر گئی تھیں۔ وہ اپنے اپنے تخلص دوست سے جھوٹ نہیں بول سکا۔

”ہاں زیوتم جو کہہ رہے ہو سچ ہے مجھے عفرہ اچھی لگتی ہے اپنی تمام تر بدتمیزیوں کے ساتھ بھی میں اسے اپنے دل میں اترنے سے نہیں روک سکا۔“ آصف نے نہایت سچائی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔
 ”یعنی عفرہ صحیح کہتی ہے؟“ زوہیب حیران ہوتا ہوا بولا۔ وہ تو سمجھا تھا۔ آصف دلیل دے گا۔ عفرہ کی بات کو جھوٹ ثابت کرے گا۔ مگر اس نے تو فوراً ہی ہار مان لی تھی۔ جیسے اپنے دفارے کے لیے اس کے پاس کوئی جملہ نہ ہو۔

آصف کہہ رہا تھا۔
 ”ہاں وہ سب جانتی ہے۔ میرے اندر کی وارداتوں کی اسے خبر ہے اس لیے کہ وہ میرے اندر اتری ہوئی ہے۔“

”پھر تم چڑچڑے کیوں ہو؟“ زوہیب نے پوچھا۔
 ”وہ سب کے سامنے جو میرے جذباتوں کا مذاق اڑاتی ہے۔“ آصف نے مصیبت سے کہا۔
 ”تم سمجھاؤ اسے۔“

”سب کے سامنے میں بھلا کیسے سمجھا سکتا ہوں؟“ آصف بار بار ہوا تھا۔
 ”اکیلے میں بھی یہ کام تم نہیں کر سکتے۔“ زوہیب دھوکے سے بولا۔
 ”کیوں بھلا؟“ آصف نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”وہ تمہیں بولنے دے تو تم بولو نا۔“ زوہیب نے کہا اور آصف مسکرا کر رہ گیا۔
 ”میں بات کروں اس سے؟“ زوہیب نے پوچھا تو آصف جلدی سے بولا۔
 ”نہیں تم ایسا نہ کرنا۔“

”کیوں؟“ زوہیب نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔



”کیوں؟“ وہ غرایا۔
 ”میں نے اس جیسی کھڑی اور سچی لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔“
 ”کڑوی ہے۔“ آصف نے عفرہ کو کڑوی کا ٹائٹل دیا۔
 ”کتنی کڑوی ہے؟“ زوہیب نے ابرو نیچاتے ہوئے پوچھا۔
 ”نمک جتنی۔“ آصف نے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ زوہیب اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔
 ”کوئی مطلب نہیں۔“ آصف نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
 ”ویسے آصف ایک بات تو بتاؤ؟“
 ”پوچھو۔ مگر کوئی بے ٹکی بات نہ پوچھنا۔“ آصف نے کہا۔
 ”وہ اچھی نہیں عفرہ عزیز نہیں ہے؟“ زوہیب نے پوچھا۔
 ”جی ہاں وہ ہماری دوست ہے اور بس۔“ آصف سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
 ”پھر بھی کوئی تو حد تم نے مقرر کی ہوگی نا؟“ زوہیب جانتا چاہتا تھا۔
 ”نہ ہو۔ تم نے وہ سات شہزادیوں والی کہانی سنی ہے۔“
 ”کون سی؟“

”میری دادی وہ کہانی سنایا کرتی تھیں۔ مجھے آج تک یاد ہے ہم سب بہن بھائی اور بھائی کزنز بڑے شوق سے وہ کہانی سنتے تھے کہ کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کی سات بیویاں تھیں اور وہ انہیں بے حد چاہتا تھا۔ پتا نہیں ایک روز بادشاہ کے دل میں کیا آئی کہ اس نے سات شہزادیوں کا امتحان لینا چاہا۔ ہر کسی کو باری باری بلا کر پوچھا۔
 ”بتاؤ تم ہمیں کتنا چاہتی ہو؟“

سب سے بڑی شہزادی سے لے کر چھٹی شہزادی تک سب نے جو چیز انہیں مرغوب تھی نام لے کر کہا۔

”بابا جان! آپ کو میں اتنا چاہتی ہوں۔“
 اور سب سے چھوٹی اور ساتویں شہزادی جو سب سے حسین تھی اور ذہانت بھی اس میں حساب تھی۔ بادشاہ اس کی ذہانت کا معترف بھی تھا۔ اس نے ساتویں شہزادی سے پوچھا تو اس نے نہایت اعتماد سے کہا۔
 ”بابا جان آپ اتنے اچھے لگتے ہیں مجھے جتنا کہ نمک۔“

بس جی اس کے جواب پر بادشاہ بھنگا گیا کہ شہزادی نے بادشاہ کو نمک جیسی معمولی چیز کے قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ نے اسے اپنی توہن سمجھا۔ اور کارندوں کو حکم دیا کہ شہزادی کو دوسری جنگل اکیلا چوڑا دیا جائے۔“ آصف سوچوں میں کم بول رہا۔

”تم کہنا چاہتے ہو وہ ساتویں شہزادی اب عفرہ امیر کی صورت میں ہمارے بیچ ہے۔ وہ تو پھٹ اور بدتمیز لڑکی جو بہت ہی تمہیں عزیز ہے۔“ زوہیب پوری کہانی سننے کے بعد بولا۔

”کہنا مجھے وہ نمک جتنی پیاری ہے اور بس۔“ آصف اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔
 ”یار برسوں تم نے اپنی دادی سے کہانی سنی مگر عقل میں یہ نکتہ نہ آیا کہ کسی کو نمک جتنا چاہا بے حد بے حساب چاہنا ہوتا ہے۔“

دم ہی کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھے۔
 ”ارے تم۔۔۔ اسجد۔۔۔“ تیرا آمیز آواز ان کے لبوں سے نکلی۔
 ”جی۔“ اسجد نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور جمال الدین کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی پناہ میں آ گیا۔
 ”تم۔۔۔ تم اچانک بغیر اطلاع کے یہاں کیسے؟ کیوں؟“ بے ربط سے جملے ان کے لبوں سے نکل رہے تھے۔

”بس دل چاہا اور آ گیا۔“ وہ شوشی سے بولا۔
 ”مگر پچھلے ماہ جب میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔“
 ”ارادہ بنتے اور بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔“
 ”یہ تو ہے۔“ وہ اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولے۔
 ”اصل میں چاچا جی میری کمپنی نے ایک پاکستانی کمپنی کے اشتراک سے چولستان میں پانی کی تلاش کا معاہدہ کیا ہے اور مجھے اسی سلسلے میں بھیجا گیا ہے۔“ اسجد نے اپنے آنے کی وضاحت کی۔
 ”ارے واہ۔“ جمال الدین خوش دلی سے بولے۔ ”بیٹھو تم۔“ انہوں نے اسجد کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی قریب ہی ٹک گئے۔ مگر اس سے پہلے تیل بھانا نہیں بھولے تھے۔ تیل کی آواز پر بیون تیزی سے اندر آیا۔ اور موزوں انداز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”بیٹا! چائے چلے گی یا کافی؟“ جمال ملک اس سے پوچھ رہے تھے۔
 ”ٹوٹی، ٹوکائی۔“ وہ بولا۔

”پھر؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کولڈ ڈرنک۔“
 ”گھر چلیں گے اور میں کھانا کھاؤں گا۔“ اسجد نے کہا۔
 ”وہ بھی ملے گا مگر۔“

”کچھ نہیں چاچا جی! میں نے پتا ہے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا کہ اپنے وطن جا کر گرم گرم قہہ پھرے پرائے چاچا جی سے کہہ کر پکواؤں گا۔“ سچ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ وہ پراٹھے جو دادو ہمیں پکا کر کھلاتے تھے۔“

”وہ تو ماں جی ہی پکا سکتی ہیں۔“ جمال ملک بولے۔
 ”تو کیا۔ اب نہیں مل سکتے وہ پراٹھے۔“ اسجد بولا۔

”تم باہر جاؤ گل خان۔“ جمال الدین نے بیون سے کہا پھر اس کے جانے کے بعد اسجد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ماں اور بیوی میں بہت فرق ہوتا ہے اسجد۔ پھر تمہاری چاچی جی جو ہیں نا بس تو شاید کبھی یکن میں جھانکنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”کیوں؟“ اسجد کو حیرت تھی کہ پاکستانی عورت کو بھی کیا یکن میں جانے کی فرصت نہیں ہوتی۔
 ”چوٹے کے سامنے جا کر رنگ جھننے کا اندیشہ جو ہوتا ہے۔“ وہ مسکرائے۔
 ”مگر۔“ اسجد نے کہنا چاہا۔

”چھوڑو یا را! تم بھی کیا ذکر لے بیٹھے۔“ جمال الدین بات بدلتے ہوئے بولے۔ اسجد جان گیا ماکہ وہ عزیز اس ٹاپک پر بات نہیں کرنا چاہتے۔
 ”بس میں نے پراٹھے کھائے ہیں۔“ وہ بیون کے سے انداز میں بولا۔

”وہ اور پڑ جائے گی۔ کہ میں نے تمہیں کیوں سیڑھی بنایا۔ میرا ہوتا کام بھی نہیں آصف نے کہا۔

”تمہارے گھر والے بھی مان جائیں گے؟“ زوہیب نے پوچھا۔
 ”پہلے وہ تو مانے۔ آصف کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ آ گئی۔

”دیکھو آصف تمہارا گھر انہ بہت قدامت پرست ہے اور روایت پرست لوگ ایسی لڑم پسند نہیں کرتے۔“ زوہیب نے سمجھایا۔

”اگر گھر والے نہیں مانیں گے تو میں کورٹ میرج کر لوں گا۔“ وہ جوش سے بولا۔
 ”اور اگر وہ نہ مانی تو؟“ زوہیب نے آصف کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”یہ تو پھر ہی دیکھا جائے گا۔ وقت کے مطابق حالات کو طے کریں گے۔“ آصف نے بے پروائی سے کہا۔ ”اب تم لائٹ آف کرو اور مجھے سونے دو۔ دیکھو تو سواتین بج گئے ہیں۔“

لیٹ گیا اور چادر تان لی۔

”تمہاری خرافات سنتے۔“ زوہیب نے جملہ مکمل کیا۔

”میرے جذبوں کی تو بین مت کرو زبیر۔“ آصف نے اسے گھر کا اور چادر میں منہ چپ زوہیب۔۔۔ سے دلی میں پھپھارا ز کہنے سے وہ خود کو بہت ہی ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس خوشبو میں اٹھ رہی تھیں۔ جو اسے ہولے ہولے لگ گدا رہی تھیں۔ اور ہونٹوں کی مسکان گہری رہی تھی۔

اف عفرہ امیر تم نے مجھ جیسے بندے کو کیا کر دیا۔ کہاں نقب لگائی ہے کہ میرے پاس بچا۔ چلو اب جاؤ۔ اور مجھے سونے دو۔ اس نے تقور میں عفرہ کو جھڑکا۔ اور آنکھوں کو موند لیا۔

☆☆☆

”السلام علیکم چاچا جی!“

بھاری آواز پر اٹھا کر سیٹھ جمال الدین ملک نے دیکھا۔ ان کے سامنے اونچے قد کا شگفتہ چہرے اور چمکتی آنکھوں والا نوجوان کھڑا تھا۔ ایک لحظہ کے لیے تو انہیں یقین نہیں آیا۔

”پھر یوں کرتے ہیں۔ مظفر پور چلتے چلتے ہیں۔ جمال ملک بولے۔

”یعنی میں مزید بھوک برداشت کروں۔“ وہ چلا یا۔

”میں پسند چیز نہ تھی۔ پیٹ تو بھرنا ہے بھوک مٹانی ہے۔“ کچھ اور تھی۔ جمال الدین آ

اور نرمی سے بولے کہ احمد کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

”سناؤ آج وہ۔ وہ فخر کیسا ہے؟“ وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔

”فخر ماموں بالکل ٹھیک ہیں۔“ احمد جلدی سے بولا۔

”تم اسے بھی لے آتے نا؟ تمہارے ساتھ تو آ جاتا وہ۔“

”وہ اول تو آتے ہی نہ۔ ان دنوں وہ ناروے میں ہیں۔“

”کیوں پھرنا ہے وہ نگر نگر؟“ جمال ملک دھبی سے ہو گئے۔

”یہ۔ یہ آپ پوچھ رہے ہیں چاچا جی!“ احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بہت دکھ ہوتا ہے احمد اس نے کیسا بن باس لیا ہے۔ پورے اٹھائیس برس ہو گئے

گئے۔ مجھے تو پھوپھو سے شرمندگی رہی۔ اب بھی میں ان کے تصور کے سامنے شرمندہ رہتا ہوں

تو زمین کا پیوند کو تمام دکھوں سے چھٹکارا پاؤں اور مجھے احساس کی انجانی دلدل میں اتار

برسوں گزر گئے مگر میں اس دلدل سے نہیں نکل سکا۔“ جمال ملک کی آواز بھر گئی۔

”مگر کیوں؟ آپ کا کیا قصور ہے؟“ احمد نے کہا۔

”پھوپھو نے بار بار مجھے کہا تھا کہ میری وجہ سے وہ جوگی بنا ہے۔ بتاؤ بھلا جو میرا کیا قصور

اتنا ہی تاکہ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کی اور میں نے اسے بھیج دیا۔ مجھے کیا

اس کے دل میں کیا ہے۔ وہ کیوں جانا چاہتا ہے؟“ جمال ملک کے لہجے اور لفظوں

تھے۔ لگتا تھا لفظوں کے کناروں سے اشک بہہ رہے ہوں اور ان کی بجلی ان کے لہجے میں صاف

کی جا سکتی ہے۔

”آپ انہیں خود لے آتے۔“ احمد بولا۔

”ایک بار کیا کئی بار گیا ہوں لینے۔ مگر وہ عجیب باتیں کرتا ہے جو میں حیران ہوتا ہوں

کی اتنی ذمہ دار پوسٹ پر کام کس طرح کر رہا ہے۔ اگر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کوئی

فخر عالم کو کچھ سوچے سمجھے بغیر منٹل قرار دے دے۔“ جمال ملک کی بات پر احمد مسکرا کر رہ گیا

سب سن کر ذرا حیرت نہ ہوئی تھی۔ اسے علم تھا کہ فخر عالم جو اس سے کسی باتیں کرتے

ایسے مواقع آتے کہ احمد نے فخر عالم سے کہا تھا۔

”ماما! ایک بار تو آپ پاکستان چلے جائیں۔ امی اور بڑی خالہ کتنا بلا تاتی ہیں۔ بے شک

جایے گا۔ چند روز رہ کر۔ مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

”نہیں جو۔ میں اسے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

تب ایک روز چڑ کر احمد نے کہا تھا۔

”وہ آپ کو نہیں ملے گی ماما۔ بھلا مردے بھی زندہ ہوئے ہیں۔“

”احمد!“ وہ چیخ پڑے۔

”آپ سچائی کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟“ احمد بھی غصے سے بولا۔

”کسے تسلیم کروں۔ اور کیوں تسلیم کروں۔ وہ زندہ ہے مجھے تلاش رہتی ہے۔ اس کا

سائی دیتی ہے احمد اور جب وہ تھک جاتی ہے تو رونے بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی سسکیاں میری سماعتوں کو

چیرتی ہیں۔ بار بار میرا گریبان اس کے آنسوؤں سے بیگنا ہے۔ سمجھیں کیا معلوم وہ بیٹیں کہیں ہے بہت

نزدیک۔ بس اس کے نزدیک جانے والا راستہ نظر نہیں آتا۔ اور جس روز تجھے راستہ ملا میں ایک ہی

جست میں پہنچ جاؤں گا۔ اس کے پاس۔ ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ کسی تصور سے۔

”ایک سراب ہے سب کچھ جبکہ حقیقت وہ ہے جس سے آپ نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں

اور آپ کو ایک روز وہ حقیقت ماننی پڑے گی واقعی وہ نہیں ہے۔“

”تم مانو گے کہ میں جو کہتا اور سمجھتا ہوں حقیقت وہ ہے۔ جب وہ میرے ساتھ ہوگی تو تم سب

شرمندہ ہو جاؤ گے۔ اپنے جذلوں پر میرا یقین ہے اور اپنی لگن پر بھی کہ وہ مجھے ملے گی۔ میری صدا میں

اس تک پہنچتی ہیں اور جب تک وہ مجھے نہیں مل جاتی میں اس پکارنا ہوں گا۔“ فخر عالم کے لہجے کا عزم

احمد کو خاموش کر داتا مگر جب وہ چڑ جاتا تو پھر اپنے ماما کو سمجھانے کے لیے لفظوں کی بیساکھیاں لے

کر کھڑا ہو جاتا۔

فخر عالم کو کس کس نے نہ سمجھا یا تھا۔

جمال الدین ملک نے بار بار کہا تھا۔ ”دیکھو فخر! تم ایک لفظ کو منزل سمجھ کر بھاگ رہے ہو۔

تمہاری دوڑ ختم نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی تم منزل تک پہنچ سکے ہو کہ وہ نقطہ منزل نہیں صرف نظر کا دھوکا ہے۔

مجھے دیکھو۔ میں عدیرہ کا باپ ہوں۔ میں نے اس حقیقت کو مان لیا ہے کہ عدیرہ نہیں ہے اس دنیا

میں۔“

”آپ مان لیں۔ مگر میں نہیں مان سکتا۔ مجھے یقین ہے وہ زندہ ہے۔“ وہ کہتے۔

”اگر زندہ ہوتی تو مل گئی ہوتی۔“

”بس نصیب میں جب ملنا ہوگا ملے گی۔“ وہ مسکرا دیتے۔

”فرض کرو وہ تمہارے تصور سے مختلف حالت میں ہوتی تو۔۔۔“

”تو۔؟“ فخر عالم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہر بات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا اگر وہ بدل گئی تو پھر کیا ہوگا۔ تم اسے قبول کر لو گے؟“

”آپ اسے قبول کر لیں گے؟“ فخر عالم سے پوچھا۔

”میری تو وہ بیٹی ہے۔“

”تو میرا وہ دل ہے۔ میری سوچ ہے۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا ہے وہ پھر میں اسے قبول کیسے

نہ کروں گا۔“ فخر عالم نے جذب کے عالم میں کہا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح جمال الدین ملک بار کر رہ گئے

تھے۔ فخر عالم جو فرینکفرٹ میں رہتے تھے اور جمال الدین سال میں ایک دو بار ضرور ان سے ملنے

جاتے تھے۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ یہ جانے جاتے تھے کہ اس کی تلاش کہاں تک پہنچی؟ کبھی کبھی وہ

حیرت سے کہتے۔

”فخر! عدیرہ تو پاکستان میں سردار پور میں گم ہوئی تھی۔ تم کہاں کہاں تلاشتے ہو؟“

”میں اسے دنیا کے کونے کونے میں تلاشتا ہوں اور تلاشوں گا۔“ فخر عالم نے کہا تھا اور واقعی فخر

عالم نے گزرے اٹھائیس برسوں میں چھ برس تو تعلیم مکمل کی تھی اور بائیس برس ایک خواب کی تلاش

میں صرف کر دیے تھے۔ پورا یورپ اور امریکہ پھر ڈالا تھا۔ مڈل ایسٹ کے چند ملک ہو آئے تھے۔

استنبول اور اہرام مصر بھی دیکھ ڈالے تھے۔ مگر ان کا گوہر مقصود کہیں نہ ملا تھا۔ ابھی تک ان کی صدا

وہاں تک نہ پہنچی تھی کہ جواب آتا۔

”پھر چلو جواب گھر چلتے ہیں۔ میں گل کو فون کر کے اطلاع دے دوں۔“

”کیا تم گھر سے آ رہے ہو؟“ جمال ملک کی آواز نے اسجد کو چونکا دیا۔

”نہیں میں شیرٹن میں ٹھہرا ہوں۔“ وہ بولا۔

”کیوں؟“ وہ ابرو چڑھا کر بولے۔

”میرے ساتھ اور بھی کولیکٹر ہیں نا؟“ اسجد نے بتایا۔

”لیکن گھر موجود ہے تو تم وہاں کیوں رہو گے؟“

”بھئی کمپنی کی طرف سے پہلے ہی ہونٹل میں کمرے ریڑز تھے۔“

”مگر تم گھر میں رہو گے۔“ انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

”کل اسلام آباد جانا ہے۔“ اسجد بولا۔

”تم گھر نہیں جاؤ گے؟“

”وہاں رپورٹ کرنے کے بعد لاہور جاؤں گا۔ پھر تو چولستان جانا ہوگا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے چولستان کی ریلی زین کے نیچے پانی کے ذخائر ہیں؟“ جمال ملک پوچھ رہے تھے۔

”مٹی کے نمونوں سے تو پتا چلا ہے کہ میٹھا پانی بھی ہے اور ڈیرہ غازی خان کی طرف تیل کے

بہت بڑے ذخائر ہیں۔ اور انشاء اللہ بہت جلد ہم کامیاب ہوں گے۔“ اسجد نے پر یقین لہجے میں کہا۔

”کتنے سال کا منصوبہ ہے؟“

”دو سال کا کنٹریکٹ ہے۔ خیال ہے کہ اس۔۔۔ سے بھی کم عرصے میں یہ کام مکمل ہو جائے۔“

گا۔

”تم پھر واپس چلے جاؤ گے؟“

”جانا پڑے گا۔“

”کیوں؟ اب اپنے ملک میں رہو جو! اس ملک کو تم جیسے قابل نوجوانوں کی ضرورت ہے۔“

”یہ درست ہے مگر پھر فقر ماما وہاں بالکل تمہارے جائیں گے۔“ اسجد نے کہا۔

”وہ لون سا تمہارے ساتھ رہتا ہے۔“ وہ بولے۔

”چاہے کہیں رہیں۔ گھر تو لوٹنے ہی ہیں۔ انہیں پتا ہے کہ یہ ٹھکانا ہے اور اگر میں لوٹ آیا

چا چا جی فخر ماما کھو جائیں گے۔ ہم انہیں کہاں تلاشتے پھریں گے۔ یہ ایک اور دکھ ہمارے خاندان

سہنا پڑے گا۔“ اسجد کہہ رہا تھا اور اس کی باتیں جمال الدین ملک کے دل کی تہوں میں اتر رہی تھیں۔

”سچی تو کہہ رہا ہے جو۔“

”اگر۔ اگر فخر عالم بھی کھو گیا تو اسے بھری دنیا میں کہاں تلاشیں گے اور کون ڈھونڈے

اسے۔“

”اب جبکہ زندگی کی شام ہونے والی ہے۔ جمال ملک کیا تم خود میں اتنی ہمت پاتے ہو کہ اگر

کی تلاش میں نکلو گے۔“

”میں۔۔ میں تو عرصہ ہوا تھک گیا ہوں۔“

”گناہ سے بھرا دل ہے۔“

”تکوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ جوندگی کی پُر خار راہ پر چلتے ہوئے روز بنتے ہیں اور روز

ہی پھوٹتے ہیں۔ درد سے بے حال ہونے کے باوجود بھی وہ چلتے تھے کہ۔۔۔ مقدر میں یہی لکھا تھا۔

تقدیر کو ایسا ہی پسند تھا۔ کرچیاں پاؤں میں پیچیں دل خون ہوا۔ اور۔۔۔

چلتے رہیں۔

سکلتے رہیں۔

ترپتے رہیں۔

اور انہوں نے بھی قدموں کو روکا نہ تھا۔

”دل زخموں سے چور تھا۔ پاؤں آبلوں سے بھرے پڑے تھے لیکن شدت کرب سے وہ ہونٹوں کو

بھینچے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جمال الدین ملک نے اپنی سیکڑی مس کلا را کو ضروری ہدایات دیں

اور پھر اسجد ملک کے ہمراہ اپنے آفس کی وسیع عمارت سے باہر آ گئے۔

باوردی ڈرائیور گیٹ پر موٹر گاڑ دروازہ کھولے ان کا منتظر تھا۔ سجو اور وہ سفید براق کوروالی پچھلی

سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا۔ اور اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”بس سر۔“ ڈرائیور مڑے بغیر اجازت طلب کر رہا تھا۔

”گھر چلو۔“ جمال الدین کے لب بے اور کار حرکت میں آ گئی۔

☆☆☆

سخت گرمی تھی۔ دن بھر لو کے تھپڑے منہ پر پڑتے اور شا میں خشک ہو جاتیں۔ چینی ریت پر

سے ہو کر آنے ہوا میں بالکل آگ کے شعلوں کی طرح بدن کو تپاتی ہیں۔ پھر بھی رنے والے ایسے

علاقوں میں رہتے ہیں۔ فصل کی کٹائی تھی۔ ساتھ ہی رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ بھی تھا۔ لوگ

روزہ رکھ کر اناج کی کٹائی جیسا سخت کام کرتے تھے۔

انہی لوگوں میں حیات محمد کا گھرانہ بھی تھا۔ حیات محمد اور فضل دین بھی صبح سحری کے بعد کھیتوں

میں جا کر سونے جیسی چمکتی اناج کی فصل کو کاٹتے تھے۔ اور یہ مشقت دوپہر تک جاری رہتی۔ جب

سورج سروں پر آ جاتا۔ پھر باپ بیٹا گھر لوٹ آتے مگر آنے سے پہلے دریا یہ نہانا نہ بھولتے تھے۔ پھر

گھر آ کر بیری کی چھاؤں تلے چار یا نیاں ڈال کر سورتے۔ شرفاں تو حسب سابق کم صم رہتی۔ جب

کہ تاباں این دنوں رنگ برنگے دھانگوں سے اپنا دوپٹہ کاڑھنے میں مصروف تھی۔ وہ ماں کے پاس تہی

پٹھی رہتی تھی۔ شرفاں نہایت پر شوق نظروں سے اسے دیکھتی رہتی۔

”کیا دیکھتی ہو اماں۔“ ایک بار تاباں نے پوچھ ہی لیا۔

”تو کتنی سوئی ہے تابی! شرفاں کے لب کاٹنے۔“

”اماں! تم خود جو سوئی ہو۔ اس لیے تو سوئی بچی پیدا کی ہے۔ یہ میرا کمال تو نہیں کہ میں سوئی

ہوں۔“ تاباں نے اپنے موتیوں جیسے دانتوں سے دھاگا توڑتے ہوئے کہا۔ تو شرفاں کے نازک لب

مکھڑے لگے۔ اور آنکھوں میں انجانی سی جوت چمکنے لگی۔ اپنی خوبصورتی کا اعتراف سن کر وہ بہت

خوش ہوئی تھی۔ اور آج اسے پہلی بار لگا تھا۔ جیسے پردوں کے پیچھے دو سائے آپس میں الجھ رہے

ہوں۔

”اے بھوری ملی۔“ وہ لڑکا ہمیشہ لڑکی کو بھوری ملی ہی کہتا تھا۔

”تم باگڑ بولتے ہو۔“ تنگ آ کر بولتی۔

”چلو تم بلی اور میں بلا“

”جی نہیں میں تو پری ہوں پری“ وہ اکڑ کر کہتی۔

”اچھا۔۔۔ بھی اتنی خوبصورت ہو“ لڑکا بھوری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”مما بہتی ہیں مجھ جیسا کوئی نہیں؟“ لڑکی کا لہجہ فخریہ تھا۔

”ظاہر ہے بھوری بلی جیسا کون ہو سکتا ہے؟“

”دیکھو تم مجھ کو غصہ نہ دلایا کرو“

”لو بھلا غصے کی کیا بات ہے تم ہو ہی“

”مما!“ لڑکی غصے سے تنٹنا کر ماں کو پکارنے لگی۔

”خدا کے واسطے چیخو ٹو مت بھوری بلی“ وہ منمننا کر کہتا۔

”پھر تم نے کہا“

”چلو پری ہی سہی۔ تم پری ہو۔ یہ تو بتاؤ تم آئی کہاں سے ہو؟“

”آسمانوں سے“ لڑکی لہک کر بتاتی۔

”اچھا“ لڑکے کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

”ہاں ممما کہتی ہیں۔ میں آسمانوں سے آئی ہوں اور پھر آسمانوں پر چلی جاؤں گی“

”نہیں۔۔۔ نہیں“ لڑکا ترپ کر بولا۔

”کیوں نہ جاؤں مجھے بہت شوق ہے آسمان پر جانے کا“

”اگر تم چلی گئیں تو میں کیا کروں گا“

”تم مجھے آواز دینا“

”پھر کیا ہوگا“

”میں آ جاؤں گی“ لڑکی سر ہلا کر بولی۔

”اور پھر واقعی وہ پری آسمانوں میں کھو گئی۔ کسی نے اسے آواز ہی نہ دی کہ وہ واپس آ جاؤ

شرقاں بڑبڑائی۔

”کیا ہوا اماں؟“ تاباں کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”تجھے پتا ہے تابی! وہ پری گم ہو گئی ہے۔ آسمانوں پر جا کر۔ پھر کوئی اسے ڈھونڈنے نہیں آ

”اماں! کون سی پری؟ کیسی پری؟ آج تم کیسی بائیں کر رہی ہو؟“ تاباں نے ماں کا ہاتھ

لیا۔

”وہ جو اس کو بھوری بلی کہتا تھا تا وہ بھی تلاش نہ نہیں آیا۔ کیسے ہوتے ہیں یہ لوگ۔

خلاف“ شرقاں نے ماں کی بھوری آنکھوں میں جھانکا۔ کامل سے تھا وہ خوبصورت آنکھیں جن

عجیب طرح کا سوز اور گداز تھا۔ جیسے بیانا نے پھلکنے کو بے تاب ہوں۔ جیسے ابھی سلاب کی وجہ سے

کا بند ٹوٹنے والا ہو۔ جیسے وہ ابھی ابل ہی پڑے۔ بھی فضل دین نے کروٹ بدلی اور زہر خند نکلا

سے شرقاں کی طرف دیکھتے ہوئے تاباں سے مخاطب ہوا۔

”کہا جاتا ہے رمضان شریف میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ مگر۔۔“

”ابا!“ تاباں نے احتجاج کیا۔

”تو اپنی ماں کو نہیں سمجھاتی۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”نیند خراب کرتی ہے۔“

”بھلتی ہے یہ تو تم تو احساس کر لیا کرو۔ سودائی عورت کے ساتھ کیوں مٹھا لگاتے ہو۔“

”میں۔۔۔ میں سودائی نہیں ہوں“ شرقاں نے احتجاج کیا۔

”سن لے۔ سن لے۔ خود کہہ رہی ہے یہ سودائی نہیں ہے۔ نہ چھٹی ہے۔ مگر کرتی ہے۔“ فضل

دین تلملارہا تھا۔

”ابا! جب تم جانتے ہو کہ مگر کرتی ہے۔ تو تم خود کو کرب میں مبتلا کرتے ہو۔ برسوں گزر گئے

ہیں۔ تم دونوں دلی طور پر تو نہ سہی دہنی طور پر بھی قبول نہ کر سکے۔ ایک دوسرے کو۔“

”تو چپ رہ تابی! تو چپ رہ۔“ حیات محمد نے چہرے پر سے لملل کا کپڑا اتارتے ہوئے کہا۔

کہنے دے اسے۔ یہ اس اللہ لوگ عورت کو تنگ کرتا ہے کرنے دے دھی اسے۔ خود جھگٹے کا۔ پر دین

ہے یہ کئی واری کہہ چکا ہوں پردیسوں کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔ جو اپنوں سے بچھڑا ہوا ہو۔ اس کا دل

خدا کا گھر ہوتا ہے۔ خدا ان کے بالکل قریب ہوتا ہے۔ بہت نزدیک ہو کر ان کی دعا میں سنتا ہے مگر

اس بے عقلے کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں۔ نہ کیا کر فضول تنگ تو اسے۔ خدا کا دیون کیوں ہوتا

ہے۔ اوئے بے وقوف یہ ہماری پناہ میں ہے۔ امانت ہے۔“ فضل دین ایک جھٹکے سے لیٹا لیٹا اٹھ کر

چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”امانتیں تو صدیوں بڑی رہتی ہیں۔“ حیات محمد مسکرایا اور فضل دین نہایت خاموشی سے اپنے

ہاتھ کی لکیروں کے کال کو دیکھتی رہی تھی۔ اور پھر وہ شام تاباں کے لیے حیرت لے کر آئی تھی جب

اظہار کے بعد مغرب کی نماز پڑھ کر فضل دین گھر آیا تو شرقاں نے کہا۔

”اپنے ابا کے لیے روٹی نکال دے میں دے آؤں اسے بلکہ میں بھی اسی کے ساتھ کھاؤں

گی۔“

”تم اماں۔“ مارے حیرت کے تاباں کی آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔

”ہاں آج میرا دل چاہ رہا ہے۔“ تاباں حیرت میں غوطہ زن تھی۔

”یا خدا! یہ کیسی کایا پلٹ ہے۔“

پہلے تو کبھی فضل دین یہ خواہش بھی کرتا تھا کہ شرقاں اس کے ساتھ ایک ہی رکابی میں

کھانا کھائے تو وہ صاف انکار کر دیتی تھی۔

اسے بہت گھن آتی تھی جب فضل دین شور بے میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں

میں تو اس نے برداشت کیا تھا۔ برداشت کیا کیا تھا خود ہی بھوکی رہ جاتی تھی لیکن جب احتجاج کرنے کا

سلیقہ بنا گیا۔ تو پھر فضل دین ہی ہارا تھا۔ اور اپنی شکست کا احساس زائل کرنے کے لیے وہ شرقاں کو

دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ شرقاں چنگیر میں روٹی اور اس پر کٹوری میں سالن رکھے فضل دین کے قریب آئی

جو چارپائی پر دراز تھا۔

”کھانا کھا لو تابی کے ابا۔“

فضل دین نے سر اٹھا کر قریب کھڑی شرقاں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت

تھی۔ شرقاں کے لب مسکرا رہے تھے۔ اور بھوری آنکھوں میں عجیب سی لپک تھی۔

”بھئی جگہ بناؤ۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔“ شرقاں نہایت معصومیت سے بولی۔ فضل دین نے

جلدی سے پاؤں سمیٹ لیے۔ ایک دم ہی اس کے اندر نرمیاں سی اگ آئی تھیں۔

شرقاں نے چنگیر رکھ دی اور خود پائنتی بیٹھ گئی۔ تاباں نے مکین کی کجگ بھر کر اس کے قریب

ہی رکھ دیا۔ اور فضل دین سے بولی۔
 ”ابا زیادہ غلطی اچھی نہیں ہوتی۔ اب تم روز ہی اماں کے ساتھ کھانا کھایا کرو گے۔ ہے نہ ابا۔“
 ”تاہاں نے ماں سے پوچھا۔“
 ”ہاں۔“ شرفاں نے سر ہلایا۔
 ”میں ماسی بخت سے دھکا لے لینے جا رہی ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں نا؟“ تاہاں پوچھا۔

”ماں۔“ شرفاں نے کہا۔
 ”ابا لڑنا نہیں۔“ تاہاں نے آہستگی سے سرگوشی کی اور ایک دم ہی پلٹ گئی۔ حیات محمدی چولہے کے پاس بیٹھا حق کی چلم میں انگارے رکھتے ہوئے حیرت سے بہو بیٹے کو دیکھ رہا تھا جو نہایت خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔
 کھانا کھا چکنے کے بعد شرفاں نے فضل دین کے ہاتھ دھلائے اور برتن اٹھا کر رکھے پھر فضل دین کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ نکیہ کہنیوں تلے رکھے نہایت بر شوق نظروں سے بیوی کو دیکھنے لگا۔
 ”فضل۔ تم بہت تھک جاتے ہو گے نا؟“
 ”کیوں؟“ فضل کا لہجہ پھول کی طرح نرم تھا۔
 ”آج کل تم روزہ رکھ کر فصل کی کٹائی کرتے ہو۔ شام کو وہ بڑے بڑے گٹھے ایک جگہ کرتے ہو تو کیا سمجھتے ہیں؟“

”شرف۔“ فضل دین نے چور نظروں سے باپ کی طرف دیکھا جو ان کی طرف سے ہر موڑے حق گزارنے میں مصروف تھا۔ تب اس نے شرفاں کا ملائم ہاتھ تھام لیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے پیچ بھینچتا ہوا بولا۔
 ”تو میری تسکین کے سارے کانٹے چن سکتی ہے۔“
 ”کیسے بھلا؟“ شرفاں نے انجان بن کر پوچھا۔
 ”اپنی ان خوبصورت انگلیوں کی پوروں سے۔ اپنی مسکراہٹ کے پھولوں سے۔ ٹو۔ ٹو۔ ٹو۔ مسکرا کر نہیں دیکھتی۔“ کتنا معصوم سا شکوہ کیا تھا اس نے۔
 ”چلو آئندہ میں مسکراؤں گی۔“ شرفاں نے جلدی سے وعدہ کیا۔ ”مگر ایک شرط ہے۔“
 ”بولو۔“ وہ تیار ہوتا ہوئے بولا۔
 ”تم مجھے مارو گے تو نہیں۔“
 ”میں۔ میں۔ فضل سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔“
 ”پتا ہے فضل میری ہڈیاں دھتی ہیں۔ یہ دیکھو ابھی تک نیل نہیں گئے۔ یہاں سے۔“ شرفاں نے آستین ہٹا کر گورا بازو دکھایا۔ جہاں بڑا سا نیلا نشان تھا۔ جیسے خون جم گیا ہو۔ درد کی اک لہر آ فضل دین کے دل سے لپٹی۔ وہ دکھ سے بولا۔
 ”ٹو۔ ٹو۔ مجھے مار لے شرف۔“

”میں بھلا کیوں ماروں؟ بس تم مجھے نہ مارا کرو۔“
 ”وعدہ۔ ٹو کتنی ہی بڑی غلطی کرے گی تاہاں نہیں ماروں گا۔“
 ”ٹھیک۔“ فضل دین نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر نہایت محبت سے کہا۔

”تو میری محبت ہے شرف۔ میں تیری آنکھوں میں خود کو دیکھنا چاہتا ہوں جھلی۔ تجھے دکھی کر کے میں کون سا سکھی رہتا ہوں۔ تجھے کیا خبر تو سارے جگ میں مجھے کتنی عزیز ہے۔ تو حکم کر میں تیرے قدموں میں خوشیوں کے ڈھیر لگا دوں۔ مگر ایسی کوئی خواہش نہ کرنا جو میرے اختیار سے باہر ہو۔ فضل نے اس کا ہاتھ تھاما۔“

”میں نے جو خواہش کرنی تھی کر دی۔ بس مجھے مارنا مت فضل۔“ وہ مار سے بہت خوفزدہ تھی۔
 ”نہیں ماروں گا۔“ فضل نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو اس کے سینے سے آگ لگی۔ مٹیالے اندھیرے میں ان سانسوں کو کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ فضل دین کے دل میں ٹھنڈک سی اتر گئی تھی اور یہ دریا کے ٹھنڈے ٹیٹھے پانی جیسا احساس ہی تو تھا۔ جو زندگی میں پہلی بار اس دل کے آنگن میں رواں دواں تھا۔ آج سے پہلے اس نے کب ایسا سکھ محسوس کیا تھا۔

شرفاں کو اس نے بے حد اور بے حساب چاہا تھا۔ اور قربت کے نازک لمحوں میں اس بات کا اعتراف بھی اس نے شرفاں سے کیا تھا۔ مگر شرفاں نے تو پتا نہیں لبوں پر کیسے تالے لگائے ہوئے تھے کہ کسی عطر ہیز لمحے میں بھی وہ نہ کھلے تھے۔ آج بالکل اچانک اور ایک دم ہی شرفاں نے خود اس کے پاس بیٹھنے کی خواہش کی تھی۔ اور اب بھی وہ کسی معصوم بچی کی طرح اس کے سینے سے چپکی ہوئی تھی۔ پہلی کی طرح اس نے فضل دین کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پوری قوت کے ساتھ دھکیلا نہ تھا۔ شاید حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے اس نے۔ فضل دین نے سوچا۔ اعتراف محبت تو شرفاں نے نہ کیا تھا۔ مگر فضل دین کو امید تھی کہ کسی روز ایسا ہو جائے گا۔
 وہ کیسا دن ہوگا۔

خوش ہو کر اس نے سوچا اور اپنے سینے سے لگی شرفاں کے سر کی طرف دیکھا جہاں سیاہ بالوں کو لمبی ندی جیسی مانگ نے دھنوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ فضل دین نے اس مانگ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

☆☆☆

”اُف توبہ حلق سوکھ گیا ہے۔ لگتا ہے کانٹے اُگ آئے ہوں حلق میں۔“ عقیقہ نے اپنے بڑے سے بیک میں فائل ٹھونکتے ہوئے کہا۔
 ”گرمی بھی تو شدید ہے۔“ وہاں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں کھلے آسمان سے سورج آگ برسا رہا تھا۔ ایک دم ہی گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔
 ”سنو دجہی۔ مجھے پیاس لگی ہے۔“ اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔
 ”پھر کیا کروں۔“ وہاں نے گردن موڑ کر پوچھا۔
 ”مجھے پانی پلاؤ۔“ وہ بچوں کے سے ضدی انداز میں بولی۔
 ”باگل ہوئی ہو۔ رمضان میں کہاں سے پانی لاؤں۔“
 ”چلو پانی نہ سہی کولڈ ڈرنک ہی سہی۔“ عقیقہ کے انداز میں شرارت ہی شرارت تھی۔
 ”عفی۔ تم کو میں بیوقوف لگتا ہوں؟“

”لگتی کی کیا بات ہے۔“ عقیقہ نے آنکھیں نیچائیں۔
 ”دیکھو تنگ نہ کرو۔ تمہیں پتا ہے ساری یونیورسٹی کے کولر بند ہیں۔“ وہاں نے بتایا۔
 ”نہر تو سلامت ہے۔“ عقیقہ امیر نے کب شکست مانی تھی۔

”وہ گدلا پانی تم پیو گی۔“ وہاں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے تمہیں پیتے ہیں وہاں کے دیہاتی لوگ اس سے بھی گندہ پانی پیتے ہیں کبھی تم چولستان کے علاقے میں گئے ہو۔ صحرائے کھل جہاں ٹوبھوں میں برسات کا پانی جمع کیا جاتا ہے اور وہی پانی وہاں کے لوگ پیتے ہیں۔ اسی پانی میں ان کے مویشی نہاتے ہیں۔ عورتیں کپڑے دھوتی ہیں وہیں اور پھر وہی پانی۔“

”تم کرو ایسی باتیں۔ میں نہیں سن سکتا۔“ وہاں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”تم سن نہیں سکتے۔ اور جن پر گزرتی ہے۔ ان کی برداشت کا اندازہ لگاؤ۔ کتنے بڑے دل ہیں ان لوگوں کے میں سروے کے لیے گئی تھی نا تو۔“

”اچھا یہ باتیں تم مجھے کیوں سنارہی ہو۔“ وہاں نے پوچھا۔

”یارتہ زمیندار لوگ ہوا اگر کھل کے علاقے میں دو چار ٹیوب ویل لگوا دو تو کیا حرج ہے۔ ان کے آنے والی تسلیں صدیوں تک دعائیں دیں گی۔“ عفریہ نے مشورہ دیا۔ یہ تو نیکی کا کام ہے۔

”جب مجھے میرا حصہ مل جائے گا تب کروں گا یہ کام نیکی کے۔“ وہاں بولا تو عفریہ ہنس دی۔

”سرمایہ دارسر مایہ دار ہی ہوتا ہے۔ اسے بھی غریبوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ وہ چاہتا ہے کہ غریب کا پیٹ ہمیشہ خالی رہے۔ اگر غریب کا پیٹ بھر گیا۔ تو وہ بھی گردن اونچی کر کے بات کرے گا اور تم جیسا استحصال طبقہ یہ کب برداشت کر سکتا ہے کہ۔“

”تمہاری بکواس بند نہیں ہو سکتی؟“ وہاں کر جا۔

”چلو کوئی اور بات کرتے ہیں؟“ عفریہ نے نہایت بے پروائی سے کہا۔

”بیٹاؤ کیا بات کروں؟“ اس نے اتنی معصومیت سے پوچھا کہ وہاں کو ہنسی آ گئی۔

”بہت ہی کٹی شے ہو۔“

”اے میں انسان ہوں۔“ عفریہ نے گھورا پھر ایک دم ہی ٹھٹھک گئی۔

”ذرا یہ میرا بیگ پکڑنا میں واش روم سے ہو آؤں۔“ وہ اپنا بیگ وہاں کے ہاتھ میں تھما کر جلدی سے واش روم میں گھس گئی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ باہر آئی تو وہاں اسے دیکھ کر ہنس دیا۔

اس سے چہرے کے ساتھ بال بھی بھگو لیے تھے۔ جو چپک کر رہ گئے تھے۔ اور بالوں کی ٹوکولا سے پانی بوندوں کی صورت اس کے آف و ہاٹ کھدر کے سوٹ میں جذب ہو رہا تھا۔

”تم تو بالکل بکوتری لگ رہی ہو۔“ وہاں ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

”اچھا“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ اور بیگ اس سے لے لیا۔

”آخر کیا ضرورت تھی۔“ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”بھئی پانی دیکھ کر جی چاہ رہا تھا نہالوں۔ مگر سر ہی گیل کر لیا۔ رنج کر پانی بھی پی لیا۔ اور پھر رعب ڈالنے کی بات ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہاں رعب والی بات نہ سمجھا تھا۔

”بھئی لوگ سمجھیں گے مجھے روزہ بہت لگا ہے۔“

”شرم کرو لوگوں کو دھوکہ دے رہی ہو۔“ وہاں نے غیرت دلائی۔

”لوگ تو اللہ میاں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں تو پھر اللہ کے بندوں کو دے رہی ہوں۔ دھوکا۔“ عفریہ نے آخری لفظ ذرا کرا کر کہا۔ پھر بولی۔

”وہ یار وجہی! ایک بات ہے۔ رمضان شریف میں یونیورسٹی بند ہونی چاہیے۔“

”کیوں بھلا؟“ وہاں کو اس کی بات سمجھ نہ آئی۔

”دیکھ نا ضروری نہیں کہ ہر کوئی روزہ دار ہو پھر یہاں غیر ملکی لوگ بھی پڑھتے ہیں۔ اب دیکھو نا ان کے روزے ہوتے ہیں۔ تو ہم دھڑلے سے ان کے سامنے کھاتے پیتے ہیں۔ یہ ان پر ظلم نہیں کہ ہمارے ساتھ ان کو بھی کچھ نہ ملے۔“

”جی لبرل مت بنا کرو۔“ وہاں نے کہا۔

”سچی بات کو تم تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ کہہ نہیں سکتے کہ ہاں میں جو کچھ کہہ رہی ہوں ٹھیک ہے اور پھر دیکھو نا یہ یہ برکتوں کا مہینہ عبادت کر لیے ہوتا ہے۔ دنیا جہاں کے جھجٹ۔ یونیورسٹی آؤ نوٹس ہاؤ۔“

”پانی کے لیے مارے مارے پھرو۔“ وہاں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”ہاں یہ کام ہی ہے۔“ عفریہ ہنس کر بولی۔

”تم بیٹاؤ عید کرنے گاؤں جا رہی ہو؟“ وہ بات پلٹ کر بولا۔

”ناں۔“ عفریہ نے گردن ہلائی۔

”کیوں؟“

”بس یونہی۔“

”کوئی وجہ تو ہوگی؟“ وہ جاننا چاہتا تھا۔

”وجہی! بس دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے گول مول سا جواب دیا۔

”پچھلے سال بھی تم نہیں گئی تھیں۔“ وہاں نے یاد دلایا۔

”میں تو گزرتے تین برسوں سے نہیں جا رہی۔“ عفریہ نے اطلاع دی۔

”میں خفا ہوں اپنے والدین سے۔“

”بری بات ہے عفو!۔“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے چودھری وہاں احمد۔“ وہ ڈپٹ کر نہایت بدتمیزی سے بولی۔ تو وہاں نے اس کی بات کا برا نہ منایا کہ کبھی بھی جب اندرونی خلفشار حد سے بڑھتا تو وہ یونہی ہتھے سے اکھڑ جاتی تھی۔

”اکیلے کیسے تم یہ بڑا دن گزارو گی؟“ وہاں پوچھ رہا تھا۔

”جیسے گزرا رہے ہیں بہت سے دن۔“ چلو اس بات تم یہ دن میرے ساتھ گزارو۔“ عفریہ کے لہجے میں ٹھٹھک تھی۔

”عفو! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر۔“ وہ رکا۔

”مگر کیا۔“ عفریہ نے گول ستون سے ٹیک لگا کر اس کی طرف دیکھا۔

”سردار پور میں ایک عورت ہے وہ چاند رات کو میرا شدت سے انتظار کرتی ہے۔“ وہاں نے بتایا۔

”وہ میری مام ہے۔“

”وجہی کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں نا وہ لوگ جن کا انتظار ختم ہو جاتا ہے جیسے تمہاری مام!“

”جیسب بایست بھر الجہ تھا اس کا۔“

”ہاں میری ماں ہر معاملے میں بہت خوش قسمت ہے۔“

”کاش میں بھی خوش قسمت ہوتی۔ مجھے وہی انتظار ہے اس دن کا جب میں اور ماما ایک گاؤں جائیں گے۔“ عفریہ کے لہجے میں دکھ گھل مل گئے۔ پھر وہ ایک دہم ہی ہنسی جیسے ہی خول پڑنے پھر ہنس کر اس خول کر جوڑ لیا تھا۔ پھر بولی۔

”سنو! میں نے آج جیل جانا ہے چلو گے؟“

”ضرور چلوں گا۔“

”مگر تم روزے سے ہو۔“ عفریہ کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

”تو کیا حرج ہے؟“

”نہیں تم مجھے بس چھوڑ کر آ جانا۔“ اس نے خود ہی فیصلہ سنا دیا۔

”غفوا! وہاں نے اسے پکارا۔“

”ہوں۔“ وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

”تم نے عید کی تیاری کر لی ہے۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”کیسی تیاری؟“ عفریہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ جوڑکیاں کرتی ہیں۔ کپڑے پھڑکیاں۔ مہندی۔“

”ارے یہ تم عفریہ امیر سے توقع رکھتے ہو۔“ عفریہ امیر ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہنسنے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہاں دکھ سے اسے دیکھے گیا۔ عفریہ کا دکھ اس کا دل تھا۔ وہاں کا دل چاہا کہ عفریہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے اور کہے۔

”اس طرح مت ہنسو جیسے کالج ٹیچر۔ جائے۔“

”یہ کیسی ہنسی ہے جس میں گھنگھر ووں کی جھنکار کے بجائے آنسوؤں کی نمی ہے۔“

”مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ البتہ عفریہ کہہ رہی تھی۔“

”میں بھلا یہ لوازمات کرتی اچھی لگوں گی۔“

”عفریہ! تمہیں پتا ہے تم بے حد خوبصورت ہو۔“ وہاں نے کہا۔

”یہ۔۔۔ یہ تم کہہ رہے ہو۔“ عفریہ نے پوچھا۔

”ہم اچھے دوست ہیں نا غفوا! اور دوست اپنے دوست کی خوبی کے بارے میں نہ بتائے غلط بات ہے۔“

”مگر یہ تو مجھے پتا ہے کہ میں بے حد خوبصورت ہوں۔“

”بہت اور کو فیڈبیکس ہو تم۔“

”اور یہی اور کو فیڈبیکس ہے جس نے مجھے تم جیسے گدھوں سے بچا کر رکھا ہوا ہے۔“ عفریہ

مضبوط تھا۔

”خیر آج تم میرے ساتھ بازار چلو گی۔“ وہاں نے فیصلہ سنا دیا۔

”کیوں؟“ عفریہ ترنگ میں بولی۔

”بھئی دوستوں کو عید گفٹ دیے جاتے ہیں نا؟“

”تم نے اوروں کو دیے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”اور کون؟“

”جیسے فرحت زوہیب اور آصف ہیں۔“ وہ بولی۔

”انہیں دے دوں گا۔ زوہیب اور آصف تو کل چلے گئے ہیں گھر عید کرنے فرحت کو دوں گا گفٹ۔ اس کی مرضی سے دلاؤں گا۔“

”مگر پہلے مجھ پر نظر عنایت کیوں کر رہے ہو؟“ عفریہ نے گیلے بالوں میں انگلیاں پھریں۔

”غفوا! تو آصف کا نچو سے چاہے جس لہجے میں بات کر میں نہیں روکتا۔ مگر میں تمہارا لہجہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”آصف تو کرتا ہے برداشت۔“ عفریہ نے یاد دلایا۔

”وہ تو تم سے محبت کرتا ہے۔“ وہاں نے کہا۔

”ہاں یہ بھی تو فرق ہے تم میں اور اس میں۔“ عفریہ ہنسی اور وہاں شرمندہ سا ہو گیا۔ پھر شر

مندگی کے احساس کو زائل کرتا ہوا بولا۔

”چلو لبرٹی چلتے ہیں۔“

”سوی وہاں احمد“ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہاں حیرت سے اسے ٹکنے لگا۔

”تمہیں مجھ سے محبت نہیں تو پھر کس ناتے سے مجھے شاپنگ کے لیے جا رہے ہو؟“

”یاد تم بات کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہو۔ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں عفریہ!“ وہاں نے

کہا۔

”کیا؟“ عفریہ کو لگا جیسے پیروں تلے زمین کھسک رہی ہو۔

”بھئی جیسے دوستوں سے محبت کی جاتی ہے وہ محبت کرتا ہوں۔ میرے اور آصف کا نجوں کے

جڈوں میں بہت فرق ہے۔“ وہاں نے وضاحت کی۔

”اوہ۔ میں سمجھی۔ بے چارے آصف کو ڈوڈل کرنا پڑے گا۔“ عفریہ نے شوشی سے کہا۔ تو وہاں

مکرا دیا۔

”چلو یہ بات ہے تو میں تم سے گفٹ لے لوں گی۔“ عفریہ ایک دم ہی مان گئی۔ اور بولی۔

”واپسی پہ مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔“

”میں بھی ان سے ملوں گا۔“ وہاں نے کہا۔

”کیوں؟“ عفریہ نے پوچھا۔

”بھئی اتنی بہادر بھانجی کے ماموں سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”میرے ماما مجھ سے بھی زیادہ بہادر ہیں۔“ عفریہ نے فخر سے بتایا تو وہاں کندھے اچکا کر

بولا۔

”دیکھیں گے۔“

☆☆☆

اسجد کیا آیا تھا کہ ”ملک ہاؤس“ میں رونق آ گئی تھی۔ آمنہ اور آصف بھی گھر بار چھوڑ کر بھائی

سے ملنے آ گئی تھیں۔ اور وہ بھی آیا ہوا تھا مع بیوی اور بچی کے اور کمال ملک بھی اونچے اونچے قہقہے لگا

رہے تھے کہ بیٹا پورے دس برس بعد لوٹا تھا۔ زہرہ جبین بار بار اسے گلے لگا کر پیار کر رہی تھیں۔ جیسے

انکس اسجد کے آنے کا یقین نہ آیا ہو۔

”اچھا ہے تو میری زندگی میں آ گیا۔“ زہرہ جبین نے کہا۔

”آئی! آپ کی عمر بہت لمبی ہے۔“ اسجد نے ماں کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

”ہاں ابھی تو مامی جی آپ نے اسجد بھائی کے بچوں کو لوریاں دینی ہیں۔“ وہاں نے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں۔ خدا وہ دن لائے۔“ وہ خوشی سے بولیں۔

”بھئی اسجد بھائی! آپ کوئی میم نہیں لائے۔“ وہاں نے پوچھا۔

”ضروری تھا۔“ اسجد نے اسے دیکھا۔

”ہاں یہ ضروری۔“ تھا کہ ساتھ ”بھئی“ لے کر آتے۔“ وہاں نے شرارت سے ”بھئی“

دے کر کہا۔

”کسی کو تو بخش دیا کرو وہاں!“ آصف نے پیار سے سرزنش کی۔

”لیں آصفہ آیا! یہ کتنی اسلٹ ہے کہ بندہ دس برس بعد آ رہا ہے اور کوئی میم ساتھ نہیں

کیا کہیں گے کہ ان میں گٹس ہی نہیں۔“

”تم جاؤ تو دیکھیں گے کتنی لاتے ہو؟“

”دس برس میں دس تو ہونی چاہئیں۔“

”خدا کا خوف کرو وہاں!“ احمد ملک نے ہنس کر کہا۔

”بھئی میں تو بہت سچا کھرا آدمی ہوں۔ ویسے اسجد بھائی آپ کو کوئی ملی نہیں یا۔“ وہاں نے

طرف جھکا راز داری سے پوچھ رہا تھا۔ اور اس کی سرگوشی اتنی اونچی تھی جو سب ہی نے سن لی تھی۔

ملک نے قہقہہ لگایا۔ اور بولے۔

”بھئی وہاں! ہمارے خاندان میں آج تک کوئی میم نہیں آئی۔ تو اب میرا بیٹا روائے

کیوں بنتا۔ دیکھو نا جمال بھی تعلیم حاصل کر کے لوٹ آیا تھا۔ اور یہیں شادی کی۔“ وہ رکے تو

جلدی سے بولا۔

”جی ہاں دوسری شادی تو دیسی میم سے کی۔ اس سے بہتر تو ولایتی میم ہی ہوتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سب کو حیرت تھی۔

”بھئی دکھو تو نہیں ہوتا زیادہ کہ غیر ہے اور جب اپنے ہی وہی حرکتیں کریں تو ایسا دکھ ہوتا

جس کوئی علاج نہیں۔“

”اچھا تو تم اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو؟“ آمنہ نے ہنس کر پوچھا۔ تو وہاں بھی ہنس دیا

”اب تم کہیں نہ جانا۔“ زہرہ جبین بیٹے سے کہہ رہی تھیں۔

”یہاں آ کر کہیں بھی جانے کو دل نہیں چاہتا۔ خیر دو سال تک تو یہیں ہوں۔“ اسجد نے

”بس ماما جی بجوادیے شادیانے۔“ وہاں نے مشورے دیا۔

”ابھی نہیں بھئی۔“ اسجد بے چین ہو کر بولا۔

”چکر کیا ہے؟“ وہاں نے آنکھیں نیچا کر شرارت سے کہا۔

”یار تم تو بال کی کھال نکالتے ہو۔“ اسجد جھپٹ گیا۔

”وجہی تمہارا فون ہے۔“ غاشیہ نے آکر اطلاع دی۔ وہاں جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا

نے سکھ کی سانس کی وہاں کی چرب زبانی نے اس کے پسینے چھڑا دیے تھے۔

”فخر کیا ہے؟“ زہرہ جبین نے ہولے سے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں۔ بہت دعا سلام کہہ رہے تھے اور مجھے کہا تھا کہ میری بہن کو یوں پیار کرنا

نے ماں کو پلٹایا اور ان کی پیشانی چوم لی اور زہرہ جبین تو بھبھک بھبھک کر یوں روئیں کہ لگا برسوں کے رے آنسوؤں کو آج ہی راستہ ملا ہو۔ سب پریشان ہی تو ہو گئے تھے۔

”پلیز امی! مت روئیں۔ جب وہ آپ سب کو یاد کر کے نہیں روتے تو آپ کیوں آنسو بہاتی

ہیں۔“ اسجد نے کہا۔ مگر زہرہ جبین کے آنسو تو رکنے میں نہ آ رہے تھے۔ ناحول ایک دم ہم بخیدہ ہو گیا

تھا۔ سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ جیسے زہرہ جبین کے آنسوؤں کے ذمہ دار وہی

ہوں۔

☆☆☆

حیرت انگیز بات یہ ہوئی تھی کہ خلاف معمول عفرہ امیر نے پہلی کلاس لی تھی۔ جو چیئر مین

ڈاکٹر شمس اللہ کی تھی۔ کتنے ہفتوں بعد وہ پہلی کلاس میں موجود تھی۔ سب کے ساتھ شمس اللہ

صاحب بھی حیران تھے۔

”بھئی آج سورج کہاں سے طلوع ہوا؟“ وہ طالب علموں سے بہت ہی دوستانہ انداز میں

بات کرتے تھے۔

”سر سورج تو حسب معمول اپنی سمت ہی سے طلوع ہوا ہے۔ بس میں نے سوچا امتحان قریب

ہیں۔ ذرا پڑھائی کی جانب بھی بخیدہ ہو جاؤں۔“ عفرہ نے مسکراتے ہوئے بے دھڑک کہا۔

”بہت اچھی سوچ ہے“ چیئر مین صاحب مسکرا دیے۔ لیکن کے بعد وہ سب ہی اس کے قریب

جمع ہو گئے تھے۔

”خیریت تو ہے؟“ وہاں نے پوچھا۔

”بھئی سب ٹھیک ہے۔“ عفرہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

”لگتا ہے رات تم سوئیں نہیں۔“ آصف نے اس کے چہرے کی دیکھا۔

”مجھے تو تمہاری آنکھیں دیکھ کر یہی لگ رہا ہے“ وہ تڑپے پولی۔

”کیا میں بہت یاد آ رہی تھی۔“ وہ راز داری سے پوچھ رہی تھی۔

”تم ہی بکواس کیا کرو۔“ آصف کا پارہ ہائی ہو گیا۔

”دیکھو زہرا! میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہی۔ اچھا تم بتاؤ۔ یہ تمہارا روم میٹ ہے یا۔ رات یہ سویا

نہیں نا۔“ وہ زوہیب جعفری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت اعتماد سے پوچھ رہی تھی۔ زوہیب

ہنس دیا۔ تب عفرہ نے لہک کر شرع پڑھا۔

وہ ہنس دیے وہ چپ رہے

منظور تھا پردہ تیرا

دوسرا مصرعہ پڑھتے ہوئے وہ آصف کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اور حسب سابق رات جتنے

نرم جذبے اس کے اندر ابھر رہے تھے۔ آصف کو لگا جیسے ان سب میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ اسے گھورتا

ہوا کلاس روم سے نکل گیا۔ کہ وہ مزید سچائی کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی سچائی جو اسے انجانی آگ

میں جھینک دیتی تھی جہاں وہ جلتا نہیں تھا مگر سلگتا رہتا تھا اور یہ سلگنا اسے کمزور تر کر دیتا۔

”غصا مات چھیڑا کرو اسے۔“ وہاں نے اسے کہا۔

”بھئی میں کب اسے چھیڑتی ہوں۔ نہ بات کیا کرے مجھ سے جب جواب سننے کا حوصلہ نہیں

ہوتا تو۔ میں تو جواب دوں گی۔“

”چلو چھوڑو۔ مٹی پاؤ۔“ عفریہ نے ہنس کر کہا۔ تو وہاں مسکرا دیا۔ اور اس روز عفریہ نے کلاسز اینڈ کی تھیں۔

آخری کلاس لینے کے بعد بولی۔

”وہاں! مجھے ماریہ کے ہاں چھوڑ دو گے؟“

”ماریہ! وہاں نے حیرت سے پوچھا۔“ کیوں لڑکی کب سے تمہاری دوست بن گئی؟“

”یار! یہ بیوی پارلر کا نام ہے۔“ عفریہ ہنسی۔

”اوہ۔“ وہاں جھینپ کر ہنس دیا۔ ضرور۔ ضرور۔۔۔

”پھر کہاں جاؤ گے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”گھر۔“ وہاں نے کہا تو عفریہ نے شرارت سے کہا۔

”جہاں تمہاری ماموں زاد تمہاری داد دیکھ رہی ہوں گی۔“

”یہ تم وہاں کی ماموں زاد سے جلتی کیوں ہو؟“ ایک دم ہی فرحت منیر نے پوچھا تھا اور وہاں ہی عفریہ کی طرف رہا تھا۔ بس لمحے کے ہزاروں میں اس نے عفریہ کے چہرے پر ایک سایہ

دیکھا۔ یوں لگا تھا جیسے خول چٹھا ہو اور پھر وہ ایک دم ہی سنبھل گئی۔ زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”میں بھلا کیوں جلوں اس سے۔“ مگر وہاں سے ایسا کوئی رشتہ نہیں کہ میں اس سے وابستہ

سے جلوں۔ کیوں وہاں! اس نے وہاں کی آنکھوں میں دیکھا۔ تو وہ بولا کچھ نہیں بس مسکرا دیا۔ اور

”چلو اگر چلنا ہے تو۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

”تم سے یہی امید ہے۔“ وہ بولی۔

”بہت بدتمیز ہو۔“ وہاں ہنس دیا۔ اور چابی اچھالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر پلٹ کر بولا۔

میں بائیک لاتا ہوں۔“

اور جب وہ وہاں کے ساتھ بائیک پر جا رہی تھی۔ آصف نے یہ منظر دیکھ کر آنکھیں

تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس کے اندر تک دکھاتر گیا تھا۔

”سنو وہاں! پہلے مجھے چاٹ کھلاؤ۔“

”یار ایک تو تم ہر وقت نمدیوں کی طرح کھانے پر ہی ٹوٹتی ہو۔“ وہاں نے پیار سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے آج میں نے ساری کلاسز لی ہیں۔ اور مجھے بہت بھوک لگ رہی۔“

بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔

”مت وضاحت کرو۔“ وہاں نے کہا تو عفریہ نے اس کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ وہاں

کانپ کر رہ گیا۔

ایسا بھلا کب ہوا تھا؟

وہ تو پچھلے ایک سال سے اس سے بہت بے تکلف تھی۔ مگر آج پہلی بار اس نے ایسا

ورنہ تو وہ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھی تھی۔ تو اپنے اور اس کے درمیان اپنا بڑا سا بیگ رکھ دیتی

”وہاں! میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔“ وہ نہایت آہستہ سے بولی۔

”ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں؟“ وہاں نے پوچھا۔

”نہیں بھوک سے میرے سر میں درد ہوتا ہے۔“ وہ اس کے کندھے سے سر اٹھانے

بولی۔ تو وہاں ہنس دیا۔ پھر اس نے حادث کی ایک ریزہ کی باس بائیک رکوا دی۔ اور بولی۔

”یہ بابے دتو کی چاٹ بڑے مزے کی ہوتی ہے۔“

”ٹٹ! ہاتھ پہ کھڑے ہو کر کھائیں گے۔“ وہاں نے کہا۔

”اس کا بھی اپنا مزہ ہے۔“ عفریہ تیزی سے اتر کر ریزہ کی طرف بڑھی۔ اور وہ آج پہلی بار

تلا کر رہ گیا۔ حالانکہ وہ عفریہ کو جانتا تھا۔ مگر آج واقعی اسے عفریہ پر غصہ آیا تھا۔

مگر وہ اظہار نہ کر سکتا تھا۔ اسے پتا تھا۔ ابھی وہ پلٹیں پھینک کر چل دے گی۔ اور پھر منانے

میں بھی وقت لگے گا۔

”تم پارلر جا کیوں رہی ہو؟“ چاٹ کھاتے ہوئے وہاں نے پوچھا۔

”بال درست کروانے ہیں۔“

”ٹھیک تو ہیں۔“ وہاں نے اس کے بالوں کی طرف دیکھا۔ جو کھڑے ہوئے تھے۔ تم بال بڑھا

کیوں نہیں لیتیں؟“

”تم چاہتے ہو؟“ عفریہ نے وہاں کی آنکھوں میں دیکھا۔ تو وہاں بات بدل کر بولا۔

”یہ بات نہیں۔ لڑکیوں کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔“

”مگر میں اضافہ نہیں چاہتی۔“

”کیوں؟“

”ابھی ابھی لوگ میرے حسن کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ تو پھر۔۔۔“ عفریہ کی آنکھوں میں

شرارت ہی شرارت تھی۔ اور وہ کہہ رہی تھی۔

”پتا ہے وجہی! میرے بال بہت لمبے تھے۔“

”پھر؟“

”بس روز میں نے معصومی عفریہ کو مارا تھا۔ اسی کے دوسرے روز میں نے اپنے بال کٹوا لیے

تھے۔ اپنے پتہ دے کو بدل لیا تھا۔ اور پھر میں بڑے لمبے بال سنبھال بھی نہیں سکتی تھی۔“ اس کے لہجے

نما بیزاری تھی۔ وہاں بس خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ عفریہ سے کہے۔ وہ اپنی کہانی ٹکڑوں میں نہ سنائے۔ بلکہ اون کے

گوسے کی طرح ایک دم ہی وہ کھل جائے۔ مگر وہ ایسا نہ کہہ سکا۔

”ماریہ بیوی پارلر! کے سامنے ہی وہاں نے اسکو ٹروکا۔ تو عفریہ جلدی سے اتری۔

”بہت شکریہ۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہاں مسکرایا۔ مگر تبھی اس کے ہونٹ بھیجنے لگے۔ پارلر کے دروازے پر کھڑی

اٹھ اسے شعلہ پار نظر سے دیکھ رہی تھی۔ وہاں کو لگا جیسے اس کا وجود جلتے لگا ہو۔ وہ غاشیہ کو پکارنا

پہناتا تھا۔ مگر غاشیہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سڑک کے کنارے کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھی۔ باوردی

راؤ نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اور غاشیہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور ڈرائیور نے ڈرائیونگ سیٹ

نمٹائے ہوئے کار بڑھا دی۔ وہاں اڑتی گرد و دیکھتا رہ گیا۔

”تمہاری ماموں زاد بہت غصے میں گئی ہے۔“ عفریہ نے اطلاع دی۔ وہاں کو ہوش آیا اور کوئی

غائب دیے بغیر اس نے بائیک کو لگ لگائی اور تیزی سے راؤنڈ لے کر کھلی سڑک پر آ گیا۔ عفریہ نے

نہایت سے اسے دیکھا۔ پھر کندھے اچکاتے ہوئے پارلر میں داخل ہو گئی۔

وہاج احمد نہایت بے قراری سے اپنے کمرے میں ٹہیل رہا تھا اس کے دل میں ایک
موجزن تھا جس کی لہریں اس کے دل کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ بار بار اس کے ذہن کے
غاشیہ کی عیسیٰ نظریں ابھر آئیں۔
وہ شعلہ بار نظریں
دیکتی انگارہ جیسی نظریں۔ جیسے جسم کر دینا چاہتی ہوں۔
وہ تنج صفت نظریں
جو وہاج احمد کے دل کو چیرتی ہوئی اندر تک اتر گئی تھیں۔
کیا اندازہ تھا؟
کیا میں اتنا بے اعتبار ہوں۔
نہیں غاشیہ کمال۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ شاید میری نظروں کا دھوکا ہے تمہارے لئے
بے اعتبار نہیں بن سکتا۔ وہاج نے مٹھیاں پیچھنے ہوئے سوچا۔
تم تو بہت معصوم ہو
بہت سادہ ہو۔
تمہارا یہ انداز نہیں ہو سکتا۔
تم صرف محبت کرنے کے لئے ہو۔ چاہتی ہو اور چاہے جانے کے قابل ہو۔ تم نفرت
سکتیں۔ ہاں۔ ہاں غاشیہ تم ایسی نہیں ہو سکتیں مجھے تم پر بہت اعتبار ہے۔
مگر۔ مگر ابھی سوا گھنٹہ پہلے کی تو بات ہے۔ جب تم پارلر کے دروازے پر کھڑی
تھیں۔ اُف کتنی نفرت تھی تمہاری آنکھوں میں۔
کیا اسے نفرت کہہ سکتا ہوں۔
اس کا جی چاہ رہا تھا۔ ہر شے کو تو دبلا کر دے۔ یا توڑ پھوڑ کا تجربہ عمل شروع کر
اس طرح جس طرح کے اس کے ذہن میں توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔

اور بے وقوف لڑکی تو کیوں نفرت اور شک کی آگ میں جل رہی ہے۔ کچھ بھی نہیں بچے گا تو۔ کہیں
کی نہیں رہے گی۔ غاشی تجھے پتہ نہیں شک محبت کو نگل لیتا ہے۔
میں تجھے سمجھاؤں گا۔

ایسا نہ ہو تیری بے وقوفی کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے کو کھودیں۔ اور میں تمہیں کھونا نہیں
چاہتا غاشیہ کہ تجھے کھوکھلی خود کو بھی کھودوں گا۔ تو تو میرا اپنا آپ ہے خیالات کی لہریں اس کے قلب
و ذہن سے اٹھ رہی تھیں اور وہ بار بار ان میں ڈوب رہا تھا۔ ابھر رہا تھا۔ غاشیہ کی بے اعتباری اس کے
دل کو پھوڑا رہی تھی مگر ذہن کہہ رہا تھا۔

وہ۔۔۔ حق یہ ہے وہاج احمد کہ عورت کا دل بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے وہ جسے چاہتی ہے اس کی
خواہش ہوتی ہے وہ کسی اور طرف نہ دیکھے جب کہ تم تو ”کسی اور“ کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہو۔
مگر عفیہہ میری دوست ہے میری کلاس فیلو ہے۔ وہاج نے اپنے ذہن کو دلیل دی اور اسے لگا
جیسے چپکے سے کوئی اس کے بے حد فریب ہی تسخر انداز میں ہنسا ہو۔

میں ابھی اسے منا لیتا ہوں۔ وہاج جلدی سے اپنے کمرے سے نکلا اور دوسرے پل وہ غاشیہ کی
خوابگاہ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

چند لمحے بعد ہی دروازہ کھلا۔ سامنے ہی غاشیہ کھڑی تھی۔

بکھرے بکھرے بال۔

بھگی پلکوں والی سرخ آنکھیں۔

لڑتے ہونٹ۔

وہاج کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت کی آگ پھر بھڑکی۔ اور ہونٹ پیچھنے لگے۔ پھر اس نے
ایک دم ہی رُخ موڑ لیا۔

”غاشی۔“ وہاج نے آہستگی سے اسے پکارا جیسے کسی ساز کو انگلیوں نے چھویا ہو۔

”چلے جاؤ وہاج احمد۔“ کتنا بدلا بدلا اوپر اسالہ لہجہ تھا۔ وہاج کا دل کٹنے لگا۔

”کیوں چلا جاؤں۔ تجھ سے بات کے بغیر۔“

”کوئی ضرورت نہیں مجھ سے بات کرنے کی۔“ وہ سُلگ کر بولی اور آگے بڑھ گئی۔ وہاج بھی
خوابگاہ میں داخل ہو گیا اور بولا۔

”غاشی تجھے پتہ ہے ناعفیہہ میری کلاس فیلو ہے۔ پھر تمہاری اس سے علیک سلیک بھی ہے تم
نے اس سے بات بھی نہ کی کیا سوچتی ہو گی وہ؟“

”اس کی سوچ کی بڑی فکر ہے۔“ غاشیہ نے کٹیلے لہجے میں کہا۔

”مجھے تو تمہاری سوچوں کی فکر ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ کتنی غلط بات ہے عفیہہ کہے گی کتنی ال
میزڈ کرن ہے وہاج کی۔“

”ہاں کہتی رہے وہ۔ تمہیں اس کی فکر ہے تو جاؤ کہہ دو اسے کہ مجھے میسر نہیں آتے۔ بالکل اُجڈ
مکوار ہوں۔“ وہ گرجی۔

”کیوں کہوں؟“ وہاج نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب غاشیہ نے اتنی تیزی سے
اس کا ہاتھ جھکا جسے کوئی کیڑا اس کے کندھے پر آ گیا۔

”وہاج پیڑ تم چلے جاؤ۔ جاؤ اپنی عفیہہ کے پاس جس کو تم لئے لئے پھرتے ہو۔ مجھے تو پہلے ہی

شک تھا؟

”کیا شک تھا؟“ وہاج کے لہجے میں حیرتیں اتر آئیں۔

”یہی کہ عفریہ سے تمہارا کوئی جذباتی تعلق ہے کلاس فیلو کے علاوہ بھی۔“

”بکومت۔“ وہاج نے گرج کر اس کی بات کاٹی۔ ”تمہیں پتہ نہیں وہ کس قدر سچی اور

لڑکی ہے۔“

”ہاں وہ بہت معصوم لڑکی ہے۔“ غاشیہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”تبھی ایک غیر مرد کے

بازاروں میں گھومتی ہے۔“

”یہ مت بھولو کہ وہ میری کلاس فیلو بھی ہے۔“ وہاج نے پھر اسے یاد دلایا۔

”وہاج کیوں وضاحتیں کر کے اپنا بگڑا بیچ مزید بگاڑ رہے ہو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”مجھے تو اسی روز شک ہو گیا تھا جب وہ پہلی بار یہاں آئی تھی اور پھر چاچو کے ایکشن کے

سلسلے میں ہر دم تمہارے ساتھ چلی رہی تھی۔“

”مت الزام لگاؤ۔“

”سچ کو الزام مت کہو وہاج احمد۔“

”میں تمہیں پھر کبہ رہا ہوں غاشیہ کہ اپنے دل سے ہر کدورت نکال دو۔ بخدا ایسی کوئی

نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔“

”پھر وہ تمہارے ساتھ کیوں گھومتی پھرتی ہے جب ایسی بات نہیں تو؟“ پوچھنے کا انداز وہ

جارحانہ قسم کا تھا۔

”بھئی اس نے مجھے کہا کہ ذرا پار چھوڑ دو تو۔“

”پہلے تم نے اسے کہاں کہاں چھوڑا ہے؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”غاشیہ بلیوئی۔ میں نے فرسٹ ٹائم آج ہی اس کا کہا مانا ہے۔“ وہاج ایک دم ہی چھپا کر

پہلے بھی وہ عفریہ کو اپنی بانیک پر لے جا کر اسے ڈراپ کرتا رہا ہے۔ ”بھئی آفس۔“ بھی ہاسٹل۔ اگر

دیتا تو غاشیہ مزید بھڑک اٹھتی۔

”آج تو میں نے دیکھ لیا۔ تو تم یہ کہہ رہے ہو نا؟ تمہارا رنگ کیوں فق ہو گیا تھا۔“ غاشیہ

تیوروں سے پوچھ رہی تھی۔

”لو میں کوئی چور تھا جو رنگ فق ہو گیا۔“ وہاج ہنسا۔ نہایت ہی بے دلی سے۔

”اس وقت تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔“

”مجھے اسوس یہ ہوا تھا کہ تم بات کئے بغیر وہاں سے چلی گئی تھیں تمہیں کیا پتہ کہ کتنی اسٹاپ

کی میں نے۔ یعنی یہ اہمیت ہے میری۔“

”تم نے اپنی اہمیت خود ہی گواہی ہے وہاج۔“

”پلیز غاشی اس لہجے میں بات نہ کرو۔“

”وہاج میرے دل سے یہ پھانس بھی نہیں نکل سکتی۔“

”آخر ہوا کیا ہے ذرا عفریہ۔“

”خوبصورت عورت سے ہر عورت ڈرتی ہے وہاج اور میں ساری زندگی خوف کی نکل

تزاز سکتی۔ ہر لمحہ دھڑکا سا لگا رہے۔“

”عفریہ! تم سے زیادہ خوبصورت تو نہیں۔“ وہاج نے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں۔

”مگر وہ مثل تم نے سنی ہوگی کہ گدھی پر دل آ جائے تو پری کیا چیز ہے؟“ غاشیہ نے کہا تو وہاج

ہنس دیا۔ اور بولا۔

”ار کیا دماغ خراب ہے تیرا۔“

”نہیں وہاج میرا دماغ بالکل صحیح ہے۔ فرض کرو اگر تم مجھے کسی لڑکے کے ساتھ دیکھ لیتے تو میری

وضاحتیں تمہارے دل پر چھائی گرد صاف کر دیتیں۔“ غاشیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”شاید نہیں۔“ وہاج نے نہایت سچائی سے کہا۔

”نہیں نا۔ تو میں کیسے اس بات کو دل سے نکال دوں۔ جذبے اور احساسات تو ایک ہی سے

ہوتے ہیں مرد کے بھی اور عورت کے بھی۔ دل بھی قدرت نے ایک ہی شکل کے بنائے ہیں اور جب

چوٹ لگتی ہے تو تکلیف یکساں ہوتی ہے۔ چاہے وہ مرد کا دل ہو یا عورت کا۔ کم تکلیف کوئی تخصیص نہیں

رہتی کہ چوٹ لگے تو عورت کم کم تکلیف ہو اور مرد کو زیادہ۔ عفریہ بھی ایک چوٹ ہے وہاج۔“

”بلیوئی غاشی کہ۔“ اس نے اسے پھر سمجھانا چاہا۔

”مت وضاحتیں کرو بس میں نے کہہ دیا نا کہ میرے دل سے یہ پھانس بھی نہیں نکل سکے گی کہ

تم۔ تم۔“

”غاشی! میں تجھے کس طرح یقین دلاؤں“

”پہلے تم خود کو تو یقین دلا دو کہ تم عفریہ امیر کو چاہتے ہو۔“

”پاگل ہوئی ہو۔“

”یہ سچ ہے۔“

”اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے یہ غاشی میرا اعتبار کر لو۔ کہ وہاج احمد نے اپنی ماموں

زاد کو ہی بے حد بے حساب چاہا ہے اس کے دل کے گوشے گوشے پر وہی قابض ہے۔“

”مت دو لفظوں کے بہلاوے۔ اب میں مزید نہیں بہل سکتی۔“

”دیکھ غاشی میں بہت برداشت کر رہا ہوں۔ اور اپنی بے عزتی کوئی بھی مرد نہیں برداشت

کر سکتا۔ اپنے جذبوں کی ناقدری کا حق میں تمہیں نہیں دے سکتا کہ تم میرے سچے اور کھرے جذبوں کو

جھوٹ سمجھو۔“

”تو کس نے کہا کہ جذبوں کی بیساکھیوں سے اپنی لولی لنگڑی محبت کو سہارا دو۔“

غاشیہ مسکرائی۔

”تم بہت معصوم ہو۔“

”اسے بھی تم کہتے ہو گے۔“ غاشیہ نے کہا تو وہاج حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ سچ ہی تو کہہ رہی

تھی۔

وہاج نے کئی بار عفریہ سے کہا تھا کہ وہ اندر سے بہت نرم اور معصوم لڑکی ہے۔ اپنے باہر کی سر پھر

لڑکی سے بالکل مختلف۔

”نہیں کرتے تم اس کی تعریفیں۔؟“ غاشیہ پتھر یلے لہجے میں بولی تو وہاج کو لگا جیسے سارے پتھر

اس پر برس گئے ہوں۔

”اب تم مفروضوں کو سچ بنانے پر تلی ہوئی ہو تو میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ تمہاری سوچ غلط ہے۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔

”نہیں وہاب احمد میری سوچ غلط نہیں البتہ جو تم کہہ رہے ہو وہ غلط ہے سچ وہ ہے جو ابھی پر دے میں ہے اور جس روز وہ سچ سامنے آ گیا تو وہ کچھ بھی نہیں رہے گا۔ میں نے پلٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تاکہ بعد میں دقت نہ ہو۔“ وہ سنگدلی سے بولی۔

”رہ لوگی میرے بغیر۔“ وہاب نے پوچھا۔
”بالکل۔“ میں ایسے جفا جو مرد کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ جو گھر میں کوئی کھیل کھیلے اور باہر۔“

”شت اپ۔“ وہاب مارے غصے کے کھول کر رہ گیا۔
”ممت رعب ڈالو وہاب احمد مجھ پر۔“ میں نے تمہاری اصلیت دکھا دی تو تم چیخنے لگے۔“ وہ اس سے زیادہ زور سے گرجی۔

”تم کون ہوئی ہو مجھے میری اصلیت بتانے والی۔ پھر تمہیں کیا پتہ میری اصلیت کیا ہے۔ تم تو آنکھوں پر شک کی پٹی باندھے ہوئے ہو۔ جہاں تمہیں سچ اور جھوٹ کی پہچان نہیں ہے۔ تمہارے نزدیک وہی سچ ہے جو بات تمہارے ذہن میں بیٹھ گئی ہے اور تم جان بوجھ کر اس بات کو ذہن سے نکالنا نہیں چاہتیں۔ تو میرا کیا قصور؟ وہاب زچ ہو کر بولا۔

”تم اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ میں جو کہہ رہی ہوں سچ ہے۔“
”میں ایک غلط بات کا اعتراف کیوں کر لوں۔“ وہاب نے تڑخ کر جواب دیا۔
”ایک وقت آئے گا تم خود اعتراف کرو گے جو میں نے کہا ہے وہ سچ ہے اور جو تم نے کہا وہ جھوٹ۔“ وہ وثوق سے بولی۔

”بہتر بتا دوں گا غاشیہ بیگم کہ تمہارا ذہن ہی چھوٹا ہے عورت مرد کی دوستی کو تم صرف ایک ہی نظر سے دیکھتی ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ مائی ذری ضروری تو نہیں کہ مرد ہر عورت کو چاہے۔ وہ تو ایک ہی ہونی ہے جسے وہ دل و روح کی شدتوں سے چاہتا ہے سراہتا ہے۔“ وہاب کا لہجہ نہایت تپا تپا تھا۔
”مجھے یقین ہے تم عقیہ امیر کو چاہتے ہو۔“ غاشیہ نے پھر وار کیا۔

”سنو اگر میں اسے چاہتا ہوں تو مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں برملا اظہار بھی کر سکتا ہوں مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ کوئی کوئی خوف نہیں۔ اب ایسی بات نہیں تو میں کیا کروں۔“ وہاب لفظ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔

”غاشیہ مجھے یہ امید تھی کہ تمہارا شک اس حد تک آگے بڑھ جائے گا اور ایک معمولی بات کو تم اتنا کا مسئلہ بنا لوگی۔“

”یہ اتنا کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے لوح محفوظ پر آئندہ وقت دیکھ لیا ہے۔ ہوا کا رخ محسوس کر لیا ہے چوہدری وہاب احمد۔ اور بعد کے رونے سے بہتر ہے ابھی سے راہ الگ کر لی جائے۔“
”سنو! میں آج ہی مام کو بلواتا ہوں۔“ وہاب نے ایک دم فیصلہ کر لیا۔

”کیوں؟“ اس نے ابرو چڑھا کر پوچھا
”تاکہ ہماری شادی کر دی جائے۔“ وہاب نے بتایا۔
”پھر کیا ہوگا؟“ وہ نہایت بے پروائی سے بولی۔

”تاکہ تمہارے دل میں کوئی بات نہ رہے۔“ شک نکل جائے۔“
”دل میں جو باتیں گھر کر لیں وہاب احمد وہ کبھی نہیں نکلتیں اور میرے دل کے شیشے میں دراڑ آ گئی ہے۔ بھلا ٹوٹے شیشے بھی جڑے ہیں۔ نہیں جناب بھی نہیں۔ اور میرا دل بھی اب مزید فریب نہیں کھا سکتا۔“

”تم دیوانی لڑکی میری بات سمجھو پلیر غاشیہ۔“ وہ ایک دم ہی ملائمت سے بولا۔ چند لمحے پہلے جو اسے غصہ آیا تھا اسے اس نے دبا دیا۔ وہ فرط جذبات سے کہہ رہا تھا۔

”پیارے ماموں زاد! وہاب احمد صرف تمہارا پرستار ہے تمہیں میں نہیں بتا سکتا لفظوں میں کہ تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ عقیہ جیسی سینکڑوں لڑکیاں بھی۔ وہ مقام نہیں لے سکتیں جو میرے دل میں تمہارا ہے۔“

”جھوٹ ہے یہ۔“ وہ یاؤں زمین پر پٹخ کر بولی۔
”اعتبار کرو غاشیہ۔ کیا تم نے بھی مجھے نہیں چاہا؟“ اس کا لہجہ دھیما تھا۔
”جائش نفرت میں بھی بدل جاتی ہیں۔“

”بدگمانی نہیں۔ نہیں غاشیہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تم۔ تم ٹھنڈے دل سے سوچو یہ نہ ہو کہ پچھتاوا مقدر بن جائے ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہے۔“ وہاب اسے سمجھا رہا تھا۔
”تم کیا سمجھتے ہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی؟“ وہ تنک کر بولی۔

”یہ میں نے کب کہا۔ اگر ایسا ہوتا تو تم یوں نہ اکڑتیں۔“
”میں اکڑ رہی ہوں۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
”اور کیا؟“ وہ مسکرایا۔

”سچ کوچ کہنا اکڑ ہے۔“
”غاشیہ! سچ کیا ہے مجھ سے سنو۔ میری دھڑکنوں کو نہ اسنو جہاں صرف ایک ہی نام ہے۔ تو میرا اپنا آپ ہے غاشیہ مجھ سے بدگمان نہ ہو۔ بھلا کوئی خود سے بھی بدگمان ہوتا ہے۔“ وہاب نہایت نرمی سے بولا۔

”میں خود سے بدگمان نہیں ہوں جیسی تو یہ فیصلہ کیا ہے۔“
”تو نے محبت کی ہی نہیں غاشیہ!“
”تم نے تو کر لی ہے نا۔؟“ وہ طفر سے بولی۔

”ہاں میں نے تو کی ہے محبت۔“ وہاب آہ بھر کر بولا۔
”عقیہہ سے۔“ غاشیہ نے جلدی سے کہا۔
”عادت سے مجبور ہو گھو۔ کہو جو کہنا ہے شاید تمہیں یہ اور اک ہی نہیں کہ محبت کیسی ہوتی ہے۔

کیسے چاہا جاتا ہے۔“
”تمہیں تو پتہ ہے۔“
”ہاں تمہیں چاہ کر کائنات کے سارے چھپے ہوئے راز افشا ہوئے مجھے پتہ چلا کہ جو میرے اندر ہے وہی میرے خیالوں پر براجمان ہے۔ خوابوں میں اسی کا ذریعہ ہے۔ سوچتے جاگتے اسی کے خواب اسی کی صدا میں۔ دھڑکنوں میں صرف اسی کا نام۔ میں تو اس کے بارے میں بھی بدگمان ہونے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ جو میرے دل میں بستی ہے۔“ وہاب نے کہا۔ تو غاشیہ تڑخ کر بولی۔

”میرا ظرف تم جیسا نہیں ہے یا پھر میں بہت سچی اور کھری لڑکی ہوں جو دل میں ہو وہی زبان پر لے آتی ہوں۔ اور تم کیا سمجھتے ہو اپنے ان ڈائلاگز سے مجھے پٹالو گے تو اس امید میں نہ رہنا۔ بہت برداشت کیا ہے اب برداشت کا یہاں نہ چھلک گیا ہے۔“

”واغنی“۔ وہاں نے شرارت سے اسے دیکھا۔ غصے کی شدت سے غاشیہ کا چہرہ ہنستا رہا تھا ایسے میں بھی وہ وہاں کو بے حد اچھی لگ رہی تھی اسے یقین تھا وہ اسے منالے گا۔

”مگر وہ تو اس وقت کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی۔ جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی وہ نکل ہی نہ رہی تھی۔“

پہلے تو وہاں نظر انداز کرتا تھا اور آج بھی وہ درگزر سے کام لے رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ عفیہہ کو اس کے ساتھ دیکھ کر غاشیہ کا بھڑک اٹھنا فطری سی بات تھی اور ”فطرت“ سے لڑا نہیں جاسکتا۔

جہاں محبت ہوتی ہے شکوک بھی اور شکایات بھی وہیں جنم لیتی ہیں۔

ہیں یہ سب شکوے گلے جوش محبت ہی کے ساتھ

تم محبت ہو تو ہم تیری شکایات کم کر دیں

یہ محبت ہی تو تھی جس کی وجہ سے غاشیہ اس سے خفا ہوئی تھی اور یہ اس کا حق بھی تھا۔ مگر وہاں کو ایک بات پر افسوس تھا کہ جب اس نے وضاحت کر دی ہے تو پھر غاشیہ اس کی بات کیوں نہیں سمجھ رہی۔ پہلے تو اتنی خفا نہیں ہوتی تھی کبھی۔

ابھی غصہ تازہ ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس دلیل سے اس نے خود کو سمجھایا۔ اور پھر غاشیہ کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

”تم شک کے بیج کودل کی زمین سے نکال بیٹھو۔ شک کا پودا بانس کی طرح ہوتا ہے جو بڑھتے ہوئے دین نہیں لگاتا۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تم مجھ غریب پر زیادتی کر رہی ہو۔“

”ایسا نہیں ہے جو حقیقت تھی وہ میں نے بتادی ہے اب برائے مہربانی اپنا اور میرا وقت برباد نہ کریں اور یہاں سے چلے جائیں میں سونا چاہتی ہوں۔“ انتہائی بدتمیزی سے اس نے کہا۔ وہاں کا خون رگوں میں ایک دم ہی اُلٹنے لگا مگر اس نے ضبط کر لیا۔

کہ اس کی ماں نے اسے ضبط اور صبر کی بے بہا دولت سے نوازا تھا اور آج وہی اس کے کام آ رہی تھی۔ ورنہ غاشیہ نے اس کی کم بے عزتی تو نہ کی تھی۔

”تمہیں شاید یہ نہیں جس کا محبوب ظالم ہو ناوہ نکلوں کی طرح بکھر جاتے ہیں پلیر غاشی مجھے بکھرنے سے بچالو۔ قسم لے لو میں وعدہ کرتا ہوں میں آئندہ عفیہہ سے بات کرنا تو درکنار میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔“ وہاں اس پر بھی راضی تھا۔

”کیسے نہیں دیکھو گے آخر وہ تمہاری کلاس فیلو ہے۔“

”میں پڑھنا چھوڑ دوں گا۔“ وہاں نے فیصلہ سنا دیا۔

”یعنی اس قدر دلبرداشتہ ہو گئے ہو۔“ غاشیہ ہنسی۔

”غاشی تو سمجھنے کی کوشش کر۔ سچ اگر میں کوئی ایسی دلی حرکت کر بیٹھا تو ساری عمر روتی پھرے گی۔“

”تجھی تو میں نے راہ بدل لی ہے پتہ چل گیا ہے مجھے کہ مجھے ساری عمر رونا پڑے گا۔ بہتر ہے پرے ہٹ جاؤں۔“

”کاش کوئی طریقہ ایسا ہوتا کہ میں تمہیں سمجھاتا۔“ وہ ہاتھ پر مکار کر بولا۔

”ضرورت کیا ہے آخر سمجھانے کی۔ میں نے جو سمجھا وہی سچ ہے اب تم جاؤ۔ اگر تم نہیں گئے تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ غاشیہ نے جل کر کہا۔

وہاں چند سیکنڈ تک اسے ٹار ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر پلٹ کر کمرے سے نکل گا۔ مگر اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ غاشیہ کو اس کے موقف سے ہٹا کر ہی دم لے گا کہ وہ غاشیہ کو بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا چہ جائیکہ اس سے بچھڑ جانا۔ ناممکن تھی یہ سوچ بھی۔

☆☆☆

انٹرکام کی بیل ہوئی تو سیٹھ جمال الدین ملک نے ریسیور اٹھایا۔

دوسری جانب اس کی سیکرٹری کلارا تھی۔

”سر آپ کی سسٹرن لاء آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“

”انہیں کہہ دیں میں مصروف ہوں۔“

”سرسین مرتبہ میں کہہ چکی ہوں اور۔“ کلارا کہتے کہتے رک گئی۔ اب بھلا وہ کیا بتاتی کہ زرنشاں نے اس کی کتنی بے عزتی کر دی تھی۔

”آپ پلیر بات کر لیجئے۔“

”بہتر۔“ جمال الدین ملک بولے اور انٹرکام کار ریسیور رکھ کر ٹیلی فون کار ریسیور اٹھالیا۔

”بس۔“

”تو بہ جمال کیا ہے تمہاری سیکرٹری انتہائی بدتمیز لڑکی ہے۔ نکال باہر کرو۔“ دوسری جانب زرنشاں غصے سے پھنکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں واقعی میٹنگ میں مصروف تھا۔“ جمال ملک بولے۔

”تین مرتبہ کہا ہے بتانے کے باوجود اس کی عقل میں بات نہیں آئی۔ عبد اللہ کی سیکرٹری تو میری آواز سننے ہی اہم میٹنگ سے بھی انہیں ملا دیتی ہے۔“

”آپ حکم کریں۔“

”ہاں کہنا یہ تھا کہ میں نے گل سے بات کی تھی۔“

”کون سی بات؟“ وہ واقعی نہ سمجھتے تھے۔

”اس نے ذکر نہیں کیا۔“ وہ حیران ہوئیں۔

”جی نہیں تو۔“

”ہاں تم سنا پور گئے تھے۔ تو اس نے کہا تھا کہ تم آؤ گے تو بات کرے گی تم سے۔“

”آپ کے بارے میں۔ کیا کوئی کام تھا۔“

”ہاں تجھی وہ منعم کی بات ہے وہ بھی ضد کر رہا ہے کہ صرف خندی ہی سے شادی کرے گا ورنہ نہیں۔“

”اوہ۔“ ان کے ہونٹ ہنچ گئے۔

”اور دیکھو جمال دیکھا بھلا ہے تمہارا منعم۔ رشتے اپنوں میں ہی جوڑنے چاہئیں۔ نا۔ تم سمجھ رہے ہوتا میری بات۔“

”جی۔“ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

”پھر کیا سوچا تم نے“۔

”ایسی باتیں فون پر نہیں کی جاتیں گھروں میں بیٹھ کر اطمینان سے کی جاتی ہیں۔“ جمال بولے۔

”گھر بھی میں آ جاؤں گی تم سوچو منہم کے لیے میں آج ہی آ جاؤں شام کو۔“ زرفشاں اطلاع کے انداز میں کہا۔

”جی بہتر۔ مگر کیا آپ کو گل نے کچھ نہیں بتایا؟“ جمال ملک نے پوچھا۔
”گل تو بے وقوف ہے۔ ذرا سی بات کو دل پر لے کر بیٹھ گئی ہے اسے میں سمجھا لوں گی تم ہار دو بس۔“

”آپ آئیے پھر دیکھیں گے۔ اوکے۔“ انہوں نے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ اور پھر سلا منقطع کر دیا۔

غصے سے کھولتے ہوئے انہوں نے گھر کے نمبر ڈائل کئے۔ تو ملازم نے فون ایسٹنڈ کیا۔
”کریم بیگم صلاہ کو بلاؤ۔“

تھوڑی دیر بعد ہی گل فشاں جمال لائن پر تھیں۔

”تم نے اپنی بہن کو میرا جواب نہیں پہنچایا تھا۔“

”میں نے اپنی طرف سے انکار کر دیا تھا۔“ گل فشاں نے آہستہ سے کہا۔

”پھر اس نے انکار سننے کے بعد بھی مجھ سے بات کیوں کی۔“

”جمال آپ سمجھیں واقعی میں نے انکار کیا تھا۔“ وہ پہلی بار منمننا کر بول رہی تھیں۔

یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ پھر اس رشتے کے لئے مجھے فون کیوں کیا۔“

”میں ابھی فون کر کے پوچھتی ہوں زری سے۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔ وہ خود شام کو آ رہی ہے اور گل فشاں بیگم کان کھول کر سن لو کہ آ تمہاری بہن خندی کے رشتے کے لئے میرے گھر کی دلہیز پار نہ کرے۔ اپنے انداز میں اسے سمجھا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ جمال الدین ملک نے پھر لیے لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

گل فشاں تو حیران و ششدر سی ریسیور ہاتھ میں لئے رہ گئیں۔ لائن بے جان ہو گئی تھی اور سوچ رہی تھیں۔

جمال ملک تو انتہائی خوش مزاج شخص تھے۔ پورے اٹھائیس برس انہوں نے ان کے گزارے تھے اس لیے میں تو انہوں نے کبھی بات نہ کی تھی ہمیشہ ملائمت سے بات کرتے تھے۔

آج کیسے پھر ان کے لبوں سے برس رہے تھے جو رو برو نہ ہوتے ہوئے بھی گل فشاں کے پر لگے تھے۔

کیا ہوگی آپ کو جمال۔“

میں آپ کے اس لہجے اور رویے کی عادی نہیں ہوں۔ جمال پلیر ایسے لفظوں کی چھانٹیں نہ برساں۔ گل فشاں کی آنکھوں کے کونے چپکے سے بھگ گئے۔

ایک بل کو تو ان کا دل چاہا وہ بہن سے بات کر کے زرفشاں کو خوب سنائیں مگر جمال نے مزہ دیا تھا اور اگر انہیں پتہ چل جاتا تو بخانے کیا سلوک کرتے اس خوف کی وجہ سے گل فشاں نے چاہے بھی بہن کو فون نہ کیا۔ اور بوجھل دل لئے اپنی خواہگاہ میں آ گئیں۔

☆☆☆

منظر پور کی حویلی میں مکانی آسیہ کی خواہگاہ میں اجدان کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ملائم مگر محبت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”تو اتنے برس باہر رہا تیرا دل ہی نہیں کیا وطن آنے کو۔“

”بڑی ماں۔ دل کی کیا بات کرتی ہیں۔“ اجدہ لیٹے لیٹے الٹا ہو گیا اور ٹھوڑی ان کے گھٹنے پر نکاتا ہوا بولا۔

”پتہ ہے کبھی کبھی تو بہت دل کرتا تھا کہ میں اڑ کر اپنے دیس پہنچ جاؤں اور بڑی ماں ایک بات بتاؤں۔“

”کیا۔؟“ انہوں نے غار ہوتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”جب میں شروع شروع میں گیا تھا تو فخر ماموں سے چھپ کر چپکے چپکے رو دیا کرتا تھا۔“ وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولا۔

”اچھا۔“ انہوں نے جھک کر اس کا سر چوما۔

”ہاں۔ بڑی ماں۔ آپ سب مجھے بے حد بے حساب یاد آتے تھے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ فخر ماموں کیسے رہتے ہیں تنہا۔ بالکل اکیلے۔“

”فخر عالم ایسا کرے گا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”اور حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ برسوں گزر گئے ہیں وہ ایک ہی تصور سے نکلتے ہی نہیں۔“ اجدہ نے بتایا۔

”تم اس جذبوں بھری منڈیر سے نہیں گزرے تو تمہیں کیا خبر۔“ آسیہ بیگم مسکرائیں۔

”اب یہ تو نہ کہیں۔“ اجدہ کو لگا جیسے اس کی مردانگی پر چوٹ کی گئی ہو۔

”کیا۔ کیا تم بھی۔“ مارے حیرت کے آسیہ بیگم کی آواز نہ نکل رہی تھی۔

”بھئی سچی بات تو یہ ہے بڑی ماں محبت و حبت میرے بس کا روگ نہیں ہے۔“ اجدہ نے ان کی گود میں چہرہ چھپالیا۔

”واقعی۔“ آسیہ بیگم کے لہجے میں بڑی معنی خیزی چھپی ہوئی تھی۔

”ہاں بھلا کوئی تک ہے کہ ایک ہی بندہ خیالوں پر چھا جائے۔“ اجدہ نے دادی کی خوشبو سے اپنے اندر کو مہکاتے ہوئے کہا۔

”تو تم نے محبت کی تھی؟“ وہ وثوق سے بولیں کہ بہت ہی دوستانہ انداز تھا۔

”ہوں۔“ اجدہ نجائے کیوں ان سے جھوٹ نہ بول سکا۔

”کون تھی؟“ آسیہ بیگم بالکل دوستوں کی طرح پوچھ رہی تھیں۔

”میری کلاس فیلو تھی۔ مگر بڑی ماں اسے میں محبت نہیں کہہ سکتا۔ جو میرا جوفین سے تعلق تھا نا۔“ وہ صرف فرینڈ شپ کا تھا۔ ہم دونوں میں بلا کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ وہ سر اوچا کئے آسیہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بس پھر میں نے یہ سوچا کہ تعلق ختم کر دیں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ میں اس کے ساتھ جاتا تھا تو میرا نام بہت ویٹ ہوتا تھا۔ پڑھائی کا حرج الگ اور پھر بڑی ماں میں نے اسے منع کیا تھا کہ وہ ڈیوڈ سے نہ ملے۔“ اجدہ کی آنکھوں میں سوچوں کی

پر چھائیاں لرز رہی تھیں۔

”ڈیوڈ کون تھا؟“ آسہ بیگم جانتا چاہتی تھیں۔

”وہ بھی ہمارا کلاس فیلو تھا بڑی ماں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ جوزفین ڈیوڈ سے بات کرنے۔“

”اچھا۔“ آسہ بیگم نے اس کا گال تھپتھپایا اور بولیں۔ ”تو تمہیں اس لڑکی جوزفین سے محبت تھی۔“

”بالکل نہیں بڑی ماں۔“ وہ پر تین لہجے میں بولا۔

”پھر وہ اگر ڈیوڈ یا کسی شخص سے بات کرتی تھی تو تم کیوں برا مانتے تھے؟“

”بس بڑی ماں مجھے ڈیوڈ پسند نہیں تھا۔“ اسجد نے کہا۔

”کیا اس کا جوزفین سے کوئی تعلق تھا؟“

”کیسا تعلق؟“

”کوئی رشتہ داری وغیرہ یا کچھ اور۔“

”آپ کو کیسے پتہ بڑی ماں۔؟“ اسجد ایک دم ہی اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت سے ان کے مسکراتے

ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ”آپ کو کشف بھی ہوتے ہیں؟“

”بات تو نہ بدلو۔ بول بھی جو تمہیں پتہ نہیں تو اولاد کے دل میں گھسی ہوتی ہیں اولاد کو

ساری وارداتوں کی خبر ماں کو ایک جذبوں کے الارم سے ہو جاتی ہے۔ پتہ ہے دل بھی تو دل کی بات

ریسیور کرتا ہے ماں کے اندر ایک وائر لیس لگا ہوتا ہے۔“

”سچ بڑی ماں۔“ اسجد معصوم بچے کی طرح بولا۔

”ہوں۔“ انہوں نے سر ہلایا۔ ”میں تمہارے باپ کی ماں ہوں جب اس کے دل کی بات

جان جاتی ہوں تو بھلا تمہارے دل کی بات کیوں نہیں جانوں گی۔“

”واقعی بڑی ماں آپ سچ کہتی ہیں۔“ اسجد نے ان کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”سچ کہتی ہوں نا۔؟“

”ہاں۔ پتہ ہے جوزفین کی مجھ سے پہلے ڈیوڈ سے دوستی تھی۔“

”دوستی میں تو جلن اور حسد دل میں جنم نہیں لیتا جو۔“

”بڑی ماں یقین کریں میری صرف جوزی سے دوستی تھی۔“

”اچھا۔ پھر تمہارے خیالوں اور سوچوں پر کیسے چھا گئی تھی؟“ آسہ بیگم نے اس کی بے تحاشہ

چمکتی آنکھوں میں دیکھا۔

”ہاں۔ یہ تو ہے پتہ نہیں شاید اس وجہ سے کہ ہمارا وقت ساتھ زیادہ گزرتا تھا۔ اسٹڈی ہم ساتھ

کرتے اور ساتھ ہی لاگت ڈرائیونگ پر جاتے تھے۔“ اسجد نے وجہ بتائی۔

”پھر ڈیوڈ کی وجہ سے تم دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔“

”بالکل بڑی ماں یہی بات۔“ اسجد اچھل ہی تو پڑا۔ ”پتہ ہے ایک روز میں نے اس

ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر ڈیوڈ کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔“

”اور دوستی چھوڑ دی۔“ آسہ بیگم نے کہا۔

”جی۔ میں نے اسے جب منع کیا تھا کہ ڈیوڈ سے بات بھی نہ کرے وہ بازار میں اس کے ساتھ

تھی۔ بڑی ماں اس نے میری بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کا مطلب ہے اس کے نزدیک میری بات کی کوئی اہمیت نہ تھی نا؟“ اسجد بچوں کی طرح معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”تم نے اس سے شکایت کی تھی۔؟“

”ہوں کیوں نہ کرتا بھلا۔“

”پھر اس نے کیا وضاحت کی۔؟“

”اس کی تو ایک ہی بات تھی کہ ڈیوڈ اے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں مل گیا تھا۔“

”اور تم نے یقین نہ کیا۔“ آسہ بیگم بولیں۔

”یقین آنے والی بات ہی نہ تھی بڑی ماں۔ کیونکہ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ وہ میرے منع

کرنے کے باوجود بھی ڈیوڈ سے بات کرتی ہے۔ حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈیوڈ سے بات نہیں

کرے گی۔“

”شک کی وجہ۔“

”آخر اتنا عرصہ پرانی دوستی تھی اسکول فیلو رہے تھے دونوں اور اب تک ساتھ ہی پڑھ رہے

تھے۔ بھلا اتنی پرانی دوستی پھوٹی ہے۔“

”ہاں چھوٹ جانی ہے۔“

”کیسے بھلا۔؟“ اسجد نے سوالیہ نظروں سے دادی کو دیکھا۔

”جب ہم کسی کو بے حد بے حساب چاہتے ہیں نا تو پھر اس کی ہر بات ماننے ہیں اور سچ وہی ہوتا

ہے جو ہم اس شخص سے کہتے ہیں جسے اس وقت چاہ رہے ہوتے ہیں۔“ وہ چھت کی طرف دیکھتے

ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”مگر بڑی ماں ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تو نہ تھے۔“

”اور چاہت کیسی ہوتی ہے؟“ آسہ بیگم مسکرائیں۔

”جی۔“ اسجد حیران تھا۔

”یہ جلن اور حسد کا جذبہ تھی دل میں ابھرتا ہے جب ہم کسی کو بہت زیادہ چاہ رہے ہوتے

ہیں۔ پھر دل چاہتا ہے ہماری چاہت کو کوئی نہ دیکھے۔ ساری دنیا کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔“

”ارے نہیں بڑی ماں۔“ اسجد ہنسا۔ ”پتہ ہے جب جوزفین سے میں نے ترک تعلق کیا نا تو اس

نے مجھے کہا تھا یہ تم ایشیائی مردود سے زیادہ چھوٹے دل کے ہوتے ہو تم دوسروں پر اس لیے شک

کرتے ہو کہ تمہیں خود پر اصرار نہیں ہوتا۔ یہ اس نے کیوں کہا تھا بڑی ماں۔“

”اسی سے پوچھتے نا۔؟“ وہ مسکرائیں۔

”میں نے تو اس سے بھی بات ہی نہیں کی۔ چھوڑیں مٹی پائیں بڑی ماں مجھے آپ یہ بتائیں

آپ اتنا عرصہ مجھ پر کیسے رہیں؟“ اسجد نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا اور آسہ

بیمہ دل ہی دل میں ہنس دیں۔ کہ ان کا پوتا کس طرح بات بدل رہا تھا۔

اپنا بھرم رکھنے کو۔

اپنے دل کا راز افشا کر کے وہ بے شک ہکا ہو گیا تھا۔ لیکن آسہ بیگم کے دل پر تو بوجھ پڑ گیا تھا۔

پھر جیسا بوجھ۔

”نہو! پھر تجھے جوزفین ملی نہیں۔“

”تعلیم مکمل ہوتے ہی میں یوگوسلاویہ سے فخر ماموں کے پاس جرمنی آ گیا۔“
”جب ہماری لڑائی ہوئی تھی تو ہمارا فائل سمسٹر چل رہا تھا“ اسجد نے کچھ بھی نہ سمجھتے کہا۔

”تم نے اس سے معذرت نہیں کی۔“
”کیوں بڑی ماں۔ میرا بھلا کیا قصور ہے۔“
”قصور تو اس کا بھی نہ تھا؟“

”تھا قصور اس کا اور میں بڑی ماں چیفر لوگوں سے۔۔۔ کوئی رشتہ نہیں رکھ سکتا۔ مجھے ہے دو غلے لوگوں سے۔“ اسجد کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔
”تم اس سے سواری کرتے تو وہ کس قدر خوش ہوتی۔“
”کہا نا بڑی ماں میں اس سے تعلق ہی نہ رکھنا چاہتا تھا مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔“
”تو پہلے محبت تھی نا۔“
”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“

”بھی محبت ہی تو نفرت میں بدلتی ہے نا۔ کوئی اور جذبہ کب نفرت میں بدلتا ہے۔“
”اوہ بڑی ماں آپ بات کو کہاں لے جاتی ہیں۔“ اسجد ہنس دیا۔ ”خیر آپ بے فکر رہیں اس سے محبت نہیں تھی۔“ وہ اب بھی اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔
”اچھا اب آپ انھیں اور مجھے وہ پستے باداموں والا ٹھنڈا دودھ پلائیں۔ سچ بہت زور کی لگی ہے۔“ اسجد نے ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔ اور خیراں سے کہیں میرا بیگ بھی دے۔

”کیوں۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا

”شام کو میں لاہور جا رہا ہوں۔“ اسجد نے بتایا۔

”کل ہی تو تم آئے ہو۔؟ اتنی جلدی تو میں تمہیں نہیں جانے دوں گی نہ میں نے تم کو روک دیکھا اور نہ ہی باتیں کیں۔ اتنے سالوں بعد تو تم نے شکل دکھائی۔“ آسیہ بیگم نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”ماں واری چند روز تو رہو۔ میری آنکھوں کو ٹھنڈا تو ہونے دو۔“
”پھر آؤں گا بڑی ماں۔ اسجد نے سلی دی۔“

”سب۔ سب مجھے انتظار بخش کر چلے جاتے ہیں جو۔ میں تو اولاد کی شادی کر کے اکیلی کوئی بھی میرے ساتھ نہیں رہتا۔ لگتا ہے جیسے موسم بدلتے ہیں اور پکھیر دوسرے علاقوں میں جاتے ہیں میرے بچے بھی پکھیر ہوں بدلتے موسموں میں ہی آتے ہیں۔ مجھ سے انتظار نہ اب۔“ ان کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

”بڑی ماں انتظار میں لذت ہے۔“ اسجد نے بتایا۔

”انتالبا انتظار اپنی عمر کے تین حصے میں نے انتظار ہی میں گزار دیے یہ کیسا انتظار ہے۔“

”آپ کو ہم سے محبت ہے نا۔“ اسجد پوچھ رہا تھا۔

”یہ پوچھنے والی بات ہے بھلا۔“

”تو بڑی ماں کہتے ہیں محبت کی خاطر چھوٹے چھوٹے دکھ بھی اٹھائے جائیں تو ان کا بھی اپنا چارم ہے۔“

”یہ انتظار چھوٹا دکھ ہے۔“ آسیہ بیگم کے لبوں پر دکھی مسکراہٹ ابھری۔

”بڑی ماں۔ میں ضرور رہتا۔ مگر کل مجھے چولستان جانا ہے۔“ اسجد نے ان کے گلے میں پھر بازو پرو دیئے۔

”چند روز بعد چلے جانا۔“

”ہماری پوری ٹیم جا چکی ہے۔ ہمارے ایگزیکٹو اور باقی بڑے ریسیرج افسران بھی پہنچ رہے ہیں وہاں۔ میں اسلام آباد سے سیدھا آپ سے ملنے چلا آیا۔ کہ میں آپ کے بغیر بہت اداس تھا بڑی ماں وعدہ کہ جب بھی چھٹی کی سیدھا مظفر پور دوڑا آؤں گا۔ اب آپ خفا نہ ہوں۔ میں وعدہ کر رہا ہوں نا۔“

”تم جاؤ گے کہاں۔؟“

”چولستان کے علاقے میں ایک جگہ ہے بستی لعل باغ اس کے قریب وجوار میں ہی جانا ہے نا ہے برا خوبصورت منظر ہوتا ہے چند میل پر دریا بھی ہے اگر وہاں کوئی رہائش کا انتظام ہوا تو میں آپ کو آکر لے جاؤں گا۔ سچ بڑی ماں۔ برا مزہ آئے گا چولستان کی گرمی میں آپ کے ہاتھ کے پکے ہوئے گرم گرم قیمہ بھرے پرائٹھے۔“ اسجد مزا لیتے ہوئے بولا۔ تو وہ ہنس دیں۔ اور بولیں۔

”دادی کو بھلا رہا ہے۔“

”سمجھ گئی ہیں۔“ اسجد بھی ہنس دیا۔

”بڑوں ہو گئے ہیں اسی طرح کے لفظوں اور جملوں سے بھلتے ہوئے۔“ وہ آہ بھر کر بولیں۔
اسجد انہیں دیکھ کر رہ گیا مگر بولا کچھ نہیں۔ کہ ان کے لہجے میں کتنی حسرتیں پوشیدہ تھیں۔ جن کا انہوں نے لفظوں میں اظہار نہ کیا تھا۔ مگر اسجد سمجھ گیا تھا جس طرح بعض دکھ گو نگے ہوتے ہیں اسی طرح حسرتیں بھی لگی ہوئی ہیں کبھی کبھی خواہشوں کی بھی زبان نہیں ہوتی۔
اور کبھی لفظ نہیں ہوتے کہ بعض حسرتیں اور خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ لفظ ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔

آسیہ بیگم اس کے لئے ٹھنڈا دودھ لینے کمرے سے جا چکی تھیں اور اسجد کے دل کو ان کے اکیلے بٹانے کے دکھ کا احساس چیر رہا تھا۔

☆☆☆

دل کا اصرار ہے تجھے بھول جاؤں

مگر یہ دل کا فیصلہ بھی نہیں

”دل کا اصرار ہے تجھے بھول جاؤں۔“ وہاں احمد نے آہ بھر کر سوچا واقعی دو روز سے مسلسل وہ لڑا لڑا۔۔۔ جنگ لڑ رہا تھا۔ دل پر انجانے میں غاشیہ نے ایک ایسی چوٹ ماری تھی کہ وہ کسی بلوریں کی بات بالکل بندھی۔ اسے دیکھ کر وہ اپنی خوبصورت تیوری پر بل ڈال لیتی تھی۔

آنکھوں میں سرد مہری کی تحریر وہ صاف پڑھ لیتا۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ جاؤ۔ جاؤ ہمیں تمہاری لڑائی پر اٹھنا نہیں اور اس لئے وہاں کو لگتا جیسے اس کا دل چیرا جا رہا ہو نا معلوم سے تیز دھار آلے سے اور

ایسا وہ بارہا محسوس کرتا تھا لیکن غاشیہ کو تو شاید احساس ہی نہ تھا۔ وہ سوچتا۔
غاشیہ کمال تم نے محبت ہی نہیں کی ورنہ میری معذرت کے بعد تو تمہارے دل کے شیشے
ہوئی دھول صاف ہو جانی چاہیے تھی۔
کہتے ہیں محبت کرنے والوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں اور وہ اپنے محبت کی بڑی سے
خطا بھی معاف کر دیتے ہیں کہ محبت میں پھنسنے جانا روح کی موت ہوتی ہے۔
دل کی تڑپ تو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ جب کہ غاشیہ۔ اسی مطمئن تھی کہ وہاں کو
ہوئی۔ تبھی تو یہ سوچ اس کو اپنے حصار میں لے لیتی تھی۔
ہاں غاشیہ تم نے چاہا ہی نہیں مجھے چاہنے والوں کی طرح۔
میں ہی بے وقوف تھا کہ تمہاری محبت کے سائے تلے بیٹھ کر سمجھ لیا یہی منزل ہے۔ بھولا
اسے وہاں۔ دنیا میں لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔
اس کا دل بھی کبھی کبھی وہاں کی پریشانی سے متنفذ ہوتا غاشیہ سے تو اسے ٹھو کے دیتا۔
ہاں ہاں بھول جاؤ۔ وہاں کو لگتا جیسے اس کے اندر مسلسل سرگوشیاں ہو رہی ہوں۔
مگر دل یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ واقعی اسے بھول جائے جس نے شک کے
انگارے اس کے دل کے شکوک میں ڈال دیے تھے۔ اس کے باوجود بھی وہاں کی حالت یہی تھی
اسے چار سو نظر آتی۔

ہر ایک روپ میں اس کا وجود ملتا ہے

ہر ایک رنگ میں چہرہ دکھائی دیتا ہے

میں۔ میں تم بن نہیں رہ سکوں گا غاشیہ۔

وہاں نے اپنی انگلیوں سے کپٹیاں دبائیں اور پھر ایک دم ہی وہ اٹھا۔ اس نے کمرے کا
ایک چیز اٹھا اٹھا کر پھینکی شروع کر دی۔ دیوار سے پورٹریٹ اتار کر قالین پر دے مارے۔ نیکے
چادر۔ کتاہی جی کہ ساری چیزیں اس کے پورے کمرے میں بکھری پڑی تھیں۔ اس کا دل چاہا
ایک ایک چیز کو ہنس نہ کر دے۔ دور دراز سے یونیورسٹی بھی نہ جاسکا تھا۔
بھلا ایسے میں وہ کس طرح جاتا۔ اسے لگ رہا تھا اگر غاشیہ نے اسے معاف نہ کیا تو اسے
بند ہو جائے گا۔ وہ حیران تھا کہ کیا اتنی شدید محبت بھی ہوتی ہے۔

پہلے اسے احساس نہ تھا کہ وہ غاشیہ کو اتنی شدت سے چاہتا ہے اور اب جب احساس
بارہا اس کی سولی پر چڑھ جاتی۔ عجب سا کرب دل میں لہریں لینے لگتا اور دل تو بیٹا محسوس
میں کئی بار اس کا دل چاہتا کہ وہ غاشیہ سے دوبارہ بات کرے۔ اسے دلائل دے۔ مگر اس کی آواز
کی زنجیر بن جاتی۔

کتنے دلائل دو گے وہاں۔ اگر پھر اس نے نان کر دی تو کیا ہوگا۔

وہ تو وہی اپنے آپ کو دنیا کی کوئی سپر ہیرو سمجھ رہی ہوگی کہ تم اس کے پیچھے خواہ
تمہاری مردانگی کی توہین ہے۔ اگر وہ تمہارا نصیب ہے تو کتنی ہی دیواریں کھڑی ہوں، کتنی ہی
پیدا ہوں اور نکل آئے گی۔ اور اگر وہ تمہارا مقدر نہیں تو پھر جتنی بھی رکاوٹیں تم ہٹاؤ گے اس
رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں گی۔

خدا کے بعد دیکھو اسے اسے سمجھانے کے لیے طے آتے۔ کوئی راہ نہ پا کر وہ پاگل سا

اور آج تو اس نے ایک ایک شے اٹھا کر پھینک دی تھی۔ کمرہ میدان کارزار کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اور
وہ بانپتے ہوئے رانگ چیر پر ڈھے سا گیا تھا۔ تبھی رمضان آ گیا اور کمرے کی حالت دیکھ کر ایک لمحے
کو تو وہ ٹھنک کر رہ گیا۔

وہاں کو دیکھا تو وہ آنکھیں موند گئے رانگ چیر پر جھول رہا تھا۔ اور بار بار کرسی کی ہتھیلوں پر
کے مار رہا تھا۔

”صاحب۔!“ بہت ہمت کر کے رمضان نے اسے پکارا تھا۔

”کیا ہے؟“ وہ ایک دم ہی سیدھا ہوا اور گرجتے ہوئے بولا۔ ”کیوں آئے ہو بغیر
اجازت میرے کمرے میں۔“ وہ ٹھٹھیاں بھینچتا ہوا رمضان کی جانب بڑھا۔

”وہ صاحب۔ صاحب۔“ رمضان گڑ بڑا گیا۔ وہاں کی آنکھوں کی وحشت ناک سرخی نے اس
کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

”کیا صاحب۔ صاحب کی رٹ لگا رکھی ہے دفع ہو جاؤ۔“ وہاں نے ترش لہجے میں کہا۔
”دفع ہو جاؤ۔ اب آئے تو ناگئیں توڑ دوں گا۔“ وہاں اس وقت بالکل جاہلوں کی طرح چلا رہا تھا۔
رمضان فوراً ہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ مگر وہ حیران تھا کہ آج وہ نرم و ملائم لہجے والے ہنس مکھ سے
وہاں کو ہو گیا تھا۔

کبھی بھی تو اس طرح وہاں نے بات نہ کی تھی۔ ملازمین سے وہ ہمیشہ محبت و اخلاق سے پیش
آتا تھا۔

ملک ہاؤس کے سارے ملازمین اس سے بے حد خوش رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ انہیں گھمانے
بھی لے جاتا تھا۔ پختے میں ایک بار وہ انہیں جب میں بھر کر بھی قلعے کا شیش محل دکھانے لے جاتا۔ کبھی
مثلاً مارباغ۔ اور وہاں ان کے ساتھ خوب ہلا گلا کرتا۔ لگتا جیسے وہ انہی میں سے ہو۔ انہیں زبردستی ہی
گول گئے، تھکے وغیرہ کھلاتا۔ بار بار کہتا۔

”دیکھو شرم نہ کیا کرو۔ جو چاہو کھاؤ پیو۔ خوب گھومو پھرو۔ آخر تمہارا بھی حق ہے۔“ مجال ہے
کبھی اس نے ترچھی نظر سے انہیں دیکھا ہو۔ اور آج کس طرح اس نے رمضان کو جھڑکا تھا۔ رمضان
کے جانے کے بعد وہاں کو دکھ سا ہونے لگا۔

میں نے کیوں اسے ڈانٹا؟

اس کے اندر مسلسل کوئی رونے لگا۔

لڑائی تو میری اور غاشیہ کی ہے۔ اسیں رمضان کا کیا قصور؟

اس کا اندر بچو کے دینے لگا تھا۔

وہاں بہت بڑے ہونم۔ یہ کہاں کا انصاف ہے ایک محبت کی خاطر دوسروں سے تعلقات خراب
کر لو۔ تمہیں کیا حق پہنچتا تھا رمضان کو جھڑکنے کا۔ اس کے اندر کا نرم دل متصف وہاں اسے مسلسل
ملاست کر رہا تھا۔ تب وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکا مگر دروازے ہی میں آصف کا نچو سے ٹکرا گیا۔

”کہاں جا رہے ہو پیارے اس قدر تیزی میں۔“ آصف نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام
لیا۔

”تم کب آئے؟“ وہاں نے حیرت سے پوچھا۔

”ابھی آئے ہیں۔ رمضان کو تم نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ پتہ کیا ہے؟“ فرحت منیر آصف کے

پیچھے کھڑا آنکھیں نیچاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں اسے دھکیل کر اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے زویب اور عفیرہ بھی تھے۔

”ہائیں۔ ہائیں یہ کیا۔ کیا کوئی چیز کھو گئی جس کی تلاش میں کمرہ الٹ پلٹ کر دیا ہے تم۔“ فرحت نے کمرے میں پھری چیزوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا کھو گیا؟“ عفیرہ امیر نے پہلی بار بات کی تھی۔ مگر ایسا جملہ تھا کہ وہاں کو لگا جیسے کو اس کے دل کی ساری کیفیت کی خبر اس کی حالت سے ہو گئی ہے۔

”بھلے بندے تم دو روز سے یونیورسٹی کیوں نہیں آئے۔ پتا ہے ہم کتنے پریشان ہوئے۔ کرو تو تمہاری ماموں زاد کنبہ دیتی ہے تم گھر پر نہیں ہو۔“ زویب پوچھ رہا تھا۔

”میں تو پرسوں سے گھر ہی میں پڑا ہوں۔ نہیں نہیں گیا۔“ وہاں نے دھیرے سے کہا۔

”اور نہ ہی کہیں جانے جو گے رہو گے۔“ عفیرہ اپنے مخصوص انداز میں ہونٹ کا اوپری دانٹوں تلے دبا کر شوخی سے بولی۔

”عفیرہ پلیز مت پتھر برساؤ۔“ وہاں کا لہجہ اتنا ملتجیانہ تھا کہ عفیرہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گئی۔

”سوری وہاں۔“ اس کا لہجہ اور انداز ایک دم ہی بدل گیا تھا۔

وہاں نے خود کو جلدی ہی سنبھال لیا تھا۔

”آئے کیوں نہیں تم۔؟“

”طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”کیا ہوا۔ تمہاری طبیعت کو بھلے چنگے تو ہو۔“ آصف کانجو نے اس کے سراپا نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

تب عفیرہ امیر کا دل چاہا زور سے ہنس دے اور کہے آصف کا نجوم نظروں کی روشنی کے ساتھ احساس کی مشعل بھی ساتھ رکھو۔ تو پتہ چلے بندہ بھلا چنگا کیسے ہوتا ہے؟ اندر کی توڑ پھوڑ دا عمارت کو ڈھاتی ہے تو کچھ بھی نہیں بچتا۔ اور یہی خالی پن بندے کو کہیں کا نہیں رکھتا۔ عفیرہ۔

آصف اور فرحت منیر وہاں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ بتاؤ نا آخر تمہیں ہوا کیا؟

”بھئی کچھ نہیں ہوا۔ اب کیا بتاؤں۔ بس دل اداس تھا۔“ وہاں بالوں میں انگلیاں پیچھ بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ کیا محبت کرنے لگے ہو؟“ فرحت نے شوخی سے کہا۔

”یہ تو پرانی بات ہے۔“ عفیرہ نے کہنا چاہا مگر جملہ ہونٹوں کی پاؤں کے پیچھے ہی روک لیا وہاں اس سے درخواست کر چکا تھا کہ وہ کوئی پتھر نہ پھینکے۔ یہ جملہ بھی تو پتھر جیسا ہی تھا۔

”کیا چلے گا چائے یا ٹھنڈا۔“ وہاں پوچھ رہا تھا۔

”اس گرمی میں تو ٹھنڈا ہی چلے گا۔“ زویب بولا۔

وہاں نے نیل بجائی تو چند ساعتوں میں ہی رمضان آ موجود ہوا۔ وہاں کرسی سے اٹھ کر قریب آ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”سوری رمضان۔ آئی ایم ریگنی سوری۔“ وہاں کا لہجہ شرمندگی کے احساس سے بھیگا ہوا تھا۔

بہت ہی آہستہ اس نے کہا تھا جو رمضان ہی اس کا تھا۔

”آپ حکم کریں صاحب۔ اور مجھے بالکل برا نہیں لگتا۔ آپ تو ہمارے لوگوں کے مائی

ہیں۔ اپنے ماما باپ بھی تو جھک دیتے ہیں۔“ رمضان نے وہاں کا اپنے کندھے پر رکھا ہاتھ تمام کر عقیدت بھرے لہجے میں کہا۔

”بھئی یہ کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔ سنو کہیں تم رمضان کو یہ ہدایات تو نہیں دے رہے کہ ہمیں کچھ کھلا دے۔“

”کچھ کیا مطلب۔؟“

”جمال کھوٹا۔“ آصف شرارت سے بولا۔

”کینے جو تم۔“ وہاں کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ پھر وہ رمضان سے بولا۔

”یار ان کے لئے کولڈ ڈرنک لاؤ۔“

رمضان کے جانے بعد وہ تینوں پھر اس کے پیچھے پڑ گئے کہ آخر کیا اس پڑ آفت پڑی ہے کہ دو روز سے گھر سے نہیں نکلا۔

وہاں انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے بہلا رہا تھا۔ اب وہ بھلا کیسے بتاتا کہ اس پر کیسے شک کے نیروں کی بارش کی گئی ہے کہ اس کا دل ہی پھلتی ہو کر رہ گیا ہے۔

پھر وہ وہاں تھا۔ ان کے ہاتھ نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اور عفیرہ امیر کرسی پر بیٹھے اسٹرابیوں میں دبائے چمکی شوخ آنکھوں سے وہاں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

”بچو۔ بول دو جتنے جھوٹ بول لئے ہیں میں جانتی ہوں کہ اصل بات“ کیا ہے جو شاید خود سے چھپانا چاہتے ہو۔“

وہاں کی نظر اس پڑ پڑتی تو یہ تحریر وہ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر لکھی صاف پڑھ لیتا اور پھر نظریں پڑا لیتا۔ اور جب وہ دو دھکے بعد گئے تو یہ وعدہ لے کر گئے تھے۔

”کل اگر تم یونیورسٹی نہ آئے تو ہم پھر دھوا بول دیں گے۔“ اور وہاں نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔

☆☆☆

پینل اور شیشم کے سوکھے پتے اُن کے قدموں تلے آ کر احتجاج کار کڑھاتے ہوئے چلا رہے تھے۔ عفیرہ امیر نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے وہاں احمد کو سراہا کر دیکھا جو سر جھکائے نجانے کن سوچوں میں کم پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

”وہاں۔“

”ہوں۔“

”تمہیں پتا ہے سر مبارک کی کلاس چھوڑ کر تمہیں ساتھ لے کر کیوں آئی ہوں۔“

”تم پہلے کوئی پوری کلاسز اسٹینڈ کرتی ہو۔“ وہاں نے اپنی سرخ آنکھیں عفیرہ پر گاڑ دیں۔ وہ سرخ آنکھیں جن میں شب خوابی کے باعث سرخ ڈورے لہرا رہے تھے۔

”کب سے نہیں سوئے وہاں۔؟“ عفیرہ نے پوچھا۔

”لگ رہا ہے ہفتہ یاں بیت گئی ہیں نیند لیے۔“ وہاں نے پینل کے پیڑ کے موٹے سے تنے سے کمر نکادا۔ اور دوست کے پتوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر سوز بکھرا ہوا تھا۔ یہ اداسی عفیرہ پر بھی لڑک کو نہایت کل رہی تھی۔

”وہاں۔ میں۔ میں غائبہ سے بات کروں۔؟“ عفیرہ نے پوچھا۔

”نہیں عفو۔ تم رو گی نہیں۔ تم تو بہت بہادر ہو میری پیاری دوست۔“ وہاج نے اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں کی تیر رہی تھی۔
 ”وہاج۔ محبتوں سے کٹ کر انسان نہیں رہ سکتا۔ تم آنا کی زنجیر اتار بیٹھو یہ نہ ہو کہ آنے والا کل تمہارے گلے میں پچھتاوے کا طوق ڈال دے اور تمہارے پاس کوئی بھی لمحہ ایسا نہ ہو جسے تم اپنا کہہ سکو۔“

”عفو پچھتاؤں گے تو ہم دونوں ہی نا۔“ وہاج بولا۔
 ”کیا مطلب؟“ عفرہ ایک دم ہی پیچھے ہٹی جیسے کہ بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ وہاج ہنس دیا۔
 ”لڑکی کس قدر بولڈ کیوں نہ ہو ہوئی لڑکی ہی ہے۔ ننانوے فیصد عام سی لڑکی اور تم جتنی بھی منفرد ہو۔ ہو لڑکی ہی۔“

”سوری وہاج۔ سمجھ کا پھیر ہو گیا۔“ عفرہ بھی ہنس دی۔ ”تمہارا مطلب یہ تھا کہ شاید آنے والے وقت میں پچھتاؤ اور تمہارے ساتھ ساتھ غاشیہ کو بھی ہو۔“
 ”آف کورس۔“ وہاج کی آنکھوں کی جوت سمجھ گئی تھی۔

”اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں مجھے اس سے بات کرنے دو لفظوں اور جملوں کا پھیر بعض مرتبہ مصیبت کر دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے میری وضاحت سے مطمئن ہو جائے گی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ بعض مرتبہ وہ سچ نہیں ہوتا جو آنکھ دیکھتی ہے۔“

”تمہیں ضرورت کیا ہے وضاحت کرنے کی؟ تم کیوں چھوٹی ہونا چاہتی ہو عفو۔ میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتا کہ تم اپنے اور میرے مقدس تعلقات کی وضاحت کرنی پھرو۔ اسے مجھ پر میری زبان پر بھروسہ نہیں تو نہ سہی میں اُس کے بغیر مر نہیں جاؤں گا۔“

”وہاج! کوئی کسی کے بغیر نہیں مرنے لگا مگر پیارے دوست دل تو مر جاتے ہیں نا؟ میں نہیں چاہتی میرا دوست مردہ دلی سے جیے۔“

”بس کہہ دینا کہ تم نے غاشیہ سے کچھ نہیں کہنا۔“ وہاج نے تیغ صفت لہجے میں کہا۔ عفرہ بس اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کے چہرے پر پتھر جیسی کرختگی تھی۔



”کیسی بات۔“ وہاج نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
 ”تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا مگر مجھے علم ہے کہ کس بات نے تمہیں الجھن میں ڈال رکھا۔ میری وجہ سے غاشیہ تم سے خفا ہوئی ہے نا۔ اور اب مان نہیں رہی تمہاری وضاحتیں بھی اس کے دل پر آئی دھول صاف کرنے میں نا کام رہی ہیں۔“ عفرہ نے کہا تو وہاج کچھ نہ بولا صرف طویل لمحوں لے کر رہ گیا۔ وہ اس کی سچائی کو جھٹلا نہ سکتا تھا۔

”وہاج یہ لڑکیاں ہیں نا بہت نازک ہوتی ہیں بالکل پھولوں کی بیلوں کی طرح ذرا سی پٹخ یہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ ان کے دل شیشے کی مانند ہوتے ہیں ذرا سی چوٹ لگے تو کرچی کرچی جاتے ہیں اور وہاج غاشیہ بھی اس دنیا کی اور لڑکیوں سے مختلف نہیں ہے نا؟“ عفرہ امیرنہا دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی اور وہاج حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا کتنی مختلف لگ رہی تھی وہ اس کا دھیما سا انداز تو وہاج نے بھی دیکھا بھی نہ تھا

”مجھے اسی روز اندازہ ہو گیا تھا غاشیہ کا تم سے یہی رویہ ہو گا۔ میں خود کو مجرم سمجھوں۔“ عفرہ کا لہجہ دھیما تھا۔

”وہ کیوں؟“ وہاج نے اس کی طرف دیکھا۔
 ”میں نہ ضد کرتی اور نہ تم مجھے “ماریہ یونی پارلر“ لے جاتے اور نہ ہی غاشیہ تمہیں میرے دیکھتی۔“

”عفو۔ اسے خود پر یقین نہیں۔“
 ”شائد نہیں ہے۔“

”مجھ پر تو بھروسہ کرے۔ میں نے اسے چاہا ہے تمہیں نہیں پتا عفو میں نے اسے کس قدر ہے۔“

سوتے جاگتے اسکی پوجا کی ہے۔ میں کوئی عام سافلرٹ لڑکا نہیں ہوں۔ عفو یقین کرو غاشیہ لڑکی ہے جسے میں نے اپنے وجود کی شدتوں اور دل کی تمام گہرائیوں سے چاہا ہے اس کے اس نے میرے دل میں دڑائیں ڈال دی ہیں۔“ وہاج کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔
 ”بھی تو کہہ رہی ہوں میں اس سے بات کروں گی۔“

”کیا ضرورت ہے؟ جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی ہے۔ وہ تھوڑی نلکے گی۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے عفو۔ لیکن لگتا ہے وہ میری بات سنا نہیں چاہتی۔ اگر میرے نہیں چلنا چاہتی تو یونہی کہہ دیتی۔“ وہاج نے سینے پر بازو باندھتے ہوئے کہا۔

”تم مرد بن کر سوچ رہے ہو۔ حالانکہ شیشہ دل غاشیہ کا چور چور ہوا ہے۔“
 ”تو تمہارا کیا خیال ہے اُس کے سرد رویے نے میرے دل کو سلامت رکھا ہوا ہے۔؟“
 ”سوری وہاج۔ یہ۔ یہ میری وجہ سے ہوا۔ عفرہ نے اس کے بالوں بھرے بازو پر ہاتھ

دیا۔
 ”بڑی بات ہے عفو۔ تم کیوں معذرت کر رہی ہو۔ بھلا تمہارا کیا قصور ہے مجھے تم تو شرم کرو۔“

وہاج نے اُس کے مخروطی انگلیوں والے خوبصورت ملائم ہاتھ تھام لیے۔ عفرہ کی آنکھوں گوشے آپ آپ ہی بھیکنے لگے۔

سے ریسیور تھاڑے رکھا۔
”مگر میں نے غلطی نہیں کی۔ خود اپنی آنکھوں سے تمہیں دہان کے ساتھ دیکھا ہے۔ اور میں جھوٹی پلیٹ میں کھانے کی عادی نہیں ہوں۔“
”تو غاشیہ بیگم، جھوٹی پلیٹ میں تو بھی کھانے کی عادی نہیں ہوں۔“
”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ غاشیہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔
”یہی کہ مجھے بہت پہلے ہی سے پتا ہے دہان اور تمہارے دلی تعلق کا مجھے یہ بھی علم ہے کہ دہان تمہیں بے تحاشا چاہتا ہے۔ پھر سوچو میں کس طرح اسے چاہنے کی غلطی کر سکتی ہوں۔“
”دل پر اختیار تو نہیں ہوتا۔“

”مگر میرا دل پورے کا پورا میرے اختیار میں ہے۔ اس کی باگیں سو فیصد میرے ہاتھ میں ہیں۔ یوں بھی دہان میں ایسی کوئی بات نہیں کہ مجھ جیسی منفرد لڑکی اسے چاہے۔ اسی لیے میں تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ۔“
”تم مجھے سمجھانے والی کون ہوتی ہو۔ پھر صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اگر تمہارا کوئی چکر ”ہمیں“۔“
”میں دہان کی دوست ہوں غاشیہ۔ اور اس کی پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ وہ بہت پریشان ہے غاشیہ۔“

”پریشانی۔ ہونہ۔ یوں کہو کہ یہ تمہارے دل کا کوئی ”چور“ ہے جو تمہیں درغلز رہا ہے۔ تمہارے ضمیر کی مار ہے۔ جس نے تمہیں مجبور کیا ہے کہ وضاحت کرو۔“ غاشیہ لفظ ”چور“ پر زور دے کر بولی۔
”تم چاہتی ہو کہ میں اعتبار کر لوں۔“
”تمہارے اعتبار کرنے سے کیا ہوگا بھلا؟“

”پھر یہ ہوگا کہ میری آنکھ کے سامنے ہی چوہے ملی والا کھیل تم دونوں کھیلنے رہو اور میں اعتماد کی بی آنکھوں پر باندھے بیٹھی رہوں گی۔ سنو عفیرہ، میں بیوقوف نہیں ہوں، میں کسی چال میں نہیں آ سکتی۔“

”غاشیہ تم اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بہت اچھا شخص کھو دو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بچھتا دوں کے انگاروں سے اپنی جھولی بھرو۔“ وہ نہایت محل سے اسے سمجھا رہی تھی۔

”یہ میرا Headache (درد سر) ہے۔ اپنی زندگی میں تنخیاں بھرنے سے بہتر ہے کہ میں ابھی سے راہ بدل لوں۔ تم مجھے مت سمجھاؤ اپنی بات کرو۔ کب کر رہی ہو دہان سے شادی۔“

”بھی نہیں۔“ شدت جذب سے اس نے ہونٹ بچھنے لگے۔
”انتا مالدار بندہ تمہیں کبھی نہیں مل سکتا۔“ غاشیہ کا لہجہ مسخرانہ تھا۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں اس پر اور اس کی دولت پر۔ سنو غاشیہ کمال، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ دہان احمد نہ میرا معیار ہے نہ میری پسند۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟“

”اصل میں ہوتا وہی ہے جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ مگر عفیرہ امیرہ بات تو میں کئی روز سے سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں تمہارے نام سے میرے اندر ایک گھٹنی سی جتنے لگتی ہے جسے خطرے کی گھنٹی کہنا بجا ہے۔“

”تمہاری سوچ محدود ہے۔“

”ہیلو۔“ تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھایا گیا تھا۔ ”کس سے بات کرنی ہے؟“
”میں عفیرہ امیر بول رہی ہوں اور مجھے آپ ہی سے بات کرنی ہے غاشیہ۔“
”کیوں؟“ غاشیہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

”میں کہنا چاہتی ہوں کہ۔۔۔“ عفیرہ نے کہنا چاہا مگر غاشیہ اس کی بات کاٹ کر تلوار صفت لہجے میں بولی۔

”مجھے کچھ نہیں سننا عفیرہ بیگم۔ میں تم جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ پڑھنے والی لڑکیاں کوئی اور ہوتی ہیں تم جیسی لڑکیاں تو یونیورسٹی پڑھنے نہیں اپنے لیے برڈھونڈنے جاتی ہیں۔ پھانس لیا نا دہان کو سنو بہت ہی مالدار مرغے سے سیکٹرڈل ایکڑ اراضی ہے اس کے نام تمہیں اپنے انتخاب پر بھی پچھتاوا نہیں ہوگا۔ اگر تم دہان سے نہیں تو اس کی دولت سے تو محبت کر ہی سکو گی کہ۔“
”شٹ اپ پو۔“ عفیرہ نے چیخ کر کہا۔

بہت ہی خوبصورت سی ہنسی اتیر پیش کے ذریعے عفیرہ امیر کی سماعتوں میں سیسہ بن کر اترتی تھی۔ لگا تھا اس ہنسی نے سماعتوں کو چیر دیا ہو۔

”سچ سننے کا حوصلہ رکھو عفیرہ امیر۔“ غاشیہ کمال نے کمال ہوشیاری سے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

”سنو غاشیہ کمال۔ تم جو سمجھ رہی ہو اس میں ایک فیصد بھی حقیقت نہیں ہے۔“ عفیرہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”تم مجھے یہ بتانے والی کون ہو کہ حقیقت کیا ہے؟ میں خود تم سے بہتر جانتی ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ تم نے بر بہت اچھا تلاش کیا غاشیہ امیر۔“

”بر۔؟“ عفیرہ نے شدت جذبات سے ہونٹ کاٹے۔
”ہاں۔ ہاں۔“ وہ چیخنے کے سے انداز میں بولی۔

”غاشیہ، بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ سچ نہیں ہوتا۔ کان جو کچھ سنتے ہیں وہ حقیقت نہیں ہوتی۔ کہ لفظوں اور جملوں کو سمجھنے میں ہم غلطی بھی تو کر جاتے ہیں۔“ عفیرہ نے مضبوطی

”کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں گھر بیٹھے والی لڑکی ہوں۔“
”یہ بات نہیں ہے۔ تم نے دنیا نہیں دیکھتی۔“ عفریہ اب بھی نہیں بھڑکی تھی۔
”اب دکھ تو رہی ہوں۔“

”غاشیہ پلینز۔ ایک بار ٹھنڈے دل سے غور کرو تو تمہیں احساس ہوگا کہ وہاں تم بن نہیں سکتا۔ وہ مر جائے گا۔“
”مگر میں اس کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ میں نہیں مروں گی۔“
”مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔“

”ایسے شخص کا کیا اعتبار۔ اچھا ہے اس کا اصل چہرہ مجھے نظر آ گیا اور یوں بھی عفریہ امیر مجھے پتا چل گیا ہے کہ اس کا معیار کیا ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو لڑکیوں کی محفل میں خوش رہتی ہے۔ لڑکوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے اس کے کردار کی کیا ضمانت دے سکتا ہے کوئی۔“

”غاشیہ۔“ عفریہ گرجی۔ اس کی روح سلگ کر رہ گئی تھی۔ ”تم۔ تم میرے کردار پر ایک لفظ نہیں کہہ سکتیں۔ مجھے پتا ہے میرا کردار کیا ہے؟۔ آئی سمجھو تم ان لوگوں میں سے ہو جو شے کے گھر میں بیٹھے کرنگباری کرتے رہتے ہیں مگر اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے۔ تم۔ سنو۔ غور سے سنو تم جیسی لڑکی جس کی رگ رگ میں شک دوڑ رہا ہے۔ وہ وہاں جیسے نرم خود بین و فطین شخص کی ہمسری کے قابل ہی نہیں۔ اصل میں تمہیں اپنی اوقات پتا چل گئی ہے۔ احساس ہو گیا ہے کہ کہاں وہاں جیسا آسمان اور کہاں تم دھرتی پر رہنے والی معمولی سے لڑکی۔“ عفریہ نے کھٹ سے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور غاشیہ کے اندر جو بے تحاشا گالیوں کا طوفان اٹھا وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

اس کے وجود میں بھانپنا جل اٹھے تھے۔ امیر پیش میں سے آتی ٹوٹوں ٹوٹوں کی آواز اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس پر فٹ رہا ہو۔ اس نے غصے سے ریہیور کر پڈل پر پٹچا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔
اس کے ذہن میں بار بار عفریہ کی آواز رقص کر رہی تھی۔
”تم وہاں جیسے شخص کی ہمسری کے قابل ہی نہیں ہو۔“

”تمہیں اپنی اوقات پتا چل گئی ہے۔“
”وہاں آسمان اور کہاں تم۔ دھرتی پر رہنے والی معمولی لڑکی۔“
میں۔ میں معمولی لڑکی۔

یعنی غاشیہ کمال الدین۔ اور معمولی لڑکی۔

”آف۔“ غاشیہ نے کمرے میں ٹھہلتے ہوئے غصے سے اپنے ہاتھ پر منکا مارا۔

تم ہو کیا عفریہ امیر۔ تمہاری حیثیت کیا ہے؟ تم مجھ سے کہو کہ میں معمولی لڑکی ہوں۔

میرا دو جنگ فیکٹریز اور کاؤنٹن فیکٹری میں حصہ ہے۔ ٹریولنگ ایجنسی میرے نام ہے۔ لاکھوں کا بینک بیلنس ہے میرے نام اور تم مجھے معمولی لڑکی کہہ رہی ہو۔ معمولی لڑکی کا پتھر تم نے میرے دل پر مارا ہے۔

اس کے سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا جائے اور عفریہ امیر کے منہ سے زبان کھینچ لے کہ اس نے ایسی بات کی ہی کیوں؟۔

غاشیہ کے اعصاب پر چیونٹیاں سی ریگ رہی تھیں۔ اور اس کا خون شیریا نوں میں ابل رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ اسی وقت منادی کرا دے کہ ہر حال میں عفریہ جیسی بد زبان لڑکی کو اس کے

ماننے پیش کر دیا جائے اور پھر وہ عفریہ کے چہرے پر۔۔۔۔۔ اتنے تھپڑ برسائے کہ اس کی شکل ہی مسخ کر دے۔

ایسی ہمت اور حوصلہ بھلا کب اور کس میں تھا کہ اسے کچھ کہہ سکتا۔ اور ایسے الفاظ۔ رہ رہ کر وہ سلگ رہی تھی۔ دل کی عجیب کیفیت تھی۔

اسے کسی کل بھی چین نہ آ رہا تھا۔ دل میں غصے کا طوفان ابل ابل کر اٹھ رہا تھا۔ وہ بہر صورت عفریہ کو اس کی زبان درازی کی سزا دینا چاہتی تھی۔ تاکہ دل کی آگ پر ٹھنڈے چھینٹے پڑتے۔ کتنے ہی بل بیت گئے تھے۔ مگر اس کے غصے میں مٹی نہ آئی تھی۔ بھی بایک رُکنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے درتچے کے پاس آئی اور پردہ ہٹا کر دیکھا وہاں بایک لاک کر رہا تھا۔ بے ساختہ ہی حسب عادت اس کی نظریں غاشیہ کے کمرے کی طرف اٹھی تھیں اور درتچے کا پردہ ہٹا دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔
”تو تمہاری جگہ ختم ہو گئی ہے۔“

وہاں کا سمجھا سمجھا سداں ایک دم ہی کھل اٹھا۔ وہ ایک ہی جست میں ورائڈے کی سیڑھیاں عبور کر کے اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

”ہوں۔“ غاشیہ بیگم تمہیں یقین آ گیا کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ تین روز ہی میں ہتھیار ڈال دیے۔ میں بھی اب تمہیں اتنا ہی سناؤں گا جس قدر تم نے مجھے ستایا ہے۔ نرپاؤں گا اور پھر۔“
نصو رہی نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ وہ کپڑے اٹھا کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔
گنگنائے ہوئے اس نے غسل کیا۔ اور جب وہ تویسے سے گیلے بال گرڑتے ہوئے ہاتھ روم سے نکلا تو اس کے کمرے میں غاشیہ موجود تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی۔ وہ اس نظر انداز کرتا ہوا قد آور آئینے کی طرف بڑھا اور گیلے بالوں میں برش کرنے لگا۔

غاشیہ اس کے انداز پر سلگ کر رہ گئی۔
”وہاں۔“ غاشیہ کے لہجے میں آگ کی تپش تھی۔ اس نے مڑے بغیر آئینے میں اپنے پیچھے کھڑی غاشیہ کو دیکھا۔ اس کے تورا پتھے نہیں لگ رہے تھے۔
”آخر یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”مطلب بھی میں ہی بتاؤں۔ تم نے۔ تم نے عفریہ امیر کو ٹالٹ بنا نا چاہا ہے نا تو سنو وہاں احمد مجھے تم سے نفرت ہے۔ اتنی شدید کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آئی ہیٹ یو وہاں احمد۔“

”کہنا کیا چاہتی ہو؟“ وہاں نے ایک دم پلیٹ کر غاشیہ کو دیکھا۔ وہ بھی اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”مجھے۔ مجھے وہ کہتی ہے میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔“ غاشیہ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھی اور وہاں احمد کا گریبان پکڑ لیا۔ جو پانی کی وجہ سے گیلا ہو رہا تھا۔

”سنو۔ اسے بتا دو کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔“ وہاں تو ٹپٹا کر ہی رہ گیا تھا۔

بتا دو اسے کہ گلے گلے کی لڑکیوں کے پیچھے پھرنے والا وہاں۔ غاشیہ کے قابل نہیں۔ وہاں غلاطت پسند کرتا ہے اور وہ میری پسند نہیں ہو سکتا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں غاشی۔ شک کی پی آنکھوں سے اتار کر دیکھو تو تجھے پتا چلے کہ تو غلطی پر ہے۔“ وہاں نے اپنے گریبان پر رکھے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا اور غاشیہ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا

”تو سمجھ لے غاشی۔ تجھے پتا نہیں تو میرے لیے کیا ہے۔ محبت تو انسان کو آسودہ کرتی ہے تو مجھے دکھی کرنے پر تلتی ہوئی ہے۔ دیکھ غاشی میں کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھا تو تو روتی پھرے گی۔“

”ہونہ۔“ غاشی استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ ”روئے گی وہ جس کو تم بلیے لیے پھرتے ہو۔“

”تو غلط نہ سمجھ۔ بعض مرتبہ جو سمجھا جاتا ہے وہ نہیں ہوتا۔“

”گلتا ہے جب اس نے فون کیا تم اس کے پاس ہی بیٹھے تھے۔“ وہ بولی۔

”بخدا مجھے تو پتا بھی نہیں کہ اس نے کب تمہیں فون کیا میں نے تو۔“ کہتے کہتے وہاں ہونٹ بھیج لیے۔

اب بھلا وہ کس طرح کہہ دیتا کہ اس نے تو عفریہ کو منع کیا تھا کہ وہ غاشیہ سے کوئی بات نہ کرے اور وہ مخلص لڑکی کوکلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے کر بیٹھی تھی۔ وہاں کو احساس تھا کہ غاشیہ نے گتے زہر لیے انداز میں اس سے بات کی ہوگی کس طرح اس نازک لڑکی کا شیشہ دل چور چور کیا ہوگا۔ کیسے لفظوں کی اس پر سنگباری کی ہوگی۔ وہاں کا نرم دل عفریہ کے لیے ترپنے لگا اور وہ اپنا غم بھول گیا۔

”تم موجود تھے نا اس کے پاس؟“ غاشیہ پوچھ رہی تھی۔ کیا جا رہا تھا انداز تھا۔

”نہیں۔“ وہاں نے جھٹکے سے اس کے ہاتھوں سے اپنا گریبان چھڑایا۔ ”مگر میں یہ جانتا ہوں کہ تم نے عفریہ سے کس طرح بات کی ہوگی کیسے اسے الزامات اس لڑکی پر لگائے ہوں گے۔ تمہیں حق نہیں پہنچتا اس سچی کھری اور شریف لڑکی کے کردار پر حملہ کرنے کا۔“

”اور اس نے جو مجھے کہا وہ۔“ غاشیہ نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے یقین ہے کہ جب اس کے صبر کا پیمانہ چھٹک گیا ہوگا۔ تب ہی اس نے کوئی بات کہی ہوگی۔ غاشیہ بیگم میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”کیا بہت قریب سے؟“ وہ پھٹکاری۔

”پلیز۔ مت لفظوں سے اس کے کردار کو آلودہ کر کے گناہگار ہو۔“ وہاں نے اسے ٹوکا۔

غاشیہ کا عفریہ پر الزام لگانا ناجائز کیوں نہ لگا تھا۔

”بہت زور کا دل میں درد اٹھا ہے۔“ غاشیہ بھوکی شیرینی کی طرح بولی۔

”کیا ہو تم غاشیہ؟“ وہاں بے بس سا لگ رہا تھا۔ ”میں مانتا ہوں جس دل میں محبت رہتی ہے وہاں خدشے بھی چور دروازے سے ناگوں کی طرح سرسراتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ پر اتنا شک غاشیہ اتنی بڑی سزا۔ ہم دونوں تو ایک دوسرے کے دل میں بستے ہیں۔ میں نے تو تمہیں چاہ کر ہونہ ڈھیر سارے خواب بھی آنکھوں میں سجالیے تھے اور تمہارے رویے نے اُن خوابوں کے چمن بڑ آگ لگا دی ہے۔ اس طرح تو نہیں کرتے۔“

”میں اپنی مرضی کی مختار ہوں وہاں احمد۔ میں عفریہ امیر نہیں کہ خوبصورت لفظوں کے لچھور سے بہک جاؤں۔ اسے بتا دینا کہ وہ جو کھیل کھیلتا جانتی ہے میری غیر موجودگی میں تو کھیل سکتی ہے۔ میرے سامنے نہیں اسی لیے میں نے راہ بدل دی ہے۔“ غاشیہ کا لہجہ نہایت نزو تھا اور روکھا تھا۔

”میرے زکی نہیں اور نفرت انگیز نظر ڈالتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اور وہاں اسے روک بھی نہ سکا۔ کوئی اختیار نہ رہ گیا تھا۔

”تو یہ طے ہوا ہے غاشیہ بیگم کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے تمہارے دل سے یہ شک کہ پھانس نہیں نکل سکتی اور نہ ہی اب میں کوشش کروں گا۔ شاید یہی ہمارے نصیب میں رقم تھا۔“ وہاں بیڈ پر ڈھ گیا اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ اس کا ذہن سچ رہا تھا۔

اور۔۔۔ او بے وقوف لڑکی، تجھے کیا ضرورت تھی غاشیہ سے بات کرنے کی۔ کروالی اپنی ”عزت“

دے دی اپنے کردار کی صفائی۔ اُلٹے چھینٹے ہی پڑے۔ کیا ہا بھلا۔

بڑا دعویٰ تھا نا کہ تم غاشیہ کو منا لوگی۔

تمہیں کیا پتا کہ یہ سونے کا چچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے لوگ کیا ہوتے ہیں۔ انتہائی کمینے اور بعض اپنی منوالے والے۔

ان کے دل کی جگہ پتھر رکھا ہوتا ہے۔ یہ کب اوروں کے دکھ درد کو محسوس کر سکتے ہیں۔ انہیں کوئی خبر نہیں ہوتی۔

کوئی ٹھل ہو جائے انہیں دکھ نہیں ہوتا۔

اور خود کو ذرا سی سوئی چھہ جائے تو واویلا مچا دیتے ہیں۔

میں سب سہ لوں گا مگر عفریہ میں کبھی یہ برداشت نہ کروں گا کہ میری وجہ سے کوئی تمہارے سر سے چادر اُتارے۔

تمہارے کردار کو لفظوں ہی کی حد تک آلودہ کرے۔

تمہیں برا بھلا کہے۔ چاہے وہ کتنی ہی میری عزیز ترین ہستی ہو۔ میں نہیں چاہوں گا کہ وہ تم پر سارے جہان کی کٹافٹیں اٹھائے۔ کہ کچھ بھی ہے مجھے تمہاری سچائیوں سے پیار ہے۔ تمہارے وہ دکھ جن سے تم نے مجھے آشنا نہیں کیا وہ گوئے دکھ جو تمہاری آنکھوں میں میں بار بار پڑھ چکا ہوں غمو۔ مجھے تو وہ بھی پیارے ہیں۔ تم جتنی مضبوطی سے اس دنیا میں زمین پر قدم جما کر کھڑی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو کب کی اپنی شناخت ہی گنوا چلی ہوتی۔ رب پاک تمہیں ڈھیر ساری خوشیاں دے۔ اس وقت اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا عفریہ کے پاس چلا جائے۔ مگر وہ نکلیوں میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ دکھ کا انجانا سا احساس اس کا دل جیرتا چلا گیا۔

☆☆☆

اُف اتنی بے عزتی۔

اتنی تضحیک۔

غاشیہ جمال۔ تم نے۔ تم نے عفریہ امیر جیسی منفرد لڑکی کو بے عزت کر دیا۔ لفظوں کے پتھروں سے اس کے وجود کو زیرہ زیرہ کر دیا۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہاں کی بلند استے چھوٹے ذہن کی ہوگی۔ اس کا لہجہ تلوار کی مانند ہوگا۔

اسے بات کرنے کی تمیز بھی نہ ہوگی۔

کیا بڑے گھروں میں رہنے والوں کے دل اتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔

تمہیں کیا پتا تھا غاشیہ جمال۔ میں بھی عزت رکھتی ہو۔ میری بھی عزت نفس ہے جسے تم نے اپنی آلودہ ذہنیت سے داغ داغ کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں تم جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی ہو۔

غاشیہ کا یہ جملہ عفرہ امیر کے ذہن کے برتن میں سکے کی مانند بج رہا تھا۔
اس کے رگ رگ میں انگارے سنگ رہے تھے۔

انجانے سے ڈکھ کی ایک تیز لہر بار بار اس کے پورے وجود کو آری کی طرح رگیدتی ہوئی پڑ رہی تھی۔

تم نے مجھ پر رسوائیوں کی گرد ڈال دی ہے غاشیہ کمال۔ مگر میں اتنا حوصلہ رکھتی ہوں کہ اگر کو جھاڑ لوں۔ بتا دوں گی میں تمہیں کہ میں کیا ہوں۔

عفرہ نے اپنا چنچا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ عجب کی تھی جو اس کے اندر جاری ہو چکی تھی۔ اپنے اندر کی لڑائی کی ”وجہ“ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ کھم کیوں ہے؟

کس لیے ہے؟

اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ حلق میں کانٹے سے اک آئے تھے جیسے صحرا میں آبلہ پا چلتے ہوئے کی شدت سے حلق خشک ہو جائے۔ بالکل خشک دھرتی کی طرح جو خود بھی دو بوندوں کی پیاس کی پیاس کی شدت ہی تو تھی جس کا احساس اس کے پورے وجود کو ہو رہا تھا۔ ضبط کے مارے وہ با ہونٹ چل رہی تھی۔

”بھئی عفرہ۔ وہ فنی والا آرٹیکل کتابت ہو کر آ گیا ہے؟“ حلیمی صاحب بغل میں پرے کا پیاں دبائے ایک ہاتھ سے چشمہ درست کرتے ہوئے اس کی میز کے قریب آ کر پوچھ رہے تھے ”مجھے نہیں پتا۔“ وہ نزدیک لہجے میں بولی۔

”بھئی پتا رکھا کرو۔“

”میں نے ٹھیک نہیں لے رکھا۔“ وہ ترخ سے بولی۔

”یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔“ حلیمی صاحب نے اسے اپنے مخصوص لہجے میں سمجھایا۔

”ذمہ داری۔ میں تنخواہ دار ملازم نہیں ہوں بس۔“

”کیا ہوا بھئی؟ بہت غصے میں ہو چکا ہے؟“ فلک ”تو تمہارا اپنا پرچہ ہے۔ یہ تم ہی ہے۔ ورنہ ٹھپ تھا۔“ حلیمی صاحب نے عینک کی اوٹ سے اسے دیکھا۔ جس کے چہرے پر غصے

سُرخی تھی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت تھی جسے حلیمی صاحب کوئی نام نہ دے سکتے تھے محسوس کر رہے تھے کہ کوئی بات آج ضرور عفرہ کے مزاج کے خلاف ہو گئی ہے۔ جس نے اس

اندر جنگ جاری کر دی ہے اور اس جنگ کے ”آثار“ عفرہ کے چہرے سے صاف محسوس کئے جا

تھے

”دروازہ بند کر کے خوب رولو۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“ عفرہ لمبی لمبی طرح غرائی۔

”تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ دل پر پڑی سل پگھل جائے۔“

”میں۔ بزدل نہیں ہوں حلیمی صاحب۔ میں رونا نہیں لانا جانتی ہوں۔ اور۔ اور۔“ نے ہونٹ پیچھنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کی چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔

”میں بہادر ہوں۔ بہت بہادر۔“ لفظ مالا کے دانوں کی طرح گھر گئے۔

”کیا بہادر لوگوں کے دل نہیں ہوتے عفرہ امیر؟ ہوتے ہیں دل ان کے بلکہ عام لوگوں

زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا دکھ درد محسوس کرنے والے۔ اپنے سے زیادہ دوسروں کے دکھوں پر رونے والے۔“ حلیمی صاحب بولے۔

”اور پھر دکھی ہونے والے۔“ عفرہ نے آہستہ سے کہا۔

”بالکل۔ یہی تو حساس لوگوں کا المیہ ہے۔ اور حساس جو ہوتا ہے وہی بہادر ہوتا ہے کہ اسے کی کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ بے خطر بحر آتش میں کود پڑتا ہے یہ حساسیت اور بہادری کی بہت ہی اعلیٰ قسم ہے۔ انتہا ہے بہادری کی یہ تو، کیوں دکھی ہوتی؟“ حلیمی صاحب نے اتنے پیارے سے پوچھا کہ بے

انتہائی ہی عفرہ کی آنکھوں کے گوشے بھگ گئے۔ مگر اس نے کیاں ضبط سے آنسوؤں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خشک کیا کہ ایک بوند بھی پلکوں کی باڑھ نہ پھلانگ سکی تھی۔ وہ حلیمی صاحب کے سامنے رونا نہ چاہتی تھی۔ بلکہ اس نے تو آج تک کسی کے سامنے آنسو نہ بہائے تھے۔ اس کی سسکیوں کو اس کے

کمرے کی دیواریں اپنے اندر جذب کر لیتی تھیں اور چپکے چپکے جو آنسو نکلتے، وہ سسکیوں میں بنا آہٹ کے ردپوش ہو جاتے۔ اور جب صبح ہوتی تو اس کا چنچا ہوا خول پھر بڑ جاتا۔ اور وہ وہی خطی سی بولڈ اور

پڑ پڑ بولنے والی بد تمیزی عفرہ جیسے آصف کا بوجھ کو ستا کر مزا آتا تھا۔

جوز بردستی وہاں احمد کی جیب سے پیسے نکلاتی تھی۔ ضد کر کے اسے کتنی مجھے فلاں جگہ چھوڑ آؤ۔ اور وہ بھی بلا چوں چرا اس کی بات مان لیتا تھا۔ یہی تو وجہ تھی کہ آج وہ خود بھی تھا تو عفرہ بھی اس کے

دکھ پر ڈکھی ہوئی تھی۔ غاشیہ کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کی تھی مگر غاشیہ نے تو اس کے وجود میں کانٹے چھب دئے تھے۔ اور یہی چھبین اسے کسی کل چین نہ لینے دے رہی تھی۔

”چائے پیو گی؟“ حلیمی صاحب نے اسے خاموشی سے انگلیاں چمکاتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

وہ کئی بے قرار اور مضطرب تھی۔

جیسے لوگ محبت کرتے ہیں تو انہیں کسی پل بھی چین نہیں آتا۔

تئیں عفرہ بھی تو۔

حلیمی صاحب کے ذہن میں بلب سا روشن ہوا۔ تب وہ اس کے راز داں بننے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

”محبت کر رہی ہو۔؟“

”واٹ؟“ عفرہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کوئی حرج نہیں۔ اس کائنات کی بنیاد ہی محبت پر رکھی گئی ہے۔ چاہتا اور چاہے جانا کوئی جرم نہیں۔ پھر تم پریشان کیوں ہو؟ ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ۔“

”آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ عفرہ نے میز پر مٹکا مار کر غصے سے کہا۔ اس کا چہرہ

ٹہننے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

”بھئی غصے کیوں ہوتی ہو۔ میں سی کو نہیں بتاؤں گا۔“ وہ راز داری سے بولے۔

”اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں آپ مگر عقل نام کو نہیں ہے۔“ عفرہ ان کے انداز پر مسکرائی۔

”مجھے تو بوڑھا کہہ رہی ہوں؟“ وہ مصنوعی چٹکی سے بولے۔

”سچ کو تسلیم کریں۔“ عفرہ نے کہا۔

”تو تم بھی تسلیم کرو۔“ حلیمی صاحب بولے۔

”حلیمی صاحب بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ عفرہ نے پیپر ویٹ میز پر گھاس

ہوئے کہا۔

”پھر جو جگہ ہے وہ بتاؤ۔“ وہ جاننا چاہتے تھے۔ ”محبت کر رہی ہونا؟“

”محبت۔“ عفریہ کے لب ہلے۔ ”یقیناً بہت ہی اچھا جذبہ ہے۔ بے حد ملوک اور پالا خود کو محبت کرنے کے قابل نہیں سمجھتی۔ پھر دیکھیں نا محبت کرنے کی عمر ہی کب ہے؟“ وہ منہ ”ارے محبت کے لیے بھی بھلا عمر کی قید ہے۔“ حلیمی صاحب نے کہا۔

”بالکل۔“ عفریہ زور دے کر بولی۔

”نہیں۔“ حلیمی صاحب نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سمجھتا ہوں جذبہ محتاج نہیں ہوتے۔ بھئی بندہ بوڑھا ہو سکتا ہے مگر اس کے لاغر وجود میں دھڑکتا دل ہمیشہ ہے۔ پھر تمہاری اس دلیل کو میں مسترد کرتا ہوں کہ محبت کرنے کے لیے عمر کی قید ہے۔ بھئی ہر دور میں محبت کر سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اپنی عمر کے ساتھ ساتھ ہمارے شعور کی عمر بھی بڑھتی پسند کا معیار بھی بڑھتا بلکہ بدلتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ محبت کے لیے عمر کی قید نہیں۔ بلکہ محبت ہی اصل محبت ہے۔ جب انسان ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ کئی بار اچھائی برائی کا اور پھر۔“

”مگر ظلمت میں گود پڑتا ہے۔“ عفریہ نے ہنس کر ان کا جملہ اُچک لیا۔

”ہاں۔“ تم بھی سوچنے کے عمل سے گزر رہی ہو۔“ وہ یقین سے بولے۔

”سر۔ یہ بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ اور پرائلجز ہیں۔ پھر ایسے مسئلے بہت سے ہوتے جو بتائے نہیں جاسکتے۔ یوں بھی میں اپنے مسائل کو دخل کرنے کی عادی ہوں۔ کبھی کسی کے نہیں چلتی۔“

”بتا ہے مجھے۔ مگر کبھی کبھی انسان کو مشورے کی ضرورت ضرور پڑتی ہے۔“

”وہ کوئی اور ہوتے ہوں گے۔ میں نہیں۔“ عفریہ نہایت اعتماد سے بولی۔

”ایک تو تمہاری حد سے زیادہ خود اعتمادی بہت پریشان کرتی ہے۔“ حلیمی صاحب ہنسنے لگے۔

”آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“

”تم سچائی کا اعتراف کرو۔“

”سر۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ محبت کا تو کوئی غم ہی نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم ہے جبکہ حقیقت بھی یہی ہے۔ بھلا محبت بھی کوئی کرنے کی چیز ہے جو ذرا سی شک کی چنگاری ہو جائے۔“

”اس نے تم پر شک کیا ہے؟“ حلیمی صاحب نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ عفریہ ہنسنے لگی۔ ”میں کسی اور کی بات کر رہی ہوں۔ سر وہ دوا دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔ سر بس غلط فہمی کی آگ میں لڑکی جھلس رہی ہے۔ مجھے بتائیں۔“

”سمجھایا جائے؟“

”تمہاری وجہ سے شک میں مبتلا ہے۔“ وہ یقین سے بولے۔

”جی۔“ عفریہ نے سر جھکا لیا۔ وہ جھوٹ نہ بول سکی تھی۔

”تم وہی ایسی کہ لوگ خواہ مخواہ شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔“

”سر میں نے وضاحت بھی کی۔“ عفریہ نے کہنا چاہا تو وہ چیخ پڑے۔

”کیوں گریں تم اپنی سطح سے؟“

”سر۔“ عفریہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”کوئی ضرورت نہیں تم جیسی لڑکی کو وضاحتوں کی۔ تم بہت اونچی ہو عفریہ امیر۔ زمین پر رہنے والا کیوں کی طرف دیکھنا نہ صرف تمہاری تو بین ہے بلکہ تمہارے آورش کی بھی ذلت ہے۔ حلیمی رہے لڑکی شک کی آگ میں۔ تم اپنے آپ میں مست رہو۔ کس کس سے وضاحتیں کرو گی۔ زندگی میں کس سے کسے مقام آتے ہیں اور تمہیں یہ جھیلنے ہیں۔“

”جھیل تو رہی ہوں۔“ عفریہ ہنس کر لگی۔

”تم ہارڈ اسٹون ہو عفریہ۔ تم ہیرا ہو۔ ٹوٹنا نہیں چاہیے تمہیں۔ تم توڑ دو دوسروں کو۔“ حلیمی اب بولے۔ پھر وہ کتنی ہی دیر تک اسے حوصلے دیتے رہے۔ اسے سمجھاتے رہے کہ وہ کتنی منفرد لڑکی ہے۔ انہوں نے بانی کچھ بھی نہ پوچھا تھا۔ یہی بات تو ان میں اچھی تھی کہ وہ عفریہ کی ذاتیات میں لاندہ دیتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک عفریہ امیر اس دکھ کی دلدل سے نہ نکل سکی تھی۔ جو اس کو جو کدو برے کی طرح چیر رہا تھا۔

غاشیہ کمال کالب دلچسپ اس کی سماعتوں میں سویوں کی طرح چھو رہا تھا۔ کاش غاشیہ کمال وہ سب اہمات جو تم نے کہا ہے تو میں اس طرح درد کے سمندر میں تونہ اترتی۔

انسان کوئی جرم نہ کرے اور اسے اس جرم کی سزا دیدی جائے تو دکھ رنج رگ میں اتر جاتا۔ کاش میرا جرم ہوتا۔ وہاں احمد کو چاہنا تو میں بھی بھی تم۔۔۔۔۔

میں نے تو بھی بھی اس کے بارے میں اس زاویے سے نہیں سوچا۔

”غاشیہ کمال۔ میری آنکھیں گواہ ہیں۔ انہوں نے کبھی وہاں احمد کے خواب نہیں دیکھے۔ بے دل کی دھڑکنوں نے اس کا نام کبھی نہیں الاپا۔ تمہیں کیا پتا غاشیہ کمال کہ عفریہ امیر کیا تھی بالکل کی ہے۔

اپنی ذات کے حوالے سے تو اس نے خواب دیکھنے ہی عرصہ ہوا چھوڑ دیے تھے۔

میرے خوابوں کی دنیا تو بالکل محدود ہے۔

میرے خواب۔ ہاں صرف یہ کہ میرا ماما کب رہا ہوگا اور کب میں اس کے ساتھ اپنے گاؤں لگاؤں۔ اپنی ماں کی نرم گرم آغوش میں جانے کے خواب دیکھتی ہوں جس سے میں سوائیں برس غمگین ہوں اور تم نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں غاشیہ۔ عفریہ نے منہ بیاں بند کر کے آنکھیں رگڑیں اور پھر اپنے مضامین دیکھنے لگی۔

☆☆☆

حسب سابق وہ لیکچر روم میں لیٹ داخل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر شفقت کی کلاس ہو رہی تھی۔ جب اس میں داخل ہوئی تو ایک دم ہی سب کی نظریں اس پر اٹھیں۔

اس کی نظریں بے ساختہ ہی وہاں کی مخصوص سیٹ پر جا پڑیں۔ جہاں وہاں بیٹھا اسے عجیب ال سے محسوس ہوا تھا۔ پھر وہ ایک دم ہی سر جھکا کر لیکچر نوٹ کرنے لگا تھا۔

عفریہ کو لگا جیسے ایک دم ڈھیر ساری میٹھیں اس کے اندر گاڑ دی گئی ہوں۔ وہ بالوں میں

”وہاج۔ تم۔ تم۔“ عفریہ واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔ تب وہاج بات بدلتے ہوئے بولا۔
 ”مجھے افسوس ہے عفو کہ غاشیہ نے تم سے غلط بات کی۔“ وہاج اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔
 ”کیا مطلب؟“ کیسی بات؟“
 ”مجھے پتا ہے اس نے تمہیں کیا کچھ کہا ہوگا؟ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ تم اس سے بات نہیں کرو گی۔ مگر تم نے میری نہیں مانی۔ تمہیں پتا نہیں وہ کتنے تکبر کی ماری لڑکی ہے۔“ وہ وضاحت کر رہا تھا۔
 ”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا بات کی ہے میں نے غاشیہ سے۔“ عفریہ نے اپنے ہاتھوں کے لیے ناخنوں پر نظریں جما کر پوچھا۔
 ”تم نے عفریہ۔ تم نے غاشیہ سے اپنے اور میرے تعلق کے بارے میں کوئی بات نہیں کی اسے نہیں کہا کہ اسے ہمیں ساتھ دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے؟“ وہاج اس کے جھکے سر پر نظریں جما کر بولا۔
 ”مجھے کیا ضرورت تھی وضاحت کرنے کی؟ تم کم تھے۔“ عفریہ کا سر بدستور جھکا ہوا تھا۔ وہ بھلا کیسے سراٹھا کر جھوٹ بول سکتی تھی۔
 ”عفو۔ میری طرف دیکھ کر کہو۔“ وہاج نے کہا۔
 ”کیا؟“ وہ بیگ سے خواہ مخواہ کچھ تلاش کرنے لگی۔
 ”یہی کہ تم نے غاشیہ سے کچھ نہیں کہا۔“
 ”میں نے کچھ نہیں کہا اسے۔“ عفریہ نے اپنا جھکا ہوا سراٹھا کر وہاج کی جانب دیکھا مگر لہجے کی لغزش کو وہ نہ چھپا سکی تھی۔
 اس کی آواز کی کپکپاہٹ وہاج نے صاف محسوس کی تھی۔ تب ہی تو وہ مسکرا کر بولا۔
 ”جھوٹ کا سلسلہ نہ ہو تو بولنا نہیں چاہیے۔“
 ”ہیں۔ میں۔“ عفریہ کے لفظ اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔
 ”پلیز عفو، تم سچائیوں کے خمیر سے گندھی ہوئی ہو۔ جھوٹ بول کر اپنی حیثیت نہ گنواؤ۔ ایک بار تم نے جھوٹ بولا پھر تمہیں عادت پڑ جائے گی۔ سچائیوں کا علم بلند رکھو عفو۔ تمہاری سچائیاں ہی تمہاری پہچان ہیں۔ جھوٹ سے اپنی پہچان کو آلودہ نہ کرو۔“
 ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“
 ”تم جھوٹ بول رہی ہو، تمہیں سب کچھ سمجھ آ گیا ہے۔“
 ”تمہارے پاس کیا پیمانہ ہے جھوٹ سچ کو ناپنے کا۔“ عفریہ نے خود کو سنجال لیا تھا۔
 ”پیمانہ۔“ وہاج نے طویل سانس لی۔ ”تم چھپانا چاہو چھپا لو۔ مگر سنو عفریہ۔ امیر۔ جب کوئی لڑکی جھوٹ بولتی ہے تو وہ اسے مقابل سے نظر ملا کر بات نہیں کرتی بلکہ اس کی نظریں اپنے مقابل کے کندھوں اور سر سے اوپر نکلتی چلی جاتی ہیں۔“
 ”یہ ہے پیمانہ؟“ عفریہ مسکرائی۔
 ”یہ بات میں نے کہیں پڑھی تھی اور مجھے اچھی لگی یاد رہے گی تھی تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تم جھوٹ بول کر اپنی قدر کم نہ کرو۔“
 ”میری قدر تمہارے دل میں ہے؟“ عفریہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
 ”بہت۔ بہت زیادہ عفو۔ میں نے تم جیسی بولند اور سچی لڑکی نہیں دیکھی۔ تو اپنے کردار کی وجہ

انگلیاں پھیرتے ہوئے پچھلی نشستوں کی طرف بڑھ گئی۔ بیگ سے اس نے نوٹ نکالے اور نظر تھا بلکہ خالی خالی نظروں سے وہاج احمد کی پشت پر دیکھ رہی تھی۔ جس کے کافی کلم کے بال اس کے سفید کار پر ایک ترتیب سے نظر آ رہے تھے جوڑے شانے نمایاں تھے۔
 ڈاکٹر شفقت کی کلاس ختم ہوئی۔ وہ گاؤں پھڑ پھڑاتے ہوئے لیچر روم سے نکل پیریز فری تھا۔ پوری کلاس ہی خالی ہو گئی تھی۔ بس ”وہاج گروپ“ موجود تھا۔ اور اکیلا عفریہ فرحت اور زوہیب اس کے قریب آ گئے۔
 ”یہ کیا تینوں والی شکل بنائی ہوئی ہے۔“ فرحت نے عفریہ سے پوچھا۔
 ”کیوں اس مت کرو۔“ وہ ترخ کر بولی۔
 ”کیوں اداس ہو؟“ زوہیب نے محبت سے پوچھا۔
 ”یہ کب خوش رہتی ہے؟“ آصف کا نجو بھی وہاں آ گیا۔
 ”تم تو نہ ہی بات کیا کرو۔“ عفریہ نے آصف کو گھور کر دیکھا تو فرحت ہنس کر بوللا۔
 ”کیا بات ہے آصف کی بات تمہیں گولی بن کر لگتی ہے۔“
 ”بھئی بھائے کا سب کچھ بھائے اور نہ بھائے کا کچھ بھی نہ بھائے۔“ آصف ہنسا۔
 ”سے تمہاری لڑائی ہو گئی ہے؟“
 ”تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟“
 ”کاش میں کون ہوتا۔“ آصف سر آدھ بھر کر بولا۔
 ”وہاج کیا بات ہے تم وہیں کیوں بیٹھے ہو۔“ زوہیب نے ہانک لگائی۔
 ”میں لیچر مکمل کر رہا ہوں۔ کچھ جملے چھوٹ گئے ہیں۔“ وہاج ان کی طرف دیکھے اپنے یار بیٹھنے دوا نہیں ہم چلتے ہیں۔“ فرحت نے کہا۔ پھر وہ زوہیب اور آصف کے سے باہر جانے لگا تو آصف جانتے جاتے ایک دم پلٹا اور عفریہ کے قریب آ کر بولا۔
 ”جانا اتنی اداسی اچھی نہیں ہے۔ تمہیں منانے میرے علاوہ کوئی ہیر و نہ آئے گا۔“
 ”شٹ اپ آصف کا نجو۔“ عفریہ کی آواز لیچر روم میں گونجی۔
 وہاج نے ایک دم پلٹ کر دیکھا مگر آصف قہر آلود نظر عفریہ پر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ اپنی جگہ پر کھڑی یارے عفریہ کے کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں پر چنگاریاں نکل رہی تھیں۔
 ”کیا ہوا عفو؟“ وہاج اپنا سارا غصہ بھول کر اس کے قریب چلا آیا۔
 ”میں۔ میں آصف کا نجو کوئل کر دوں گی۔“ وہ منھیاں بھیجنے لگی۔
 ”کیوں؟“ وہاج حیرت سے پوچھ بیٹھا۔
 ”جو ہدیری وہاج احمد۔ وہ حد سے بڑھ رہا ہے۔“ عفریہ کی سانس تک قابو میں نہ تھی۔
 ”یہی بات تو تمہیں۔ تم اس کے جذبات کو اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ اپنے دل میں کیا مقام رکھتا ہے۔“
 ”ہاں۔ جو مقام اس کے دل میں میرا ہے نا مجھے آج پتا چل گیا ہے۔ میں اسے جاؤں گی۔“
 ”کیا بات ہے بڑی خونخوار ہو رہی ہو۔“ وہاج ہنسا۔

سے بھی مثالی ہو اور باتوں سے بھی۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ غاشیہ نے تم سے بدتمیزی کی۔
 ”شاید یہ اس کا حق تھا۔“ عفیرہ نے اب بھی اس کی برائی نہ کی تھی۔
 ”نہیں تھا اس کا کوئی بھی حق کہ وہ تمہیں کچھ کہتی۔ قصور اگر وہ میرا سمجھتی ہے تو مجھے لفظوں
 جوتے مارتی۔ تمہیں کیوں۔ اس نے کچھ کہا۔ عفو آئی ایم ریسی سوری۔ میں اس سے تمہاری بے عزتی
 بدلہ ضرور لوں گا عفو۔“ وہاج کا نرم دل معذرتوں پر معذرتیں کیے جا رہا تھا اور عفیرہ اپنی بیگم
 سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
 ”تم میری بے عزتی کر لو۔ مگر خدا کے واسطے یوں اپنے آپ کو مت گھلاؤ۔ نکالو خود کو کہ
 دلدل سے عفو۔ تمہاری شخصیت مسخ ہو جائے گی۔ بائی گاڈ عفو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میری بیوی
 بدلو۔“

”وہاج۔ مجھے شاید یہ افسوس رہے گا کہ میری وجہ سے تمہارا شیشہ دل کرچی کرچی ہوا۔
 وجہ سے غاشیہ نے تمہیں بے اعتبار ٹھہرایا اور سلسلہ توڑ لیا۔ بخدا میں چاہتی ہوں تم دونوں پھر پہلے
 ہو جاؤ۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے۔“
 ”تمہارا جذبہ سچا ہے عفو۔ شاید اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ غاشیہ کو میں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ میرا
 خیال تھا وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی مگر یہ میری بھول تھی۔ میں ہی بے وقوف بنا رہا۔ اب میں نے
 ہے کہ جس طرح لوگ زندہ رہتے ہیں اس طرح کے ڈھنگ میں بھی اپنالوں گا۔ یہاں جذبول کی
 نہیں۔ جھوٹ کا ماسک لگا کر بے شمار کامیابیاں حاصل کی جاسکتی ہیں اور اسی کا نام زندگی ہے شاید
 میں بھی زندگی کو اس کے انداز کے مطابق برتوں گا عفو اور یہ میرا فیصلہ سچ ہوگا۔“
 ”تم غاشیہ کے بغیر رہ لو گے؟“ عفیرہ نے مصہومیت سے پوچھا۔
 ”رہنا پڑے گا۔ جب وہ رہے گی تو میں کیوں نہ رہ سکوں گا۔ اس نے میری مرداگی کے
 طمانچہ مارا ہے۔ مجھ پر شک کر کے اس نے میری شرافت پر کچڑا اٹھالا ہے اور عفو اب میں حریفانہ
 کے ہاتھ میں اپنے جذبول کی ڈگڈگی نہیں دے سکتا۔“ وہاج احمد کے لہجے میں انجانا سا عزم جھلک
 تھا اور اس کے چہرے پر اتنی کڑکھلی تھی کہ عفیرہ حیران ہی تو رہ گئی۔

☆☆☆

چولستان کے صحراؤں میں اڑتی گرم ریت اور پھر لو کے پھیڑوں نے تو انہیں پکان ہی کر
 تھا۔ اتنی شدید گرمی۔ احمد ملک کا ایکڑ ایکٹو انجینئر مارک رابرٹ تو بار بار پسینے سے نہا جاتا۔ اس کی
 رنگت بالکل ٹائٹلی طرح سرخ ہو گئی تھی۔ اور وہ حیرت سے ان مزدوروں کو دیکھتا جو گرم ریتیلی مٹی
 رہے تھے۔

”یہ لوہے کے انسان ہیں شاید۔“ مارک رابرٹ نے بار بار سوچا۔
 ”یہ لوگ کیسے کام کر لیتے ہیں ملک۔“ رابرٹ نے احمد سے کہا۔ جو نقشے کو دیکھ رہا تھا۔ احمد
 سراٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”ترقی پذیر ممالک میں یہی غربت ہے سرجس نے ہمیں مغربی ممالک کا غلام بنا رکھا ہے
 احمد نے مسکرا کر کہا۔ اور بھی فضل دین ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔
 ”سائیں۔ اب کریں بند کر دوں؟“
 ”کیوں بھی؟“ احمد بولا۔

”وہ جی میں گھر جانا چاہتا ہوں۔“
 ”کس لیے؟“

”روٹی کھانے کے لیے۔“

”کھانا تیار ہو رہا ہے۔“

”سائیں میں اپنی بیوی کے ساتھ ہی کھانا کھانا ہوں۔“ فضل دین کے لہجے میں بیوی کی محبت
 بول رہی تھی۔

”بہت محبت ہے بیوی سے تمہیں؟“ احمد مزالیتے ہوئے بولا۔
 ”ہاں سائیں۔“ فضل دین کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ چالیس سال سے اوپر کی عمر تک کا
 تھا۔ مگر جو انوں کی طرح شرماتا تھا۔

ایک ہفتہ قبل ہی جب یہاں احمد کی ٹیم نے کام شروع کیا تھا تو بھرتی کے لیے مقامی لوگ ہی
 لیے تھے یوں بھی چولستان کے علاقوں میں روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے انہیں
 مزدوروں کی کوئی دقت نہ ہوئی تھی۔ فضل دین چونکہ موٹر چلانا جانتا تھا اس لیے احمد نے اس کا سٹ
 لینے کے بعد اسے کریں دے دی تھی جو زمین سے مٹی اکھاڑتی ہے۔ فضل دین بہت خوش اسلوبی سے
 کام نہا رہا تھا۔ البتہ دوپہر کو جب سب مزدور اکٹھے کھانا کھاتے بیٹھتے تو فضل دین چپکے سے غائب ہو
 جاتا۔ کہ گھر اس کا بالکل اس پراجیکٹ سے قریب ہی تو تھا۔

لیکن آج احمد نے کہہ دیا تھا کہ ہر صورت میں وہ ریت کے بٹے ہٹانے تھے۔ ابھی کام بہت
 زیادہ تھا۔ اس لیے فضل دین دوپہر کے کھانے کی اجازت لے کر چلا گیا۔

”کہاں گیا ہے یہ؟“ رابرٹ نے احمد سے انگریزی میں پوچھا۔

”کھانا کھانے۔ کہ بیوی کے ساتھ سچ کرے گا۔“

”اچھا۔“ رابرٹ مسکرایا۔ اس کے تصور میں وہ بھورے بالوں والی کرسٹینا آگئی تھی جو اس کی
 بیوی تھی لیکن ابھی ان دونوں نے سچ ساتھ نہ کیا تھا۔

”ہمارے ہاں کے مرد کی بہترین دوست اس کی بیوی ہوتی ہے اور جہاں میاں بیوی میں محبت
 ہو وہاں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہتا۔“ احمد کبھی ہی دیر تک رابرٹ کو مشرقی ازدواجی اقدار
 کے بارے میں بتاتا رہا اور رابرٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہلکتی چلی گئی۔

☆☆☆

”کیا سوچ رہی ہے عفی؟“ شیر محمد نے اپنے قریب بیٹھی عفیرہ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں ماما۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔

”آج تو خاموش کیوں ہے؟“ وہ جانتا چاہتا تھا۔

”نہیں تو۔“ عفیرہ مسکرائی۔

”کوئی بات تو ہے۔“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ماما۔“

”کسی نے کچھ کہہ دیا؟“ شیر محمد نے پوچھا۔

”کسی میں جرات ہے کہ وہ مجھے یعنی شیر محمد کی ہانچی کو کچھ کہے۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بظاہر
 شوخی سے بولی۔ مگر اس کی آنکھوں کی اداسی شیر محمد سے چھپی نہ رہ سکی۔ انسانوں میں رہ کر وہ انسانوں کو

پچانے کی صلاحیت سے محروم رہا تھا مگر نیل کی کوٹھڑی کی تنہائی میں رہ کر اب وہ لوگوں کو پہچانے لگا تھا۔ وہ دلوں کے راز بھی جان جاتا تھا۔

تنہائی میں اسے نئے نئے رازوں کا انکشاف ہوا تھا۔ کتنے ہی ادراک ملے تھے۔ تنہائی اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی تھی۔ وہ جوٹ سچ کی پہچان کرنے لگا تھا۔

عدالت میں جب گواہ لائے جاتے اور اس پر جرح ہوتی تھی تو وہ بس کٹہرے میں کھڑا مسکراتا رہتا۔

سردار سکندر خان لغاری اور فیروز حسین کا وکیل ہدایت اللہ بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے سے بحث کرتے۔

سکندر خان شیر محمد کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتا اور ہدایت اللہ کا خیال تھا شیر محمد کو مجرم کے تحت پر لٹک جانا چاہیے۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ایسا کرتا اور معاملہ صاف ہو چکا تھا۔ مگر مسئلہ تو شیر محمد کا تھا جو اب تک زبان نہیں کھول سکا تھا۔ کہ اس نے چوہدری مراد حسین کو قتل کیوں کیا ہے؟

بار بانجھ نے پوچھا تھا اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ”گناہوں کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور میں نے وہ اتار پھینکا ہے۔ میں نے قتل کیا ہے سزا ملی چاہیے مجھے۔“

شیر محمد نے سیدھا سا اعتراف کر لیا تھا۔ اس کے باوجود بھی سکندر خان لغاری اسے بچانا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے شیر محمد کے بارے میں عدالت میں سرٹیفیکیٹ دے دیا تھا کہ اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ یہی وہ اقرار جرم کر رہا ہے۔ ان دونوں ہدایت اللہ کو وکیل نے اس سرٹیفیکیٹ کو چیلنج کیا ہوا تھا۔ کہ یہ جعلی اور بوس ہے۔ اور سکندر خان لغاری اسے سچ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

”ماما۔“ عفریہ نے اسے دیوار کی طرف ہلکتے دیکھ کر پکارا۔

”ہوں۔“

”آپ سچ بتائیں نا؟“

”کیا بتاؤں؟“

”وہی سوال جو میں سو اتین سال ہے آپ سے کر رہی ہوں۔ مجھے اس کرب سے نکالیں ماما۔“

”دیکھو عفری۔ جورات مجھے قبر میں آتی ہے وہ تو آئے گی ہی۔ سکندر چاہے اپنے علم کا کتنا ہی زور

لگالے سچ پوچھو تو میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“

”نہیں ماما۔ آپ زندہ رہیں گے میری خاطر۔ میرے لیے ماما۔ میں اکیلی کیسے رہوں گی۔“

ترپ کر اس سے لپٹ گئی۔

”تو نے اکیلے رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔“ شیر محمد نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں ماما۔ نہیں مجھے کوئی ڈھنگ نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے رات کو جب میں اپنے اکیلے

کمرے میں بستر پر لیٹی ہوں تو ایک ہی خیال آتا ہے کہ آپ کب رہا ہوں گے۔ پھر میں آپ سے

سونے سے پہلے بہت ساری باتیں کیا کروں گی۔ ماما کب ہوگی رہائی۔ پتا ہے سردار سکندر خان

کے ہیں اگر آپ انہیں سچ سچ بتا دیں نا تو کوئی نہ کوئی نکتہ نکال لیں گے۔ کیس کا رخ موڑ دیں گے۔ لیکن

شرط یہ ہے آپ انہیں سچ بتا دیں۔ پتا ہے ابھی تو سارا کیس چوہدری کے حق میں جا رہا ہے۔ میری خاطر آپ کریں ماما بتائیں نا۔“

”کوئی اور بات کرو عفری۔ اچھی سی بات۔“ شیر محمد نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”ماما۔ مجھے تیز دھوپ چھینے لگی ہے۔“

”گھر لوٹ جاؤ۔“ شیر محمد نے مشورہ دیا۔

”آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی۔“ اس کے لہجے میں عزم اور استقامت تھی۔

”خدا نہیں کرتے عفری۔“

”پلیز ماما آپ مجھے گھر جانے کا مت کہیں اور یہ آپ کو سوجھی کیا؟“ عفریہ نے شیر محمد کی پُر

سوچ آنکھوں میں دیکھا۔

”تو لڑکی ذات ہے عفری اور لڑکیاں بہت ملوک ہوتی ہیں۔“

”میں لڑکی بن کر نہیں لڑکا بن کر رہ رہی ہوں ماما۔ پھر بس میری تعلیم ایک سال بعد مکمل ہو

جائے گی اور پھر فراغت ہی فراغت۔ آپ کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔ پتا ہے ماما پھر ارادہ ہے

لاہ کرنے کا۔“ عفریہ نے کہا۔

”پھر کیا ہوگا؟“ شیر محمد نے پوچھا۔

”آپ کا مقدمہ میں خود لڑوں گی۔“ عفریہ نے کہا تو شیر محمد ہنس دیا۔ عرصے بعد اس نے اپنے

ماما کو اس طرح ہنستے دیکھا تھا وہ دیکھے گی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ماما۔ ہنستے رہیں آپ۔ آپ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے آپ ہنسا کریں۔“ عفریہ

نے شیر محمد کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔ اور پتا نہیں کب کے رُکے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ

نکلے۔ وہ روتی رہی۔ اور شیر محمد اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ اس نے عفریہ کو رونے سے نہیں

روکا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ دل پر وہ بہت سا بوجھ لیے پھر رہی ہے۔ اچھا ہے آنسو بہا لے تاکہ وہ

بوجھ ہلکا ہو جائے۔ وہ بوجھ کیا تھا؟ اس کی خبر تو شیر محمد کو بھی نہ تھی۔ عفریہ کے آنسو اس کا جگر کاٹنے

لگے تو اس نے عفریہ کے اچھے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

☆☆☆

سو سویرے سویرے ہی گل فشاں جمال ابھی ایک سرساز سے فارغ ہونے کے بعد رانگ چیمز

برٹنی اپیل جوس کے ہلکے ہلکے سب لے رہی تھیں کہ زرفشاں آگئیں۔ بہن کو اتنی سویرے سامنے دیکھ

گردہ حیرت زدہ سی رہ گئیں۔

”ہائے گل۔“ زرفشاں نے ان کا گال ہلکے سے تھپتھپایا۔

”ہائے خیریت تو ہے زری۔ اتنی صبح صبح۔“ پتا نہیں کیوں گل فشاں کے دل میں دھڑک پڑ

ہونے لگی۔

”بھی حیرت زدہ کیوں ہو میرا آنا رانگا؟“ زرفشاں کرسی پر ٹنگ گئیں۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”کہاں ہے جمال؟“

”جمال سوئے ہوئے ہیں۔“

”آفس نہیں جائے۔“

”جائیں گے۔ ابھی تو بہت وقت ہے۔ ویسے بھی وہ رات ہی اسلام آباد سے لوٹے ہیں۔ اسمبلی کا اجلاس ختم ہوا تو فوراً آ گئے۔“

”بھئی یہ بیٹھے بٹھائے کیا الیکشن لڑ بیٹھے۔ سیاست انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ ویسے کوئی نئے کنٹریکٹ لیے ہیں جمال نے۔“ زرفشاں نے اپنی انگلیوں میں پہنی ڈائمنڈ کی انگوٹھیوں کو گھماتے ہوئے پوچھا۔

”جمال نے اسمبلی کی ممبر شپ کسی نئے کنٹریکٹ کے لیے تو نہیں لی زری۔ اور یوں بھی کیا گی ہے ہمیں۔ ویسے ہی جمال کے دوست بہت ہیں۔ ہمارا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے۔“

”بھئی ہر کام کا کوئی فائدہ تو ہونا چاہیے نا۔“

”جمال کی یہ سوچ نہیں ہے۔“ گل فشاں نے بتایا۔

”اس نے تو تیری سوچوں کو بھی رنگ آلودہ کر دیا ہے۔ تو گل ایسی تو نہیں تھی۔ کیا ہو گیا ہے تجھے بالکل پینڈو عورت جیسی تیری سوچ ہو کر رہ گئی ہے۔“

”یہ آپ کا خیال ہے ورنہ ایسی بات نہیں۔“ گل فشاں جمال مسکرا دیں۔

”تم اپنے آپ کو ضائع کر رہی ہو۔“

”بھئی کس طرح سمجھاؤں میں پہلے جیسی ہی ہوں۔ آپ بتائیں سویرے سویرے کیسے آ گئیں؟“ انہوں نے بات بدلتی۔

”منعم۔ آج ہی سنگا پور گیا ہے۔ میں اور عبداللہ اسے ایئر پورٹ چھوڑنے گئے تھے۔ واپسی پر میں نے عبداللہ سے کہا مجھے یہاں ڈراپ کر دیں۔“ زرفشاں نے صبح آنے کی وجہ بتائی۔

”اور عبداللہ بھائی اندر نہیں آئے۔“ گل فشاں نے پوچھا۔

”اوہ۔ میں نے خود ہی نہیں چاہا وہ آئے۔“

”وجہ؟“

”بھئی ہم بہنوں میں کوئی ایسی بات بھی تو ہو سکتی ہے جو میں نہ چاہوں کہ عبداللہ کو پتا چلے۔ گل سے عبداللہ کی والدہ آئی ہوئی ہے۔“ وہ منہ ہٹا کر بولیں۔

”اوہ۔“ گل فشاں نے ہونٹ سیکڑے۔ انہیں پتا تھا جب بھی زرفشاں کی ساس آتی ہیں زرفشاں کو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ساس کا وجود انہیں کھٹکتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی ہیں۔ حالانکہ عبداللہ بھائی کبھی بھی ماں کو لینے نہیں جاتے تھے۔ بس ماں انہیں اولاد کی محبت میں وہ بھاگی آتی تھیں۔ حالانکہ وہ بڑے بیٹے معبد اللہ کے پاس رہتی تھیں لیکن عبداللہ کی محبت میں کھینچ جلی آتی تھیں۔ جہاں عبداللہ کی بیوی کی پیشانی پر پڑنے والے بل صاف گئے جاسکتے تھے۔

”منعم کیوں گیا ہے سنگا پور؟“ گل فشاں بات بدھاتے ہوئے بولیں۔

”یونہی گھومنے پھرنے۔ بنگاک بھی جائے گا۔ اس بار گرمی بھی تو بہت پڑ رہی ہے نا۔ میں بھی جانا چاہ رہی تھی عبداللہ نے کہا آئندہ ماہ چلیں گے۔“

”ہاں۔“ گل فشاں نے خالی گلاس سائینڈیکل پر رکھا۔

”پھر میں نے چاہا کہ اچھا ہے چلا جائے منعم۔“ وہ خود ہی کہنے لگیں۔

”کیوں؟“

”بھئی۔ وہ بڑی بی چاہتی ہیں عبداللہ کی بھانجی نفیسہ سے منعم کی شادی ہو جائے۔ اب تم دیکھو کہاں منعم کہاں نفیسہ ال میز ڈس لڑکی۔ میں نے تو عبداللہ سے کہہ دیا ہے ایسی لڑکی میری بہو نہیں بن سکتی۔“

زرفشاں نہایت تفاخر سے کہہ رہی تھیں۔

”پھر بھی زری۔ یہ تو ہے کہ وہ عبداللہ بھائی کی بھانجی ہے اور سیدھی سادی لڑکی ہی منعم کے ساتھ گزارا کر سکتی ہے۔ ورنہ منعم کی جو عادات ہیں۔“ ایک دم انہوں نے ہونٹ پیچھ لپے۔

”تم تو بس اسی۔ بات کے پیچھے پڑی ہو۔ بھئی مرد کی فرینڈز تو بہت ساری ہو سکتی ہیں۔ بیوی صرف ایک ہوتی ہے۔“ زرفشاں نے سمجھایا۔ ”یہ سوسائٹی میں عام بات ہے۔“

”لیکن زری۔ یہ تو کوئی شرافت نہیں۔ مردامات میں خیانت کرنا پھرے۔“

”شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ پھر میں چاہتی ہوں ہم دونوں بہنیں ایک ہو جائیں۔ میں تو خندی کے بڑا ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میری تو عرصے سے خواہش تھی ورنہ منعم کی شادی اب تک کر چکی ہوتی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ کتنے اونچے اونچے گھرانے کے لوگ منعم کو داماد بنانا چاہتے ہیں مگر میں صاف کہہ دیتی ہوں کہ میں نے تو اپنی بھانجی کو بہو بنانا ہے۔“

”زری آپ۔۔۔“ گل فشاں کہنا چاہتی تھیں پر وہ بولے لگیں۔

”بھئی۔ میں خود جمال سے بات کروں گی۔ آج اسی لیے آئی ہوں۔ ایک روز آفس فون کر کے میں نے بات کی تھی اور آنے کا کہا تھا مگر اسی شام اچانک کرل ہمایوں کے ہاں جانا پڑ گیا۔ ان کی والدہ کو ہارٹ ایک ہو گیا تھا۔ پھر اتنی جان پہچان ہو تو نبھانا پڑتا ہے۔ دوسرے روز پتا چلا کہ جمال اسلام آباد چلا گیا ہے۔“

”جی۔۔۔“ گل فشاں کا دم سا ٹکٹا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ جمال الدین ملک سے ڈرنے لگی تھیں۔ عجیب سا خوف تھا جو انہیں سہا دیتا تھا۔ لگتا تھا جیسے کہ کچھ ہونے والا ہے۔

”کیا۔۔۔؟ اسی کیا کی انہیں سمجھ نہ آئی تھی۔“

”کریم۔ صاحب اٹھ گئے؟“ قریب سے گزرتے ہوئے کریم کو آواز دے کر زرفشاں نے پوچھا۔

”وہ تو کب کے اٹھ چکے۔“ کریم نے بتایا۔

”کیا کر رہے ہیں؟“ زرفشاں نے پوچھا۔

”خسٹل کر چکے ہیں؟“ گل فشاں نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں جی آفس کی تیاری بھی کر چکے ہیں۔ میں اب ناشتا لے کر جا رہا ہوں۔“

کریم نے بتایا تو گل فشاں جلدی سے اٹھ کر خواب گاہ کی طرف بڑھیں۔ انہیں پتا بھی نہ چلا زرفشاں بھی ان کے پیچھے ہی چلی آئی تھیں۔

”جمال وہ۔۔۔“ گل فشاں نے کہنا ہی چاہا تھا کہ کف لنک لگاتے ہوئے ایک دم ہی ان کی نظر زرفشاں پر پڑ چکی تھی۔ دل میں عجیب سی سرد مہری کی لہر اٹھی مگر وہ ضبط کر لے لیوں پر مسکان سجاتے ہوئے بولے۔

”آخا۔ آج تو صبح صبح زری کا دیدار ہوا ہے۔ دن یقیناً اچھا گزرے گا۔“

”ہمیشہ تم مجھے بتاتے رہتے ہو۔“ زرفشاں کروفر سے بولیں۔

”تشریف رکھے۔“ جمال ملک نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور وہ ساڑھی کی فال کو نرا کر کے پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”کیسے آنا ہوا؟“ جمال ان کے قریب ہی صوفے پر آ بیٹھے اور پھر کچھ یاد کرتے ہوئے۔

”گل تم نے ناشتا کروا دیا زری کیا۔“

”بھئی۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔“

”وجہ؟“

”آج کل میں نے ناشتا چھوڑا ہوا ہے۔ ڈائٹ کنٹرول کر رہی ہوں۔ منعم مجھ سے لڑتا رہا ہے۔“

”عبداللہ بھائی کچھ نہیں کہتے۔“ جمال مسکرائے۔

”وہ بھلا کبھی کہہ سکتے ہیں۔“ زرفشاں کے لہجے میں بڑائی کا احساس نمایاں تھا۔

”بھئی۔ تم نے ناشتا بھی کرنا ہے ابھی اور آفس بھی جاؤ گے۔ میں جس لیے آئی ہوں وہ بتاؤ۔“

”کہ منعم نے کہا تھا آج ہر صورت میں بات کر ہی لوں۔“

”کیسی بات؟“ وہ جان کر انجان بن گئے۔

”منعم اور خندی کے رشتے کی بات۔“ وہ بولیں۔

”رشتہ۔“ جمال ملک کے ہونٹ میچ گئے۔ انہوں نے شعلہ بار آنکھوں سے گل فشاں کو دیکھا وہ کانپ کر رہ گئیں۔

”ہاں بھئی گھر کی بات تو ہے جمال۔ تم نے منعم کو دیکھا ہی ہے۔ پھر اس کی خواہش بھی ہے کہ

خندی ہی اس کی شریک حیات بنے۔“

”آپ کو گل نے کچھ نہیں بتایا۔“

”کیا؟ نہیں بتایا۔ تم نے کچھ کہا تھا؟“

”میں۔ میں بتانا چاہتی تھی جمال۔ پر زری کسی کو کچھ بولنے دے تب نا۔“ گل فشاں نے تھوک نکلتے ہوئے کہا۔

”میں انکار نہیں سنوں گی۔“ زرفشاں نے فیصلہ داغا۔

”ہم انکار کب کر رہے ہیں زری۔ جمال اور ان کی والدہ نے خندی کا رشتہ طے کر دیا ہے

رات ہی جمال نے مجھے آتے ہی بتایا تھا۔ میں منعم کی بات کرنا ہی چاہتی تھی کہ۔“

”کب۔ کہاں؟“ زرفشاں جھٹکے سے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”خندی کی پھوپھی کا بیٹا ہے۔ وہاج احمد۔“ گل فشاں نے نہایت اطمینان سے یہ نام لیا۔



جمال الدین ملک نے نہایت حیرت اور استعجاب سے گل فشاں کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر اطمینان کی ایسی پرچھائیں لرز رہی تھیں جو آج سے پہلے انہوں نے بھی نہ دیکھی تھی۔ اور وہ بہن سے کہہ رہی تھیں۔

”زری۔ یہ فیصلہ جمال کی والدہ کا ہے اور اس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے خاندان میں آج بھی بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کے فیصلوں پر سر جھکانا ملک کے خاندان والے اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اور کسی خاندان میں بزرگوں کا احترام نہیں کیا جاتا؟“ زرفشاں نے گل فشاں کی بات کاٹ کر تقریر یا سلگتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ بہتر سمجھتی ہیں۔“ گل فشاں نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔“ زرفشاں نے حیرت سے پوچھا۔

”کہانا رات ہی تو جمال نے بتایا تھا۔ اب اتنی جلدی میں کیسے آپ کو بتا دیتی۔ کیوں جمال؟“ گل فشاں نے ان کی سمت تصدیق کے لئے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں، وہی نہیں جو میں نے کہا ہے۔

اور وہ جواب تک سنبھل گئے تھے بلکہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیوی کی منشا کیا ہے، تبھی تو جلدی سے بولے۔

”ہاں زری آپ! یہ حقیقت ہے کہ رات ہی میں نے گل کو بتایا ہے پھر وہاج بہت اچھا لڑکا ہے۔“

”منعم میں کیا برائی ہے؟“ زرفشاں نے پوچھا۔

”خدا خواستہ۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ منعم میں برائی ہے۔“ گل فشاں رسائیت سے بولیں۔

”میں نے کب سے یہ بات تمہارے کانوں میں ڈالی تھی کہ خندی مجھے دے دو۔ یہ منعم کی خواہش بھی تھی اور میری دلی تمنا بھی۔ (خواہشیں پوری کب ہوتی ہیں؟ گل فشاں کے ذہن میں یہ جملہ گونجا مگر لبوں پر نہ آ سکا)

زرفشاں کہہ رہی تھی۔

”مجھے علم ہے کہ تم خود بھی اس رشتے سے خوش نہیں تھیں۔ تم جانتیں تو جمال کیوں نہ مانتا؟“
 ”ابھی اتنا ہول نہیں ہے مجھ پر گل کا۔“ جمال الدین ملک مسکرا کر بولے۔
 ”اب یہ تو نہ کہو۔ گزشتہ آنتیس برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔“ زرفشاں نے ہونٹ پکچے۔
 ”یہ بتاؤ ناشتہ کرنا ہے؟“ جمال ملک نے بات پلٹی۔
 ”نہیں کرنا مجھے ناشتا واشتا۔“ زرفشاں ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”بیٹھیں نازری۔“
 ”اب بیٹھنا فضول ہے۔“ وہ غصے میں تھیں۔
 ”زری آپ یہ نہ بھولیں کہ ہم بہنیں ہیں۔“
 ”پتا ہے مجھے۔“ انہوں نے بھنوں اچکا میں۔ ”مگر تم نے میرے ساتھ برادران یوسف والا طرز کیا ہے۔“

”میرا کیا تصور ہے؟“ گل فشاں نے انہیں دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔
 ”اب بھی یہ تمہارا تصور نہیں۔ میں تمہیں کب سے کہتی رہی تم جمال سے بات کرو اور تم مال منول سے کام لیتی رہیں۔“
 ”گل نے مجھ سے بات کی تھی۔“ جمال ملک کے بولے۔
 ”پھر۔؟“ انہوں نے ترچھی نظر سے جمال ملک کو دیکھا۔
 ”دیکھیں زری آپا۔ میں کسی صورت بھی خندی کو آپ کے ہاں نہیں بیاہ سکتا۔“ وہ سختی سے بولے۔

”کیا برائی ہے میرے گھر میں؟“
 ”میرا مطلب یہ نہیں۔۔ بات صرف اتنی ہے کہ خندی میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اور کسی صورت بھی میں اسے اپنے خاندان سے باہر نہیں دے سکتا۔“
 ”کیا تم ہمارے خاندان میں شامل نہیں؟“ زرفشاں بولیں۔
 ”حقیقت سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ اگر میں منعم سے خندی کو منسوب کر دوں تو میری پوری برادری میرا بایکٹ کر دے گی۔“
 ”وجہ۔؟“ زرفشاں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

”اس لیے کہ ملک خاندان کی کوئی لڑکی باہر نہیں بیاہی گئی۔ اور میں روایت شکن نہیں بننا چاہتا میں نہیں چاہتا کہ غلط فیصلوں کی بعد میں تقلید کی جائے اور وہ غلط راستہ میں دکھاؤں۔“
 ”جمال تم پینڈو لوگ جتنے بھی بڑھ لکھ جاؤ تمہارے ذہن سے روایات کی وہ سڑی ہوئی بو نکلتی جاتی۔ آخر ہم نے بھی تو گل تمہیں دی تھی۔ تب تو تمہارے خاندان کو اعتراض نہ ہوا تھا۔“
 ”اب تو وہ نہ سمجھیں گے کہ اتنے عرصے بعد میں نے بیٹی دے کر آپ کے خاندان کا بدلا لیا ہے۔“ جمال ملک مسکرائے۔ ”خیر گل کا یہ کہنا کہ میری اماں نے خندی کو وہاں سے منسوب کر دیا ہے یہ غلط ہے۔“
 ”واٹ۔؟“ وہ چونکیں۔

”ہاں۔“ جمال ملک اطمینان سے بولے۔ ”وہاں بے شک بہت اچھا لڑکا ہے۔ میرا بھائی ہے۔ اور مجھے اس لیے بہت عزیز ہے کہ وہ نہایت ہمدرد انسان ہے۔ انسانیت کے سارے تقاضے پوری

پورے کرتا ہے۔ اگر وہ میرا داماد بن جائے تو میری خوش نصیبی ہوگی۔ مگر ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب اگر گاؤں گیا تو ماں جی سے ضرور بات کروں گا۔“
 ”یعنی تم بیٹی والے ہو کہ بات کرو گے۔؟“ زرفشاں کی آواز پھٹ گئی۔
 ”حرج کیا ہے۔ پھر ماں تو سنا بھی ہوتی ہے۔ اپنی اولاد کی ہر بات سن کر دل میں رکھنے والی۔ اور ماں سے کیا پردہ؟ میں تو ماں کو ہر بات کہہ دیتا ہوں۔ وہ میری ہر بات سن لیتی ہے۔ پھر برائی کیا ہے اگر میں خود کہوں کہ وہاں خندی کا لائف پارٹنر ہے۔“
 ”خیر جمال۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“
 ”میں نے آپ کو کبھی کوئی آس نہیں دلائی۔“
 ”میں تو مطمئن تھی۔ اب منعم کو پتا چلے گا تو کس قدر ہرٹ ہوگا۔ یہ سوچا تم نے۔“ وہ رو دینے کو تھیں۔

”یہ سوچنا میرا کام نہیں ہے۔“
 ”تم بہت سنگدل ہو جمال۔“
 ”اس ٹائٹل کا شکریہ زری۔ پر یہ مت بھولیں کہ میں بہت ہی روایت پرست بندہ ہوں۔ اپنے ہاں کی رسموں و رواجوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا انسان جسے پتا ہے کہ اگر ان زنجیروں کو اس نے توڑا تو پھر اس کے تحفظ کی کوئی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔“ جمال الدین ملک کا لہجہ پر عزم تھا۔
 ”مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ تم ہمارے خاندان میں شامل ہونے کے باوجود بھی خود کو مالگ سمجھتے ہو۔“

”میں نے کہا تھا کہ حقیقت سے نظریں چڑانا دانشمندی تو نہیں ہے۔ آپ میں اور ہم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی۔ بقول آپ کے ہم پینڈو لوگ ہیں ایک ہی دائرے میں چکر لگانے والے۔ اور پھر ہر کوئی اپنوں ہی میں اچھا لگتا ہے زرعی۔ آپ خفا نہ ہوں۔ عبداللہ بھائی کے خاندان میں بہت اچھی لڑکیاں ہوں گی۔ آپ ان سے بات کریں۔ یقیناً وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔“
 ”مجھے سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی مجھے کسی کی خوشی کا احساس کرنے کی ضرورت ہے تم نے فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے راتے بھی مت دکھاؤ۔ مجھے افسوس یہ ہے کہ گل نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔“

”تصور گل کا نہیں ہے۔ اس نے تو ایک اچھی بیوی کا حق استعمال کیا ہے۔ اسے پتا ہے کہ اس کا شوہر کس بات سے خوش ہوگا اور کس سے ناخوش۔“
 ”مگر بھائی بہنوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ شادی کے بعد شوہر ہی کی غلامی میں رہا جائے۔“

”پاپائی اپنی سوچ ہے زری۔ پوچھ لو میں نے کبھی گل کو غلام نہیں بنایا البتہ۔“
 ”خیر مجھے بہت ڈک ہے۔ میں پھر کہہ رہی ہوں جمال کہ تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔“
 زرفشاں ایک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میرے فیصلے میں کبھی بھی نظر ثانی کی گنجائش نہیں ہوتی زری۔ اور آئی ایم سوری کہ میں آپ کی بات نہیں مان سکتا۔“ جمال ملک نہایت رکھائی سے بولے۔ تب زرفشاں نے طویل سانس لے کر

گل فشاں کو دیکھا پھر جمال ملک کو اور پھر بولیں۔
”آج سے ہمارا ہر رشتہ ختم سمجھو۔“

”آل رایت زری۔ جیسی آپ کی مرضی۔ مجھے اپنا گھر بہت عزیز ہے۔ اور میں بہن کی خوشی کا خاطر اپنے گھر کی بنیادیں نہیں ہلا سکتی۔ تم ٹھنڈے دل سے سوچو تو تمہیں پتا چلے گا کہ خندی اور منتم جو نہیں ہے۔“

”جب تمہارا اور جمال کا جوڑ بن سکتا ہے تو۔۔۔“

”زری پلیز۔ مت کہیں کچھ جمال میری چوائس تھا نہ کہ آپ لوگوں کی۔“ گل فشاں نے بہن کی بات کاٹ کر کہا اور زرفشاں تیزی سے ان کی خوابگاہ سے نکل گئیں۔
تب جمال الدین ملک نہایت آہستگی سے آگے بڑھے اور گل فشاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولے۔

”میرے خیال میں اپنی چوائس پر کبھی پچھتاؤ تو نہیں ہوتا؟“

”نہیں جمال۔ آپ اتنے اچھے ہیں پچھتاوے کی گنجائش ہی نہیں۔“ گل فشاں مسکرا دیں۔
تب جمال ملک کے لبوں پر بھی اطمینان بھری مسکراہٹ آگئی۔ آج پہلی بار انہیں احساس ہوا تھا کہ گل فشاں نے واقعی آج غلطی کا ثبوت دیا ہے اور وہ بہت خوش تھے۔ پھر وہ بیوی کو ساتھ لے ناٹشے کے لیے ڈائننگ ہال میں آگئے۔

☆☆☆

ساون کے مہینے کی پہلی بارش تھی۔ ٹوٹ کر ساون برس رہا تھا اور تیز ہواؤں سے درخت چھوٹ رہے تھے۔ ہر سو جل ٹھل ہو گئی تھی۔ عفریہ امیر نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے سمیٹے اور کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے سے پیشانی ٹکا دی۔ اتنی ٹھنڈک سے بھی اس کے ذہن کی کھولن دور نہ ہوتی تھی۔
اسے لگ رہا تھا جیسے پورے وجود میں کانٹے اُگ آئے ہوں جیسے کسی نے ایک دم ہی اسے بلند یوں سے اٹھا کر نیچے جت دیا ہو اور اس کی ہستی پتھروں کی زد میں آگئی ہو۔ سارے پتھر اس پر براہ راست ہی تو آ کر پڑے تھے۔ اور اس کا وجود زخم زخم تھا۔ خود اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کس طرح اپنے زخموں پر وہ مر رہا ہے۔
میرے ہاتھ کیوں زخمی ہیں؟

عفریہ نے اپنی ہتھیلیاں دیکھیں اور اس کی آنکھوں میں دھند سی چھا گئی۔

آخر وہ کچھ کیوں نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں یا ہم سوچتے ہیں۔ لوگ کیوں ہم پر نگرینے بیٹھتے ہیں۔ میں نے تو کبھی کسی پر پتھر نہیں پھینکا پتھر۔ پھر۔۔۔ تم نے غاشیہ کمال میرے لیے کیوں پتھروں کا انتخاب کیا۔ میرا شیشہ دل بہت نازک تھا۔ تمہیں کیا پتا بھی میرے اندر جھانک کر دیکھ لیتیں کہ میں تمہارے لیے کس قدر مخلص ہوں۔ کتنی قدر کرتی ہوں۔“

اس لیے کہ تم وہاں احمد کی محبت ہو۔ اس کی پسند ہو۔ اور وہاں سے میرا ایک ہی رشتہ ہے کہ وہ میرا اچھا بلکہ بہت اچھا دوست ہے مجھے بے حد اور بے حساب محبت ہے اس سے مگر وہ محبت جو ایک دوست کو دوسرے دوست سے ہوتی ہے۔ میرے جذباتوں میں کوئی کھوٹ نہیں غاشیہ کمال۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی وہاں احمد کی سنگت کے خواب نہیں دیکھے پھر تم نے کیسے وہ کچھ کہا جس کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی۔

عفریہ کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ رونا چاہ رہی تھی۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے سارے آنسو کہیں اندر ہی اندر کھو گئے ہوں اور آنکھیں خشک ٹھل کا منظر پیش کر رہی ہیں۔

اس کا دل ڈھٹا ہوا پھوڑا بنا ہوا تھا۔ لگتا تھا ابھی دل پھٹ جائے گا۔ ایسا درد تو اس نے تب بھی محسوس نہ کیا تھا جب اس نے اپنے ماما شیر محمد کی خاطر گاؤں کے ساتھ ساتھ سارے خاندان کو بھی پھوڑ دیا تھا۔ تب بھی اس ڈھکے نے اسے ایسا نہ زلایا تھا۔ کبھی احساس ہی نہ ہوا تھا کہ کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اب اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے وہاں احمد کا کہنا نہ مان کر اور غاشیہ سے بات کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔

وہاں احمد جو اس کا بہت اچھا دوست تھا اس کی ہر بات ماننے والا۔ ہر ضد پوری کرنے والا۔ دوست، مشکل وقت میں سہارا دینے والا اور پہلی بار اس نے ایک بات سے منع کیا تو میں نے وہ بھی نہ مانا۔ اُف عفریہ کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ عجیب طرح کا عذاب تھا جو اس پر ٹوٹا تھا اور یہ اذیت ناگ کیفیت اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔ دل وروح پر اس عذاب کا بے تحاشا بوجھ پڑا ہوا تھا۔
کاش کسی طرح یہ بوجھ اتر جائے۔ سارے عذاب ختم ہو جائیں۔ عفریہ نے طویل سانس لے کر اٹھایا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی اور کھڑکی کے شیشوں پر سے پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔
میرے خدا۔ تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ یہ چاہا کہ غاشیہ کے دل پر چھائے کدو توں کے بادل چھٹ جائیں۔

یا الہی۔ تو گواہ ہے کہ میں اپنے دل کے سارے اچھے جذبوں سمیت غاشیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا بے شک اس نے میرے منہ پر نقطوں کے طمانچے مارے ہیں۔
اس نے میرے خلوص۔
میری محبت۔

اور میرے جذباتوں کی توہین کی ہے۔ پھر بھی مجھے اس سے نفرت نہیں ہوئی۔ کہ میں تو کانٹوں پر طے کی عادی ہوں۔ اور غاشیہ کے پاؤں تلے ہمیشہ پھول ہی رہے ہیں۔ اس کے دل میں سچائی کو سمجھنے کی کچھ ڈال دے میرے رب۔“

درد کی ایک شدید لہر تھی جو اس کے دل کی رگوں کو کاٹتی ہوئی اندر ہی اندر اترتی چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی جل رہی تھیں۔ وہ بے تحاشا رونا چاہتی تھی تاکہ دل پر دھرا بوجھ کم ہو مگر آنسو اس کی کھلی شدت سے خشک ہو گئے تھے۔

کاش کوئی ہمارے خلوص کو پہچان سکتا۔

کاش کوئی جان سکتا کہ ہم اس کے لیے کتنے مخلص ہیں۔

اور کاش غاشیہ کمال۔ تم بھی جان جانتیں تو میں اس انجانے کرب کی دلدل میں لمحہ بہ لمحہ تو نہ اترتی۔

خود سے شرمندہ تو نہ ہوتی۔

تمہیں کیا پتا غاشیہ کمال اپنی نظروں سے گرنا کس قدر اندوہناک ہوتا ہے۔ کیا جانو تم انسان خود کو ہوتے تمہیں کتنے کچھ لگتا ہے۔ اور میں بھی خود کو مجرم سمجھتی ہوں کہ نہ اس روز تم مجھے وہاں کے ساتھ دیکھیں اور نہ وہاں کے دل کا خون ہوتا۔ غاشیہ۔ یہ کیسی محبت ہے جو اتنی جلدی شک کے ناگ سے نکل ل۔

ارے تم نے محبت دیکھی ہی نہیں۔ دیکھو کبھی تم آصف کا بچو۔ جو پاگل ہو گیا ہے۔ مجھے ہے تو اس کی آنکھوں میں اس قدر چمک پیدا ہوتی ہے کہ میں حیرت زدہ رہ جاتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے اسے کہوں۔

یہ ساری روشنیاں میری زندگی کے اندھارے کمرے میں بکھیر دو۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتی بھی منہ پھٹ ہوں، کس قدر بھی بہادر ہوں۔ لیکن میں انتہائی بزدل لڑکی بھی ہوں۔ آصف کا خواہش کے باوجود میں اپنے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں پاتی۔ یہ دلوں کے سودے بھلا کی طرح ہوتے ہیں۔

مگر تمہارا اور وہاں کا معاملہ تو یکطرفہ نہ تھا، پھر۔ پھر ایسا کیوں ہوا؟ کیوں تم لوگ دور ہو؟ ذرا سی بات کو تم نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ یہ کیسی محبت تھی؟

ایک آصف کا بچو ہے۔ میری تمام تر بد تمیزیوں کو برداشت کرتا ہے۔ پھر بھی راستہ نہیں بدلتا۔ جذبے کس کے تھے ہیں؟

تم لڑکی ہو کر حد سے گزر گئیں۔ راستہ بدل لیا اور۔۔۔ اور وہاں نے ملک ہاؤس ہی چھوڑ دیا۔ صرف تمہارے رویے کی وجہ سے غاشیہ کمال۔ اور اس کا یہ فیصلہ میرے جگر کو چھریوں کی

کاٹ گیا۔ تھی بھی تو حقیقت۔ آج صبح ہی تو جب وہ سب لائبریری میں بیٹھے نوٹس تیار کر رہے

زویب نے کہا تھا۔ ”عفیرہ! کچھ سنا تم نے؟“

”کیا؟“ عفیرہ نے اپنی بے تحاشا بھوری آنکھوں سے زویب کی جانب دیکھا۔ ”بھئی اپنا وجہی بھی ہم لوگوں میں شامل ہو گیا ہے۔“ زویب نے کہا۔

”کوئی نئی بات کرو۔ وہ تو ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہے۔“ عفیرہ نے قلم دانتوں میں دبائے رکھا۔ ”بھئی۔ تم تمہیں نہیں اب تو یہ ہاشل نشین ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ عفیرہ نے حیرت سے پوچھا تب وہاں جلدی سے بولا۔

”کچھ نہیں، تم کام کرو، ابھی تک واپس کر لی ہے۔“

”نہیں پہلے بتاؤ کیا بات ہے؟“ عفیرہ نے قلم میز پر پٹا اور کتاب بند کر کے اس پر کھینچا دیں۔

”کوئی بات ہو تو بتائیں بھی۔“

”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔“

”جب تمہیں پتہ ہے کہ ہم پردہ داری کریں گے تو تم پوچھ کیوں رہی ہو؟“ آصف نے جلانے کے لیے کہا۔

”تم تو خاموش ہی رہا کرو۔“ عفیرہ ہنسنے لگی۔ ”شاید تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ تم خا رہو تو بے حد اچھے لگتے ہو۔ یہ میری بات تم زندگی کے ہر موڑ پر یاد رکھنا۔“

”تم ساتھ دو اور یاد دلانی رہنا۔“ آصف نے نہایت حوصلے سے کہا۔ سب نے ایک حیرت سے اسے دیکھا تھا اور عفیرہ اس کی جرأت پر ہنس دی تھی۔

”انہونی خواہشوں کو دل میں جگہ نہ دو آصف کا بچو کہ جب خواہشیں پوری نہیں

پوری ہوتی ہیں۔“ عفیرہ نے اسے سمجھایا۔

”میری ہر خواہش پوری ہوتی ہے عفیرہ امیر۔“

”مگر جس خواہش نے ابھی تمہارے دل میں ڈیرہ جمایا ہے نا، یہ شاید ہی پوری ہو۔“ عفیرہ ہنسنے لگی۔

”شاید۔“ آصف نے کہا۔

”ہوں۔“ عفیرہ نے سر ہلایا۔

”تو اس کا مطلب ہے اس خواہش کے پورا ہونے کا امکان ہے۔“ آصف نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میں نے تو نہیں کہا۔“ عفیرہ جلدی سے بولی۔

”بہت بڑی گنجائش ہوتی ہے، شاید میں۔“

”بس ہر کسی کی سمجھ کی بات ہے، اپنی پسند کے مطلب نکال لیتا ہے۔ اور آصف کا بچو، میں تمہیں

ماتو نہیں کر سکتی نا، جو چاہو سو سوچو۔ جو خواہش چاہو سو کرو۔ میں تو روک سکتی ہوں کہ دلدل میں

اترنے سے صرف اپنا ہی دم گھٹتا ہے۔ کنارے پر کھڑے لوگ تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہے نا

نہت؟“ وہ فرحت منیر سے مخاطب تھی۔

”یہ تم دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”گوئی بارو سارے معاملات کو تم بتاؤ وجہی؟ تم نے کیوں ملک ہاؤس کو خیر باد کہا ہے؟“ وہ پھر اسے مخاطب تھی۔

”بھئی وہاں اسٹڈی نہیں ہو یا رہی تھی۔“ وہاں بولا۔

”یہ بات تو نہیں۔“ اس نے بغور وہاں کا چہرہ دیکھا اور مسکرا دی۔

”تم یقین کرو۔“ نہ جانے کیوں وہ عفیرہ کی طرف دیکھ ہی نہ سکا تھا۔

”وہاں احمد جھوٹ بولنے کے لئے بڑا حوصلہ چاہئے۔ اور تمہارا چہرہ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تم

لڑائی سے کام لے رہے ہو۔ بھلے بندے جھوٹ بولنے کا ڈھنگ سیکھو۔“

”تم ہر ایک کے بارے میں اتنی تہی رائے کیوں رکھتی ہو؟ ضروری تو نہیں جو تم سمجھو صحیح ہو۔“

”ظاہری بصارت دھوکہ کھا سکتی ہے مگر جنہیں قدرت نے اندر کی روشنی دی ہے، وہ تو سب

سہتے ہیں۔“

”پھر تو تم ولی اللہ ہوئیں۔“

”ولی اللہ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتی پر اتنا جانتی ہوں کہ میری پیش گوئی غلط نہیں ہوتی۔ اور یہ تم

کی طرح جانتے ہو۔“ اس کا انداز اتنا قطعی تھا کہ وہاں کچھ کہہ ہی نہ سکا بس دائیں ہاتھ کی انگلی میں

انگوٹھی کے نگ سے میز کو بجاتا رہا۔

”تمہاری حالت تمہاری پریشانی کی گواہ۔“ عفیرہ نے کہا۔

”پلیز غصو۔ کچھ مت پوچھو۔ مجھے پڑھنے دو۔ میں نے ملک ہاؤس کو اپنے سکھ کی خاطر چھوڑا

میں یا کچھ اور جاننا چاہتی ہو۔“ وہاں احمد کے لہجے میں اتنا کرب تھا کہ عفیرہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”اور بول ہی نہ پاتی کہ کہنے کو کچھ بھی تو نہ رہ گیا تھا۔ وہاں احمد کے لہجے کا درد اس بات کا غماز تھا

کہ انہونی کی نفرت کے کانٹے برداشت نہیں کر سکا۔ اور وہ گھر ہی چھوڑ آیا تھا جہاں اس کی محبت بچی

تھی۔ جہاں اس نے غاشیہ کے حوالے سے ڈھیروں خواب دیکھے تھے۔

اس گھر کے درو پوار اور رویش اس بات کی گواہ تھیں جہاں اس نے غاشیہ کے سنگ ہوئے ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ سبز لان میں ٹام کی چائے پیتے ہوئے غاشیہ کے پرے پر وہ رنگ بکھرتے دیکھتے تھے۔

پھر وہ سارے رنگ بکھر گئے اور وہ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کچھ بھی تو نہ بچا تھا اور وہ غاشیہ کی ناک کے کانٹوں سے اپنا پورا وجود چھلنی کر چکا تھا۔ اب مزید اس میں سکت نہ تھی کہ وہ کچھ اور سہتا۔

وہ جان گیا تھا کہ غاشیہ کو سمجھانا نافضول ہے۔ وہ اپنے شک کی آگ میں پوری طرح جھلس تھی اور وہ آگ اب روز بروز کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کہ اس کی پیش تو ہمارے محسوس کرتا تھا اور اسی لیے تو کمال الدین ملک سے اجازت لے کر ہاسٹل شفٹ ہو گیا تھا کہ۔

”گھر میں اسٹڈی نہیں ہوتی۔“ یہ بہانہ اس قدر معقول تھا کہ وہ بھی انکار نہ کر سکے۔ اس نے تو غاشیہ کے سامنے ہی کمال الدین ملک سے اجازت چاہی تھی۔ شاید لاشعور طور

کا خیال تھا کہ غاشیہ اسے روک لے گی۔

مگر ایسا نہ ہوا تھا۔

غاشیہ نے تو اس کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔

جیسے وہ کوئی غیر ہو۔ نا آشنا ہو۔

اس کرب نے وہاں کا دماغ سگا کر رکھ دیا تھا۔ وہ یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ غاشیہ قریب ہو اور وہ اسے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے اُردیکھے بھی تو سوائے نفرت اور جلن کے اور کوئی چہرے کی آنکھوں میں نہ ابھرتا تھا۔ اس لیے اس نے ”ملک ہاؤس“ چھوڑ دیا۔

کتنا دل تڑپا تھا۔

روح کر لاتی تھی۔

اور دل کی رگیں بار بار ٹوٹی تھیں۔

ملک ہاؤس چھوڑتے ہوئے بار ہاں اس کا دل چاہا تھا ایک بار صرف ایک بار تو غاشیہ

لے۔

پر امید نظروں سے اس نے اس درتیجے کی جانب دیکھا تھا جو اس کی گھر میں آمد پر ایک کھل جاتا تھا۔ مگر اب تو اس کے پیچھے کوئی جنبش ہی نہ ہوئی تھی اور وہاں احمد دل پر ڈھیر سارا ہوئے ملک ہاؤس سے چلا آیا تھا۔

اسے ڈکھ ضرور تھا اپنے جزیروں اور محبت کی ناقدری پر لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔

یہ ڈکھ تو روگ بن گیا تھا۔

دل کی تہوں میں اتر گیا تھا۔

کبھی بھی اسے لگتا۔ یہ کرب اس کی رگوں میں خون کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ دل میں اٹھتی جو اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور وہ گھنٹوں اس درد سے ہوتا رہتا۔ اس کے اندر کا درد چہرے پر صاف نظر آتا تھا۔ یہ اور بات کو وہ مسکراہٹ لبوں پر

درد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن عفیرہ امیر تو دلوں پر کبھی تحریر اندر گھس کر پڑھ لکھی سے بھلا کچھ کسے جھسا جا سکتا تھا۔

کوئی بھی دوست تو وہاں کے ڈکھ کو نہ جان سکا تھا۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کیوں ہاسٹل میں شفٹ ہو گیا ہے۔

اور عفیرہ تو بن بتائے ہی جان گئی تھی کہ وہاں احمد کی جان کیسے تلواروں میں سے نکلی ہے اور یہی آگئی تو تھی جس نے اس کے دل کو اپنے حصار میں لیے لیا تھا۔

صبح سے ہی وہ اس انجانے سے کرب میں مبتلا تھی۔ حساس لوگوں کا یہی تو المیہ ہے کہ انہیں ذرا سی بات دیکھوں کی دلدل میں اتار دیتی ہے۔ اور عفیرہ بھی بہت حساس تھی اور بن کہے ہی وہاں کا دکھ وہاں لگ گیا تھا۔

یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ عفیرہ نے برستے مینے کی بوندوں پر نظریں جماتے ہوئے طویل سانس لی۔

سارے جرم میرے ہیں۔ وجہی میرے دوست ہیں شرمندہ ہوں تم سے۔ میری وجہ سے تمہارے دل کی دنیا اجڑی ہے۔

یہ میں ہی کم نصیب ہوں جس کی دوستی نے تمہارا دل ادھیرا۔ وجہی مجھے معاف کر دو۔ کہ یہ جرم انجانے ہی میں مجھ سے سرزد ہوا۔ ورنہ خدا گواہ ہے میرا کہ میں چاہتی ہوں میرے دوست خوش رہیں۔ ان کے سارے ڈکھ مجھے مل جائیں۔

اور۔۔

اور اگر میرے لیر لیر دامن میں خوشیوں کے کچھ پھول ہیں تو وہ میرے دوستوں کو مل جائیں۔ میں نے بھی نہیں چاہا کہ تم دھمی ہو۔

بخدا عفیرہ امیر تو کسی کو سوئی بھی پیچھ جائے تو برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر تم تو میرے دوست ہو۔ تمہارے اتنے بڑے ڈکھ پر میں دھمی نہ ہوں۔ تم نہ بتاؤ مجھے سب معلوم ہے۔ تم تو کہہ رہے تھے ”گجی“ کہ تم نے ”ملک ہاؤس“ اپنی خوشی اور سکھ کی خاطر چھوڑا ہے۔ کیسی خوشی؟ کیسا سکھ؟۔

تم تو نچو کر رہ گئے ہو۔

کیا خوشی ایسی ہوتی ہے۔؟۔ جس کی کوئی بھی رمت تمہارے چہرے پر۔۔۔۔۔ نظر نہیں آئی۔ اور میں تم سے نظر نہ ملا سکی کہ میں مجرم ہوں تمہاری۔ بھی تو میں شرمندہ ہوں تم سے۔

میرے دوست۔

میرے حبیب۔

میرے محرم راز۔

میرا وہ انجانا سا جرم معاف کر دو جو میں نے دانستہ نہیں کیا۔ مگر میرے ضمیر کی عدالت مجھے بار بار مجرم ٹھہرا رہی ہے۔

کیا واقعی بعض لوگ بغیر جرم کے مزا پاتے ہیں؟

مگر میں تو مجرم ہوں۔ بھی یہ کچھ کے مل رہے ہیں؟

کب سے سہمہ رہی ہوں یہ تازیانے۔

ہر ایک پل کا گھڑی کا حساب دینا پڑا

ہمیں تو زندگی تیرا جواب دینا پڑا

بدن پہ نیل تھے لفظوں کے تازیانوں کے

ہنسی کے ساتھ خوش کا سراب دینا پڑا
ہاں دیکھو تو وہاں احمد کہ میرے بدن پر کتنے نیل پڑے ہوئے ہیں۔ غاشیہ نے جوفظوں کے سحر
برمائے ہیں۔ تم ڈکھی ہو تو میں بھی تو کم ڈکھی نہیں۔ مجھ جیسی منفرد لڑکی پر اس نے کیسے انگارے
برمائے کہ میری روح تک پر چھاتے پڑ گئے ہیں۔
میں جو بھی نہ بھٹنے والی لڑکی تھی اپنی انا کو پس پشت ڈال کر میں نے غاشیہ کو سمجھانا چاہا۔
اپنی انا کے ناگ کو چل کر میں نے اس سے بات کی۔ پھر بھی میری قربانی کسی کام نہیں آئی۔
اپنا سٹ سے گر کر بھی میں نے کچھ نہ پایا۔

اور۔۔۔ اور وہاں تم بھی ہار گئے۔
آخر یہ دولت مند لڑکیوں کے دل پتھر کیوں ہوتے ہیں؟
تم تو دولت مند نہیں ہو عفرہ امیر۔ پھر میرے معاملے میں تم کیوں پتھر بنی ہوئی ہو۔
اس کے قریب ہی سرگوشی سی ابھری تھی اور وہ چونک کر رہ گئی۔ یہ۔۔۔ یہ آصف کا نوجو یہاں کیسے
اسے لگا تھا جیسے آصف کا نوجو بہت قریب ہو اور پوچھ رہا ہو۔
”تم میرے معاملے میں کیوں پتھر بنی ہوئی ہو؟“
تم نہیں جانتے۔ کوئی بھی نہیں جانتا آصف کا نوجو۔۔۔ میں پتھر کیوں بنی؟
میں اپنے ماما کا مان ہوں؟

اس کا وہ خواب ہوں جو اس نے اپنے بڑے سے کچے آنگن میں پورے چاند کی روشنی میں
نہاتے ہوئے گھڑی چار پانی پر لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ چاہتا تھا میں اتنی مضبوط ہوں کہ مجھے
بڑے سے بڑا حادثہ بھی نہ ہلا سکے۔
پر اس کا خواب بھر گیا۔ اس کی زندگی صرف اور صرف جیل کی ایک چوٹی سی کوٹھری تک محدود
ہو کر رہ گئی وہ چاہتا ہے میں واپس وہاں چلی جاؤں جہاں رہ کے اس نے میرے لیے بہت کچھ
کرتے خواب دیکھے تھے۔

مگر میں اس کا خواب پورا کرنا چاہتی ہوں۔ وہ جو چاہتا تھا میں وہی ہوں گی۔ مجھے مت تو ڈرو
میں ہارڈ اسٹون ہوں۔ ایک ایسا پتھر جو کسی ضرب سے نہیں ٹوٹتا۔
مت تو ڈرو مجھے۔ رہنے دو پتھر بنا۔ رہنے دو اسی طرح۔
عفرہ نے کھڑی کی چوٹ پر رکھی تھیلیوں پر دباؤ دیا تو خون چھلک پڑا۔ اس نے ہونٹ
اور پردہ برابر کے کے کھڑکی سے ہٹ آئی۔ باہر اب بھی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی بالکل وہی طرح
طرح اس کے ذہن میں خیالوں کی بارش ہو رہی تھی۔ اور اس پھوار سے بچنے کے لیے وہ اسٹڈی
پڑا گئی۔

☆☆☆

”منوں آیا! آپ کا کیا خیال ہے میری غلطی ہے۔ میں۔۔۔ میں وہاں کو روک گیا
غاشیہ آنکھوں میں حیرانی بھرے آمنہ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کا دل بھر گیا۔ یہاں
رہتے اور چلا گیا۔ نہ وہ میری مرضی سے آیا تھا نہ ہی وہ گیا۔
”غاشی! تجھے پتا ہے وہ تجھے کس قدر چاہتا ہے۔“
”ہونہ۔“ غاشیہ نے گردن کو جھکا دیا۔

”تمہیں شاید احساس نہیں۔ بچی محبتوں کی قدر کرنی چاہیے کہ یہ تجھ بہت مشکل سے ملتا ہے۔
لوگ تو محبت کے لیے ترستے ہیں۔ محبتوں کو ٹھکرانے والے انسان نہیں ہوتے۔“

”اب اس نے۔۔۔ آپ کو ٹالٹ بنایا ہے۔“
”جدا اس نے مجھے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“ آمنہ بولیں۔
”پھر آپ اس کی وکالت کیوں کر رہی ہیں؟“ غاشیہ نے پوچھا۔
”کل وہ آیا تھا میرے گھر۔“
”میری شکایت کرنے۔“ غاشیہ نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔
”یہ بات نہیں۔“ آمنہ نے جلدی سے تردید کی۔ ”وہ تو نیل کو مال روڈ پر مل گیا تھا تو وہ گھر لے
آئے۔“

”اکیلا تھا۔“ انجانے سے خدشات غاشیہ کے لہجے میں بول رہے تھے۔
”ہاں بالکل تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر تو میں حیران ہی رہ گئی۔ وہ چلبلا سا وہاں تو مجھے
ڈھونڈے سے بھی نہ مل رہا تھا۔“
”بعض لوگوں کو بننے کی عادت ہوتی ہے۔“
”وہ بن نہیں رہا تھا۔ تجھے پتا ہے کہ تجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر گلاب کھلتے تھے اور آنکھوں
میں مشعلیں جلتی تھیں۔“

”اچھا۔“ غاشیہ مسکرائی۔
”غاشی! یہ زندگی کے سودے ہوتے ہیں۔ جب تک محبت ہمارے پاس ہوتی ہے ہم اس کی
قدر نہیں کرتے اور جب وہ ہم سے پھڑپھڑاتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ زندگی میں کسی شے کی کمی رہ گئی
ہے۔“ آمنہ نہایت دھمے لہجے میں اسے سمجھا رہی تھیں۔
”مجھے یہ احساس نہیں ہو رہا منوں آپا۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بہتر ہوا کہ ہم نے راستہ بدل لیا۔“
”راستہ صرف تم نے بدلا ہے نہ کہ اس نے۔“

”ابھی تو کہہ رہی تھیں اس نے آپ سے میری کوئی شکایت نہیں کی۔ پھر آپ کو کیسے پتا؟“
”بھئی میں نے اس سے کہا کہ ہوٹل میں کیوں شفٹ ہوئے تو کہنے لگا کہ اب ملک ہاؤس کی
دیواریں قفس معلوم ہوتی ہیں۔ بس دم گھٹنے لگا تو وہاں سے نکل آیا۔“
”لفظوں کا تو وہ زبردست کھلاڑی ہے منوں آپا۔ مگر اب میں نے محبت کی عینک اُتار کر حقیقت
کی نظر سے دیکھا تو پتا چلا کہ وہ اور اس کی محبت سوائے فراڈ کے کچھ نہیں۔“

”اس نے بتایا نہیں۔؟“
”میں نے پوچھا ضرور تھا مگر اس نے جواباً کہا کہ میرا جرم آپ غاشیہ سے پوچھیے۔ میں کچھ نہیں
کہہ سکتا۔ اور مجھے تو تب پتا چلا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو کس قدر چاہتے ہو۔ تمہیں میں کن لفظوں
میں بتاؤں کہ وہ کس قدر ٹونا اور ٹھکرا ہوا تھا۔ پلیز غاشی اسے بلاؤ۔“
”ضرورت کیا ہے؟“ غاشیہ بے پروائی سے بولی۔
”یہ کچھ عرصے بعد تمہیں پتا چلے گا۔“ آمنہ نے کہا۔
”دیکھیے منوں آپا۔ آپ کو علم نہیں کہ اس نے میرے اعتماد کا شیشہ کس طرح چکنا چور کیا ہے۔“

ہے ان کا تو۔ کبھی کبھار وہ سکندر ماموں کے ہاں آ جاتی ہے۔ عموماً چھٹیاں وہ انہی کے ساتھ گزارتی ہے۔ آمنہ کو جو تفصیل پتا تھی وہ انہوں نے غاشیہ کے گوش گزار کر دی تھی۔ کہ واقعی سکندر خان نے۔۔۔ اس کا یہی تعارف کرایا تھا۔ کہ وہ ان کے برائے میں دوست کی بیٹی ہے جن کی پوری فیملی باہر سٹیل ہے۔ اور عفرہ اپنی ضدی عادت کی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں گئی کہ وہ اپنا ملک اور لوگ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ بات اتنی معقول تھی کہ کسی نے مین میخ نہ نکالی۔ اسے دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ ”کتنی“ ضدی طبیعت کی مالک تھی۔

سکندر خان ایڈوکیٹ نے اپنے کسی رشتہ دار کو یہ ہوا ہی نہ لگنے دی تھی کہ عفرہ ایک قاتل کی بھانجی ہے اور صرف اپنے ماما کی وجہ سے اس نے سب سے ہر رشتہ توڑ ڈالا ہے۔ ایک ماما کی خاطر۔ ہر خونی رشتے سے نانا توڑ لیا ہے۔

سارے لوگ ایک بندے کا ساتھ دینے کے جرم میں چھوڑ دیے اور پھر بھی وہ مطمئن تھی۔ جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

اما شیر محمد کی رہائی کا خیال اسے ڈھیروں سکھ بخش دیتا تھا اور اس کے سکھ کا کوئی بھی اندازہ نہ کر سکتا تھا۔

آمنہ کہہ رہی تھیں۔
”تو غاشی معافی مانگ لے عفرہ ہے۔“
”واٹ۔“ غاشیہ کو لگا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔
”جھکنے میں عظمت ہے۔“ آمنہ نے کہا۔
”یہ سبق آپ مجھے نہ پڑھائیں۔“

”غاشی وہ بہت حساس ہے۔ میں دو چار بار ہی اس سے ملی ہوں اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تمہارے رویے نے اسے کس قدر ہرٹ کیا ہوگا۔ وہ ٹوٹ پھوٹ گئی ہوگی۔ اپنی نظروں میں شرمندہ ہو گئی ہوگی۔“

”آپ کو اس سے کیا ہمدردی ہے۔؟“ وہ چڑ کر بولی۔
”تم اس سے ملو تو پتا چلے وہ کتنی اچھی ہے۔ تم تو شک کی دلدل میں اتری ہوئی ہو۔ اس کے اندر کی خوبصورتی کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ وہ کبھی بھی یہ جرم نہیں کر سکتی کہ وہ تمہاری محبت پر ڈورے ڈالے۔ وہ تو اوروں کے حقوق کے لیے لڑتی ہے پھر بھلا کسی کا حق کیسے چھین سکتی ہے۔“

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے منوں آپا۔“ غاشیہ نے ہنس کر کہا۔
”مگر میں تمہیں پھر کہہ رہی ہوں کہ تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میں آنکھ بند کر کے کہہ سکتی ہوں عفرہ کے بارے میں تم نے جو سوچا ہے وہ بالکل غلط ہے۔“

”اتنا یقین۔“ غاشیہ اب بھی بے اعتبار تھی۔
”اگر تم کسی اور لڑکی کا کہیں تو میں مان جاتی۔۔۔ مگر عفرہ۔۔۔ نہیں وہ کبھی بھی ایسی نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ اس نے تم سے کہا وہ اپنے اندر کی ساری سچائی سے اس نے کہا ہے۔“
”آپ کو پتا نہیں اس نے میری توہین کی ہے۔ مجھے۔ مجھے کہا کہ میں وہاں کے قابل نہیں ہوں۔“

”وہ منہ پھٹ اور انتہائی صاف گو ہے۔“ آمنہ اب بھی اس کی طرف اشارہ تھیں۔

اس کا خیال تھا میں زخمی ہوں گی۔ ایسا نہیں ہوا۔ میں آج کی لڑکی ہوں۔ محبت میں روگ لینا میری سرشت میں شامل نہیں ہے۔ میں ٹوٹنا نہیں توڑنا بھی جانتی ہوں۔ پھر یہ بات ہے کہ فلرٹ وہ نہیں کرے۔ مجھ سے کیوں کیا۔“
”پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے جو تم سمجھتی ہو وہ بات نہ ہو۔“

”وہ بھی یہی کہتا ہے۔“ آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں اور۔۔۔ اور اس لڑکی نے بھی یہی کہا تھا کہ میں جو سمجھی ہوں وہ غلط ہے۔ جب کہ مجھے علم ہے جو میں نے سمجھا ہے وہی سچ ہے۔ باقی سب جھوٹ ہے۔ فریب ہے مجھے لفظوں کے فریب سے بھلانے کی کوشش وہ کرتا رہا ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ منوں آ یا اب اعتبار کا موسم گزر گیا ہے اور وہاں بے اعتبار ہو چکا ہے۔ وہ کچھ بھی کرے میرا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا۔“ غاشیہ لہجہ جی اور آخری تھا۔

”لیکن مجھے بتاؤ تو ہوا کیا۔ تمہاری بات سے تو یہی لگتا ہے تم دونوں کے بیچ کوئی لڑکی آ گئی تھی۔“

”ہاں۔ بلکہ وہ موجود ہے زندگی کی حقیقت کی طرح مجھے تو عرصے سے اس پر شک تھا۔ لیکن اس روز میرا شک یقین میں بدل گیا جب میں نے ان دونوں کو دیکھا۔ آپ یقین کریں منوں آ یا اب وہ لڑکی وہاں سے اس طرح چپک کر بیٹھی تھی جیسے وہ دونوں ایک ہی ہوں اور۔۔۔“ غاشیہ نے ہونٹ کچلتے ہوئے ساری تفصیل بتا دی۔ ساری بات سننے کے بعد آمنہ بولیں۔

”اگر اس لڑکی کے دل میں کوئی چور ہوتا تو وہ کبھی بھی تم سے وضاحت نہ کرتی۔“

”آپ کو نہیں پتا اس نے میری کس قدر بے عزتی کی ہے۔ اور جب میں نے وہاں کو بتایا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ میں نے کچھ کہا ہی ہوگا جو اس نے اتنی بات کی ہے۔ سنا آپ نے۔ اس نے پھر بھی طرفداری اسی کی۔ اسے حق بجانب سمجھا۔ منوں آ یا۔ یہ ہوتے ہیں محبت کرنے والوں کے انداز۔ اسے تو چاہیے تھا وہ عفرہ کو کہتا وہ غلطی پر ہے۔ لہذا اس نے مجھے کہا میں غلط ہوں۔“

”عفرہ۔“ آمنہ کے لبوں سے یہ نام پھسلا۔
”ہاں! وہ عفرہ امیر کلاس فیلو ہے وہاں کی۔ انتہائی منہ پھٹ بدتمیز لڑکی جس کی دوستی صرف لڑکوں سے ہے۔“ غاشیہ کے لہجے میں عفرہ کے لیے انتہائی نفرت تھی۔

”وہی عفرہ تو نہیں گندی رنگت اور بھوری آنکھوں والی۔“ آمنہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔
”ہاں وہی۔“ غاشیہ نے منہ بنایا۔

”شو لڈرکٹ بال ہیں۔ اور عموماً کھد کر بالاس پہنتی ہے۔“
”ہاں۔ ہاں وہی۔“ غاشیہ نے تقریباً تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ جانتی ہے اسے۔؟“

”جانتی ہوں غاشی اسے میں تجھے واقعی غلط نہیں ہوئی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں۔“
”پھر کیسی لڑکی ہے۔؟“

”بہت بہت نرم دل والی معصوم سی لڑکی ہے۔ نیل کے ماموں ہیں ناصر دار سکندر خان ان کی بیٹی بنی ہوئی ہے۔ ذکیہ ممانی اسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہیں اور اس کی تعریفیں کرتے ہیں۔“

”مگر اس کا اکل سکندر سے کیا رشتہ۔؟“ غاشیہ نے حریت سے پوچھا۔
”وہ ان کے دوست کی بیٹی ہے۔ اس کے والدین ملک سے باہر رہتے ہیں۔ بہت بڑا بزنس

اجد ملک اپنی کیفیت پر حیران تھا کہ وہ ایک دم بالکل اچانک ہی ایک دیہاتی لڑکی کیوں بھاسی

گئی۔

”آئندہ احتیاط کرنا یہاں شکار نہ ہو کوئی۔“ لڑکی نے کہا۔

”اگر خود شکار ہو جاؤں تو۔۔۔؟“ بے ساختہ ہی اجد کے لبوں سے یہ جملہ پھسلا۔

”کیا مطلب؟“ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں چمک کے ساتھ ساتھ حیرت بھی اُٹھ آئی تھی۔

”مطلب پھر بھی بتاؤں گا۔“

”تو پھر تم آؤ گے؟“ اُس نے پوچھا۔

”شاید بار بار آؤں۔“ اجد ملک مسکرایا۔

”لیکن تمہیں کہا ہے تاکہ یہاں شکار نہیں کر سکتے۔“ وہ اپنی بات پر اڑی تھی۔

”شاید شکار ہونے آؤں۔“

”یہ تم شہری لوگ اتنے اوکھے اوکھے جملے کیوں بولتے ہو۔ تمہاری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ ایسے

ہی۔۔۔ ایسے ہی کبھی بھی مجھے اپنی ماں کی باتیں بھی سمجھ نہیں آتیں۔؟“ آخری جملہ اتنا آہستہ تھا کہ اجد

سن نہ سکا تھا۔

”تم نہیں سمجھیں۔“

”ناں۔“

”سمجھائیں گے اور بہت اچھی طرح سمجھائیں گے۔“ اجد کی آنکھوں میں ایک دم ہی جذبے لو

دینے لگے تھے۔ ”تمہارا نام کیا ہے۔؟“

”میراناں۔!“ اُس نے کہا۔

”ظاہر ہے میں نے تم ہی سے پوچھا ہے اور تو یہاں کوئی نہیں۔“ اجد نے براہ راست اُس کی

آنکھوں میں جھانکا تو اُس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

”ہوں بتاؤ کیا نام ہے۔“

”ضروری ہے بتانا۔“

”تاہاں! تاہاں چل بھی سورج ڈوب گیا ہے۔“ جھاڑیوں کے جھنڈ کے پار سے ایک نسوانی

آواز میں کسی نے پکارا۔

”آئی۔!“ وہ بولی اور ایک دم ہی پلٹ کر تیزی سے چڑھائی اُترنے لگی۔ اجد ملک نہایت

دلچسپی سے اُس کی پشت پر تھکرتی ناکن ٹیلیسی جونی کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گئی۔

”تاہاں۔“ اجد کے لبوں کے کھنور میں یہ نام پھنس کر رہ گیا اور پھر اُس نے یہ نام ہونٹوں ہی

میں جذب کر لیا۔

”چلو غلام حسین۔“ اجد نے رائفیل ملازم کو پکارتی اور اپنی جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر اُچک کر

بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اُس دن راج کا پکڑ بہت بُرا ہوتا ہے۔ پھر اپنی انا کو گھلنا اس سے بھی برا ہوتا ہے۔ لیکن غاشیہ

نے طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو اب وہ وہاں کو ایک بار پھر وضاحت کا موقع ضرور دے گی۔ آئندہ کی

باتوں سے اُس کے دل کے آسمان پر چھائے کدورت کے بادل کچھ چھٹے ضرور تھے مگر مطلع پوری طرح

”یعنی آپ سمجھتی ہیں وہ حق بجانب ہے۔“

اگر اس کی جگہ میں بھی ہوتی تو یہی کہتی۔

”تو آپ اندازہ لگائیں کہ وہاں کے لیے اس کے دل میں کون سا جذبہ ہے۔“ غاشیہ اب بھی

شک کے کھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔

”سوائے دوستی کے اور کوئی جذبہ نہیں ہے۔“ آئندہ اب بھی اپنی بات پر اڑی ہوئی تھیں۔

”حیرت ہے آپ میری بجائے ایک غیر لڑکی کی حمایت کر رہی ہیں“

”وہ ہے ہی اس قابل۔“

”تو جائیں اس کے پاس۔“ غاشیہ ہڑک اٹھی اور منتناقی ہو کر سے نکل گئی۔ آئندہ پر سوچوں

کی چار آگری۔

☆☆☆

دور یا نہایت تیزی سے اپنی منزل کی جانب بہہ رہا تھا۔ اجد یہاں مرغابیوں کے شکار کے لیے

آیا تھا۔ اُس نے رائفیل غلام حسین سے لی اور چند گز کے فاصلے پر بیٹھی مرغابیوں پر پشت باندھ کر فائر

کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم ہی کسی نے رائفیل کی نال اوپر کر دی تب تک اس کی انگلی ٹرائیگر دبا چکی

تھی۔ ہوائی فائر ہوا تھا اور مرغابیاں پھڑ پھڑاتی ہوئی اُڑ گئی تھیں۔

اجد ملک کی نظر اپنے سامنے کھڑے ہوئے اُس کول سے وجود پر پڑی۔ جس کا ایک ہاتھ

رائفل پر تھا اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی اس نے پیچھے رکھی تھی۔ اجد ملک گڑبڑا گیا۔ سرودند۔ گندم کے

خوشوں کی طرح چستی رنگت والی وہ لڑکی جس کی آنکھوں میں عجیب سا گداز تھا۔ پگھڑی کے سے

ہونٹ کانپ رہے تھے پھر اُن ہونٹوں پر الفاظ اُتر آئے بالکل وہی کی طرح۔ شیریں لہجے میں کہا گیا۔

”تمہیں شرم نہیں آتی بے زبان جانوروں کی جان لیتے ہوئے۔“

اجد کا دل چاہا کہہ دے۔

”تمہیں شرم نہیں آتی ایک دم میری جان تلواروں میں سے نکال لی ہے۔“ مگر وہ خود کو سنبھالتے

ہوئے بولا۔

”اس میں شرم کی کیا بات ہے کون ہے جو یہاں آ کر مرغابیوں کو شکار نہیں کرتا۔ اگر میں نے کیا

تو جرم ہے بھلا۔“

”مگر یہاں کسی کو شکار نہیں کرنے دیا جاتا۔“

”کیوں؟“ اجد نے پوچھا۔

”بس یہ ہماری بستی والوں نے طے کیا ہوا ہے یہ پرند ہمارے علاقے میں ہماری پناہ میں

ہوتے ہیں اور ان کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔“ وہ گول سی لڑکی نہایت اعتماد سے بول رہی

تھی۔ اجد تو حیران ہی رہ گیا۔

”یہ تمہاری بستی ہے۔“ اجد نے چند فرلانگ دور بنے کچے گھروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ اُس نے سر ہلا کر اتنی معصومیت سے کہا کہ اجد اسے دیکھنے لگا۔ اس کی ستواں

ناک پر پسینے کی بوندیں سچے موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں ڈوبتے سورج کی ٹھنڈی روشنی میں وہ اُس

کے قریب کھڑے کھڑے ہی دل کی عمیق گہرائیوں میں اترنے لگی تھی۔

رگ و پے میں مساموں میں اترنے لگی تھی۔

صاف نہ ہوا۔ اور اب وہ تیزی سے یوازہ ہاسٹل کے نمبر ڈائل کر رہی تھی مگر بار بار خود ہی سلسلہ منقطع کر دیتی۔

کیا کہوں گی میں وہاں کو۔۔۔ پھر تو وہ اور بھی اکڑے گا کہ میں اُس بن نہیں رہ سکتی۔ یہ سچ بھی ہے میں نے خود پر کتنے کڑے پہرے لگائے ہیں وہ کیا جانے میں آج کے دور کی لڑکی ہوں۔ محبت کو روگ بنانا میرے عہد کا تقاضا نہیں ہے۔ مگر منوں آپا کی باتوں سے محسوس ہوا ہے مجھے کہ واقعی تم سچ کہتے ہو ورنہ یہ وضاحتیں تو نہ کرتے۔ مجھے پتا ہے میری ایک فون کال پر تم دوڑے چلے آؤ گے۔ تم میرے بلاوے کے منظر ہو گے۔ اُس نے سوچا تھا اور پھر یونیورسٹی یوازہ ہاسٹل کے نمبر ڈائل کیے ہی تھے کہ اس کے اندر سے اُٹا کے ناگ نے سراٹھایا۔

کیا کر رہی ہو بے وقوف لڑکی تم کیوں گر رہی ہو۔ اپنے آپ کو کیوں اتنا چھوٹا بنا رہی ہو۔ محبت میں کیا چھوٹائی برائی بھلا۔ اس دلیل سے اس نے خود کو سمجھایا۔ اور پھر نمبر ملایا۔ مگر کئی بار خود ہی اُس نے سلسلہ منقطع کر دیا کہ انا پیروں کی زنجیر بن رہی تھی۔ اور پھر آخر وہ ہار گئی۔ تیسری کھنٹی پر دوسری طرف سے ریسپور اٹھا لیا گیا تھا۔

”پلیز روم نمبر تھرٹین سے وہاں احمد کو بلا دیجئے۔“ غاشیہ نے کہا۔ وہاں نے کئی بار آصف کا نمبر اور زوہیب کو فون کیا تھا اس کے سامنے ہی اس لیے اسے روم نمبر یاد تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ وہاں ان ہی کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی انیٹرٹینس میں آواز ابھری۔

”جی میں زوہیب بول رہا ہوں کوئی سچ ہو تو دے دیں وہاں تو نہیں ہے۔“ تیز تیز تنفس کے درمیان زوہیب جھفٹری کہہ رہا تھا۔

”کہاں گئے ہیں؟“ غاشیہ کی پھنسی پھنسی آواز ابھری۔

”وہ ذرا کام سے گیا ہے۔“

”کہاں۔ کب تک آ جائے گا۔؟“

”یہ تو میں نہیں کہہ سکتا وہ کب آئے گا۔ جس کے ساتھ گیا ہے یہ تو اُس پر منحصر ہے کہ وہ کب چھوڑے۔“

”کس کے ساتھ گیا ہے۔؟“ غاشیہ نے پوچھا۔

”عفیرہ نے کوئی انٹرویو کرنا تھا وہ اسے لے گئی ہے۔“ زوہیب نے بتایا تو غاشیہ کے دل میں ایک دم ہی کانٹے اُگ آئے اسے لگا جیسے یہ کانٹے اس کے دل کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی چبھے گئے ہوں۔

”آپ کون بول رہی ہیں؟ کیا کہنا ہے اُسے۔“

”کوئی بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“ غاشیہ کے لب کانپے اور اُس نے فوراً ہی ریسپور کر ڈیل پر رکھ دیا۔ وہی ہے تمہاری منزل وہاں احمد۔ وہی ہے تمہاری منزل۔ غاشیہ ہونٹ کچلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

ملکانی آسیہ نے اپنی گود میں سر رکھے لیٹے جمال الدین ملک کے بالوں میں انگلیاں الجھاتے ہوئے نہایت نرم لہجے میں پوچھا۔

”کیا بات ہے جمال پتر تو سویرے سے بہت چپ ہے؟“

”کچھ نہیں ماں۔“

”کچھ تو ہے۔“ آسیہ بیگم جاننا چاہتی تھیں۔

”بس تھک گیا ہوں۔“ وہ آہ بھر کر بولے۔

”تھکے تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ تو اتنا کام نہ کیا کر۔“ ماں نے پیارے سے کہا۔

”کیا کرتا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ماں جی، آپ نے کسی ایسے مسافر سے سفر کی روکد اُٹنی ہے جو ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہے پھر بھی جب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچتا ہے تب بھی اس کا جواز جوڑ دکھ رہا ہوتا ہے جیسے کہ وہ سفر اس نے پیدا ل کیا ہو۔ دیکھا ہے ایسا مسافر؟“

”ہوں۔“ آسیہ بیگم نے سر ہلایا۔

”بھلا کہاں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”مجھے دیکھ رہی ہوں برسوں سے یہی حال ہے تیرا جب بھی تو گاؤں آتا ہے تھکن تیرے چہرے پر دوڑ رہی ہوتی ہے۔“

”ماں جی، آپ کے پاس آ کر تو ساری تھکن اتر جاتی ہے۔“ جمال الدین ملک نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

”جب یہ خوبصورت ہاتھ میری بلا میں لیتے ہیں نا اور یہ انگلیاں۔“ انہوں نے ماں کی ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں گولیوں سے لگایا۔

”یہ سیما انگلیاں جب میری تھکن کے سارے کانٹے چن لیتی ہیں تو لگتا ہے جیسے میں بچتی دھوپ میں طویل سفر کے بعد کسی سایہ دار شجر تلے ٹھنڈے میٹھے چائے کے کنارے پر آ گیا ہوں۔ ماں جی یقین کریں آپ کی قربت کے چند گھنٹے تازہ دم کر دیتے ہیں۔ بہت توانائیاں آ جاتی ہیں مجھ میں۔“

”ماں داری۔“ ملکانی آسیہ کا لہجہ محبتوں کے امرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بالکل میں بھی اسی طرح مسکرتی ہوں میری آنکھوں کی چمک تمہیں دیکھ کر بوھ جاتی ہے۔ بس کبھی کبھی خیال آتا ہے تو اتنا

خوش کیوں نہیں جتنا بھی تجھے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میں بہت خوش ہوں ماں جی۔“

”ماں سے جھوٹ نہیں بولتے۔ تجھے شاید پتا نہیں ماں تو اولاد کے دل کے اندر گھسی ہوتی ہے۔ ہر واردات کی خبر ہو جاتی ہے اسے۔ مجھے پتا ہے تیرے دل کے آسمان پر کس قدر دھند چھائی ہوئی ہے۔ اور جس زندہ زمینوں پر جب تک پانی نہ رہے ان کی گھٹن ختم نہیں ہوتی۔“

”ماں جی۔“ جمال الدین ملک نے سراونچا کر کے ماں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولے۔
”آپ کو کیا خبر؟ کتنے برسوں سے میں اپنے دل کی جس زندہ دھڑکی پر اپنے آنسوؤں کی بارش کر رہا ہوں پر کیا کروں کہ گھٹن ختم نہیں ہوتی۔ ماں جی، کیوں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان خود کو غریب سمجھتا ہے۔ اپنا کشکول خالی ہی نظر آتا ہے۔ وہ سکہ کشکول میں کیوں نہیں آگرتا جس کی خواہش ہے۔ ہاں ماں جی، خواہشیں پوری نہ ہوں تو زلاتی کیوں ہیں؟“ وہ بچوں کی طرح ضدی لہجے میں بولے۔

”تو کیوں روتا ہے؟“

”ماں جی، مجھے تو ظفر کا دکھ بھی زلاتا ہے۔ کتنا پریشان ہے وہ بھی اب تک۔ نو جوانی میں گلے زخم کو اب تک چاٹ رہا ہے کہ جیسے یہ ختم ہو جائے گا۔ مگر ایسا تو نہیں ہے نا؟ زخم مندمل کیوں نہیں ہوتا۔ پتا ہے مجھے جب سے اسجد نے بتایا ہے نا کہ وہ کہاں کہاں تلاش رہا ہے اپنے مقدر کے ستارے کو تو میں خود سے شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ میں نے تو اپنی بیٹی کی تلاش ختم کر دی۔ سوچ لیا کہ سیلاب کا پانی اسے بہالے گا۔ اور۔۔ اور ظفر ہے کہ اسے دنیا کے کونے کونے میں تلاش رہا ہے۔ ماں جی، کیا وہ مل جائے گی؟“ وہ ایک دم ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔
”شاید مل جائے اور نہ بھی ملے۔“

”آپ آس دلا کے دوسرے لمحے توڑ کیوں دیتی ہیں۔“

”پتر زندگی اس طرح تو نہیں گزرتی جس طرح ہم گزارنا چاہتے ہیں۔ زندگی تو ہمیں گزارتی ہے۔“
”پھر بھی میں کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ مجھ سے کوئی عدیرہ کے بارے میں مایوسی والی بات کرے۔“

”ماپوس تو تم ہو گئے ہو۔“

”نہیں ہوا۔“ وہ پر عزم لہجے میں بولے۔

”مت جھٹلاؤ اس حقیقت کو کہ تم برسوں قبل ہی عدیرہ کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔ تبھی تو تم نے شادی کر لی اور زندگی کی نئی دوڑ میں شامل ہو گئے۔“
”کیا میں بھی ظفر کی طرح قریہ قریہ گھومتا؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔
”میں نے یہ کہا کہا؟“ وہ بولیں۔

”ماں جی، اگر مجھے یہ امید ہوتی کہ عدیرہ مجھے مل جائے گی تو قسم خدا کی میں بن باس لے لیتا۔ میں اپنی بیٹی کو دنیا کے آخری کونے اور سمندر کی تہ تک گہرائیوں تک تلاش کرتا مگر۔۔۔“
”اب تم نہیں کر رہے مایوسی کی باتیں۔“ وہ بولیں۔
”میں چاہتا ہوں دوسرے مجھے حوصلہ دیں میرے زخموں پر مرہم رکھیں نہ کہ مجھے دہلا دیں۔“

میرے زخموں کو کریدیں۔ ماں جی، میں آپ کی طرف سے بھی یہی امید رکھتا ہوں۔“
”امیدوں پر زندہ رہنا چاہتے ہو؟“

”شاید زندگی کا جو تھوڑا سا سفر ہے وہ سہل ہو جائے۔ یقین کریں آپ، میں بہت تھک گیا ہوں۔ برسوں گزر گئے ہیں، یہ تھکن ہی نہیں جاتی۔“ ان کے لہجے میں بھی تھکن کے کانٹے اتر آئے تھے جو سیدھے ملکائی آسیہ کے دل میں چھپتے، ان کی آنکھوں کے گوشے بھیکنے لگے مگر ان کے لبوں پر مکرانٹ بکھر گئی اور وہ بات بدلتے ہوئے بولیں۔
”رائف کی ماں سے نہیں آیا۔“

”مصرف ہے۔ فائل ایگزام ہیں نا اس کے۔ اب میں جاؤں گا تو بھیج دوں گا۔ پھر گل کہتی ہے اسے بائز اسٹڈی کے لیے باہر بھیجوں۔ دیکھیں۔“ انہوں نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔
”کیوں اتنا دور کرنا چاہتی ہے؟“
”ماں جی۔ بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے انہیں دور کرنا ہی پڑتا ہے اور گل بھی یہی چاہتی ہے۔“ جمال ملک نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

”ہر ماں یہی چاہتی ہے۔ مگر کوئی ماں بھی یہ نہیں چاہتی کہ اس کی اولاد دُور ہو۔“

”پھر آپ نے مجھے کیوں اسٹینس بھیجا تھا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”یہ تو تمہاری ضد اور ملک صاحب کا شوق تھا جمال ورنہ میں کب چاہتی تھی تم دور ہو۔“

”بس تو یہ رائف کا بھی شوق ہے ضد ہے۔ کچھ بھی نہیں اسے وہ مزید پڑھنا چاہتا ہے۔ اسے کمپیوٹر کرنے کا شوق بھی ہے اور ماں جی، میں بھی چاہتا ہوں وہ یہ کورس کر لے آج کل تو کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے۔“ جمال الدین ملک نے سیدھے سادے طریقے سے ماں کو سمجھایا۔

”خندناں کے بارے میں بھی سوچا کچھ؟“

”ماں واقعی دل میں بیٹھی ہوتی ہے۔“ وہ ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

”اچھا یقین آ گیا۔“ وہ مسکرائیں۔

”ہاں۔ یہ یقین تو برسوں سے آیا ہوا ہے۔ بس آپ یہ جانیں کہ اس بار میں آیا ہی اس لئے تھا؟“
”آپ خندی کے مستقبل کا فیصلہ کریں۔“
”میں کروں۔“ آسیہ بیگم حیران تھیں۔

”آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“

”مجھے کیا اعتراض۔ پر۔“ وہ ایک دم ہی خاموش ہو گئیں۔

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“ جمال ملک نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے سر کو جھٹکا دیا۔

”گل کی آپ پر واندہ کریں۔“

”وہ ماں ہے۔“

”اور آپ کون ہیں؟“

”میں تمہاری ماں ہوں۔“

”پھر خندی آپ کی کچھ ہے نا۔“

”بہت کچھ ہے میری۔“
 ”تو پھر آپ کیوں شش و پنج میں مبتلا ہیں۔“
 ”تمہیں میرا فیصلہ قبول ہوگا؟“
 ”آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟“

”دیکھو جمال پٹر۔ کچھ فیصلے انسان کو بہت دکھ دیتے ہیں اور میں بھی کوئی ایسا فیصلہ تمہیں دے سکتی جو تمہیں دکھی کر دے کہ تم تو پہلے ہی۔“ آسیہ بیگم نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبایا۔
 ”ماں جی۔ آپ یقین کریں آپ کے ہر فیصلے پر میں آنکھیں بند کر کے دستخط کر دوں گا۔“
 بھروسہ کریں مجھ پر۔ اگر خاندان کا کوئی لڑکا آپ کی نظر میں ہو تو۔۔۔“
 ”تمہیں جلدی کیا ہے؟“

”میں نہیں چاہتا خندی اس خاندان کی زنجیر سے الگ ہو۔۔۔ ماں جی میری بیٹی بہت کچھ ہے۔ آپ یقین کریں کہ کبھی بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ گل فشاں جیسی عورت کے کٹن سے چمکا والی میری بیٹی اپنی ذہین اور ہر بات کو محسوس کرنے والی کس طرح ہو سکتی ہے۔“
 ”اس کی رگوں میں خون تو تمہارا ہے نا اور وراثت بھی تربیت میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔“

”شاید یہی وجہ ہے۔ خیر آپ بتائیں نا؟“
 ”مجھے وقت تو دو۔“

”وقت کی بات ہے آپ حکم کریں تو جمال ہے کوئی انکار بھی کر دے۔“ وہ بولے۔

”مجھے پتا ہے وہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔“
 ”کون؟“ وہ جانتا چاہتے تھے۔
 ”اجد۔“ آسیہ بیگم بولیں۔
 ”اوہ۔“ وہ نجانے کیوں مجھ سے گئے۔
 ”تمہیں اعتراض؟“

”نہیں تو ماں جی۔ اگر آپ ہمارے بات کرتیں تو بہتر تھا۔“ جمال الدین ملک نے اپنے اہل خواہش کا اظہار کر دیا۔

”ہمارے وہاں کے بارے میں؟“

”جی۔“ نہ جانے کیوں ان کا سر جھک گیا۔

”اجد میں کیا برائی ہے؟“ آسیہ بیگم نے پوچھا۔

”یہ بات نہیں ماں جی اصل میں مجھے وہاں بے حد پسند ہے۔ بہت حساس لڑکا ہے دکھ درد والا۔ جبکہ اجد ذرا لاپرواہ سا ہے۔“

”اس عمر میں لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر جو مجھے ہر لحاظ سے پسند ہے۔ اگر تمہارا نہیں ہے۔ تو نہ سہی۔ میں ہمارے بات کر لوں گی جبکہ میرا خیال ہے ہمارے وہاں کو کمال کے گھر کی اجازت ہی اس لیے دی ہے غاشیہ کی وجہ سے۔“

”اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں۔“ جمال ملک کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

”میں موقع دیکھ کر بات کروں گی۔“ وہ پھر بھی بولیں۔

”رہنے دیں ماں جی۔ مجھے لگتا ہے وہاں بھی غاشیہ میں انٹرٹنڈ ہے۔ میں الیکشن کے دنوں میں ہاں رہا ہوں نا تو اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ ایسا ہی ہے۔ حالانکہ وہ ہر پل ہر ساعت لڑتے رہتے ہیں لیکن جہاں محبت ہو وہاں لڑائی بھی ہوتی ہے اور یہ محبت ہی کی نشانی ہے۔ آپ اجد سے پوچھیے گا۔“
 ”مجھے یقین ہے میرا انتخاب تمہیں پسند آئے گا۔“

”آپ کا انتخاب ہوتا ہی لا جواب ہے ماں جی ورنہ نور العین کو اب تک میں بھول چکا ہوتا۔“

”مت یاد رکھا کرو۔“ وہ تڑپ کر بولیں۔

”کاش بھول سکتا۔ پتا ہے ماں جی کبھی کبھی میں سوچتا ہوں میرے ذہن کی سیٹ پر ایسا کپڑا پھرا جائے کہ ہر خیال اور ہر یاد کی تحریر صاف ہو جائے۔“

”خدا نہ کرے۔“ ملکائی آسیہ تڑپ کر بولیں۔ ”بھٹلے ہو تم تو۔ اگر یادیں اور خیال نہ ہوں تو بڑی کا کیا حراز ہے بھلا۔“ ان کی بات پر جمال ملک مسکرا کر ماں کی آنکھوں میں دیکھنے لگے تو ملکائی آسیہ نے انہیں کسی معصوم بچے کی طرح سینے سے لگالیا۔

☆☆☆

۔ وہ ایک شخص مجھے ساری عمر ترے گا!

نصیب اس کے کہ اس نے مجھے گنویا تھا

غاشیہ کمال نے ڈائری میں یہ شعر نوٹ کیا اور پھر اس کی پلکوں پر آنسو موتیوں کی طرح آن لاک گئے۔

دل درد سے بھر گیا تھا۔

رگیں ٹوٹنے لگی تھیں۔

اس درد سے بھلا وہ کب آشنا ہوئی تھی۔

وہ تو ہمیشہ قہقہے لگاتی تھی۔

ہنسی ہنساتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ اور گالوں پر سرخ چھلکتی تھی۔

تم نے مجھے گنوا دیا وہاں۔

ایسا کب میں نے سوچا تھا۔

”تم جس بات کو جھوٹ کہتے رہے وہ تو سچ نکلی! اگر ایسا نہ ہوتا تو زوہیب مجھے کیوں بتاتا؟۔“

کیوں کہتا کہ تم عفیرہ کے ہمراہ گئے ہو۔

آخر اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے جو تم اسے لیے لیے پھرتے ہو۔ وہاں احمد! تمہیں پتا نہیں شاید انکوشوں کی تشہیر کی ضرورت نہیں ہوتی خود بخود ہی انسان کو سمجھ میں آ جاتے ہیں اور مجھے بھی سمجھ آ جاتا ہے جو تمہارا عفیرہ امیر سے رشتہ ہے۔

اب کوئی وضاحت بھی کرو وہ قابل قبول نہیں ہوگی۔ تمہیں کیا پتا میں نے اپنی انا کو کس طرح کچلا

کیسے میں نے خود سے خود کو ہرایا۔

اپنے آپ سے ہارنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے! اس کرب سے گزری ہوں میں۔

مجھے پتا ہے محبت کا عذاب۔

محبت سوائے غم اور دکھ کے کچھ نہیں۔

ارے میں تو جتنی تھی میں تم بن رہ لوں گی مگر منوں آپا کی باتوں کا جب تجزیہ کیا تو جی میری سمجھ تو ناقص تھی۔

شاید مجھے آگہی نہیں تھی کہ میں نے تمہیں کتنی شدت سے چاہا ہے۔

پوچنے کی حد تک تمہاری پرستش کی ہے۔ اور یہ ادارک مجھے ایک دم ہی اچانک ہی ہوا ہے کاش وہاں احمد میں منوں آپا کی بات نہ مانتی۔ خود کو نہ ٹوٹی تو یوں ریزہ ریزہ نہ ہوتی۔ پتا میں کتنی بلندی سے گری ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں بچا۔

کرجی کر چکی ہو گئی ہوں۔

اور وہ گر چیاں میری روح میں دھنس رہی ہیں۔

مجھے یہ دیکھ نہیں کہ تم نے مجھے ٹھکرایا ہے۔ غم تو یہ ہے کہ جس کی خاطر ٹھکرایا ہے وہ نہیں۔

سارا زمانہ اس کی تعریف کرتا رہے۔

ساری خدائی کہے کہ وہ اچھی ہو سکتی ہے مگر میں نہیں مان سکتی۔ جولو کی دل کو توڑے وہ ہو سکتی ہے۔

وہاں احمد اس نے تمہیں مجھ سے چھین لیا ہے۔

اور میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔ نہ ہی تمہیں معاف کروں گی۔

آئی ہیٹ یو وہاں احمد اینڈ عفیرہ امیر۔ آئی ہیٹ یو بوجھ آف دیم۔

غاشیہ نے ہونٹ پکلے اور بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے وہاں احمد کی فریم شدہ کردیکھے بغیر ہی دیوار پر دے ماری اور پھر تنکیوں میں منہ چھپا کر بلک پڑی۔

پتا نہیں لڑکیاں باریکیوں جانی ہیں؟

خود ہی آگ لگانی ہیں اور پھر چاہتی ہیں دھواں بھی نہ اٹھے۔ بھلا یہ کب ممکن ہے؟ اور یہ اس کے دل کی انکیتھی میں دہکنے والی آگ ہی تو تھی جس کا دھواں اس کی آنسو بن کر قطرہ قطرہ بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

”اس کا مطلب ہے تم مطمئن ہو۔“

”ہاں بے حد مطمئن۔ اتنا سکھ۔۔۔ تو میرے ذہن و قلب نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ دکھ کے کچھ نہیں ہے۔“

”کیا تم غاشیہ کو بھول گئے؟“

”پرانے تعلق اتنی جلدی تو نہیں بھلائے جاتے نا۔ وقت لگتا ہے۔“

”فرض کرو تم بھول جاؤ پھر۔“

”پھر کیا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ انجانے سے کرب سے تو نجات ملے گی۔ ان چھکارہ ملے گا۔ جو رہ کر دل میں ابھرتی ہیں۔ اور تب ہی میں مطمئن ہوں گا۔“

”تمہیں غاشیہ سے تعلق ٹوٹنے کا دکھ تو کا؟“

”ہے۔ ضرور ہے دکھ۔ مگر اس دکھ یہ وہ دکھ بھی حاوی ہے کہ اس نے مجھ پر شک کیا اور یوں بھی بھلا ضروری تو نہیں کہ ہر تعلق نفرت کر کے ی توڑا جائے۔ محبت سے بھی تو راستہ بدلا جاسکتا ہے۔“

انجام نے ہتھیلیاں گھاس پر ٹکا دیں۔

”مگر ہم اتنے شریف کب ہیں کہ کسی کو یہ کہہ سکیں کہ اب دل بھر گیا ہے راہ بدل لو یا ہم تھک گئے ہیں۔“

”مجھے پتا ہے نا غاشیہ کا مجھ سے دل بھرا تھا اور نہ ہی وہ تھکی تھی بس معلوم نہیں کیوں وہ ایک دم نا اہوا پسند ہو گئی وہ ایسی تو نہ تھی۔“

”وہاں عورت کے بدلنے میں کوئی دیر نہیں لگتی عورت اور مقدر میرے خیال میں ایک ہی چیز ہے نہیں شاید پتا نہ ہو عورت جسے بھی چاہتی ہے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے اور صلے میں سوائے محبت کے کچھ نہیں چاہتی مگر جب وہ نفرت کرتی ہے تو وہ بھی شدت سے کرتی ہے۔“

”عجیب منطق ہے تمہاری۔“

”منطق نہیں سچائی ہے زندگی کی یہ۔ تم مرد لوگ نفرت نہیں کر سکتے۔“ اُس نے گھٹنوں پر ٹھوڑی باتے ہوئے کہا۔

”پھر بڑے دل کے ہوئے نا۔! وہاں اکثر کر بولا۔

”نہیں۔ تمہارے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں وہی۔ تم انتقامی لوگ ہو انتقام تمہارے سرشت کا مثال ہے۔ محبت نفرت کا کھیل تو تم لوگ کھیل ہی نہیں سکتے۔“

”پھر ہم کیا کرتے ہیں؟“ وہاں نے پوچھا۔

”فلٹ اور بدلہ۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”بکواس کرنے کی تمہیں کچھ زیادہ ہی عادت ہے۔“ وہاں ہنس دیا۔

”کیا لڑکے فلٹ نہیں کرتے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”کرتے ہوں گے ضرور۔ ساری انگلیاں تو برابر نہیں ہوتیں نا؟ تمہیں کیا پتا مرد کس طرح عشق کرتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو فرہاد شیر کیوں کھودتا، راجھا کان کیوں چھوڑا نا اور۔۔۔“

”اور تمہارا سر بس یہ دو چار مثالیں رٹ لی ہیں کیا شیریں نے نکلات کی آسائش ہونے کے لیے فرہاد جیسے کو بہن کو نہیں چاہا۔ ہمیر جیسی خوبصورت عورت راجھے کے عشق میں مبتلا نہ ہوئی جو اُس کی دل چاہتا تھا۔“

”وہ بھی محبت کی خاطر اُس نے اتنا کم ز کام قبول کیا تھا ورنہ وہ تو تخت ہزارے کا وارث تھا۔“

”جیسا یہ محبت ہوتی کیا ہے؟“ بڑا پرشون سا لہجہ تھا عفیرہ کا۔

”کبھی کر دیکھو“ وہاں نے مشورہ دیا۔

”کیا یہ جذبہ پلاننگ کا محتاج ہے۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”تم بھئی لڑکی بغیر پلاننگ کے محبت بھی نہیں کر سکتی۔“

”بالی کام تو میں پلاننگ سے کرتی ہوں نا۔؟“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”شاید ایسا نہ ہو۔“

”یا نہیں کیوں آج کل شدت سے جی چاہ رہا ہے میں بھی محبت کروں۔ سب کچھ بھول
سوائے تصور جانا کے وہی بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے پھینکی پھینکی سی کوئی بھی تو چارم نہیں ہے۔
ہی کم نہیں ہوتیں۔“

”بھئی یہ کیا کیوں پلٹی؟“

”آج کل میں لوگ گیت بہت سن رہی ہوں تم یقین کرو گے کہ لوگ گیت سن کر جی
ہی محبت کرنے کو چاہنے لگتا ہے۔ کتنی خوبصورت شاعری ہے۔ مساموں میں گھسی چلی جاتی ہے
روح بھی ناچ اٹھتی ہے مست موربن کر۔“

”ہوں۔“ وہاں۔۔۔ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

”تم نے بھی سنے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”تم جو سن رہی ہو۔“

”میں اور تم ایک تو نہیں۔“

”اے دھیان سے تمہاری نیت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔“ عفرہ نے اُسے شرارت سے
دیکھا۔ اور وہاں احمد نس دیا۔ اور نہایت غور سے عفرہ کو دیکھنے لگا۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔؟“ اُس کے دیکھنے پر بولڈی عفرہ امیر گڑبگڑ گئی۔

”دیکھ رہا ہوں کہ تم اس قابل ہو کہ تم پر نیت خراب کی جاسکے۔“

”کردیکھو ملے گا کچھ بھی نہیں۔“ پشت پر آئی آواز پر وہاں نے گردن موڑ کر دیکھا۔

کا بنجو فرحت منیر کھڑے تھے۔

”اؤ بھئی یہ کن سونیاں لینے والی عادت کب سے ڈال لی۔“ وہاں نے پوچھا۔

”اب تم دونوں فل والیم سے بولو تو ہمارا کیا قصور ہے؟ کیوں فرحت۔“ آصف کا

فرحت سے پوچھا۔

”بالکل۔“ فرحت منیر نے گھاس پر فائل پھینکی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا جبکہ آصف لگا

تھا۔

”تم کیا کھڑے ملک سے آئے ہو؟“

”تم نے بیٹھنے کو کہا۔“ وہ کٹ کھٹے انداز میں بولا۔

”بھئی میں انتہائی ال میمز ڈلڑکی ہوں نہ مجھ سے میمز نہ بھائے جاتے ہیں نہ ہی روایات

سی زندگی ہم تکلفات کی نذر کر دیں بھلا کوئی تک بھی ہے۔ بیٹھنا ہے تو بیٹھو۔ ورنہ بھاگ کر

سے بیگو جوس تو لے آؤ تم سے ہم حلق سوکھا جا رہا ہے۔“ عفرہ نے کہا تو وہاں احمد نے سوچا

بات بدلتی ہے اور کس طرح اسے بات بدلنے کا فن بھی آتا ہے۔

آصف بولا کچھ نہیں بس اُسے گھوڑا ہوار فیڑی شوکی طرف بڑھ گیا کہ بعض لوگ اس قدر

ہوتے ہیں تاکہ انسان باوجود خواہش کے اُن کی کوئی بات رد نہیں کر سکتا اور۔

عفرہ امیر بھی آصف کا بنجو کو اتنی ہی پیار ہی تھی۔ بلکہ وہ اپنے پورے گردپ کو ہی

تھی۔ کوئی بھی اُس کی بات ماننے کا خود میں حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

بعض لوگ ہوتے ہیں ناجن کی اہمیت خود بخود ہی بن جاتی ہے۔ انہیں کسی سے

کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ و آپ ہی اُن کی عزت کرنے کو جی چاہتا ہے وہاں

میں واحد لڑکی تو تھی وہ بھی مرد نما لڑکی۔

جس سے سب محبت بھی کرتے تھے۔

اُس کی ہر بات مانتے تھے۔

یہ مقام اُس نے اپنی اچھی عادات کی وجہ سے پایا تھا۔ بے شک وہ آصف کا بنجو کو لفظوں کی بے

پہنچیاں دیتی تھی۔ پھر بھی وہ پروانے کی طرح اُس کا طواف کرنے سے باز نہ آتا تھا۔

☆☆☆

کالا تل مانی دا سوئے ملکھ تے سجدا اے

کے دساں مینوں کتنا پیارا۔ لگدا اے

(میرے محبوب کے چہرے پر کالا تل بہت ہی جتا ہے میں کیسے بتاؤں کہ وہ مجھے کتنا پیار لگتا

ہے۔)

وہ دریا سے پانی کا گھڑا بھرتے ہوئے نہایت دھیمے سُروں میں گنگنا رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے

ماہی اُس کے ساتھ ہی گنگنا رہی ہو۔ بے اختیار ہی اسجد ملک کا ہاتھ اپنے ہونٹ کے دائیں کونے پر

پاگیاں ٹھوڑی سے اوپر ہونٹ کے گوشے پر چھوٹا شامل تھا۔ سیاہ رنگ کا۔ اُس کے لب کھل اُٹھے۔

اباں ایک جھپٹے سے سدھی ہوئی اور پھر وہ ٹھک کر گھڑا اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ پانی میں تھر تھراتے

مانے کو دیکھ کر اُس کے گھڑے کی جانب بڑھتے ہاتھ رک گئے۔ اُس نے گردن ترجیحی کر کے اپنے

اُپ کھڑے اُس اونچے قد کاٹھ کے اسجد ملک کی طرف دیکھا۔

”بہت خوبصورت آواز ہے تمہاری۔“ اسجد اُس کے قریب آ کر بولا۔

”رائی بات ہے یہ۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”اگر میں کہوں تو نئی سمجھا کرو۔“ اسجد نے کہا۔

”تم کیوں کہو؟“

”زبردستی ہے کہ نہ کہوں۔“ اسجد ملک نے اُس کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھا۔

”آج تم دیر سے آئے ہو؟“ تاباں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

”بس ہوگئی دیر کام بہت زیادہ تھا۔ دیکھو تو میں نے مُنہ ہاتھ بھی نہیں دھویا اور یونہی بھاگا چلا آیا

’ایسی کیا جلدی۔؟‘

”مجھے چاہتا تھا تم میرا انتظار کر رہی ہوگی؟“

”خوش نہیں تو دیکھیں۔“

”کیا تم میرا انتظار نہیں کر رہی تھیں؟“

تاباں خواہ مخواہ ہی اپنی لمبی چوٹی کے بل کھولنے اور بند کرنے لگی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”سوال کا جواب ضروری ہوتا ہے ملک۔“

”اباں یہ بھی بات ہے۔“

کچھ باتیں صرف محسوس کی جاسکتی ہیں اُن کے جواب کے لیے لفظ ہی ذہن میں نہیں

”تاباں کے گالوں پر ڈوبتے سورج کی سُرخ پھلکی پڑ رہی تھی۔ اسجد ملک کا جی چاہا وہ نظروں کو

”کیوں نہ پڑھاؤں بھلا۔؟“

”اس کے سوا تمہیں آتا ہی کیا ہے؟“ تاباں شوخی سے کہہ رہی تھی۔ اسجد ملک اس کی آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر ہنس دیا۔

”سنو ملک۔ اگر میں تم سے پھڑ جاؤں پھر۔“

”خدا نہ کرے۔“ اسجد کو لگا تھا جیسے یہ جملہ نہ ہو کوئی سنسا تا ہوا تیر ہو جو اس کے کلیجے کے پار ہو گیا۔

”آئندہ ایسی بات مت کرتا۔“

”ارے تمہارا تو رنگ ہی فق ہو گیا ہے۔“ تاباں ہنسی۔

”کیا نہ ہوتا۔؟“ اسجد پوچھ رہا تھا۔

”کیوں بھلا۔؟“

”تمہیں نہیں پتا آئندہ ایسا کوئی جملہ نہ کہنا کہ میرا دل ہی بند ہو جائے۔“ اسجد نے اپنے بازو پٹ کر سینے سے لگا لیے۔

”واقعی ملک تم مجھے اس قدر چاہتے ہو۔“ وہ بے اعتباری سے بولی۔ ”تم اندازہ ہی نہیں لگا سکتیں کہ میرے دل میں تمہارے لیے کس قدر وسعت ہے۔ کیا جذبے ٹوکتے ہیں۔ تم بس یہ سمجھتی ہو جو کہتا ہوں جھوٹ ہے۔“

”نہیں ملک! ایسا تو میں نے کبھی بھی نہیں سوچا۔ مجھے تم پر خود سے بھی زیادہ اعتبار ہے۔“ تاباں نے اس کے بالوں بھرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”اب دیکھو نا تمہیں نہ جھپٹروں تو پھر کے جھپٹروں؟“

”جس روز میں نے چھپڑ چھاڑی کی تو تمہیں پتا چل جائے گا۔“ اسجد ملک کے لہجے اور آنکھوں میں انجان سے تقاضے تھے۔ تاباں ہنس دی اور اسجد کو لگا تھا جیسے بلبل چمک رہی ہو۔

”تاباں بھی تو تم مجھے اپنی اماں اور بابا سے ملوؤ۔“

”تم مجھ سے مل لیتے ہو اُن سے ملنا ضروری ہے۔“

”ہاں بے حد ضروری ہے۔“

”کیوں بھلا۔؟“ وہ گردن ہلا کر بولی۔

”ہر بات لڑکیوں کو نہیں بتانی جانی۔“

”میں تمہیں اُن سے نہیں ملا سکتی ملک۔؟“ اُس نے انکار کر دیا۔

”کیوں۔؟“ اسجد جانتا چاہتا تھا۔

”بس کہنا نا!“

”وجہ بتاؤ۔۔“

”کچھ باتوں کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔۔“

”پھر بھی مجھے پتا تو چلے۔“

”ملک میری ماں جھلی سی ہے وہ تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے پھر میرا بابا بہت غصے کا تیز ہے۔ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔“ تاباں کے لہجے میں خوف سے جھبر جھری آ گئی تھی۔ اور اسجد ملک جان گیا تھا کہ وہ کتنی خوف زدہ سی ہے اُس نے مزید بات کرنی مناسب نہ سمجھی کہ وہ کسی صورت بھی تاباں کو دکھ دینے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

اس کے چہرے پر جمائے ہی رکھے۔

یہ چند روز میں لا آبا ہی سی دیہاتی لڑکی مجھے اس قدر عزیز تو کیوں ہو گئی ہے۔

جیسے برسوں سے جانتا ہوں۔

جسمِ جنم کی آشنائی ہو۔

ہاں تاباں کبھی شاید کسی کو دیکھ کر ایسا بھی محسوس ہوتا ہوگا جیسے میں نے محسوس کیا ہے۔

”کیا سوچ رہے ہو ملک۔؟“ اُسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر تاباں نے پوچھا۔

”کیا سوچوں گا۔؟“

”کچھ تو ہے تمہاری نظریں ایک جگہ جمی ہوئی تھیں اور جب ایسی بات ہوتی۔“ تاباں نے پوچھا۔

ادھورا چھوڑ دیا۔

”مگر یہ ہے۔“ اسجد ملک نے پوچھا۔

”میری ماں بھی جب کچھ سوچتی ہے نا تو گھنٹوں ایک ہی جگہ نظریں جما کر بیٹھی رہتی ہے۔“

تاباں نے سچ بتایا۔

”کیا سوچتی ہے تمہاری ماں۔؟“

”پتا نہیں۔“ تاباں کے لہجے میں دکھ کی آمیزش آ گئی تھی اور وہ انجانا سا دکھ اسجد کے لیے چیرنے لگا۔

”تاباں۔“ جب بھی تم اپنی ماں کا ذکر کرتی ہو تمہارے لہجے میں درد ہوتا ہے جو تمہارے دل سے بھی عیاں ہوتا ہے۔ آخر ایسی کیا وجہ ہے؟ اسجد جانتا چاہتا تھا۔

”کاش مجھے بھی وجہ پتا ہوتی۔ ملک! لوگ پھڑ جائیں تو پھر اُن کا سوگ ساری زندگی بھرا رہا ہے۔“

”کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں نا جو پھڑ جائیں تو ان کی جدائی نا سوری طرح دل میں بٹھ رہے۔ اور پھر وہ نا سوری زندگی کی آخری سانوں تک رستا ہی رہتا ہے۔ تکلیف دیتا ہے ایسا ہی کوئی ماں سے بھی پھڑا۔“

”کوئی ایک۔“ تاباں کے شکر نی لب کا نپے۔ اس کی تو جھوک ہی آج گئی۔

”جھوک۔ کیا مطلب۔؟“ اسجد سمجھ نہ سکا تھا۔

”ساری دنیا۔ ساری کائنات۔“ تاباں آہ بھر کر بولی۔

”اچھا۔“ اسجد دیکھ کر رہ گیا۔

”تم اوکھے لفظ بولتے ہو میں سمجھ جاتی ہوں۔ تم کیوں نہیں سمجھتے۔“

تاباں نے مصنوعی خفگی سے پوچھا۔

”یار جاہل بندہ ہوں آہستہ آہستہ سمجھوں گا۔“ اسجد نے اُس کے گالوں پہ جھلٹی لٹکائی۔

جھٹکا دیا۔

”بھئی میرے ساتھ بدتمیزی نہ کیا کرو۔“ تاباں ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ تو اسجد مٹا دیا۔

”یہ بدتمیزی نہیں اسے محبت کہتے ہیں۔“

مجھے اے سبق نہ پڑھاؤ۔“

”مام آخر آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔؟“ وہاج احمد نے زور سے مٹھیوں کو بھیجنا۔
”بس اب تم فائل ایگزام دے کر آگئے ہو اور طے یہ پایا ہے کہ تم اب سردار پور میں رہو گے۔“

اور

”نہیں مام میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر بولا۔

”کیوں۔؟“ ظل ہمارے پوچھا۔

”میں کوئی بھی ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہاں سوائے ظلموں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لالا علیہ السلام شخص کے ساتھ میں اس حویلی میں نہیں رہ سکتا۔ مام پلیز آپ مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہاج نے ظل ہمارے کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا۔ ”مجھے مت روکیں یہاں!“

”مام کی جان پھر میں کیسے رہوں گی۔؟“ ظل ہمارے آواز بھر اگئی۔

”آپ میرے ساتھ چلیں۔ میرے حصے کی جائیداد لیں لالا سے ہم لاہور میں رہیں گے۔“

میں گھر لے لیں گے۔

”مام میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“

”کیا تمہیں غاشیہ نے کہا؟“

”اُس کا یہاں کیا ذکر۔؟“ وہاج احمد کو کرٹ سا لگا۔

”جے نا ذکر آخر اُس نے تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر تا عمر چلنا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ واقعی نہ سمجھا تھا۔

”میں تو تمہاری بات بن کہے سمجھ جاتی ہوں تم کیسے نہیں سمجھے۔؟“

ظل ہمارے کی آنکھوں میں شرارت کی چمک لبوں پر مسکان تھی۔

”کیا سمجھتی ہیں آپ۔؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”یہی کہ تمہارے دل کی خواہش کیا ہے۔؟“

”کیا ہے بھلا۔؟“

”غاشیہ۔“ ظل ہمارے لبوں سے یہ نام موتی کی طرح پھسلا تھا۔

”غاشیہ کمال۔؟“ وہ استفہامیہ انداز میں مسکرایا۔

”ہاں وہ بولیں۔“

”مام۔ بعض مرتبہ مائیں بھی دھوکا کھا جاتی ہیں۔ غاشیہ میری پسند بھی نہیں رہی۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم۔“

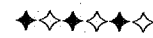
”جو آپ نے سنا ہے۔“ وہاج نے ہونٹ کا کونا دبا کر کہا کہ اپنا بھرم اس طرح بھی رکھا جا

ہے وہ ماں کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ غاشیہ نے ایک ذرا سی بات پر اُسے ٹھکرا دیا ہے۔

”پھر کون ہے تمہاری پسند۔“ ظل ہمارے جاننا چاہتی تھیں۔

”میری پسند۔“ وہاج مسکرایا۔ ”آپ نے اُسے پسند کرنا ہے ہر صورت میں میری پسند

عفیہ امیر۔“ وہاج احمد نے گویا۔۔۔ دھماکا کر دیا تھا۔



ظل ہمارے ایک لمحہ کے لیے نہایت حیرت سے وہاج احمد سے چہرے کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کسی بھی جز بے کا کوئی شبہ نہ تھا۔

عجیب ساٹ سا چہرہ تھا۔

کوری سلیٹ جیسا۔ جس پر جو چاہو لو لکھ لو مگر کچھ نظر نہ آئے۔ کوئی تحریر بھی نہ پڑھی جاسکے۔

”یہ ایسا کب تھا؟“ ظل ہمارے دل کے گنبد میں یہ چار حروف جملہ گونج کر رہ گیا تھا۔

”مام۔۔۔ مجھے غاشیہ پسند نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی میری پسند نہیں رہی۔“ وہاج ہونٹ کا اوپری

گوشہ دانتوں تلے دبائے کہہ رہا تھا۔

”مام۔ میری پسند آپ دیکھیں گی تا تو عش عش کر اٹھیں گی۔ عفیہ امیر جیسی بہو یا کر آپ

رنگ کریں گی مام۔ وہ اتنی سچی اور کھری لڑکی ہے کہ کبھی بھی مجھے اس کے کھرے پن سے خوف آتا

ہے لیکن مام ایسے لوگ دل کے بہت صاف ہوتے ہیں جو ان کے دل و ذہن میں ہوتا ہے وہی زبان

پڑھتی ہوتا ہے۔ بے شک ان کا لہجہ کڑوا ہو لیکن۔“

”وجہی۔“ ظل ہمارے وہاج کو ایک دم ہی ٹوک دیا جو سر جھکائے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ لگتا

تھا جیسے اس نے کوئی سبق رٹا ہوا ہو۔ اور وہ سر جھکائے ملاں کو سناٹے جا رہا ہو اور اب تسلسل ٹوٹ گیا

تھا۔

ظل ہمارے آواز نے ایک دم ہی اس کی زبان پر تالے ڈال دیئے تھے۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر

اٹھا کر ماں کو دیکھا جس کی آنکھوں میں فکر کے سائے تھے۔ اور چہرہ پریشان سا تھا۔

”مام۔ آپ انکار نہیں کریں گے۔“ وہ ضدی انداز میں بولا۔

”تم غاشیہ سے کیوں دستبردار ہو رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں نے اس پر حق جمایا کب ہے؟“ وہ جی سے بولا۔

”تم نے کہا نہیں مجھے کچھ بر میں سب جانتی ہوں وہاج۔ میں تمہارے چہرے سے اندازہ لگا

کتی ہوں کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ وہ کون سی بات ہے جس نے تمہارا دل چیر لیا۔ کیوں تم نے راستہ بدلا

ہے وجہی، میرے لعل۔“ ظل ہمارے وہاج کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا۔ ”وجہی“

زندگی کے فیصلے یوں اچانک نہیں کیے جاتے۔ زندگی کوئی جواری کا پتا نہیں جس طرح مرضی پتا چھینک دیا جائے ماں صدقے زندگی تو بہت ٹھن راستوں سے گزرنے کا نام ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر راستے بدلنے والے بزدل ہوتے ہیں۔ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا زندگی کا دوسرا نام ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟“

”کیسا فیصلہ؟“ وہاں نے ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”یہی غاشیہ سے دور ہونے کا فیصلہ۔“ وہ بولیں۔

”مام۔ کیا کبھی میں نے آپ سے ذکر کیا تھا؟“ وہاں نے پوچھا۔

”ذکر۔“ وہ ہنسیں۔ عجیب سی ہنسی تھی۔

”آپ بتائیں۔ آپ کی یادداشت میں کوئی ایسا لمحہ موجود ہے جب میں نے یہ جملہ کہا ہو کہ

غاشیہ کو میری شریک زندگی بنادیں؟“ وہاں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولیں۔

”پھر آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں جس بات کا شائبہ بھی میرے دل و ذہن میں کہیں نہیں ہے

نہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہے کہ غاشیہ میری ہمسفر بنے۔ مام میں جو خوبیاں اپنی شریک سفر میں دیکھنا

چاہتا ہوں عقیرہ امیر اس پر پوری اترتی ہے۔ مام آپ اسے دیکھیں گی تا تو آپ میرے انتخاب کی داد

دیں گی۔ ہمارے خاندان میں ایسی لڑکی ہونی نہیں سکتی۔“

”انسان جسے چاہتا ہے نا پھر اس جیسا کائنات میں دوسرا اور کوئی بھی نہیں لگتا۔“ وہ بولیں۔

”شاید ایسا ہی ہو۔“ وہاں نے تائید کی۔

”کیا عقیرہ کے والدین مان جا سکیں گے؟“ ظل ہمانے پوچھا۔

”کیوں نہیں؟ پھر وہ خود مختار ہے۔“

”یعنی زندگی کے اتنے اہم فیصلے پر وہ اپنے والدین سے مشورہ بھی نہیں لگی۔“ عجیب حیرت

تھی ان کے لیے۔

”زندگی اس نے گزارنی ہے۔“ وہاں بولا۔

”واہ پتر۔ واہ۔ یہ ہے تعلیم کا نتیجہ۔ پھر تم مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو؟ تم بھی مجھے نہ بتاؤ خود

مختار ہو۔“

”ناراض کیوں ہوتی ہیں؟“ وہاں نے ماں کے گلے میں بازو حائل کر دیئے۔ میری تو

ساری باگیں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ میں تو مختار کل ہونے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”مگر جو لڑکی تم نے پسند کی ہے وہ تو مختار کل ہے نا؟“

”جی مام۔“ وہاں نے سر ہلایا۔

”ایسی لڑکیاں تو۔“ ظل ہمانے کہنا چاہا تو وہاں نے جلدی سے ماں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں مام۔ ایک لفظ بھی مت کہیے گا اس کے کردار پر۔ وہ ایسی ویسی لڑکی نہیں۔ اس کا کردار

تو ہیرے کی مانند صاف شفاف۔ میں گواہی دیتا ہوں اس کے کردار کی۔“

”اچھا۔“ ظل ہمانے دیں۔ طنزیہ سی ہنس تھی۔ وہاں تڑپ کر رہ گیا۔

”مام۔ کسی بھی قسم کا شک نہ کریں اس پر۔ وہ ایسی ہے میں جانتا ہوں۔ لاکھوں میں ایک

چچی کھری۔“

”قصور تمہارا نہیں وجہی۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں نا اس کی خامیاں بھی خوبیاں محسوس ہوتی ہیں۔ اور محبت کرنے والے تو آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں۔ کہ محبت کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ میں تمہیں منع نہیں کرتی۔ اس سچی اور کھری لڑکی سے شادی نہ کرو۔ مگر وہ بھی میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ اچانک مت کرو کہ کل کو پچھتاؤں کی آگ تمہیں آکھیرے۔ یہ مت بھولنا کہ اس پیش سے میں بھی محفوظ نہ رہ سکوں گی۔“ ظل ہمانے ہولے ہولے کہہ رہی تھیں۔

”تو آپ دوسرے لفظوں میں انکار کر رہی ہیں؟“

”کچھ بھی سمجھو تم۔“ یہ تمہاری سوچ ہے۔ جبکہ میرا خیال ہے میں انکار نہیں کر رہی بلکہ تمہیں وہ

کچھ سمجھا رہی ہوں جو تم جانتے ہو جیسے ہوئے بھی نہیں جان پار ہے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“ وہاں نے منہ بنایا۔

”تم نہیں جانتے۔“ وہ اپنی بات پراڑی ہوتی تھیں۔

”مام۔ مجھے علم ہے کہ آپ چاہتی ہیں اپنے ہی خاندان سے کوئی لڑکی یہاں آئے۔ میری پسند

سے اسی لیے آپ انحراف کر رہی ہیں۔ آپ کو پتا ہے کیسی لڑکیاں ہیں ہمارے خاندان کی۔ انتہائی

مغرور۔ انہیں اپنی دولت پر گھمنڈ ہے۔“

”عورت دولت پر گھمنڈ نہیں کرتی۔“ ظل ہمانے ترشی سے کہا۔

”ہونہ۔“ وہاں مسخرانہ انداز میں ہنسا۔

”اگر عورت دولت پر گھمنڈ کرتی تو میں سب سے زیادہ گھمنڈی عورت ہوتی۔“ ظل ہما کے لہجے

میں فخر نمایاں تھا

”اچھا۔“ وہاں مسکرا دیا۔

بہت دولت ملی ہے مجھے۔ اتنی محبت ملی کہ وہ دولت سے بڑھ کر ہے اور تم سمجھتے ہو کہ عورت

دولت پر گھمنڈ کرتی ہے وجہی عورت تو صرف محبت پر گھمنڈ کر سکتی ہے۔ یہ اس کی جبلت میں شامل ہے

محبت کی اک نظر پر وہ اپنا آپ وار دیتی ہے۔ بشرطیکہ اُسے یقین ہو کہ جسے وہ اپنے وجود کی ساری

شدتوں سے چاہ رہی ہے وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔“ ظل ہما کو یہ احساس ہی نہ تھا کہ وہ یہ ساری

دل کی حکایتیں اپنے بیٹے سے کہہ رہی ہیں۔

بالکل دوستوں کی طرح وہ بات کر رہی تھیں اور پہلی ہی بار تھا ورنہ اس طرح تو کبھی بھی نہ ہوا تھا

یاس قدر بے تکلفی سے انہوں نے وہاں سے کبھی بھی بات نہ کی تھی۔ بلکہ وہ بیٹے سے بات ہی نہ کرتی

تھیں۔

۔۔۔ بہت کم وہ سب کے سامنے وہاں سے بات کرتی تھیں تاکہ سوتیلے بیٹے نہ سمجھیں کہ وہ

اپنے بیٹے کو زیادہ چاہتی ہیں۔ کبھی کبھی ہم کتنا ڈرتے ہیں۔

محبوبوں کے اظہار میں بھی خوفزدہ رہتے ہیں۔

دوسروں سے ڈرتے ہیں۔

اور بھی خود سے ڈرتے بھی ہیں

ظل ہما بھی خوفزدہ رہتی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ساری ریاضت پر پانی پھر جائے۔

زندگی کو نہایت بر سکون انداز میں انہوں نے گزارا تھا۔ کہیں بھی شک و شبہ کہ گنجائش نہ تھی اور

آخری عمر میں وہ اپنے غلوں بھرے گھڑے کو توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ وہاں شکوہ نہیں

کرے گا۔ کہ وہ توجہ نہیں دیتیں۔ اور کرے گا بھی تو وہ منالیں گی۔ مگر سراج احمد کو تو نہ مناسکتی تھیں۔ ان کا ایک شکوہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہت سارے شکوکوں میں بدل جاتا۔ اور وہ آئندہ جہان میں شوہر کے سامنے شرمندہ ہوتیں۔ وہ احمد خان سے کبھی بھی شرمسار نہ ہونا چاہتی تھیں۔ یہی وجہ تو تھی کہ انہوں نے وہاں کو بھی توجہ نہ دی تھی۔ اور بھی اس نے بھی کوئی توجہ دیئے بغیر زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ بھڑکھا کہ وہ اس کا فیصلہ مانیں۔ اگر وہ نہیں مانیں گی تو۔

غل ہما کو بیٹے کے تیروں سے خوف سا آنے لگا۔

پھر بھی وہ نرم لہجے میں بولیں۔

”تم ایک بار پھر سوچ لو۔“

”سوچ لیا ہے مام۔“ وہاں نے آہ بھر کہا۔

”تمہارا فیصلہ اٹل ہے۔“

”جی۔“ وہاں بولا۔

”فرض کرو نباہ نہ ہو۔ سکا تو پھر؟“

”کیوں نہ ہو سکے گا؟“

”مام کی جان، تم ابھی بچے ہو۔ تمہیں پتا نہیں کہ زندگی کیا کچھ لیتی ہے تب ہم اسے گزارنے کے قابل ہوتے ہیں۔“

”بس مام، آپ ایک بار عفیہہ سے مل تو لیں۔“

”کہاں ملوں۔“

”وہ یہاں آئے گی۔ میں اسے لے آؤں گا۔“

”شادی سے پہلے ہی وہ اس گھر میں آئے گی؟“ حیرت سے غل ہما کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اسے پتا

نہیں تھا کہ کوئی لڑکی اس طرح بھی آ سکتی ہے بغیر کسی بندھن کے۔ احمد خان کی وہ منگیتر تھیں اور بھی

بھی وہ کس خوشی غمی میں سردار پور کی حویلی نہ آئی تھیں۔ پہلی بار ان کی ڈولی ہی اس حویلی کے بیچ

آگن میں اتری تھی۔

”مام۔ وہ بہت براڈ مائنڈ ڈ ہے اور پھر وہ میری دوست ہے وہ کیوں نہیں آئے گی یہاں۔ میں

کہوں گا تو ضرور آئے گی۔“

”حیرت ہے شہر کی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں ایک لڑکے کے ساتھ چلی جائیں اس کے گھر۔“

”مام۔ آپ بات کو غلط مطلب میں نہ لے جائیں۔ عفیہہ بہت منفرد ہے۔“

”ہاں۔ اس کی انفرادیت کا پتا تو مجھے چل ہی گیا ہے۔“ وہ نہیں۔“ خیر پھر بھی تمہاری خوشی میں

خوش ہوں۔ پتا نہیں اس لڑکی نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے اس کی برائی بھی تمہیں اچھی لگ رہی ہے۔ تو

ٹھیک ہے تم مجھے لے چلو اس کے گھر۔ اسے یہاں مت لاؤ۔“

”اس کے گھر لے چلوں۔“

”ہاں ہاں بھی یہاں وہ آئے گی سراج وغیرہ دیکھیں گے۔ تمہارے بھائی اپنی ہونے والی

بھائی کا کیا امپریشن لیں گے۔ یہ مغرب نہیں ہے اور پھر ہم گاؤں میں رہتے ہیں۔ تم سمجھ رہے ہوتا۔“

”پر مام۔ میں آپ کو اس کے گھر کیسے لے جا سکتا ہوں۔“ وہاں نے پریشان سے لہجے میں

کہا۔

”جب اسے یہاں لا سکتے ہو تو مجھے کیوں نہیں لے سکتے اس کے گھر؟“ غل ہما کا لہجہ سخت تھا۔

”وہ تو خود گھر کا راستہ بھولی ہوئی ہے۔“ وہاں بڑبڑایا تو غل ہما تنک کر بولیں۔

”یہ کیا پھیلیاں بھجوا رہا ہے مجھے ٹو۔ کیا کوئی ایسی ویسی جگہ کی ہے وہ۔“

”مام پلیز۔“ وہاں چیخا بڑا۔ ”مت دیں اسے گالی۔ آپ مجھے مار لیں مگر اسے گالی نہ دیں وہ۔“

وہ اتنی پوتر ہے کہ میں اس کے آپٹل پر نماز پڑھ سکتا ہوں۔ پلیز مام مت دیں اسے گالی۔“ وہاں تیزی

سے انگلیاں پٹختانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

”میں نے تو ابھی اسے بھی نہیں بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ مجھے پتا ہے جب میں اسے بتاؤں گا

تو وہ کہے گی بکواس نہ کرو وجہی ایسی باتیں تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔“

یا پھر کہے گی، تم بھی آصف کا جو جیسے نکلے۔ شرم کرو شرم۔ دوستوں سے ایسی باتیں کرتے ہو۔

جاؤ تم اپنی ماموں زاد کے پاس جو تمہاری سب کچھ ہے۔

پھر میں اسے بتاؤں گا کہ میں بھٹک گیا تھا۔

راہ بھول گیا تھا۔

منزل تو میری تو تھی۔ میں تو بس دم لینے کے لیے رکھا تھا غاشیہ کے پاس۔

او میری ہیر۔ میں تو تجھے تلاش رہا تھا۔

میرا اندر تو تیری کھوج میں تھا۔

اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ میری حد تو تھی۔

میری تلاش تو تھی۔

اب میں سکھی ہوں۔

میرا دل اور ضمیر مطمئن ہے۔

میری روح کو قرار ہے۔

تجھے اپنانے کا خیال آیا ہے تب بھی دل نہیں تڑپا۔ اور یہ اس بات کو دلیل ہے کہ میرا فیصلہ صحیح

ہے۔ ہر غرض اور کھوٹ سے پاک۔

شاید اسی کا نام محبت ہے۔

”کیا سوچ رہا ہے تو؟“ غل ہما نے اسے خیالوں کی دنیا سے نکال لیا۔

”کچھ نہیں ماما۔“

”پھر بھی۔“

”بس آپ نے فیصلہ نہ دیا ہے اور میرا فیصلہ بھی سن لیں کہ عفیہہ کے علاوہ کوئی نہیں۔“

”ابھی میں نے اپنا فیصلہ کب سنایا ہے؟“

”پھر یہ سب کیا تھا؟“

”کچھ بھی تھا پر وہ نہیں تھا جو تم سمجھے ہو۔ مجھے تیری پسند سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بس ٹو نے

مجھے اس سے ملانا ہے تا تو ضرور ملو پر یہاں نہیں۔ میں کمال بھائی کے ہاں چلی چلتی ہوں تو وہاں لے آ

اسے۔“

”وہ وہاں نہیں لے جا سکتا اسے۔“

”کیوں؟“ غل ہما نے اس کی طرف دیکھا۔

”مام۔ سچ بتاؤں اب میں ملک ہاؤس میں رہتا بھی نہیں ہوں۔“
دہان نے سرجھکا لیا جیسے کہ چوری کر لی ہو۔

”کیا یونی میری اسٹڈی کا حرج ہوتا تھا۔ تو میں ہاسٹل شفٹ ہو گیا۔“
”مجھے نہیں بتانا تھا کیا؟“

”ابھی ڈیڑھ ماہ تو ہوا ہے۔ پھر یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی۔ میرے دوستوں نے کہا۔ پھر میں ان کے پاس ہاسٹل چلا گیا۔ بس۔“

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔“

”جی۔“ دہان نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

”اب کہو کیوں تم نے کمال بھائی کا گھر چھوڑا؟“

”مام میری مرضی۔“

”وہ گھر چھوڑنے کی وجہ عفرہ ہے۔“

”شاید یہ سچ ہے۔“

”کمال بھائی کو اعتراض تھا تمہاری اور عفرہ کی دوستی پر؟“ وہ خود بخود ہی سوال کر رہی تھیں۔

”نہیں۔“ دہان نے جلدی سے کہا۔

”پھر کسے اعتراض تھا؟“

”غاشیہ کو اعتراض تھا۔“ دہان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ ظل ہما مسکرائیں۔ انہیں لگا جیسے دل پر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔

ساری بات سمجھ گئی تھیں۔ خود بخود ہی سارے اوراک انہیں ہو گئے تھے۔

”غاشیہ نے اعتراض کیا تھا کوئی خاص وجہ؟“

”یہ تو آپ ابھی سے پوچھ لیں۔“

”ہم کسی کے فضل پر بھی اعتراض کرتے ہیں جب ہم کسی کو چاہتے ہیں ورنہ لوگ کچھ بھی کرتے رہیں ہم ان پر اعتراض نہیں کرتے یہ بات تو تم بھی مانتے ہوتا۔“

”جی۔“

”تم نے بھی تو غاشیہ کو چاہا ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟“

”ماں ہوں تمہاری۔ مجھے پتا ہے کتنے بے چین ہو کر تم روز ملک ہاؤس فون کرتے تھے اور اب تم چار روز سے آئے ہو ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ تم غاشیہ سے خفا ہونا؟“

”نہیں تو۔ میرا اس سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جس میں خفگی کا پہلو نکل سکے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ وہ بچی ہے یقیناً اس نے کوئی ایسی بات کی ہوگی جسے تم دل سے لے گئے ہو۔ وجہی محبت کرنے والوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر غصا نہیں توڑا جاتا۔“

”مام۔ یہ ذرا سی بات نہیں تھی۔ وہ کیوں بے اعتبار ہوئی۔ کیوں اس نے میری اور عفرہ کی صاف ستھری دوستی پر شک کیا۔ اور کیوں پھر اس نے عفرہ کی بے عزتی کی تھی؟“

”یہ سب اس نے تمہاری محبت میں کیا۔ یہ اس کی شدید ترین محبت کی دلیل ہے۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں شک کے ناگ بھی آپ ہی آپ سر سرانے لگتے ہیں۔“

”مگر یہ بھی تو ہے محبت اور شک ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ پھر شک کا ناگ تو محبت کو ڈس لیتا ہے۔ مام آپ باتیں کہ غاشیہ نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ اس نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔“

”اور تم عفرہ سے شادی کر کے اُس کے شک کو تقویت دے رہے ہو؟“

”میں غاشیہ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں عفرہ سے محبت نہ کرنے کے باوجود بھی اُس سے وفادار رہوں گا۔ اُسے گھر دوں گا پھر جب عفرہ سے محبت نہ ہونے کے باوجود وفا کروں گا تو غاشیہ سے میں کس طرح دھوکا کر سکتا ہوں، لیکن مام اُس نے میری ساری دلیلوں پر ایک ہی جواب دیا کہ اُسے مجھ سے نفرت ہے اور نفرت بھی ایسی کہ وہ میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی۔“ درد دہان کے لہجے میں گھنکر دوس کی طرح بولی رہے تھے۔

”اُسے یقیناً غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”جب یہ غلط فہمی میں نے دور کرنا چاہی تو وہ تب بھی نہ مانی۔“

مام یہ کہاں کا انصاف ہے کہ انسان جس چہرے سے پہلے محبت کرے اُس چہرے کو بگاڑ دے۔ میں نے تو ایسا بھی سوچا بھی نہ تھا۔“

”میں بات کروں گی کہ۔“

”نہیں مام۔ بس کوئی ضرورت نہیں، کچھ بھی ہو غاشیہ میری زندگی کی ہمسفر نہیں ہوگی۔ میں۔“

میں صرف اور صرف عفرہ امیر سے شادی کروں گا یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور اس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں مام آپ چاہے مانیں یا نہ مانیں۔ میں اُس سے کورٹ میرج کر لوں گا۔“

”وجہی۔ اتنے انتہا پسند نہ بنو۔ پھر میں کیوں نہیں مانوں گی۔ میں خود عفرہ کو بیاہ کر لاؤں گی۔“

آفردہ تیری پسند ہے جان مام۔“ ظل ہما نے اُسے چھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

”تیری بات کیوں مانوں۔ بھلا کوئی اپنے دل کی خواہش بھی رد کرتا ہے؟ تو تو میرا دل ہے۔ میری روح کا ہر تار تیرے نام سے جٹا ہے۔ جان مدر ایسا سوچنا بھی نہیں۔ آخر تو نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے نا۔ مجھے تیری پسند جی جان سے پیاری ہے۔“

ظل ہما نے اُس کے گھنے بالوں والا سر چوم لیا اور نجانے کیوں دہان کی آنکھوں کے فرش گیلے ہونے لگے۔

☆☆☆

شرفاں نے نہایت حیرت سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے اُس اونچے لمبے قد کاٹھ والے لڑکے کو دیکھا۔

”وہ۔۔۔ وہ میں سمجھا تاہی ہے یعنی تاپاں۔“ اسجد کے بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔ اُسے اپنی جلد بازی پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر اُس نے مجھے میں غلطی کیوں کی۔

اصل میں اُسے آج دیر ہو گئی تھی اُسے پتا تھا تاپاں اُس کا انتظار کر رہی ہوگی اور جب وہ دریا کے کنارے پہنچا تو تاپاں اپنے اکبر سے بدن پر پانی کا گھڑا رکھے ٹیلے سے اتر رہی تھی۔ وہ تیزی سے لگا اور پیچھے سے اُس نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھڑا ایک دم ہی نیچے آ رہا تھا اور جب وہ پلٹی تو اسجد کھڑک کر گیا تھا۔ وہ تاپاں نہیں تھی۔ پر تاپاں جیسی تھی۔

قد میں رنگ روپ میں چال ڈھال میں غرض وہ تاباں جیسی تھی۔ بس یہ اور بات تھی کہ تاباں کی آنکھوں میں جتنو چمکتے تھے۔ جبکہ اُس کی ہنسی کی آنکھوں میں سیاہ رات جیسی خاموشی اور سناٹا تھا۔

تاباں کے چہرے پر شگفتگی تھی۔

جبکہ یہ چہرہ سروں کا کھلا ہوا پھول تھا۔ سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی مانگ میں کئی سفید بال جھانک رہے تھے۔

”کب سے جانتے ہو تاباں کو؟“ شرفاں نے پوچھا۔ بالکل ہی انکوائری آفیسر والا انداز تھا۔

”وہ جی۔ آپ کو تاباں نے نہیں بتایا۔“

”شاید لڑکیاں ماؤں سے ایسا ذکر نہیں کرتیں۔“

”تو تو آپ اُس کی والدہ ہیں۔“ اسجد ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”ہاں میں تاباں کی ماں ہوں۔ بڑی بے وقوف ہے وہ۔ پتا ہے اُسے میں اپنی ہر بات بتا دیتی ہوں؟ میرے بارے میں وہ سب جانتی ہے میں کون ہوں؟ کہاں سے آئی ہوں؟ کس کی کونج ہے مجھے ساری خبر ہے اُسے۔ دیکھو اُس نے مجھے نہیں بتایا۔ ہے نامی بات۔“ شرفاں بول رہی تھی اور اسجد ملک کے ذہن میں بے شمار چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔

جب بھی وہ ماں کا ذکر کرتی تھی اُس کے لہجے کا پیالہ درد سے لبریز ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں غم دکھ کی آندھیاں چلنے لگی تھیں۔ اور چہرہ مارے ضبط کے سرخ ہوتا تھا۔ کئی بار تو اسجد کو یہ دھوکا ہوتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ ایک بار اُس نے اسجد کے کندھے پر سر ٹکا کر کہا تھا۔

”ملک۔ مجھ سے مل کر پھڑنہ جانا۔“

”ہم کوئی پھڑنے کے لیے تو نہیں ملے نا۔“

”تم کچھڑے نا تو۔ شاید میں زندہ نہ رہوں۔“

”کیوں بھلا۔؟“

”میں اپنی ماں کی طرح بہادر نہیں ہوں ملک۔ وہ تو بہت بہادر ہے۔ وچھوڑوں کا ڈکھ اُس کے دل کے آنگن میں ناسور کی طرح پڑا ہوا ہے۔ پھر بھی وہ زندہ ہے۔ حوصلہ ہے اُس کا۔ اپنے پیالوں سے جدا ہو کر زندگی بھلا زندگی تو نہیں رہتی۔“

”تو میں تمہارا پیارا ہوں۔“ اسجد شوقی سے بولا۔

”شائد زندگی سے بھی زیادہ پیارے ہو۔“

”واقعی۔“ اسجد نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اُس نے ہولے سے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کی لمبی اور کومڑی ہوئی پلکیں اسجد کے دل میں ہچکچاہٹیں ہی تو چاگی تھیں۔

”میری سوئی۔ میری جند۔ میں کبھی تم سے نہیں پھڑوں گا۔ میں نے وچھوڑے کے عذاب سے نہیں پردیکھے ضرور ہیں۔ محسوس ضرور کئے ہیں۔ اور جھیلنا ہے وہ عذاب خود پر۔“

پھر نہ ہی تاباں نے وضاحت چاہی تھی نہ اسجد نے ہی وضاحت کرنی ضروری سمجھی تھی۔ مگر اب اسجد کو پتا چل گیا تھا کہ ماں کے ذکر پر اُس کے دل میں اداسیوں کے کانٹے کیوں

اُگ آتے ہیں؟ کیوں اس کی آنکھیں برسنے کے لئے تیار ہوتی ہیں؟

”بھئی چلو آج تم میرے ساتھ گھر میرے میں تمہارے سامنے تابی سے پوچھوں گی کہ اُس

مجھے بتایا کیوں نہیں تمہارے بارے میں۔“ شرفاں نے اُسے سوچوں کے کھنور سے نکالتے ہوئے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ اسجد سمجھ گیا تھا کہ یہ ابتلا سی خاتون ہے۔ اور غائب دماغ لوگوں کو تو کسی کی پروا نہیں رہتی۔ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے اور نہ ہی سوچتے ہیں۔ مگر وہ تو ٹھیک ٹھاک بندہ تھا۔ وہ بھلا ایک غائب

دماغ عورت کہ بات کیسے مان لیتا۔ جو کہہ رہی تھی۔

”تم میرے ساتھ گھر چلو بس۔“

”ماں جی میں پھر آؤں گا۔ اور ضرور آؤں گا۔“

”پھر کیوں ابھی کیوں نہیں؟“

”آپ سمجھیں نا۔!“

”بھئی تابی تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر کس قدر حیران ہوگی۔ پھر اُس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔“

”کیا ہو گیا ہے اُسے؟“

”سویرے کھاؤے میں پھسل گئی تھی۔ پیر مڑ گیا تھا۔ ابھی تک پڑی ہے وہ تو میں زبردستی پانی پھرنے آئی تھی اور اُس نے وعدہ لیا تھا میں جلدی آ جاؤں گی۔ چلو میں اُس سے تمہاری شکایت بھی کر دوں گی کہ تم نے میرا گھر توڑا ہے۔“

”کیا وہ آپ سے لڑے گی؟“

”کیوں لڑے گی مجھ سے؟ میں اُس کی ماں ہوں اور پھر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ نہیں لڑتی وہ مجھ سے کوئی بھی نہیں لڑتا۔ پہلے مجھ سے فصل دین لڑتا تھا اب تو وہ بھی نہیں لڑتا۔“ نہایت مصدومیت سے لاکھ رہی تھی۔

”اب دیکھو نہ میں کہاں تک خود سے لڑتی۔ میں نے بھی سوچ لیا یہی میرا نصیب ہے خود ہی لڑتی رہوں۔ مار کھاتی رہوں۔ سچ اب میری ہڈیوں میں سہ (سانس) ہی باقی نہیں رہا۔ نہیں سہہ سکتی تھی میں۔ پر یہ تو ہے جب بھی میرا سانول آیا میں چلی جاؤں گی۔ پھر کر کے انہیں پتہ بھی نہیں پڑے گا۔“ اسجد حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

”کبھی تابی عقل کی باتیں کرتی تھی اور پھر دوسرے لمحے ہی وہ پھر سے بے ربط سی باتوں میں لکھڑکھڑاتی۔“

”ماں جی میں آپ کے ساتھ کیسے چل سکتا ہوں؟“

”میں تمہیں لے جاؤں گی۔ تابی خوش ہو جائے گی۔ پتا ہے محبت کرنے والا پیارا سا بندہ سامنے اُسے تو آدھی تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ پتا ہے اُس کا پیر بہت سوجا ہوا ہے۔“ شرفاں اُسے لے جانے

بانتھتی اور اسجد ہستی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

کہ اُس ہستی کے مرد اُس کے پروجیکٹ پر مزدوری کرتے تھے۔ وہ بھلا کیا سوچتے کہ ان کا صاحب غریب کے بھونپڑے میں کیوں آیا ہے؟“ پھر وہ ”جواز“ تلاش کرتے۔

حقیقت تاباں کی شکل میں سامنے آئی تو پھر۔۔۔ پھر کیا ہوتا؟

اسجد کو لگا جیسے لوگ تاباں پر سنگ باری کر رہے ہیں۔ اور وہ گھٹنوں میں سر چھپائے بیٹھی ہے۔

اب اسے بھر جھری سی لی اور ایک دم ہی پلٹا۔

”ماں جی۔ تابی کو کہنا وہ کل ضرور آئے۔ اگر اُس کی طبیعت ٹھیک ہو تو۔ ورنہ میں نے تو آنا ہی

”وہ تیزی سے ریت کے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔“

”زکو۔ تو زکو تو۔“ شرفاں کی آواز اُس کا کافی دور تک پیچھا کرتی رہی اور اس نے اشارت کر دی۔ اپنے خیمے میں گھر در پی سی چار پائی پر لیٹے ہوئے اُس کے سامنے بار بار شرفاں معصوم چہرہ آ رہا تھا۔ کتنے غلوں سے وہ تمہیں گھر لے جانا چاہتی تھی اسجد اور تم نے انکار کر دیا۔

”تمہاری کیسی محبت ہے؟“
”تم لوگوں سے ڈر گئے؟ کیا لوگ کھا جاتے تمہیں۔ تم نے محبت کی ہے کوئی جرم تو نہیں کیا۔“
”اتنا خوف اسجد۔ اُسے لگا کیسے تاباں اُسے گھور رہی ہو۔“

جیسے وہ کہہ رہی ہو۔
تم محبت نہیں بناہ سکتے۔
تمہارے دل میں کوٹ ہے۔ محبت کرنے والے تو زمانے سے نہیں ڈرتے اور ٹوٹنے خوف بگل ابتدا ہی میں اوڑھ لی ہے۔

یہ محبت تو نہ ہوئی کہ محبت تو منصور ہے جو بلا دروغ ہی سولی پر پڑھ جاتا ہے۔
محبت تماشا بھی نہیں ہے جو ہر ایک کو دیکھا دیا جائے۔ اسجد نے اپنے آپ سے کہا۔
اُس نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت جب عشق کرتی ہے تو یہ ”جرم“ ایک ایک کو بتانا چاہتی ہے؟
مرد ایسا نہیں کرتا۔ وہ سب سے سبب کرا اپنے جذبات رکھتا ہے۔ کہ محبت کا تقاضا نہیں برباد کرنا۔
کسی کو بدنام کرنا۔ یہ محبت تو نہ ہوئی۔

اور میں تمہیں کسی صورت بھی بدنام نہیں کر سکتا تاباں کہ تم اسجد کی محبت ہو۔ محبتیں بدنامی آگ کی پیش نہیں سہہ سکتیں۔

جھلس کر جھیتوں کے گلاب رہ جاتے ہیں اور میں اپنی محبت کے گلابوں کو تروتازہ رکھتا ہوں۔ اُن کی خوشبو سے ہر دم اپنا آئینہ دل بہکانا چاہتا ہوں اسجد نے آنکھیں موند لیں اور مسکراتی ہوئی تاباں اُس کی پلکوں میں سمٹ آئی۔

☆☆☆

”ارے دجی ایک زبردست شعر سنو گے۔“ عفریہ ہر جگہ کے بوڑھے درخت کے سارے تنے کے ساتھ ٹپک لگاتے ہوئے کہا۔

”تم پہلے میری بات تو سنو۔“
”بھئی میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتی۔“
”کیوں؟“

”مجھے پتا ہے تم مجھے کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”بتاؤ بھلا کیا کہنا چاہتے ہو؟“
”تم آصف کا نوجو کے گاؤں گئے تھے۔“

”ہاں۔“
”بس اب مجھے تم اُس کے بارے میں بتاؤ گے کہ ان کا گھر ایسا ہے۔ اتنی زمینیں ہیں۔“

باغات ہیں۔
”اور۔“
”اور تمہارا سر۔“ وہاں دھپ سے سینٹ کی بیچ پر بیٹھ گیا۔ ”بھئی یہ اول فول میں

”نکن۔“
”ضرور ہے میں بھی کیوں۔“

”تمہارے پاس یہی موضوع ہے تمہیں کیسے پتا۔؟“ وہاں کے لہجے میں حیرتیں عود آئیں۔
”بھئی وہ فرحت اور زویب بھی تو گئے تھے کیا باتیں بگھا رہے ہیں۔ ایک اُس نے ہرن کا ٹکار کیا کروا دیا اور بیٹروں کی دعوت کیا کی۔ بات یہ ہے کہ اُس نے کسی طرح ہی میں تم لوگوں کی مدد کرتا ہوں۔ وہ ان ڈائریکٹ مجھ پر رعب ڈالنا چاہتا ہے دجی۔ تم اُسے کہو بھئی یہ بات بھی نہیں ہے۔ آصف کا نوجو بتا دو کہ وہ اپنی سوچوں کو قابو میں رکھے۔ ایک ایک سے نہ کہے۔“

”عفو۔ تو سمجھتی نہیں یا پھر تو جان کر امتحان ہے۔“ وہاں نے اُس کے چہرے پر دیکھا۔
”کیا سمجھوں۔ میں کچھ نہیں سمجھتا چاہتی دجی۔ پھر یوں بھی مجھے پتا ہے میں اُن لڑکیوں میں سے نہیں جو گھر بستی ہیں۔ میرے نصیب میں میرا گھر ہے ہی نہیں۔ میں تو ساری زندگی یونہی آوارہ ہے کی طرح ڈوٹی پھرو گی۔“ درد عفریہ کے لفظوں سے خون کی بوندوں کی مانند ٹپک رہا تھا۔
”عفو اگر کوئی شخص تجھے اتنے غلوں سے چاہے کہ۔“

”خیر وہ آصف کا نوجو نہیں ہو سکتا۔“ عفریہ نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔
”میں تو ہو سکتا ہوں نا۔؟“ ایک دم ہی وہاں کے بوں سے یہ جملہ پھسلا تو عفریہ کو لگا بے شمار بولے چھوٹے دھماکے اُس کے دل کے بہت ہی قریب ہونے لگے ہوں۔ اور اُس کے دل کے پر نے سے اڑا گئے ہوں۔ اُسے کبھی بھی یہ امید نہ تھی کہ وہاں احمد ایک دم ہی کبھی یہ بات بھی کہہ دے گا۔
جہاں سے کوئی امید نہ ہو۔ وہاں ایسی بات ہو جائے تو انسان کی سمجھ میں جواب نہیں آتا اور فیرہ کی بھی زبان پرتا لے لگے گئے تھے۔

وہ جس کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہوتا تھا، حلیمی صاحب کہتے تھے۔
”عفریہ! آپ بہت ذہین ہیں لڑکیوں کو اتنا ذہن ہونا نہیں چاہیے کہ بات بندے کے حلق میں ہو اور عورت جواب دے دے۔ کہ بعض مرتبہ ذہین عورت بہت بُری لگتی ہے۔ جو مرد کے دل کی مالدار دارتوں کی خبر رکھے۔ اُسے مرد پسند نہیں کرتا۔“
اور عفریہ ہنس کر کہتی۔

”آپ مرد یہ کیوں چاہتے ہیں کہ عورت مرد کے دل کا بغض نہ جان سکے۔ اور جو عورت مرد کو ہانے لگ جائے وہ کیوں بُری لگتی ہے جبکہ عورت کو تو وہ مرد اچھا لگتا ہے جو اُسے جانتا ہے سمجھا ہے۔ اُن پر تقاضا کیوں ہے؟“

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا عفو۔“
”دیکھو دجی ایسے سوال کا میں کوئی جواب نہیں دے سکتی جو میرے متعلق نہ ہو۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔ کیا میں نے یہ بات کسی دیوار سے کہی ہے۔ وہ اُس کے مقابل

”تم مجھے مذاق میں بھی یہ بات نہ کہو وہاں احمد۔“
”کیوں۔؟“ وہ چیخ کر بولا۔

”اُس لیے کہ تم میرا آئیڈیل نہیں ہو۔“ عفریہ نے کہا تو وہاں کو لگا جیسے اُس نے اُس کے منہ پر مار دیا ہو۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے عفریہ کو دیکھنے لگا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا۔۔۔ کہ وہاں سے جا رہے۔
 عفریہ تو وہاں سے نہ گئی۔۔۔ البتہ وہاں نے دو قدم آگے بڑھ کر اُس کی گردن دیوچ لی۔ عفریہ
 لگا جیسے وہ کسی شکرے کے پتوں میں آگئی ہو۔ ایک لمحہ کے لیے اُس نے وہاں کے وحشت زدہ چہرے
 کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ تب وہ دھیرے سے مسکرا دی اور آنکھیں بند
 لیں، بہت زیادہ اطمینان اُس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔



عفریہ کی لمبی اوپر کو مڑی ہوئی بند پلکیں کپکپا رہی تھیں۔ اور چہرے پر اتنا سکون تھا کہ وہاں
 اور حیرت زدہ سا رہ گیا۔ اس نے کب اتنا پرسکون چہرہ دیکھا تھا۔
 وہ بھی عفریہ جیسی لا اُبابی لڑکی کا۔ اتنا اطمینان، وہ حیرت زدہ تھا۔ اتنا سکھ تو شاید اس کے
 چہرے پر موت کے وقت بھی نہ ہوگا۔ وہاں کی انگلیاں ایک دم ہی پتیلی کی سمت میں سمٹ کر رہ گئیں
 اور اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبالیے۔
 ”سوری عفریہ۔ آئی ایم سوری۔“ لفظ اس کے لبوں سے ٹوٹنے لگے تھے۔
 عفریہ نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں عجب سا سوز تھا اور پگھل یوں
 جھلب کہہ رہے تھے۔
 ”وجہی۔۔۔ مارنا تھا تو مار دیتے۔ گلا گھونٹ دیتے میرا۔ یقین کر دو میں احتجاج نہ کرتی۔“
 ”مر جاتیں تو پھر احتجاج کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے؟“ وہاں نے پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ
 ال کر ساٹ لچے میں کہا۔
 ”بعض لوگ مر جانے کے بعد بھی احتجاج کرتے ہیں۔“
 ”جیسے تم۔۔۔ وہاں ترخا۔“
 ”میں نے تو کبھی زندگی میں احتجاج نہیں کیا۔ زندگی نے جو سلوک کیا ہے نا میرے ساتھ میں
 نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔“
 ”مگر مجھے تو شکوہ کرنے کا حق ہے۔“ وہاں بولا۔
 ”کس سے؟“ عفریہ مسکرائی۔
 ”تم سے۔“ وہاں نے کہا۔
 ”وہ کیوں بھلا؟“ عفریہ ہلک کر بولی۔
 ”عفو۔۔۔“ وہاں کے لچے میں جذبے کو کٹنے لگے تھے۔ عفریہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
 جہاں عجیب سا دکھ لہریں مار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا گداز تھا وہاں کی آنکھوں میں کہ
 نگراہ کے دل کی دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ اس نے نہایت سختی سے خود کو جھڑک دیا۔

”اوغیرہ۔ عفیہ امیر تم عام سی سطحی سی لڑکی نہیں ہو جو کسی لڑکے کے اظہار محبت پر مٹ جاتی ہے تم تو مٹانے والی لڑکی ہو۔ تمہیں مٹانا آسان کام نہیں ہے۔ تمہیں مٹانے کے لیے بہت جرات اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ بس ذرا سے بیٹھے بولوں پر تم رتھ گئی ہو۔“

”نہیں۔ بھلا میں کہاں رہی ہوں۔“ اس نے اپنے دل کی دلیل کو مسترد کر دیا۔
”میں نے تو ابھی بہت آگے جاتا ہے۔ بہت طویل سفر ہے جس میں وہاب احمد اور آصف کاغذ جیسا کوئی پڑاؤ نہیں ہے۔“ عفیہ نے خود کو سمجھایا۔
”غفو۔“ تجھے پتا نہیں شاید کہ میں نے اپنی ماں کو بھی تیرے بارے میں بتا دیا ہے۔“

”مجھ سے پوچھتے بغیر۔۔۔؟“
”ہاں تم سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مجھے یقین تھا۔“
”تمہیں یقین تھا کہ میں تمہارا ہر فیصلہ آنکھیں بند کر کے قبول کر سکتی ہوں۔“ عفیہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”شاید یقین و گمان سے بھی آگے بات ہے۔“
”سنو چوہدری وہاب احمد تمہارا اندازہ ایک فیصد بھی درست نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اکیلی ہوں اور سہارے کی خواہش میں ڈوبتی پھر رہی ہوں تو سنو چوہدری۔ ابھی میں اتنی کمزور نہیں ہوں کہ سہارے تلاشتی پھروں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں اپنی لاش بھی اپنے کندھوں پر اٹھا سکتی ہوں۔“

”مجھے خبر ہے تمہارے حوصلوں کی۔“
”پھر بھی تم نے یقین کر لیا کہ تمہارے ذہن کی بے ٹکی اختراع پر میں خوشی سے ہنگڑا پاؤں گی۔ کہ تم نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ نہیں جناب ابھی میں اس مقام پر نہیں پہنچی۔ جہاں انسان دوستوں کی جائز و ناجائز خواہش ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔“

”میں تمہیں مجبور تو نہیں کر رہا۔“
”فیصلہ سنا کر کر رہے ہو۔“
”تم تو اپنا فیصلہ سنا چلی ہو۔“
”بالکل۔“

”کوئی ترمیم کی گنجائش ہے۔“ وہاب آس کے ہنڈولے میں جھونکے لگا۔
”قطع نہیں۔“ عفیہ کا لہجہ پتھر پڑا تھا۔ وہاب کو لگا جیسے ڈھیر سارے پتھر اس کے دل پر پڑ رہے ہوں۔ اس کی روح تک سکے گی تھی اور عفیہ امیر نہایت سفاکی سے کہہ رہی تھی۔
خواہشوں پر بند نہیں باندھا جاسکتا۔ نہ ہی خواہشوں اور آرزوؤں کو دل میں جگہ پانے سے روکا جاسکتا ہے مگر وہاب یہ ضروری تو نہیں کہ ہم جس چیز کی خواہش کریں وہ مل جائے۔ جو آرزو کر لیا پوری ہو۔ یہ دنیا ہے جہاں کسی کو بھی حسب آرزو نہیں ملتا۔“ عفیہ بولی۔
”ملتا ہے حسب آرزو اگر دوسرا فریق مخلص ہو۔ تم صرف دوستی کے دعویدار ہو۔“

”میں خود کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔“
”میں تمہیں مکمل تحفظ دے کا وعدہ کرتا ہوں غفو۔“
”تحفظ۔“ وہ کرب سے مسکرائی۔ ”وہاب شاید تمہیں پتہ نہیں کہ گھر سے جو لڑکی نکلتی ہے نا۔“

”کسی تحفظ کی چادر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود اپنا تحفظ کرنا جانتی ہے۔ اپنے بچاؤ کے داؤ آزماتی ہے اور پھر پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس طرح خود کو بچا لیتی ہے۔ یہ دنیا تو ایک سمندر ہے۔ کوئی اس میں اتر کر ڈوب جاتا ہے اور جو تیرنا جانتا ہے۔ وہ ساحل پر ڈوبتے ابھرے آ نکلتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں بھی کسی روز ساحل سے آنگلوں گی۔ مجھے ڈوبنے دو۔ میں پھر ابھروں گی۔“

”پھر کیا ہوگا؟“ وہاب نے پوچھا۔
”میں اپنے تجربوں سے سیکھنا چاہتی ہوں۔“
”کیا ساری عمر تجربے کرنی رہو گی۔“
”ابھی زندگی کی شام نہیں ہوئی چوہدری وہاب نہ ہی میں تکھی ہوں اور نہ میں تھکنے والوں میں سے ہوں۔ میں ابھی چل رہی ہوں۔ دیکھنا یہ ہے میں کھلتی ہوں وقت کھلتا ہے یا زندگی کھلتی ہے۔ کسی ایک نے تو تھلنا ہی ہے نا۔“

”اور جس روز تم تھک گئیں؟“ وہاب نے پوچھا۔
”چپ چاپ بیٹی کی چادر اوڑھ کر سو جاؤں گی۔“ وہ بولی۔
”غفو۔“ میں تجھے تھکنے نہیں دینا چاہتا۔“ وہاب نہایت سچائی سے بول رہا تھا۔
”تو یقین کر میرا۔“
”میں کیوں یقین کروں۔ میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح نہیں سوچا۔“
”اب سوچ لو۔“

”ضرورت کیا ہے؟“
”یاقم سوچنا نہیں چاہتیں؟“
”جو بھی سمجھ لو۔ یہ تمہارا اور دوسرے نہ کہ میرا۔“ عفیہ نے کندھے اچکائے۔
وہ اب نارمل ہو گئی تھی وہاب کے ہر سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں تھی۔ اپنے آپ کو اس نے سنھال لیا تھا

اگر وہ ایسا نہ کرتی تو نجانے وہاب کیا سمجھتا۔
”تم غاشیہ کی طرف لوٹ جاؤ۔“ عفیہ نے مشورہ دیا۔
”تم اس کی وجہ سے میری بات نہیں مان رہیں؟“ وہاب نے پوچھا۔
”میں میرے دل و ذہن کا فیصلہ ہے۔“
”میں تمہارا ایسا کوئی فیصلہ قبول نہیں کرتا۔“

”ضروری تو نہیں کہ تم میرے ہم خیال ہو۔ بھی وہاب تمہارے لئے غاشیہ جیسی لڑکی ہونی چاہیے جو ہر وقت مرد کی جوتیاں سیدھی کرے اور جب دل چاہے اس پر شک کرے۔ کوئی مضائقہ نہیں اسی طرح زندگی چلتی ہے۔ کہ زندگی کا کام ہی گزرتا ہے۔ تم میرا مشورہ مانو اور چلے جاؤ۔ وہ یقیناً اتنے لوگوں کی جدائی کے بعد کھلی ہانہوں سے تمہارا استقبال کرے گی۔“

”شٹ اپ۔“ وہاب گرجا۔
”صحیح مشورہ سن نہیں سکتے جبکہ میں منوانا چاہتی ہوں۔“ عفیہ نے کہا۔
”جہم میں جاؤ تم اور تمہارے مشورے۔“ اس جو کچھ میں نے کہا ہے اس کے بارے میں سوچو۔ مجھے ہر صورت ہاں میں جواب چاہیے۔“ وہاب نے سینٹ پچ پر پڑی ہوئی اپنی فائل اٹھائی اور پھر

”صرف ایک ہفتہ ہے تمہارے پاس سمجھیں۔“ اور پھر عفرہ کا جواب سنے بغیر ہی پلٹ گیا۔ سوکھے پتے اس کے قدموں تلے آ کر احتجاج کرنے لگے۔

”واج احمد میرا جواب ایک صدی بعد بھی یہی ہو گا کہ میں ساری عمر تمہاری غاشیہ کمال کی آنکھوں کی نفرت برداشت نہیں کر سکتی۔“ عفرہ نے زور سے مکا درخت کے مضبوط تنے پر مارا اور پھر پیشانی ٹکا کر نجانے کیوں رو دی۔

☆☆☆

”انتہائی بے وقوف ایڈیٹر ہیں آپ۔“ عفرہ چلائی

”دیکھو لڑکی برداشت کی حد ہوتی ہے۔ تم میری انسٹل کر رہی ہو۔“ مارے غصے کے حلی صاحب کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”اس میں انسٹل کی کیا بات ہے۔ ایک پرچے کے ایڈیٹر کو جب یہ سمجھ نہ ہو کہ آرٹیکل میں کیا چیز مناسب ہے اور کیا غیر مناسب تو پھر اس کی بے وقوفی میں کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔“

”تم چاہتی ہو جو تم لکھو وہ چھپ جائے۔“

”میں جو لکھتی ہوں نا حلی صاحب اس میں ایک لفظ کی بھی ترمیم کی گنجائش نہیں ہوتی چہ جائیکہ آپ پیرائے کے پیرائے نکال دیں۔ بانی پیچھے کیا چتا ہے۔“

”میں نے جو کیا ہے، بہتر کیا ہے۔“

”مگر وہ میرے لئے بہتر نہیں ہے۔“

”میں ایڈیٹر ہوں۔“

”میں رائٹر ہوں۔ آپ کو پتا نہیں شاید کتنا خون جگر اکھٹا کر کے میں لکھتی ہوں۔ ایک ایک لفظ کو ناقدانہ طور پر دیکھتی ہوں۔ اس کے بعد میں آرٹیکل آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ ہمارے نیم سیاسی پرچے کے قارئین کی کیا ذہنیات ہے۔ وہ کیا پڑھنا چاہتے ہیں۔“

”تم پرچہ بند کروانا چاہتی ہو؟“

”کاش میں اتنی خود غرض ہوتی کہ اپنے لیے رزق کا دروازہ بند کرنے کی چاہ کرتی۔“ عفرہ

بھر کر بولی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں راج ہنس تیر رہے تھے۔

اسے حلی صاحب کے انداز ان کے ”شک“ پر واقعی افسوس ہوا تھا۔ ان کے اس جملے نے جگر جھلنی کر دیا تھا۔

”تم پرچہ بند کروانا چاہتی ہو؟“

یہ جملہ تھوڑے کی طرح بار بار اس کے سر پر برس رہا تھا۔

”بھئی عفرہ۔ تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ بے شک تمہارا یہ سیاسی مضمون بہت اچھا ہے۔ مگر بات کو انتہا تک لے جانی ہو۔ یوں بھی مرکز اور صوبے کی آپس کی چیخ و پکار جنگ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ہمارا پرچہ ناپ لست پر ہے۔ تمہارے مضامین نہایت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے چند قاری تو یہ پرچہ صرف تمہارے آرٹیکل کی وجہ سے خریدتے ہیں اس کے باوجود میں نہیں چاہتا کہ یہ مضمون جوں کا توں چھپے۔“

”حلی صاحب۔ یہ مضمون جوں کا توں ہی چھپے گا ورنہ نہیں چھپے گا۔“

”تم فضول ضد کر رہی ہو۔“

”آپ فضول سی دلیلوں میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔“

”ایک تو یہ مصیبت ہے کہ جو بات تمہارے ذہن میں بیٹھ جائے وہ نکلتی ہی نہیں۔“

”اس لئے کے میں غلط فیصلہ نہیں کرتی اور جب کوئی فیصلہ کر لیتی ہوں تو اس پر ڈٹ جاتی ہوں۔“

”ضروری تو نہیں کہ تمہارا ہر فیصلہ درست ہو۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے۔“

”اپنے مسائل میں دوسروں کو مت الجھاؤ۔“

”آپ کیوں اٹکھتے ہیں؟“ وہ تڑخ کر بولی اور حلی صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے بال نوچ لیں۔

”بہت مشکل ہو تو۔ پتا نہیں کتنی تھیں ہیں تمہاری۔“ حلی صاحب بولے نہیں بس سوچ کر رہ گئے تھے۔

اور آخر کافی بحث کے بعد بالآخر حلی صاحب کو ہی جھکنا پڑا۔ کہ آخری پتا اس نے پھینکا تھا جس سے حلی صاحب حجت ہو جاتے تھے۔

”میں کل سے آفس نہیں آؤں گی۔ کوئی بندوبست کر لیجئے گا۔“

وہ یہ بات کہتی تھی اور حلی صاحب کو لگتا جیسے ان کے اوپر سے ٹرین گزر گئی ہو۔

انہیں پتا تھا کہ اتنے خلوص سے کوئی بھی لڑکی کام نہیں کر سکتی۔ وہ زبان کی تلخ ضرورت تھی لیکن دل کی صاف تھی۔ اپنا پورا آفس وہ اس پر چھوڑ کر نہایت اطمینان سے شہر سے باہر اپنے کام بنانے کے لیے چلے جاتے تھے۔ انہیں آفس کی فکر نہ رہتی تھی۔ وہ عفرہ کی تحریروں سے بھی مطمئن تھے۔ کہ غضب کی کاٹ گئی اس کے قلم میں۔

بڑے تاک تاک کے وہ نشانے لگاتی تھی۔ مگر وہ کیا کرتے کہ ”پالیسی“ نے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا پرچہ ”بین“ ہو۔ کہ رزق کا وسیلہ ہی یہی تھا۔ اور آج جو عفرہ کا مضمون ان کے سامنے تھا وہ فی الحاظ سے بہت مربوط تھا مگر ایک انجانا سا خوف حلی صاحب کے دل میں بیٹھ گیا۔

وہ صحافی تھے۔ کئی اتار چڑھاؤ انہوں نے دیکھے تھے۔ اپنی صحافتی زندگی کے دوران وہ بار بار بھوکے کے بھی سوئے تھے کہ مالکان اخبار نے جب چاہا، تنخواہ روک لی۔ اور انہوں نے صبر کا دامن چھوڑا۔ مگر عمر کے اس دور میں آ کر وہ کسی صورت بھی ”بھوک“ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اپنے بچوں کو بلکنا دیکھنا چاہتے تھے۔

اسی لیے تو وہ عفرہ کو بار بار سمجھاتے تھے۔

”میرا خیال کرو۔“

وہ کیا خیال کرتی۔ اس کا کسی نے خیال کیا تھا۔ یہ باغیانہ سوچ اس کے اندر زہر بھر دیتی اور وہ زہرہ اسے قلم کے ذریعے صفحات پر بکھیر دیتی۔

جو نقص مرتبہ تو حلی صاحب دل پر جبر کر کے پی جاتے اور اس کا دھواں دار آرٹیکل پرچے میں لگا دیتے۔ کہ قاری تو عفرہ کے آرٹیکل کو ”فلک“ کی جان کہتے تھے۔ اپنی تعریف پر وہ بھی خوش نہ ہوتی

تھی۔ بلکہ تعریفی خطوط پڑھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ رنگ جاتی تھی۔ جبکہ آنکھوں میں وہی سرد کاسکوت موجود رہتا تھا۔ جسے کوئی نام نہ دیا جاسکتا تھا۔

وہ نہ اپنی تعریف پر خوش ہوتی تھی اور نہ ہی خود پر کی گئی بات پر خفا ہوتی تھی البتہ جب اس کی بات نہ مانی جاتی اور اسے غلط کہا جاتا تو وہ ساری تمیز بھول جاتی تھی۔ دل چاہتا کہ زمین آسمان ایک کر دے۔

اور اپنی مرضی سے دنیا کو بنائے۔

حلی صاحب کو تو غصے میں بے نقط سنا دیتی تھی اور وہ حلیم سے شخص اسے مختلف دلیلوں سے پیار سے سمجھاتے رہتے مگر وہ کیا کرتی۔

بقول وہاب کے اس کی کھوپڑی میں الٹا دماغ رکھا گیا تھا۔ شاید ایسی ہی تو تھا۔ تبھی تو اس نے میز پر رکھا ہوا اپنا ”دھانسو“ آرٹیکل اٹھایا۔ جس کے کئی پیرائے حلیمی صاحب نے نشان زد کیے تھے کہ یہ نہیں چھپ سکتے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ محنت سے لکھا ہوا۔ مضمون پھٹ چکا تھا۔ اور وہ ہونٹ پکاتی ہوئی حلیمی صاحب کے آفس سے نکل آئی۔ کہ اپنی ہار پر دل یونہی ٹوٹا ہے۔ اسے بھی کرچیاں اپنے دل میں جھپتی ہوئی محسوس رہو رہی تھیں۔

☆☆☆

دروازے کی زنجیریلی تو شرفاں کو لگا جیسے جھا جھریں چھنک اٹھی ہوں۔ وہ تاباں کے پاؤں پر گرم ریت کی گھور کی رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ جھا جھریں اس کے آئینے دل میں چھنک رہی ہوں۔ وہ نہایت اطمینان سے بیٹھی رہی۔

”اماں دیکھو تو دروازے پر کون ہے؟“ تاباں نے کہا کیوں کہ چند منٹ بعد پھر زنجیر بجی تھی۔

”کون آیا ہے؟“

”دیکھو گی تو پتا چلے گا۔“

”پتا نہیں تیرا دادا کہاں چلا گیا ہے۔ میں اکیلی کیا کیا کروں“ تجھے بھی دیکھوں اور۔۔۔“

شرفاں بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور تاباں مسکرا دی۔ کہ اب شرفاں میں بہت تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ اب بات دل میں رکھ کر کڑھتی تھی بلکہ فوراً احتجاج کرتی تھی۔ ہر سوال کا جواب دیتی تھی۔ فضل دین بھی بہت خوش رہتا تھا۔ کتنے ماہ ہو گئے تھے اب تو دونوں میں جھگڑا بھی نہ ہوتا تھا۔ بڑی مطمئن سی زندگی گزار رہی تھی۔ شرفاں سر پر دوپٹہ درست کرتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی اور دوسرے لمحے ہی اُس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

سامنے ہی اسجد کھڑا تھا۔

شرفاں کی آنکھوں میں آشنائی چمک اُبھری اور لب مسکرا دیے۔

”سلام ماں جی۔“

”ولیکم سلام۔ شام کو میں نے کہا تھا آؤ تو نہیں آئے۔ اب کیوں آئے ہو۔؟“ معصوم سا شکوہ شرفاں کے لبوں سے پھسل پڑا۔

”اپنے انکار کا افسوس ہوا تو فوراً چلا آیا۔“ اسجد نے نہایت سچائی سے اپنی شکست کا اعتراف کیا۔

”دل نے مجبور کیا ہوگا۔۔۔“

”شاید یہی بات ہو کہ بعض باتوں میں دل کو ہی امام بنانا پڑتا ہے۔“

”اماں کون ہے؟“ تاباں حیران تھی کہ ماں اتنی دیر تک دروازے پہ کھڑی کس سے باتیں کر رہی ہے۔

”آؤ اندر آ جاؤ۔۔۔“ شرفاں نے دروازے سے ہٹ کر اُسے راستہ دیا۔ ”میرے ساتھ آ جاتے تو حرج تھا بھلا۔ اب بھی کس نے گھر بنانا تمہیں۔“

”ایک بچے سے آپ کا نام لیا تھا تو وہ مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔“ اسجد نے دہلیز پار کرتے ہوئے کہا۔ شرفاں ایک دم ہی ٹھنک گئی اور پلٹ کر اسجد کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے ہو۔؟“

”یوں ہی سمجھ لیں۔۔۔“ اسجد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ واقعی اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آ رہی تھی۔

”جھوٹ مت بولو تم تاباں کو تلاش کرتے ہوئے آئے ہو۔“ شرفاں نے کہا تو اسجد ہنس دیا۔

”ماں جی۔“ اسجد نے شرفاں کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نہایت نرم لہجے میں بولا۔

”تاباں بھی تو آپ کے وجود کا حصہ ہے نا۔ اُسے تلاشوں یا آپ کو بات تو ایک ہی ہے نا؟“

”ہاں تاباں تو میری جند ہے۔ اس کی وجہ سے تو میں زندہ ہوں۔ اُسی کی خاطر تو میں اپنے اندر کی جنگ مار گئی ہوں۔ تجھے کیا تاؤں کہ میں نے کتنے سالوں بعد سمجھوتا کیا ہے صرف تاباں کی خاطر۔“

شرفاں کی آواز۔۔۔ بھرانے لگی تھی۔

”اماں۔۔۔“ تاباں کی آواز پر وہ چونگی اور پلٹ کر تیزی سے کمرے میں گھس گئی۔ اسجد بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلا گیا۔ جہاں بان کی گھر درزی چارپائی پر تاباں تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اُس کی نظریں دروازے پر جم گئیں۔

اسجد نے محسوس کیا کہ پہلے اُن حسین آنکھوں میں آشنائی چمک اُبھری۔

اور پھر دوسرے لمحے وہاں چمک کی جگہ خوف نے لے لی۔ اُس نے ایک دم ہی اسجد پر سے نظریں ہٹا کر ماں کی طرف دیکھا تب شرفاں آگے بڑھی اور تاباں کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

”تو بڑی خراب ہے مجھے اس کے بارے میں تو نے نہیں بتایا۔ حالانکہ میں تجھے ہر بات بتا دیتی ہوں۔“

بالکل دوستوں کی طرح۔ وہ بیٹی سے شکوہ کر رہی تھی۔

”اماں کیا بتانی تجھے۔۔۔“

”کیوں۔۔۔؟“

”مجھے تو خود اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میں کیا ترے سوالوں کے جواب دیتی۔“ تاباں نے آواز بھڑا گئی۔

”تجھے پتا نہیں اس کا۔“ شرفاں نے حیرت سے پوچھا۔ اور پھر اسجد کی طرف دیکھ کر بولی۔

”تو بھی تاباں کو نہیں جانتا؟“

”ماں جی۔۔۔“ اسجد چند قدم اور آگے بڑھ آیا وہ اب ان دونوں کے بے حد قریب کھڑا تھا۔

”میں تاباں کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ وہ لڑکی ہے جسے دیکھ کر میرا دل پہلی بار شدت

سے دھڑکا۔ میرے اندر کی دنیا ایسی بدلی کہ مجھے ہر سمت یہی دکھائی دیتی ہے۔ میرے ذہن میں یہ بولتی ہے۔ اور دل میں رہتی ہے۔ یہ میری اپنی ہے۔ اور اتنی آشنائی بہت ہے۔
”کبھی تم نے ایک دوسرے کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی۔“

”ضرورت ہی کیا ہے ماں جی! تجھے یہ علم ہے یہ تابلی ہے جسے میں اپنے دل کی ماتمتر شدتوں سے چاہتا ہوں اور یہ میری پہلی تمام محبتوں پر حادی ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ نہ میں کچھ جانتا ہوں نہ جانتا چاہتا ہوں“ اسجد نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”دیکھیں نا کوئی جذبہ تھا جو مجھے یہاں تک لایا ہے ورنہ میں نے تو یہاں آنے سے انکار کر دیا تھا۔“ اسجد کے لہجے میں سچائیوں کی مہک بھی اور آنکھوں میں نچانے کیا تھا کہ تاباں نے جو نہایت غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ وہ ہر دھڑکن اپنی ساعتوں میں سن رہی تھی۔

”ارے تم کھڑے کیوں ہو بیٹھو نا؟“ شرفاں کو ایک دم ہی احساس ہوا تھا۔ پھر وہ بید کی کرسی اٹھالائی۔ اور چار پائی کے قریب ہی لا کر رکھ دی، اسجد گری پر ٹک گیا۔

”میں تمہارے لیے گرم گرم دودھ لاتی ہوں۔“

”میں دودھ نہیں پیتا ماں جی۔“

”چلو چائے بنا لاؤں۔“

”ضروری ہے۔“

”تم پہلی بار میرے گھر آئے ہو پھر تابلی کیا سوچے گی کہ میں نے خدمت ہی نہ کی تمہاری۔“

”ماہیں بیٹوں کی خدمت نہیں کرتیں بلکہ یہ بیٹوں کا حق اور فرض ہوتا ہے۔“

”تم میرے بیٹے ہو۔“ شرفاں کی آواز میں کئی خواہشیں کوکنے لگی تھیں۔

”ہاں! شک کی وجہ؟“ اسجد نے آنکھیں موند کر دوبارہ کھولیں۔

”میرے پاس رہو گے۔“

”میں آپ کو اپنے پاس رکھوں گا۔“

”سچ۔۔۔“

”ہوں۔ اعتبار کریں۔“

”اب مجھے کسی بات پر بھی اعتبار نہیں آتا یہ نہیں کیوں میں شک کے موسموں میں جی رہی ہوں۔“ شرفاں کی آواز پھر۔۔۔ بھرانے لگی تھی تب تاباں نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

”اماں! تم چائے تو لے آؤ۔ اسجد کیا کہے گا کہ یہ لوگ کہہ کر چیز نہیں دیتے۔“

”ہاں مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ وہ ایک دم ہی نارمل ہوگئی۔ ”میں ابھی اپنے بیٹے کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ شرفاں جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ اور کمرے پر سکوت کی چادر تن گئی۔

اسجد اور تاباں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ اسجد تو تاباں کو دیکھ رہا تھا جو سر جھکائے اپنی انگلی پر دوپٹہ کا پلو پلیٹ اور کھول رہی تھی۔

دونوں کے درمیان خاموشی کی نہر بہہ رہی تھی۔ پر اس خاموشی میں بھی کئی آوازیں تھیں۔

دل سے دل ہی جو باتیں ریویو کر رہا تھا۔

خاموشی بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔

کبھی بالکل چپ ہوتی ہے مکمل سکوت۔

اور کبھی سکوت میں بھی سرگوشیاں سنائی دیتی ہے۔ بالکل ایسی ہی خاموشی ان کے درمیان بھی تھی۔ کہ دونوں ایک دوسرے کے دل کی ہر آواز سن رہے تھے۔

اسجد۔ تاباں کو نہایت پُر شوق نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ اُس کے اس طرح دیکھنے پر بوکھلائی چلا رہی تھی۔ بولا رہی تھی۔

اسجد ملک کی نگاہوں کی گرمی وہ اپنے چہرے پر صاف محسوس کر رہی تھی۔

اُس کی جی چاہ رہا تھا کہیں پھپ جائے۔

تاباں کو لگ رہا تھا۔

جیسے وہ موم کی بنی ہوئی ہو۔

ابھی پکھل کر رہ جائے گی۔

مٹ جائے گی۔

اس کا دل چاہا اسجد سے کہے۔

”مت دیکھو مجھے اس طرح کہ میں تمہاری نگاہوں کی گرمی برداشت نہیں کر سکتی۔“

مت مجھے نظروں سے پیار کرو کہ تمہارا لمس میرے وجود میں بھانپ بھڑکا دیتا ہے۔

میرا رواں رواں تنے لگتا ہے۔

لگتا ہے جیسے وجود کسی تنور میں ڈال دیا گیا ہو۔ نہ دیکھو مجھے ایسے کہ میں اپنے آپ میں نہیں رہتی۔ جب بھی تمہاری آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھتی ہوں۔ مجھے اپنا ہوش نہیں رہتا۔

”تابلی۔“ اسجد نے سکوت کی چادر میں شکاف کر دیا۔

”ہوں۔“ تاباں خیالوں کے صحراؤں سے نکل آئی۔

”مجھے نہیں پتا تھا کہ میں دل کے ہاتھوں اتنا مجبور ہو جاؤں گا کہ دوڑا چلا آؤں گا۔ مجھ سے خفا

مت ہوتا۔“ اسجد نے نہایت لجاجت سے کہا۔

”ناراض میں کیوں ہونے لگی بھلا۔؟“

”میں تمہاری اجازت کے بغیر یہاں آیا ہوں نا؟“ اسجد نے کہا۔ ”تم نے تو کبھی بھی مجھے نہیں لگا کہ میں تمہارے گھر آؤں۔“

”کیسے کہتی۔؟“

”کہنے میں کیا حرج تھا؟“

”ملک! اس گھر میں آ کر تم نے اندازہ تو لگایا ہوگا کہ تم میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ تم محلوں کا رہنے والے شخص ہو اور میں نے کچے آنگن کے اس چھوٹے سے گھر میں جنم لیا ہے۔ اس کے

لوگ مجھے پتا ہے اپنی محبت کا انجام پھر بھی خود کو اس چھٹی راہ پر چلنے سے نہیں روک سکتی۔ مجھے اس صحرائیں چلنا اچھا لگتا ہے۔ کہ بغض مرتبہ پیروں کے چھالے دیکھ کر بھی تو تسکین ملتی ہے نا؟“

”کیا بے وقوفی کی باتیں تم کر رہی ہو۔“

”تم حقیقت کو جھٹلانے کا کہنا چاہتے ہو۔۔۔؟“

”میرا مطلب یہ نہیں ہے۔۔۔ کہ تم حقیقت کو غلط کہو۔ مگر جو بات حقیقت نہ ہو اُسے فضول سے

دھسے قائم کر کے سچ کیوں مانا جائے ملک! کیا یہ غلط ہے کہ جب تمہارا وہ کام جس کے سلسلے میں تم

تجھے ہر جگہ پکارا O 233

وہاں محبت نہیں رہتی بلکہ سودے بازی ہوتی ہے اور میں نہایت کھرا بندہ ہوں۔ میں کبھی بھی اپنی گانے کی کسی کو اجازت نہیں دے سکتا۔ تو میرے لیے کیا ہے یہ وقت آنے پر پتا چلے گا۔

”کیا پتا چلے گا اجب۔“ شرفاں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اُس کا آخری جملہ سن لیا۔

”ماں جی یہ تو نہایت کملی ہے۔“

”کون۔“ شرفاں نے مٹی کا پیالہ جو گرم چائے سے مہک رہا تھا اس کی طرح بڑھایا۔

”بھئی یہ تاباں۔ مجھے نہیں پتا تھا اتنی سیانی ماں کی بیٹی اس قدر بے وقوف ہوگی۔“

”یہ لوگ تو مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔“ شرفاں جلدی سے بولی۔

”ان کی بہت بڑی بھول ہے یہ“ اجب نے مسکرا کر تاباں کو دیکھا جو خود بھی مسکرا رہی تھی۔ کس طرح شرفاں کو بہلا رہا تھا۔

کیسے ایک دم بات کا رخ بدل دیا تھا۔

تو تم ہواؤں کا رخ بھی تبدیل کر سکتے ہو۔

زمانے کو بدل سکتے ہو۔

بہت جی دار ہوا اجب ملک۔

اور مجھے بھی ایسے ہی مرد پسند ہیں۔ جو موقع کی مناسبت سے بات کرتے ہیں۔

جو ہر کسی سے اس کے ذہن کے مطابق بات کرتے ہیں۔

اجب نے بھی شرفاں کا معصوم ذہن پڑھ لیا تھا بھی تو اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

”میں نے بلایا تھا تب تم کیوں نہیں آئے تھے؟“ شرفاں پھر وہی پہلا سوال کر رہی تھی۔

”اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو فوراً ہی آ گیا کہ جو در کھٹکھٹانا چاہتا ہوں اس کا دروازہ خود ہی کھل رہا ہے تو نہ جانا بے وقوفی ہے بس یہ خیال آتے ہی دوڑا چلا آیا۔ میں نے غلطی تو نہیں کی نا؟“

”پہلے اس سے تو پوچھوں جی۔“ اجب نے تاباں کی طرف اشارہ کیا۔

”تم واقعی تاباں کو چاہتے ہو اجب۔“

”ماں جی! میرا یہاں آنا کیا اس سچائی کی دلیل نہیں۔“ اجب نے آہستگی سے کہا۔

”تمہارے والدین بھی اسے چاہیں گے تمہاری طرح۔“

”کیوں نہیں۔ میری پسند سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوگا۔ تاباں میری پسند ہے۔ جسے میرے گھر والے آ کر نکھوں پر بٹھائیں گے۔“

”اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟“

”آپ کیوں خدشات میں گھر گئی ہیں ماں جی۔ وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔“

”فرض کرو۔ وہ اس رہتلی سرزمین کی لڑکی کو اپنی نبھوں (بہو) نہ بنائیں پھر۔“

شرفاں کے اس جملے نے تاباں کے دل میں پٹھے سے لگا دیے۔ اُس کا رخ اجب کی طرف تھا اور

”میں تو اسے اپنا نا چاہتا ہوں نا۔ ماں جی۔ مجھے آج یہ احساس شدت سے ہوا کہ میں تاباں

”میں تو اسے اپنا نا چاہتا ہوں نا۔ ماں جی۔ مجھے آج یہ احساس شدت سے ہوا کہ میں تاباں

”مگر میں تو تمہارے والدین کے آئے بغیر تاباں کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔“

تجھے ہر جگہ پکارا O 232

آئے ہو ختم ہو جائے گا تو تم لوٹ جاؤ گے؟“

”یہ سچ ہے کہ میں لوٹ جاؤں گا۔“ اجب نے اعتراف کیا تب تاباں جلدی سے بولی۔

”پھر تمہیں بھی خیال بھی نہ آئے گا کہ محرائے قتل کی پتی ریت پر کوئی تاباں تمہارے قدموں کے نشان تلاش پھرتی ہے تمہیں تو یہ احساس بھی نہ ہوگا کہ کبھی تم نے اُس سے پانی مانگا تھا اور۔“

”اور کیا۔“

”یہی مجھے لگتا ہے میں تمام عمر تمہاری کھوج میں ہر آنے والے مسافر کو پانی بلایا کروں گی۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو تاباں۔“ اجب نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ تمہیں ذرا دکھ نہیں ہو رہا یہ

لفظوں کے سوائے میرے دل میں چھبوتے ہوئے۔“

”یہی لفظ سچے موتی ہیں ملک۔“

”نہیں! سچ وہ ہے جو میرا دل کہتا ہے۔“

”تمہارا دل کیا کہتا ہے؟“

”تمہیں پتا ہے۔ میرے اندر کے سارے موسموں کی تمہیں خبر ہے۔“

”کیا ایسا نہیں ہے؟“

”پتا نہیں تم سچ کہتے ہو؟“

”میں یہاں سے جاؤں گا میرا پراجیکٹ مکمل ہو جائے پھر لاہور جا کر اپنی ماں کو لاؤں گا۔“

میری بہن غاشیہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی اور پھر فوراً ہی دیکھنا وہ ضد کرے گی کہ تمہیں اپنی بھابی بنائے۔“

اجب نے شوخی سے کہا۔ تو پتا نہیں کیوں اُس کا یہ جملہ تاباں کے چہرے پر کوئی گلاب نہ کھلا سکا۔

”تاباں! کیا تم میرے یہاں آنے پر خوش نہیں ہو۔؟“ اجب۔۔۔ اُس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”خوش۔ ملک خوشی محسوس کی جاسکتی ہے دیکھی جاسکتی اور میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ تمہارے آنے سے میں کس قدر خوش ہوئی ہوں مگر۔“

”مگر کیا۔؟“

”انجانے سے خدشے میرا دل دھڑکا رہے ہیں۔ میرا دل سوکھ رہا ہے۔“ ایک دم ہی تاباں کی آواز بھر اگئی۔

”تاباں! میرے سامنے رونامت۔ میں تمہارے آنسو کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ اجب نے اُس کی موٹی انگلیوں والا نرم ہاتھ اپنے مضبوط دونوں ہاتھوں میں دبایا۔

”میرے سامنے تم کبھی نہ رونا میری جنت۔“

”ملک۔ تم اب بھی مجھے چاہتے ہو؟“

”اب اور تب کی کیا بات ہوئی۔“

”سننا ہے شہری لڑکے دولت مند لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔“ تاباں نے کہا تو اجب زور سے ہنس

دیا۔

”جھلی نہ ہو تو۔ تیرا کیا خیال ہے کہ مجھے پتا نہیں تھا تو فضل دین کی بیٹی ہے۔“ تاباں محبت دولت کی محتاج نہیں ہوتی وہ دلوں کی محبت کے درمیان دولت کی چھری نہیں ہوتی۔ جہاں یہ چھری آ

”وہ آئیں گے۔ اور ضرور آئیں گے۔“
”فرض کرو نہ آئے تو۔“

”ماں جی کیوں آپ غلط مفروضے قائم کر رہی ہیں۔“ اسجد اب جھنجھلا گیا تھا۔ اُسے اب شرفاں واقعی خطی سی عورت محسوس ہو رہی تھی جو ایک بات کو بڑی طرح پہنچتی ہے تو پھر پچھتی ہی چلی جاتی ہے۔
”میں چاہوں گی کہ تم اپنے ماں باپ کو لے آؤ اور اُن کے آنے تک بات مکمل ہونے تک تم تاباں سے نہ ملو۔“ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں اسجد بیٹا۔ بہت زیادہ ملو گے نا تو یادوں کی گھڑی بھاری ہوگی اور جس قدر بوجھ ہو ڈکھ بھی اسی قدر ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم دونوں کو ڈکھ ہو۔ تاباں مجھے بہت پیاری ہے اور تم بھی مجھے عزیز ہو کہ تم تاباں کو پسند ہو۔ میں تاباں کو داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔ شہری لوگوں میں ایک عادت بہت اچھی ہوتی ہے کہ وہ زمانے کی رفتار کے ساتھ بدلتے ہیں وہ پچھڑنے والوں کو یاد نہیں کرتے۔ کھوجانے والوں کو تلاش نہیں کرتے۔“

”یہ آپ غلط کہہ رہی ہیں ماں جی۔ آپ کے تجربے اپنی جگہ مگر سچ تو یہ ہے کہ شہری لوگ جسے چاہتے ہیں اسے یاد بھی کرتے ہیں اور وہ کھوجائیں تو تلاش بھی کرتے ہیں۔“

”ناممکن ہے یہ۔ بہت مصروف ہوتے ہیں شہری اُن کے پاس اتنا وقت کہاں جو گمشدہ لوگوں کو تلاش کریں۔“ شرفاں کے لبوں پر زہر خند پھیل گیا۔

”ماں جی۔ میں بہت سی مثالیں تو نہیں دے سکتا مگر ایک مثال وجود ہے زندہ مثال موجود ہے زندہ مثال جس سے میں آپ کو ملوا بھی سکتا ہوں۔“ اسجد کا لہجہ نہایت مضبوط تھا اور شرفاں نہایت غور سے اُس کی باتیں سن رہی تھی جو کہہ رہا تھا۔

”میرے چھوٹے ماما ہیں ظفر عالم وہ آج بھی اس بچی کو تلاش کر رہے ہیں جو ان کی منگیتری تھی۔ اب تو وہ نجانے کہاں ہوگی۔ مگر وہ قریہ قریہ ملکوں ملکوں اُسے تلاش رہے ہیں۔ بھلا ہے نا بے وقوفی۔ انہوں نے اُس کی تلاش کی خاطر ملک چھوڑ دیا۔“

”کون ہیں وہ؟“

”میرے ماما ظفری۔ یعنی ظفری عالم۔“ اسجد نے بتایا۔

”ظفری۔ ظفری۔“ شرفاں کو لگا جیسے اُس کے ذہن میں ایک دم ہی بلب سا روشن ہو گیا ہو۔

”بہت سے تر مرے اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے تھے۔“

”کیا نام ہے؟“ وہ پھر پوچھ رہی تھی۔

”ظفر عالم۔“ اسجد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

”ظفری۔ ظفری کا تم کہہ رہے ہو نا۔ وہ۔ وہ ظفری۔“ شرفاں کا ذہن گھومنے لگا تھا اُس نے اپنا

چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”اتنا۔ اتنا۔“ تاباں نے ماں کو تھام لیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شرفاں گر گئی ہوتی۔

اسجد ہکا بکا سا شرفاں کو دیکھ رہا تھا جو تاباں کی ہانپوں میں پڑی تھی اور اُس کے لب کپکپا رہے

تھے۔ وہ اُس پر جھگ گیا تا کہ سن سکے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔



شرفاں کے لب ایک دم ہی پھنچ گئے اور اسجد کچھ بھی نہ سُن سکا۔ وہ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔
”کیا ہو گیا ہے اتناں کو؟“ تاباں کی گھبرائی گھبرائی سی آواز اسجد کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ اس نے
اتناں کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ لگتا تھا ابھی پیلکوں کے بند تو ڈر گا لوں پر وہ
ملک۔۔۔ بناؤ نا!“

”میں کیا بتاؤں؟“ وہ پریشان سا تھا۔

”تم نے کیا بات کہی اتناں سے“ تاباں جانا چاہتی تھی۔

”ہر بات تمہارے سامنے تو ہوئی ہے۔“ اسجد نے کہا۔

”اتناں۔۔۔ اتناں۔۔۔ بولونا۔“ تاباں ماں کے چہرے کو ہولے ہولے تھپک رہی تھی۔ مگر شرفاں تو

اتناں کو میں بے سدھ سی پڑی تھی۔ اسے بیٹی کی پریشانی کی ہوش ہی نہ تھی۔

”ملک۔۔۔ تم چلے جاؤ۔“

”کیوں؟“ اسجد نے حیرت سے کہا۔

”اگر بابا اور اتنا آ گئے تو میں انہیں کیا جواب دوں گی۔ رب کے واسطے تم چلے جاؤ ملک۔“ وہ رو

پھکی۔

”میں پریشانی کی حالت میں کیسے چھوڑ جاؤں۔“

”کوئی پریشانی نہیں اتناں کبھی اس طرح دیوانگی کی باتیں کرتی ہیں۔ اب کافی عرصے بعد انہیں

پھر سے تم فکر مند نہ ہو۔ بس جاؤ۔ اتنا نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔“ تاباں پورے وجود سے

پہنچ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسجد کو بازو سے پکڑ کر گھر سے نکال دے۔ وہ نہیں چاہتی تھی

کہ کوئی یہاں دیکھے۔ شرفاں کی ہوشمندی اور بات تھی۔

اگر اتنا آ گیا اور اتناں کو بے ہوش دیکھ کر اسجد کی موجودگی میں معلوم نہیں وہ کیا کچھ سوچ لے۔

بس یہی ”کیا کچھ“ ہی تو تھا جو اسے خوفزدہ کر رہا تھا۔ اور وہ دہشت زدہ ہرئی کی طرح اسجد ملک کو

دھمکاتے کہہ رہی تھی۔

”تم طے جاؤ ملک ابھی اور اسی وقت۔“ تاہاں کا لہجہ پتھر پلاتا تھا۔ جیسے وہ حتی طور پر فیصلہ کر چکی کہ اسجد کو یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ اسجد کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔ بھلا وہ اس لہجے کا کب عادی تھا۔ وہ تو تاہاں کے لبوں سے نکلنے والے نرم نرم محبت آمیز جملوں کا عادی تھا۔ ایسا رو۔ تو تاہاں نے بھی اختیار نہ کیا تھا۔ اسجد کا دل دکھ کے دھوئیں سے بھر گیا۔

”میں پہلی بار تمہارے گھر آیا ہوں تاہاں۔ اور تم مجھے دھکے دے رہی ہو۔“ اسجد کی آواز میں دکھ بولنے لگے تھے۔

”میں مجبور ہوں ملک۔ تم سمجھو نا۔ میری اس وقت کیا حالت ہے۔ میں اٹھ کر کہیں نہیں جاسکتی۔ پھر میرا بازو رانگی مزاج ہے ملک۔ کتنی مشکل سے تو وہ اتنے سالوں بعد اتناں سے راضی ہوا ہے۔ تم تمہارے ہوملک۔ بات سمجھو۔“ تاہاں کا لہجہ انتہائی ملتیانہ تھا۔

”خیر۔۔۔ میں چلا جاتا ہوں۔“ وہ ہار سا گیا۔

”خفا ہو؟“ تاہاں پریشان ہو گئی۔

”مجھے شاید ایسا کوئی حق نہیں ہے۔“ اسجد واقعی خفا تھا۔

”تم کو ہر حق حاصل ہے ملک۔۔۔“ تاہاں گلوگیر لہجے میں بولی۔

”بہتر۔۔۔“ اسجد ملک نے نہایت مایوسانہ انداز میں تاہاں کو دیکھا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

تاہاں نے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ مبادا دل سے اٹھنے والی صدا لبوں پر آ جائے۔ وہ اسے پکارنا چاہتی تھی۔

دل چاہتا تھا اسجد کے آکھیں مسلسل پیا سی تھیں۔

اور زبان اس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پر مصلحت نے زبان پر تالے لگا دیے تھے۔ بے وقوف لڑکی! تم نے پردیسی مہمان کو گھر سے نکال دیا۔ دل والے مہمانوں کو کوئی ایسا حکم ہی سناتا ہے کہ جگر چھلنی ہو جائے۔ لفظوں کے سارے تیر دل میں کھب جائیں۔ کتنی چھلنی ہے تو تاہاں۔۔۔

کتنی دور سے آیا تھا ملک۔۔۔ تجھے کھو جتا ہوا۔۔۔ بھلا محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسا سکول کیا جاتا ہے؟

ارے دل میں بسنے والے گھر کی دلیز پار کر سیں تو انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ یوں دھکا مارو نہیں جاتا کہ اگلے کی روح میں ہی کانٹے ہی چبھ جائیں اور وہ اظہار بھی نہ کر سکے۔

ہائے اسجد ملک۔ تمہیں کیا پتہ کہ تم سے ایسے سلوک پر میرا دل مجھے کس قدر ملامت کر رہا تھا۔ لیکن میں کیا کروں؟۔۔۔ میں بہت مجبور ہوں ملک۔ بہت ہی مجبور۔ روایات کی پابند لڑکی ہوں۔ اگر اب تمہیں دیکھ لیتا تو نہ جانے کیا کچھ سوچتا۔ ابھی تو اماں والا پھٹ بھی مندمل نہیں ہوا۔ وہ تو اسے اماں سے بے بے حساب محبت ہے کہ وہ اپنے زخم کے منہ سینے میں کامیاب ہو گیا ہے ورنہ۔ ورنہ۔ مجھے معاف کر دیا۔

مجھے معاف کر دینا۔

تاہاں نے بے ہوش ماں کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں بالکل دریا کی طرح بہہ نکلا۔

دل میں ایسا درد اٹھا جو پورے وجود پر مسلط ہو گیا۔ اسے تو آج ہی پتا چلا تھا کہ وہ کون سے جذبے کی دلدل میں اتر گئی ہے۔

یہ کیسا جذبہ ہے جو چین نہیں لینے دیتا ہے۔

شاید محبت دکھ ہے۔

اور وہ بھی محبتوں کے دکھ اٹھانے کی ابتدا کر چکی تھی۔

☆☆☆

ظہر ہما کو ”ملک ہاؤس“ آئے چند منٹ ہی گزرے تھے۔ وہ ابھی بھائی اور بھادج سے علیک میں مصروف تھیں کہ جمال ملک بمعہ گل فشاں اور اپنی والدہ آسیہ بی بی کے ساتھ آمو جو ہوئے۔

ظہر ہما بھائی کے سامنے بھیجی۔ اور جمال ملک نے انہیں بازوؤں میں سمیٹ کر بہن کی پیشانی چوم کر پوچھا۔

”کب آئیں تم؟“

”ابھی ابھی آئی ہوں۔“ ظہر ہما نے آگے بڑھ کر ماں کی قدم بوسی کی پھر بھادج سے گلے ملیں۔

”گل فشاں نے شکوہ کر ہی دیا۔“

”کبھی یہ نہیں ہوا کہ کراچی ہی چلی آئیں آپ؟“

”بس بھائی۔ سردار پور سے نکلنے کو ہی دل نہیں چاہتا۔“ ظہر ہما نہایت متانت آمیز لہجے میں

”یہ کہیں کہ بھائی کے گھر آنے کو جی نہیں چاہتا۔“ گل فشاں بولیں۔

”یہ بات نہیں ہے۔ مجھے تو بھائی بہت ہی پیارے ہیں بھائی۔ میں تو کبھی متیوں بھائیوں کو نظر بھر کر نا دیکھی مبادا نظر نہ لگ جائے۔ پر کیا کروں، گھر بھی تو ہے نا؟۔ ساری ذمہ داری احمد خان بھی پر تو رکھے ہیں نا۔“

”پھر بھی وقت تو نکلا جاسکتا ہے نا۔ آخر آپ یہاں بھی تو آتی ہیں۔“ گل فشاں نے ہنس کر کہا۔

ظہر ہما حیران تھیں کہ آج بھادج کی محبت اچانک کیسے عود کر آئی ہے۔ پر کہا کچھ نہیں بس مسکرا مسکرا

”بھئی۔ جلال بھائی آنے والے ہوں گے۔ میں نے بھی جلدی جانا ہے۔ ساڑھے چار بجے کی ہے میری۔ انتظام کر لو۔“ جمال ملک نے اپنی گولڈن رسٹ واپس پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا انتظام ہے؟۔ گھر کی بات ہے۔“

”بھئی منہ بیٹھا تو ہوگا۔۔۔“ آسیہ بیگم نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“

”کیسا منہ بیٹھا؟“ ظہر ہما نے پوچھا۔

”میرے رافع اور عائشہ کی بات پکی ہو رہی ہے نا۔“ آسیہ بیگم نے محبت سے کہا۔ ”اچھا ہے تو بھی آ رہا۔“

”اگر میں نہ آتی تو نہ بیٹایا جاتا۔“ وہ بولیں۔

”یہ بات نہیں۔ ابھی تو دعا خیر ہی کی ہے۔ جب منگنی ہوتی تو تجھے ضرور بلایا جاتا تو کوئی بھولنے والی پھیر کر بہنا۔“ جمال ملک نے ظہر ہما کو اپنے ساتھ لگایا۔

”اصل میں رافعؑ آئندہ ماہ جا رہا ہے انیس۔ میں چاہتا ہوں وہ شادی کر کے ہی جائے۔ آرزو تو نوجوان نسل بہت تیز دوڑتی ہے۔ پھر غائبہ اپنے گھر کی بچی ہے جوڑ بھی ہے تو میں نے سوچا یہ معاملہ طے کر ہی لیا جائے۔“ جمال ملک وجہ بتا رہے تھے کہ یہ اچانک پروگرام کیوں بنا۔ جبکہ ظل ہما کب سن نہیں۔

ان کے دل میں تو دھماکے سے ہنور ہے تھے اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

جہاں انسان بہت ساری امیدوں کے ساتھ آئے اور پھر امیدوں کے سارے چراغ ایک پھونک سے بجھ جائیں تو کڑوا دھواں آنکھن دل میں پھیل جاتا ہے۔ یہی حالت ظل ہما کی بھی تھی۔

ان کی آنکھوں میں سنگریزے پے پھر رہے تھے۔

وہ تو آئی تھیں اپنے بیٹے کی خوشیاں حاصل کرنے۔ حالانکہ وہاں نے انہیں صاف کہہ دیا غائبہ سے اسے محبت نہیں ہے مگر وہ ماں تھیں اور مامتا تو اولاد کے اندر کے سارے موسموں سے باخبر ہے۔

ٹھیک ہے غائبہ کو غلط فہمی ہو سکتی ہے مگر وہ غلط فہمی دُور بھی کی جاسکتی ہے۔ یہی سوچ کر انہوں نے برسوں بعد لاہور کا چکر لگایا تھا۔ وہ بیٹے کی خوشیاں چاہتی تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ انہوں نے بیٹوں کی خوشی کی خاطر سب سے بیٹوں سے فرق رکھا ہے۔ مارے خوف کے وہ وہاں کو تو پیار بھی نہ کرتی مبادا بڑے بیٹوں کا دل دُکھے۔

کیا دل تھا ان کا۔ اور کسی اعلا سوچ تھی۔ پر اب وہ وہاں کے دل کی خوشی پوری کرنے کا عزم آئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہاں کے دل کی خوشی غائبہ سے ہے۔ وہ ہر صورت غائبہ کو منانا چاہتی ہیں یہاں تو پانا ہی پلٹ چکا تھا۔

ان کے تو سان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس طرح اپنے ہی ان کے بیٹے کو خوشیوں کریں گے۔ جمال لالہ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ ظل ہما کا اندر سکپیاں لینے لگا۔ مگر جمال لالہ کو کیا پتا۔۔۔ ظل ہما کے ذہن نے دلیل دی۔

ان کا بچی چاہا وہ جمال احمد سے کہہ دیں کہ غائبہ ان کے وہاں کی ہے۔

وہ وہاں کے دل کا قرار ہے۔

وہاں کی روح کی تان ہے غائبہ۔

پر کیا خبر غائبہ رافعؑ کے دل کا قرار بھی ہو؟ اور جمال احمد اس کی خواہش پر ہی یہاں آئے۔ اولاد کی زندگی کے بڑے فیصلے والدین ان کے منشا کے بغیر تو نہیں کر سکتے تھے۔

پھر ہما رافعؑ اور وہاں میں کیا فرق ہے؟ ہیں تو دونوں ہی تمہارے بیٹے۔ رافع کو تم نے دیا پروہ تمہارے بھائی کا بیٹا تو ہے۔ وہاں کو تم نے بے شک جنم دیا ہے مگر اسے سمجھا سکتی ہو۔ پرش کو بہلا دیا ہے ورنہ اتنی جتنی سے بھی منع نہ کرتا۔

ظل ہما کا معصوم اور رحمدل دل دلیلیں دینے لگا۔ اور وہ ہماری دلیلیں ان کا ذہن ماننا گیا۔ تو بیٹا وہاں۔ غائبہ تیرے نصیب کا تارہ نہ تھی۔ اس نے جس کی زندگی کے آسمان پر لوگ آچکے ہیں۔ نہ تیرا تصور ہے اور نہ ہی ان کا۔ یہ تو اندھی قدرت ہے۔

جہاں دل ملتے ہیں، مقدر نہیں ملتے۔

اور جہاں شوگ جڑتے ہیں وہاں دل نہیں ملتے۔ یہ تو مقدر کے کھیل ہیں اور انسان ایک بے بس ہے۔ زندگی کی بساط پر مقدر اسے اپنے انداز میں چلاتا ہے۔ اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ظل ہما نے سچے مفید دوپٹے کے پلو سے اپنی تمام آنکھیں چپکے سے پوچھ لیں۔

☆☆☆

عفو پیاری!

خدا کرے کہ تو خیریت سے ہو۔ زمانے کی ترقی ہو ابھی تجھے نہ لگے (آمین)۔

پورے تین سال ہو گئے ہیں تو گاؤں نہیں آئی۔ آخر جنگی کیا ہے عفو۔ تجھے میں بھی یاد نہیں آئی۔ پتا ہے عفو مجھے بہت یاد آئی ہے۔ اتنی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میں راتوں کو نیند میں منہ چھپا کر روتی ہوں۔ نہایت چپکے چپکے۔ پتا ہے عفو کبھی کبھی تو ساتھ کی منجی پر سو یا ضمیر بھی کوئی شخص اس کو اچھی نکل جائے تو سن لیتا ہے۔ پھر ہمارا بہت جھگڑا ہوتا ہے۔ عجیب جنگی آدمی ہے عفو۔۔۔ اچھا ہے اس سے تیری شادی نہ ہوگی ورنہ تو تو ایک دن بھی نہ رہ سکتی اس بندے کے ساتھ۔ تو بتا کب آئے گی؟ میرا دل تجھے سے ملنے کو کرتا ہے آنکھیں تجھے دیکھنا چاہتی ہیں عفو۔

پتا ہے یہ خط میں تجھے اسکول کی استانی سے لکھوا رہی ہوں۔ بہت اچھی ہے رضیہ بی بی تو اسکول کے پتے پر ہی جواب دینا۔ اب میں سوچتی ہوں دو چار حرف میں پڑھ لیتی تو تجھے خط لکھ کر اپنے دل کی ہواڑ تو نکال لیتی تھی۔ خیر مار مقدر۔ ایک داری تو آجا۔ امتاں بھی تجھے یاد کرتی ہے۔ بابا بھی جب چوبلے کے پاس روٹی کھانے بیٹھتا ہے تا تو ضرور کہتا ہے۔ عفو کی ماں بتائیں اپنی عفو نے بھی روٹی کھائی ہوگی کہ نہیں۔۔۔ تو کیوں نہیں آئی، عفو واپس ایپوں میں کیوں غیروں میں رہتی ہے۔ تیرا دل نہیں گھبراتا۔ اوپرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے۔ ہاں آدیکھ تو کتنا پیارا ہے تیرا بھانجا حنیف محمد۔ میں اس سے تیری باتیں کرتی ہوں ساری سنتا ہے۔ ابھی صرف چھ ماہ کا ہے پر ہر بات سمجھتا ہے غوں غاں کر کے مجھے جواب دیتا ہے۔ میں اُس سے تیرے بارے ہی میں باتاں کرتی ہوں۔ میں تو نماز کے بعد رب سے بھی تیری سلامتی کی دُعا میں کرتی ہوں۔ اماں کہتی ہے۔ ہر دم تیرے لیے دُعا کیا کروں۔ خدا تجھے سوکھی رکھے۔ ایک داری چکر تو لگا جا۔ بے شک تو گاؤں میں نہ رہتا پرا تو تو۔ خط کا جواب ضرور دینا۔ میں انتظار کروں گی۔

بہت بہت پیار کے ساتھ

تیری بہن گڈی

”گڈی۔ میری بہن گڈی۔“ عفو نے یہ خط کوئی پچاسویں بار پڑھا تھا اور جب بھی وہ اس خط کی سطروں کو پڑھتی لگتا پہلی بار پڑھ رہی ہو۔

دل میں عجیب سی لہریں اٹھنے لگتی تھیں۔ وہ خط کو کبھی آنکھوں سے لگاتیں اور کبھی لبوں سے۔ اُسے رہا تھا جیسے گڈی خود اُس سے آئی ہو۔

عفو نے یہ خط سینے سے لگا کر پیچ لیا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا چیخ کر رو دے۔

آج پہلی بار اُسے احساس ہوا تھا اپنوں سے پچھڑ کر وہ بھی اندرونی طور پر مطمئن تو نہیں۔ وہ جو سمجھتی اُس جیسا بہادر کوئی نہیں۔

چنگیوں میں اڑا دیتی تھی۔ وہ تو چوہدری وہاج احمد تھا جس کا رعب ہی اس قدر تھا کہ وہ پتے کی مانند کانپ کا پتہ جانی حوصلہ ہی نہ ہوتا تھا۔

”پھر تم نے کیا سوچا؟“ عفریہ کو خاموش دیکھ کر وہاج نے پھر پوچھا۔

”جس جو بات میرے مطلب کی نہ ہو میں اُس کے بارے میں سوچتی بھی نہیں ہوں۔“ عفریہ بولی۔

”وجہ۔“ وہ غرایا۔

”بس میری مرضی۔“ اُس کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

”یہ تمہارے مطلب کی ہے؟“

”تم گڈی کا خط پڑھو گے۔“ عفریہ نے بات پلٹی چاہی۔

”مجھے ٹالو مت۔“ میری بات کا جواب دو۔“ وہ ترشی سے بولا۔

”کیا جواب دوں۔ میرے پاس بے تکے سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔“

”میرا سوال بے تکا ہے۔“ وہ مٹھیاں پیچ کر بولا۔

”ایک سو ایک فیصد بے تکا ہے۔“

”تم میرے جذبول کی توہین کر رہی ہو۔“

”اور تم میرے عزائم کی دیوار میں شگاف ڈالنے کی غلطی کر رہے ہو۔ سنو وہاج میں تمہاری بہت

عزت کرتی ہوں پر تم سے محبت جیسا جرم میں کبھی بھی نہیں کر سکتی۔“

”محبت جرم تو نہیں۔“ وہاج نے کہا۔

”تمہیں کیا پتا کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے۔“ عفریہ مسکرائی۔

”میں تم سے شادی کے بعد محبت چاہوں گا عفو۔“ وہاج کے لہجے میں جذبے ہی جذبے تھے اور وہ

حیران تھا کہ کیسے یہ جذبول کی فصل ایک دم ہی عفریہ کے لیے اُس کی دل کی دھڑکی پر اُگ آئی ہے۔ اُس

نے غاشیہ کو بھی چاہا تھا۔ مگر یہ انداز تو نہ تھا اُس کی چاہت کا۔ وہاں تو بس جذبے ہی جذبے تھے پر عفریہ

کے معاملے میں وہ خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔ جوں جوں عفریہ انکار کر رہی تھی اُس کی محبت کا ناگ انکی

شدت سے شوک رہا تھا۔ وہ ہر صورت اُس کا جواب ہاں میں چاہتا تھا۔

”میں تمہارے گاؤں جاؤں گا۔“ وہاج نے بتایا۔

”وہاں جا کر کیا کرو گے۔“ عفریہ نے پوچھا۔

”تمہارے والدین سے ملوں گا۔“

”میرے مستقبل کی ذمہ داری میرے والدین نے میرے ہاتھوں میں تھادی ہے۔“

”وہ ڈور تم مجھے نہیں پکڑا سکتیں۔“ وہاج بولا۔

”ابھی میں اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ سہارے کے لیے کسی مرد کو ہاتھ تھما دوں۔“

”یہ جو دنیا میں روز لاکھوں شادیاں ہوتی ہیں کیا وہ عورتیں کمزور ہوتی ہیں۔“ وہاج بل کھا کر

”یقیناً ہوتی ہوں گی پر وہ عفریہ امیر تو نہیں ہوتیں نا۔“ کتنا پر اعتماد لہجہ تھا اُس کا۔

”بہت مان ہے خود پر۔“

”بالکل۔“ وہ تڑنگ میں تھی۔

”کسی روز منہ کے بھار گروگی۔“ وہاج نے کہا۔

”شرم نہیں آتی مجھے کو سن دیتے ہوئے۔“ عفریہ نے گھر کا۔

”شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔“

”کیسا جھوٹ؟“ عفریہ نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

”دیکھو عفو تو کتنا ہی بہادری کا دعوا کر لے پر تو اندر سے ایک بزدل لڑکی ہے جو بچکی کے کڑکنے کی

آواز سے بھی ڈر جاتی ہے۔ دیوار پر چھٹکی دیکھ لے تو تنکیوں میں منہ چھپاتی ہے۔“

”رہنے دو۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔“ عفریہ ہاتھ لہرا کر بولی۔ تو وہاج ایک دم ہی

گڑسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہے میں بھی ان لڑکیوں میں سے نہیں جو صرف ایک بار دستک دیتے ہیں۔ میں تجھے

ہیتوں کا عفریہ امیر ایک بار ضرور ہیتوں گا۔“ وہاج نے ہونٹ چبا چبا کر کہا۔

”خواب ہی دیکھتے رہو۔“ عفریہ نے جلایا۔

”تعبیر بھی مجھے ضرور ملے گی۔ میں جو خواب دیکھتا ہوں تعبیر ملتی ہے مجھے۔“ وہاج دعویدار تھا

خوشگوار تعبیروں کا۔

”مجھے تمہاری ماموں زاد نے ذرا سی بات پر کنارہ کر لیا۔“ عفریہ نے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا مگر وہاج

بسط کر گیا۔ اُسے پتا تھا عفریہ اُسے غصہ دلانا چاہتی ہے اور وہ غصے میں کام خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”غاشیہ کا معاملہ اور تھا عفو۔“ تو مجھے اُس کا طعنہ نہ دے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ تو صرف دل کی محبت تو

مجھے تجھ سے ہوتی ہے۔“ وہاج کا لہجہ سچائیوں سے گندھا ہوا تھا۔

”ہر مرد اپنی زندگی میں آنے والی عورت کو یہی ڈور دیتا ہے اور تم بھی مرد ہو نا۔“ وہ ہنسی۔

”مجھے ہر مرد والی کی گیلری میں شامل نہ کرو۔“

”تم آسمان سے اترے ہوئے ہو۔“ عفریہ نے آنکھیں نہچائیں۔

”یہ تو تمہیں پھر پتا چلے گا۔“

”جو مرد اپنی ماموں زاد سے محبت کو دل لگی کا نام دے اُس کا بھلا کیا بھروسا۔“

”بھروسا کیا جاتا ہے اور میں خود پر بھروسا کروانے پر تمہیں مجبور کروں گا۔“

”ابھی دلی زور ہے۔“ عفریہ لہک کر بولی۔

”تم۔“ وہاج نے کہنا چاہا تو عفریہ نے اُس کی بات کاٹ کر نہایت بدتمیزی سے کہا۔ ”دماغ مت

الامیر اور جاؤ مجھے کام کرنے دو۔“

”چلا جاتا ہوں پر یہ سوچ لو میں پھر آؤں گا۔“ وہاج نے ضبط کا دامن پکڑے رکھا۔

”آؤ گے تو پھر دیکھی جائے گی۔“ عفریہ بے پروائی سے بولی۔

”میں آصف کا بچہ نہیں ہوں۔“

”تم وہ ہو بھی نہیں سکتے۔ وہ انتہائی شریف آدمی ہے، کبھی اُس نے مجھ پر اپنا فیصلہ مسلط تو نہیں کیا

میں طرح تم جان کو آگے ہو۔“ عفریہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور آگے بڑھ کر اُس نے اُس کا دروازہ کھول

لیا۔ اور بولی۔

”مجھے پتا ہے۔“ وہاج طعنے سے بولا۔

”میں نے سوچا شاید معلوم نہ ہو تھا دوں۔“ عفریہ کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

”تو پچھتا گئی عفو۔“

”پھر بھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔“ وہاں آگے بڑھا وہ دروازے کے باہر جاتے جاتے پلٹا اور ایک دم ہی اُس نے عفریہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیا۔

”تو۔۔۔ تو یہ اعتراف کیوں نہیں کر لیتی کہ جو جذبہ میرے دل کو بے سکون کیے ہوئے ہے۔ وہی جذبہ تجھے بھی چین نہیں لینے دیتا۔“ کتنا خوفناک لمحہ تھا۔

کیسی وحشت تھی جو اُس کی سُرُخ آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ عفریہ کی تو روح تک تھرا کر رہ گئی۔ پھر بھی اُس نے حوصلے سے کام لیا۔ وہاں کی انگلیاں اُس کے گداز بازوؤں میں دھنسی چلی جا رہی تھیں وہ نہایت سکون سے بولی۔

”مجھے تم سے یہ سستے قسم کے عاشقوں والی اُمید نہ تھی وہاں۔ تم مجھے بہت بلندی پر نظر آئے تھے۔ بتا چلا تم تو آصف کا نچو سے بھی گئے گزرے نکلے۔ انتہائی تھڑلے سے انسان ہو تم اپنی خواہشوں کے آگے دوسروں کی انگلیوں کے پھولوں کو مسلنے سے بھی نہیں چوکتے کیسے ہو تم۔ اگر تم مجھے دوست سمجھتے ہو تو وہاں تو آئندہ اس خواہش کا اظہار نہ کرنا ورنہ میری دوستی سے تو جاؤ گے ہی میری نفرت بھی تمہیں برداشت کرنی پڑے گی۔ آئندہ مجھے ملنا تو اپنی وہی پرانی ازل شرافت سے اگر اس کمینگی سے آئے تو مجھے بُرا کوئی نہ ہوگا ناؤ یوگو۔“ عفریہ نے جھٹکے سے اس سے اپنا آپ چھڑایا اور واپس اپنی کرسی پر آ گئی۔ وہاں کمرے سے جا چکا تھا۔

اور عفریہ کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اور کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔

وہاں کمرے سے کیا نکلا کہ اُسے لگا جیسے اس کا دل ہی وہاں کے قدموں تلے پکلا گیا ہو۔ مارے ضبط کے اُس نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو حلق میں اتارا تو اشکوں کے ساتھ ساتھ ڈھبھی اُس کی اشریانوں میں سرایت کر گیا۔

میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا چو بدری وہاں احمد جو تم نے میری پُر سکون سی زندگی میں پلچل مچا دی۔ ارے میں تو تمہیں نظر بھر کر بھی نہ دیکھتی تھی مبادا میرے ایمان دل مزید بے ایمان ہو جائے۔

تم چاہتے ہو میں اعتراف کروں کہ جو جذبہ تمہیں بے سکون کئے ہوئے ہے وہی جذبہ مجھے بھی چین نہیں لینے دیتا میں کہہ دوں وہاں احمد۔۔۔ یہ تو ایسا ”سچ“ ہے جو گزرے ڈیڑھ برس سے میں خود سے بھی چھپائے ہوئے ہوں۔ میں یہ سچ تم پر آشکار کر کے چھوٹی نہیں ہونا چاہتی۔ تم یہ اعتراف تو آج کر رہے ہو نا کہ تمہیں وہ جذبہ چین نہیں لینے دے رہا جسے محبت کہتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ چیز سامنے ہو بندہ اظہار نہ کر سکے اُسے دیکھ نہ سکے۔

جو کچھ کہنا چاہے وہ نہ کہہ سکے۔ تمہیں پتا نہیں وہاں احمد میں کس پُل صراط سے روز گزرتی رہی ہوں۔ یقین کرو تم۔۔۔ مگر تم تو اپنی امانوں زاد کی امانت تھے۔

اُسے چاہتے تھے۔ اور میں ایک غریب لڑکی۔ پھر ضروری تو نہیں کہ جو ہم چاہیں وہ پا بھی لیں۔ محرومیوں کو گلے لگا کر جینا تو بہادری ہے نا۔

میں بہادر ہوں۔ تم یہ ابھی چند روز قبل انکشاف ہوا کہ مجھے چاہنے لگے ہو تو آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے اور مجھے تو ڈیڑھ برس سے خبر ہے تمہیں چاہتی ہوں میں نے تو تمہیں کچھ نہیں کہا۔

تم کیا جانو وہاں احمد اب میں جو گزرے سات روز سے یونیورسٹی نہیں جا رہی تھی۔ دل کن کن لیلوں سے مجھے دھکیلتا ہے۔ مجھے اکساتا ہے۔ پر میں صبر کرنا جانتی ہوں۔

خدا ابھی تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے نا۔ میرا خدا ابھی میرے ساتھ ہے اور مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ تم چاہے کچھ بھی کر لو۔۔۔

سنو وہاں احمد میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے رات کی تنہائیوں میں تمہارے بارے ہی میں سوچا ہے باوجود اس کے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم غاشیہ کمال کو چاہتے ہو۔ میں نے ہرج نماز پڑھ کے دُعا کے لیے جب بھی ہاتھ اٹھائے تمہاری خیریت کی دُعا کی۔ اور آئندہ بھی کرنی رہوں گی بالکل اسی طرح تمہارے لیے دُعا میں کرنی رہوں گی۔ پر میں غاشیہ کمال جیسی لڑکی کا الزام سچ نہ ثابت ہونے دوں گی کہ یونیورسٹی میں پڑھنے نہیں برکتلاش کرنے آئی ہوں۔ میں بااقتدار بنوں گی۔۔۔ مجھے معاف کر دینا میرے دل کے گلیں۔

میرے دل کی سلطنت کے بے تاج بادشاہ۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تم نہیں تو پھر کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ اور کوئی بھی نہیں۔

عفریہ کا سر تھکا اور پیشانی میز پر ٹپک کر رہ گئی اور آنکھوں سے سیل رواں جاری ہو گیا۔ اب بھلا وہ نے اعتراف محبت پر اپنی اس بار پر روٹی بھی نا وہ اعتراف جو اُس نے بھی خود سے بھی نہ کیا تھا آج وہ حکم کھلا خود سے اعتراف کر کے۔ اپنے آپ سے ہار کر بھی رو رہی تھی۔

☆☆☆

”بس جمال لالا میری بات مان لیں اور خندی مجھے دے دیں۔“ ظل ہمارے اپنے قریب بیٹھی اور ایک سی خنداں ملک کو خود سے بٹاتے ہوئے کہا۔ تو ایک لمحے کو جمال ملک شٹا سے گئے۔ انہوں نے ایک کمر ماں کی طرف دیکھا۔ آیا ماں نے تو اُن کے دل کی خواہش کا اظہار نہیں کر دیا بیٹی سے۔ پر آئیہ ملک آنکھوں میں بھی حیرت دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے۔

”تو یہ ہمارا اپنی خواہش ہے۔“ ان کے دل میں خیال ابھرا۔ ”پھر کیا خیال ہے جمال لالا۔“ ظل ہمارے بھائی کی طرف دیکھا۔

”چھو بھو۔۔۔ میں تو ہو ہی آپ کی بیٹی۔۔۔“ خنداں نے اپنی خوبصورت آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے نہایت معصومیت سے کہا تو جمال ملک بیٹی کی معصومیت پر قربان ہی تو ہو گئے۔

”تمہیں پتا ہے چھو بھو کا کیا مطلب ہے؟“ آمنہ نے پوچھا۔ ”مطلب سے کیا مراد ہے۔۔۔؟“

”مراد تو مانگ رہی ہوں نا چا چا جی سے۔“ آمنہ مسکرائیں۔ ”پتا! جھپٹیاں بھی تو بیٹیاں ہی ہوتی ہیں نا۔“

”ہاں بیٹے۔۔۔“ ”یہ بھی بتا میں کہ بہو میں بھی بن سکتی ہیں۔“ آمنہ نے کہا تو خنداں کے میک اب سے بے نیاز سے پُرسرخی دوڑ گئی۔ اُس کا وجود کا پنے لگا تھا وہ ابھی اور جانا چاہتی تھی کہ ظل ہمارے اسے بچھڑایا۔

”ٹھیک ہے ہمارا۔ خندی تمہاری بیٹی ہے۔ آج سے یوں چھی وہاں مجھے بہت پیارا ہے۔ خندی سے لانا زیادہ پیارا۔“ جمال ملک نے کسی سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور ایک دم ہی فیصلہ سنا دیا۔

”خندی تیری ہے۔“ جمال ملک نے غل ہما کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تو وہ تشکر آمیز لہجے میں بولیں۔
”شکریہ لالا۔۔۔ بہت شکریہ۔۔۔“
”بھئی مبارک ہو ایک رشتہ طے کرنے جمع ہوئے تھے کہ وہ ہو گئے۔“ گل فشاں خوش ہو کر بولیں۔

(آمین) شوہر کا فیصلہ بہت بھایا تھا۔
سب ہی خوش تھے پر خوشی کا اظہار نہ کیا تو غاشیہ نے نہ کیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور گلے میں ڈالے گئے گلاب کے پھولوں کا ہار توڑ کر دُور پھینک دیا جو ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر جا کر ٹک گیا۔ یہ ہارا بھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو گل فشاں جمال نے اس کے گلے میں ڈالا تھا۔ اسے رافع کی بنانے کا باقاعدہ اعلان ہوا تھا۔ بھرے اس نے توڑ کر بیروں تلے سل دیے پر بھی سکون نہ ملا تو بستر پر اوندھی گر کر بھپک بھپک کر رونے لگی۔



کبھی کبھی جس بات کی اُمید نہ ہو اور وہ ہو جائے تو احساسات منجمد ہو رہ جاتے ہیں۔ سوچنے تجھے کی ہر صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے۔ کچھ سُدھ بدھ ہی نہیں رہتی۔
اور چوہدری وہاں احمد کا بھی تو دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کی تو سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ کہ کیا یوں جی پلٹ سکتی ہے۔ آج صبح ہی تو غل ہما نے اُسے ہاسٹل فون کر کے ملک ہاؤس بلوایا تھا۔ ”وہ ملک ہاؤس“ نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہاں قدم بھی نہ دھرنا چاہتا تھا جہاں وہ شک کی آگ میں تھلسا تھا۔ بلکہ اُس کے وجود کو شک کی آگ میں تھلسایا گیا تھا۔ وہ تو ”ملک ہاؤس“ سے یہ عہد کر کے نکلا تھا کہ آئندہ کبھی بھی یہاں نہیں آئے گا۔

جب دلوں میں کدروتیں ہوں تو بھلا ملنے کا کیا فائدہ؟
ان دلوں تو غاشیہ کے رویے سے اُسے زبردست شک پہنچا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ دُنیا الٹ پلٹ کر دے۔

جس طرح غاشیہ نے اُس کے دل کی دُنیا میں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ اور پھر وہ بہت جلد غاشیہ سے دُور ہو گیا تھا۔ کہ عفیہ امیر نے دے پاؤں اس کے آنگن دل میں چہل قدمی جو شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی کیفیات پر حیران تھا۔ اُسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ عفیہ امیر جیسی منہ پھٹ لڑکی اُس کے دل کے کواڑوں پر دستک دے سکتی ہے۔ جبکہ وہاں غاشیہ کمال اپنی پوری شان و طہرات سے موجود تھی۔
وہ حیران ہوتا رہا اور عفیہ امیر اس کے دل کی تہوں میں اُترتی گئی۔ رگ وریشے بس گئی۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ اس نے عفیہ امیر کو اس کی ہر خامی سمیت چاہا ہے۔ کہ محبت تو بے ساختہ ٹھوکر ہے۔ ایک ایسی ٹھوکر کہ پتا بھی نہیں چلتا اور لگ جاتی ہے۔ ٹھوکر بھی ایسی جو سیدھی دل پر لگتی ہے پھر تو اپنی بھی کچھ سُدھ نہیں رہتی۔ ایسی ہی ٹھوکر وہاں احمد ہی نے بھی تو کھائی تھی۔ بھی تو اس نے غل ہما سے بات کی تھی۔ اور پھر عفیہ امیر جیسے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا۔

عفیہ امیر سے اظہار محبت کر کے وہ بہت خوش تھا اُس کا خیال تھا عفیہ امیر چند دن نخرے دکھائے گی اور محبت خاموشی سے اُس کی محبت کے گلاب تھام لے گی۔ پر یہ تو اُس کی خوش فہمی ہی تھی۔
عفیہ امیر کوئی عام سے لڑکی تو نہ تھی۔ جو جوانی چڑھتے ہی جنس مخالف میں کشش محسوس کرنے لگتی ہے۔

جو چپکے چپکے ہی محبت کرنے کے عمل سے گزرتی ہے جس کے دل میں چاہے اور چاہے جانے کی خواہش ایک دم ہی اٹھڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اور جب پہلی بار اس کے قدم لڑکھڑاتے ہیں تو جو ہاتھ بڑھ کر تھام لے وہی اُس کے دل کا کیس بن جاتا ہے۔

مگر عفریہ اُن لڑکیوں میں سے نہ تھی۔ لگتا تھا عفریہ کے اندر تو محبت کی بوٹی اُگی ہی نہیں۔

اُس کے قدم تو کبھی لڑکھڑائے ہی نہیں۔ ورنہ کتنے ہی ہاتھ اُسے تھامنے کو بڑھ سکتے تھے۔

عفریہ تو وہ بودا تھی جس کی جڑوں نے مضبوطی سے زمین کو تھام رکھا تھا۔ اُس کے پاؤں میں کبھی لغزش آئی ہی نہ تھی لگتا تو یوں ہی تھا اور وہاں احمد نے اُس پتھر میں جو تک لگانے کی کوشش کی تھی۔ مگر عفریہ کے انکار نے تو اس کی بُری حالت کر دی تھی۔

وہ بہت تحمل مزاج لڑکا تھا۔ مگر عفریہ نے اُس کے تحمل کو لمحوں میں ختم کر دیا تھا۔

وہ آگ بن گیا تھا۔ ہر صورت عفریہ کو جلانا چاہتا تھا۔ عفریہ کا انکار اس کے من کی اگنی کو اور بھی

سلگ رہا تھا۔

عفریہ کے انکار سے آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑک اٹھی تھی۔ وہ اُسے تھکانا چاہتا تھا۔ کہ خود تھکا تھا اپنی سطح سے بہت نیچے آیا تھا۔

عفریہ کو جیتنا اُس کی سب سے بڑی خواہش بن گئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ عفریہ سے اُس کے انکار کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ عفریہ اب اُسے بے حد بے حساب اچھی لگتی تھی۔

ہر (پل)۔

ہر ساعت

وہ اس کے خیالات و احساسات پر چھائی رہتی۔ وہ آنکھیں موندتا تو وہ بدتمیز لڑکی اُس کی پتلیوں میں اتر آتی۔ جس روز عفریہ نے اُسے اپنے آئس سے نکالا تھا۔ اس روز وہ اپنے باپ سے کس قدر لڑا تھا۔ ذہن نے بار بار مشورہ دیا تھا۔

ترک تعلق کر لو عفریہ سے۔۔۔ وہ اس قابل ہی نہیں کہ اُسے چاہا جائے۔

وہ تو آوارہ پتلا ہے اور آوارہ پتلوں کے لئے ٹھکانے کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے۔

کس بات پر اسے غرور ہے۔

آصف کا بنجو کی محبت کا بڑھا ہوا کشکول بار بار اُس کے منہ پر دے مارا۔ پھر بھی وہ اس کی محبت کا جلتا چراغ اپنے دل کے اوطاق پر سے بھانہ نہ سکا۔ کہ محبتوں کے ایک بارے جلے ہوئے چراغ پھر بھلا کب بجھتے ہیں۔

یہ چراغ تو خون دل سے جلائے جاتے ہیں۔ اور خون کی ہر بوند اُن کی روشنی میں اضافہ کرتی ہے۔ وہاں آصف کا بنجو کو سمجھایا کرتا تھا۔ اُسے کہتا تھا۔

”پارا دنیا میں اور لڑکیاں کیا مرگئی ہیں جو تم اس کے پیچھے فضول میں خوار ہوتے ہو۔ جسے بات کرنے کی تیز نہیں۔ جو بے حد منہ پھٹ ہے۔ شوہر کا احترام ایسی لڑکیاں نہیں کرتیں۔ تم راستہ بدلو دیکھو یہاں جامعہ میں حسن ہی حسن بکھرا پڑا ہے۔۔۔۔۔ اُسے چاہو جو ہمیں بھی چاہے آخر یہ ایک طرفہ ٹریفک چلانے کا فائدہ۔

تم کیا جانو وہاں احمد کہ اس راستے پہ تنہا چلنا بھی کس قدر اچھا لگتا ہے۔ وہ ساتھ نہیں پر اس کا تصور نہ

ہے جو مجھے زندگی دیتا ہے پھر عفریہ کتنی مختلف ہے تم جس حُسن کی بات کرتے ہو تا وہ ظاہری ہے میں تو عفریہ کے باطنی حُسن پر مرنا ہوں۔ بے شک وہ منہ پھٹ ہے پر دل کی بہت صاف ہے۔ مجھے اُس کی صاف گوئی اُس کا کھرا پن ہی تو ہوتا ہے خواہ وہ مجھ سے لڑتی ہے بھگڑتی ہے۔ مجھے وہ کبھی بھی بُری نہیں لگتی۔ میں اُسے جان بوجھ کر بعض مرتبہ پیڑھ دیتا ہوں۔ وہ جو کسی نے کہا تھا۔

فقط اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں!

میں تیرا حُسن نظر حُسن بیان تک دیکھوں

”مجھے تو اُس کا پٹر پٹر بولنا ہی اچھا لگتا ہے۔ اور آصف کا بنجو کے ان خیالات پر اس نے کتنی اس کی محبت کی تھی۔ جو فضول میں پانی میں مدہانی چلا رہا تھا۔ بھلا یہ بھی محبت ہے۔ مگر اب وہاں کو پتا چلا تھا کہ محبت تو یہی ہے۔

محبت طالب اور مطلوب نہیں۔

یہ Give and Take کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو خود رو پودا ہے جو خود بخود ہی دل کی سرزمین پر اُلگاتا ہے۔

عاشیہ سے اُس نے محبت ضرور کی تھی مگر جو تڑپ اور بے قراری اُس نے عفریہ کو چاہ کر پائی تھی نہ نما نما اور وہ اُسے اچھا لگتا۔ عاشیہ کے ساتھ تو شاید اُسے محبت ہی تھی کہ جواب اس نے بھی اُسے چاہا تھا۔ مگر عفریہ سے تو اُسے عشق تھا۔ جو اُس کے وجود کو سلگ رہا تھا۔

محبت تو بہت نرم ہوتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ٹپٹپٹ پیڑوا کے مست جھونکوں جیسی۔

جبکہ عشق تو آگ ہوتا ہے۔ لمحہ دل کی آنکھیں میں آگ دکھتی رہتی ہے۔ اور پورے وجود کو لگاتار دہاتی ہے۔ ایک ایسی ہی انجان سی آگ جو وہاں احمد کے اندر بھی دھک رہی تھی اور وہ تپ رہا تھا۔ بے شک اُس نے عفریہ سے دستبردار ہونے کا سوچا بھی تھا۔

اُسے بھلانا بھی چاہا تھا۔

مگر وہ اُسے جس قدر بھلانا وہ اُسے اُسی قدر یاد آتی اور بار بار یاد آتی۔ وہ پریشان ہو جاتا۔

کتنی بے عزتی کی تھی عفریہ نے اُس کی۔

بھلا کبھی کسی نے اُس طرح بھی کیا ہوگا۔ لیکن دل زار کی ادائیں تو بے عزت کر دینے والی ہوتی ہیں۔ دل پھر بھی اُسی کے لئے ہلکتا تھا۔ اُسی کو چاہ رہا تھا۔ اب تو اُسے ضدی تھی۔ عفریہ امیر کو پانے کی۔ ماں کی لون کال پر ایک لمحہ کے لئے وہ حیران ضرور ہوا تھا اور کچھ پس و پیش کے بعد وہ ”ملک ہاؤس“ آ گیا تھا۔ لکھنؤ جو یہاں تھی اور ماں کی خاطر سب کچھ کر سکتا تھا۔

اپنا عہد

خود سے کھائی گئی قسم تک اُس نے توڑ ڈالی تھی۔ جس روز اُس نے ”ملک ہاؤس“ چھوڑا تھا تو خود سے عہد کیا تھا کہ آئندہ وہ کبھی بھی یہاں نہیں آئے گا۔

جہاں اس کی عزت نفس مجروح ہوئی تھی۔

لیکن ماں کے بلاوے پر اُسے آنا پڑا۔ اور پھر کس دل چیر لینے والی حقیقت کا انکشاف ہوا تھا۔

”میں نے خندی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

وہاں کو لگا تھا جیسے اُس کے پیروں تلے زمین ہی نہ رہی ہو۔ وہ خود کو فضا میں معلق محسوس کر رہا تھا۔

”مام آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔“ وہاں کے لہجے میں احتجاج تھا شکوہ تھا۔
”میں ماں ہوں تمہاری۔“ انہوں نے یاد دلایا۔
”مجھے اس سے کب انکار ہے مگر مام آپ کو میں نے اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا تھا پھر بھی۔“
”تم جذباتی ہو گئے تھے۔“ وہ بولیں۔
”جذباتی۔“ وہاں نے ہونٹ کچلا۔
”میں یہاں آئی اس لئے تھی کہ کمال بھائی سے غاشیہ کے بارے میں بات کروں تمہاری خوشی ہے؟“

”خوشی ہے نہیں تھی۔“ وہاں نے جلدی سے تصحیح کی۔
”تم فضول میں شک کرتے ہو۔ غاشیہ ایسی نہیں۔ بس وہ تمہارے مقدر میں نہ تھی۔“
”آپ نے خندی کو میرا مقدر بتا دیا۔“ وہاں نے کہا۔
”مجھے خندی بہت اچھی لگی۔ تم ملو گے تو تمہیں بھی پسند آئے گی۔ میری پسند کی داد دو گے۔“
”مام۔ میں نے جو آپ کو اپنی پسند سے آگاہ کیا تھا میرا پسند کی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔“
”یہ میں نے کب کہا؟“ وہ بولیں۔
”پھر؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کہنا تاکہ تمہارا تمہارا فیصلہ ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ وہ لڑکی جسے تم چاہتے ہو نجانے کون ہے؟ کس خاندان سے ہے۔“
”مام۔ مجھے ضرورت بھی نہیں کہ اس کے خاندان کا شجرہ تلاشتا پھروں۔ مجھے یہ خبر ہے وہ میری پسند ہے اور میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔“
”مجھے تم نے اس کے بارے میں جو معلومات بہم پہنچائی تھیں نا وہاں۔ وہ کسی صورت بھی اس معیار پر پوری نہیں اترتیں جیسی بہو میں چاہتی ہوں۔“

”مگر وہ میرا معیار ہے۔“
”میں اتنا گھٹیا تمہارا معیار نہیں سمجھتی تھی وہاں۔“
”مام۔ مت کریں اس کی اسلٹ۔“ وہاں کا لہجہ خاصا اونچا تھا۔
”تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟“
”میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کی بے عزتی کرے۔“ وہاں صاف گوئی سے بولا۔
”یہ برداشت کر سکتے ہو کہ اس کی خاطر ماں کے سامنے ہو جاؤ۔“ ان کا لہجہ ترش تھا۔
”سوری مام۔ میں بہت ڈپر ہوں۔ آپ مجھے مزید پریشان نہ کریں تو ممنون ہوں گا۔“ وہاں کرسی پر ڈھسے سا گیا۔

”اپنی ساری پریشانیوں کو ذہن سے جھٹک دو۔ جھٹک دو اس لڑکی کو جو تمہاری پریشانی کا سبب ہے۔“
”یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ۔ آپ جمال ماما سے کہیں جو کچھ آپ نے کہا وہ غلطی سے۔“
”باؤ لے ہوئے ہو۔“ غلطی ہمارے کمر بولیں۔
”میں انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ مام خندی سے۔“
”خود ہی شادی کے بعد ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہ محبت و دجبت فضول لگے گی۔ اور میں جمال بھائی سے

”کسی صورت میں نہیں کر سکتی۔ تمہیں نہیں پتہ کہ وہ مجھے کس قدر عزیز ہیں۔ اور کیسے خوش تھے وہ اس میری بات پر۔“
”یہ آپ کی خواہش کے ساتھ ساتھ ان کی بھی خواہش ہے نا۔“ وہاں نے ہر خند سے لہجے میں بولا۔
”شام ایسا ہی ہے۔“
”مام۔ خندی کو اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ خاندان میں لڑکوں کی کمی نہیں۔ آپ مجھے کیوں اپنی قبر میں اتار رہی ہیں۔ میں اس معصوم لڑکی کو کچھ بھی ندے پاؤں گا۔“
”تمہیں اپنے حقوق کا احساس ہو جائے گا۔“ وہ بولیں۔

”شام ایسا نہ ہو۔“ وہاں نے ٹھنڈی سانس لی۔
”تمہارے بابا جان بھی یونہی کہتے تھے جب کرم بی بی سے شادی پر میں نے زور دیا تھا اور دیکھو۔“
”ان کی مجبوری تھی کہ انہیں زمینوں کے لئے وارث چاہیے تھا تب بھی وہ آپ سے دستبردار نہ تھے اور مام آپ نہیں جانتیں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔“
”تم مجھے محبت کا درس دینا چاہتے ہو؟“ ماں نے پوچھا۔
”پلیز مام۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”مت سمجھاؤ مجھے۔ دو جماعتیں کیا پڑھ گئے ہو کہ خود کو کوئی چیز سمجھنے لگے ہو۔ میرے فیصلوں سے تو انہوں نے انحراف نہیں کیا جنہیں دنیا میری سوتیلی اولاد کہتی ہے۔ سراج، معراج کے لئے ان کی دلہنیں نے پسند کی تھیں اور انہوں نے سر جھکا کر میرے فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ تم۔ تم وہاں۔ تم پر مجھے بہت مان تھا۔ تو میرے مان کی عمارت کو ہی نیست و نابود کر ڈالا ہے۔ میں تمہیں ایسا تو نہیں سمجھتی تھی۔“ غل ہما کی آنکھیں اٹکی۔

”آپ بھی عام عورتوں کی طرح رونا شروع ہو گئیں۔“
”جاؤ گرو اپنی مرضی۔ میں کچھ نہیں کہتی۔ کردوں گی انکار جمال بھائی سے۔ ہو جاؤ گی شرمندہ۔ ان کے دوں گی کہ اولاد پر بہت مان کرنے والے یونہی شرمندگی کی دلدل میں اترتے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ مام کا تقدس ہی مٹا ڈالتی ہے۔ جاؤ جو تم چاہتے ہو کرو۔“

”مام۔ آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔“
”میں بھی تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔“
”ٹھیک ہے جو آپ چاہتی ہیں وہی ہو گا مگر میری بھی شرط ہے۔“ وہاں کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔
”کیسی شرط؟“ وہ بولیں۔

”میں بعد میں کچھ بھی کروں آپ کو اعتراض نہیں ہو گا۔ خندی آپ کے پاس رہے گی اور وہ۔ جو مجھے صدمہ ہے اور۔ اور جسے اپنانا میری سب سے بڑی خواہش ہے۔“ عجیب سا نرم اس کے لہجے سے لہجہ ہاتھ تھا۔

”یعنی تم خندی پر سو کن لاؤ گے؟“
”میں مان تو رہا ہوں آپ کا فیصلہ۔“
”نہ سامنے کے برابر۔“
”مام اس کے علاوہ کوئی راہ نہیں ہے۔ ابھی تو میں نے اسے بھی منانا ہے۔ وہ جو ضد ہی ضد میں مجھے میرا بھی ستیاناس کرنے پر تکی ہوئی ہے۔“

”وہاں سوچو۔“ ظلی ہما بولیں۔

”مام میں سوائے عفریہ امیر کے اور کچھ نہیں سوچ سکتا۔ آپ جو چاہیں کریں۔ مجھے اعتراض نہیں کہہ تو دیا ہے آپ کو پھر بے اعتباری سی اور کیوں؟“ وہاں کی آواز ہر قسم کے جذبات سے عاری تھی لگتا تھا اس نے خود کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔“ ظلی ہما نے حیرت سے اسے دیکھا۔

ظلی ہما کا دل ڈوبنے لگا۔

”کس قدر عزیز ہو مجھے تم وہاں۔ مگر میں تمہاری خاطر کبھی بھی شرمندگی کی دلدل میں نہیں اتروں گی۔“

”میری ماں۔ بھائی۔ بھابھیاں مجھ پر کس قدر نہیں گے سارے کے سارے کہ میں نے اولاد کی تربیت کیسی کی ہے؟ پھر۔ پھر جمال بھائی کے لیے یہ کتنا زبردست شاک ہو گا۔ میں ان کی بیٹی مانگ کر پھر لوٹا دوں۔ بیٹی والوں کے لیے کس قدر شرمندگی کا مقام ہوتا ہے۔ زبان تو آبرو ہوتی ہے انسان کی۔ اور میں نے بھی زبان دی ہے کہ خندی میری ہو ہے میں نہیں پھر سکتی تمہاری خوشی مجھے پیاری ہے مگر اس سے زیادہ مجھے اپنی زبان کا پاس رکھنا ہے۔ چاہے تم کچھ بھی کہو۔ کچھ بھی کرتے رہو۔ اور رہی عفریہ امیر تو اسے بھی میں دیکھ ہی لوں گی۔ وہ خود بخود ہی تمہارا راستہ چھوڑ دے گی۔ اور تم لوٹ آؤ گے۔“ پتا نہیں کون سا خیال تھا جو ظلی ہما کو تقویت دے رہا تھا اور ان کی آنکھیں جپکنے لگی تھیں۔ وہاں نے حیرت سے ماں کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہ آیا تھا۔ وہ اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

مگر دوسرے لمحے ہی وہ ٹھنک کر رہ گیا۔ سامنے ہی تو بیلوں سے ڈھکے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے غاشیہ کھڑی تھی۔ آہٹ پر اس نے پلکیں اٹھا کر وہاں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر سوز تھا کہ وہاں کی روح تک تھڑا کر رہ گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

”کیا وہ غاشیہ تجھے؟“ بے ساختہ ہی وہاں کے لبوں سے نکلا تھا اور ہاتھ اس کے کندھوں پر رک کر رہ گیا۔

غاشیہ کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ نمی بھی اتر آئی۔ اس کے لب کا نہ رہے تھے۔ اس نے ہونٹ کا اوپر پری گوشہ دانتوں تلے دبایا۔ مدام دل سے اٹھتی چیخیں لبوں سے نہ نکل جاتیں۔

”کیا ہوا ہے۔“ وہاں کے دل میں رحم کے سارے جذبے اٹھ آئے تھے۔

”میرا اندازہ درست تھا نا؟“

”کیسا اندازہ؟“

”تم۔۔۔ تم عفریہ کو چاہتے تھے نا؟“ غاشیہ نے پوچھا۔

”چاہتا نہیں تھا۔ اب چاہتا ہوں۔“ وہاں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”جھوٹ مٹ بولو۔“

”جھوٹ بولنے کا فائدہ۔ اور میں یہ اعتراف کرتا ہوں غاشیہ کہ میں جس انداز میں عفریہ کو چاہ رہا ہوں۔ اس طرح تو مجھے تم سے بھی محبت نہ ہوتی تھی۔ عفریہ تو تیز دھاری تلواری ہے جو مسلسل کاٹتی رہتی ہے۔ وہ میرے اندر کو مسلسل کاٹ رہی ہے۔ وہ آگ ہے جو مجھے جھلسا رہی ہے، تمہیں شاید پتا نہیں ہے کہ۔۔۔“

”مجھے سب پتا ہے وہاں۔“ غاشیہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں جانتی ہوں کہ وہ تمہیں چاہتی تھی اور۔۔۔“

”اور تم بھی۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ مجھ پر تو یہ انکشاف یہاں سے جانے کے بعد ہوا جبکہ عفریہ کو اب تک یہ پتا نہ تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے یا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اعتراف کرے پر۔ وہ جانتی نا نہیں۔ میں اندر سے اندر خود گھل رہا ہوں۔ پر اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ بتاؤ بھلا کیا کروں، کس طرح اسے یقین دلاؤں۔“

”یقین تو وہی ہوتی ہے وہاں احمد۔ جو خود بخود وہی دل کے اوطاق پر اتر آتی ہے اس کے لیے کسی کی ضرورت کب ہوتی ہے اور نہ ہی گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے تم نے نب محبت کا یقین دلا تھا۔ میں نے تو خود ہی یقین کر لیا تھا اور دھوکا کھا بیٹھی تھی۔ عفریہ بڑی تیز طرز ار لڑکی ہے۔ وہ تمہیں

میں میں روندے گی پھر گلے لگائے گی۔ اور تم مرد ہوتے ہی اسی قابل ہو۔ جو چیز آسانی سے تمہارے ہاتھ آجائے اس کی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی اہمیت نہیں رہتی اور جس کے پیچھے خوار ہوتے ہو۔ لیکن قدر و منزلت تمہاری نظروں میں بڑھ جاتی ہے۔ یہ مرد کی فطرت ہے اور اس کی جگہ سے یہ بات ضرورت بھی نہیں نکل سکتی۔“ غاشیہ کی آواز کانپنے لگی تھی۔ وہاں نہایت خاموشی سے اس کے الزامات کو سن رہی تھی۔ شاید یہ سچ کہہ رہی ہے اپنی سوچ اور سمجھ کے لحاظ سے۔ یا پھر میں ہی غلطی پر تھا۔

”سوری غاشیہ۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے تم سے محبت کر کے غلطی کی تھی۔“

”یہ احساس عفریہ کو چاہنے کے بعد ہوا؟“

”نہیں اس گھر سے جانے کے بعد ہوا۔ تمہارے روتے سے تم چاہتیں تو میں پھر وہی پر تمہیں کھڑا کرتا تھا۔ میں چلا تھا۔ پر تم نے تو قطع تعلق کر لیا۔ خود کو شجر ممنوعہ بنا لیا۔ تب۔ تب غاشیہ میں نے اس کے استوں کی طرف دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ میرا راستہ ہی نہ تھا جس پر میں چلا رہا ہوں۔ اور پتا چلا کہ احساس ہو جانے تو پلٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ میں بہت مطمئن ہوں اور یقیناً تم بھی خوش ہو۔“

”خوش۔“ غاشیہ کے لب مسکرا دیے۔

”یہ تمہاری پسند کا راستہ ہے۔ تم نے خود چنا تھا غاشیہ۔“ وہاں نے اسے یاد دلایا۔

”نہیں اپنی پسند کے راستے منتخب کرنے کے باوجود بھی خوشیاں کیوں نہیں ملتیں؟“

”تمہیں خوشی ملی نہیں رافع کتنی بڑی خوشی ہے۔ جس کا براہ راست ٹوچ رہا ہے اور۔۔۔ اور تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔ گل فشاں جیسی تازہ دم اور بیگ ساس کی بہو بن کر تم کو فخر محسوس کرنا چاہیے۔“

”ہاں گولڈ میڈل ملا ہے نا مجھے۔“ وہ استقبالیہ انداز میں تھکی۔

”یقیناً۔“

”پھر تم خوش کیوں نہیں ہو۔ خندی بھی تو تمہارے لیے گولڈ میڈل ہے نا؟“

”ایسا گولڈ میڈل جو گلے میں سانپ کی طرح ڈالا جا رہا ہے۔ جو میرے دل کو لہو لہو ڈستا ہی۔“

”کتنا چاہتے ہو تم عفریہ کو؟“

”شاید میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔“ وہاں احمد کے لبوں سے یہ جملہ گواہاں ہوا کہ غاشیہ کو لگا کہ وہ خود دھڑکھڑکھنے لگا ہو۔ تمہارا جیون کس کام آیا غاشیہ کمال۔ تمہاری چاہت کس کاراں۔

”وہاں احمد کو تو بھی پتا بھی نہ چل۔۔۔ کا کہ تم نے اسے اس قدر چاہا ہے کہ کسی کی کوڑ بٹا ہو گا۔ اور اسے آسانوں کا پیچھی تھا۔ اس کی اڑان تو بہت اونچی تھی۔ تم تو وہاں تک۔۔۔ کبھی نہ چھٹکتی تھیں۔۔۔ اور امیر بھی جس نے وہاں کے دل کی گہرائیوں کو بھی ناپ لیا۔ بھلا اس طرح کی ہونا غاشیہ کی

آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی تھی۔ اور وہاں کی شبیہ ٹٹی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”سُنیں مسز چوہدری۔ آپ کو مجھے بے عزت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“ عفریہ نے اپنی منٹھیاں بھینچیں۔

”میں تمہیں بے عزت نہیں کر رہی اپنی قیمت بتادو۔“

”قیمت۔“ عفریہ نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔ ”میں اپنی قیمت بتا دوں۔ کیا لگائیں گی آپ میری قیمت؟“

”تم چاہو گی۔ جس قدر چاہو گی۔“

”تو یہ کام وہاں سے کروانا تھا۔“

”یہ تمہارا اور میرا معاملہ ہے۔“

”نہیں یہ وہاں کا اور میرا معاملہ ہے۔ اور میں وہاں ہی کو اپنی قیمت بتاؤں گی۔“ عفریہ بولی۔

”میں وہاں کی ماں ہوں۔“

”مجھے پتا ہے۔ اگر آپ وہاں کی ماں نہ ہوتیں تو نجانے میں کیا سلوک کرتی۔“ عفریہ

برداشت کی حد سے گزرتی۔

”کیا کرتیں تم؟“

”بعض سلوک بتا نہیں جاتے۔ تجربات کر کے دکھائے جاتے ہیں۔“ عفریہ نے کہا۔

”تم حد سے بڑھ رہی ہو۔“

”میری حد وہ ہے جہاں میں کھڑی ہوں۔ حد سے تو آپ بڑھی ہیں مسز چوہدری کہ یہاں تک آ گئی ہیں۔ آپ کا تو یہ مقام نہیں ہے۔ آپ پر تو یہ بات بحتی ہی نہیں کہ آپ مجھ سے ملنے آئیں۔“

”مجھے تم سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تم سے اپنا وہاں لینے آئی ہوں۔“ ظل ہمارے تپا۔

”وہاں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے اور پھر۔۔۔ وہ میرے پاس ہے ہی کب؟“ عفریہ ہنس کر کہی۔

”تم نے اسے اپنا اسیر بنالیا ہے۔ وہ ماں کی تعظیم بھی بھول گیا ہے۔“ ظل ہما بولیں۔

”اس میں تعظیم بھی۔ اگر اب نہیں تو یہ آپ کی تربیت کی کمی ہے اور کچھ نہیں۔“

”میں تمہارا وعظ سننے نہیں آئی۔ مجھے تم یہ یقین دلا دو کہ وہاں سے آئندہ تم نہیں ملو گی۔“

”میں اس سے آئندہ نہ ملوں۔ یہی چاہتی ہیں نا آپ؟“

”ہاں۔۔۔“ ظل ہما بولیں۔

”تو میں آپ کو بتا دوں کہ گذشتہ دس روز میں میں اُس سے نہیں ملی۔ بلکہ دو روز قبل وہ خود میرے دفتر آیا تھا۔“

”کیوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”عاشق کیوں طواف کرتا ہے درمحبوب کے؟“

”میں یہ چاہتی ہوں کہ اب یہ طواف بازی بند ہو جائے۔“

”آپ روک سکتی ہیں تو روک لیں اسے۔“

”تم نے نجانے اسے کیا گھول کر پلایا ہے کہ سنتا ہی نہیں۔“ دیکھیں جی میں تعویذ گنڈوں کا

یقین نہیں رکھتی۔ اگر آپ کے پاس ایسا کوئی علم ہے تو میرا پیچھا اس جھوٹ سے چھڑا دیں جس کا

”یہاں ہے۔“

”تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔“

”میری بے خیالی۔“

”پھر کہنے کا مطلب؟ تم اپنی قیمت بتاؤ۔ میں تم جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”ٹینکوں پلینز مسز چوہدری۔“ عفریہ گرجی۔ ”اگر۔۔۔ اگر آگے ایک لفظ بھی کہا تو میں اپنی تیز کی

ساری حد پھلانگ جاؤں گی۔ آپ کا یہ دعو کہ مجھے جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی ہیں تو یہ خام خیالی ذہن

سے نکال دیں۔ ایک عمر چاہے مجھے جیسی لڑکیوں کو جاننے کے لیے۔ ابھی چند منٹ ہوئے ہیں مجھ سے ملے

اور مجھے جاننے کی دعو دیا رہو گئیں۔۔۔ پچھلے پونے دو برس سے وہاں میرے ساتھ ہے وہ تو یہ دعو نہیں کر

کا۔ آپ جاسکتی ہیں۔ اور میں مجھے وہاں کی قیمت بتا دیجیے گا۔ جب اس کی نیلامی لگے۔“ عفریہ نے

غصے سے کہا اور تشریف لے گئی۔ ”ظل ہما چند لمحوں تک تو ہلے پردے کو دیکھتی رہیں پھر

انہوں نے اپنی بڑی سی چادر کی بکلی ماری اور خود بھی باہر آ گئیں۔ ہاسٹل کے گیٹ سے نکلتے ہوئے انہوں

نے ایک مرتبہ پلٹ کر ضرور دیکھا تھا۔ کہ شاید وہ بد نیز اور ضدی لڑکی آجائے انہیں روک کر کہے۔

”آپ وہاں کو لینے آئی تھیں آپ کو وہ مبارک ہو۔“

مگر وہ تو نجانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ ظل ہما اپنی کار کی طرف بڑھیں۔ ڈرائیور نے جلدی سے پچھلی

سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اور ان کے پیچھے بیٹھتے ہی دروازہ بند کر کے خود را نیوٹنگ سیٹ سنبھال لی۔ ظل ہما نے

سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا۔ وہ تو بہت آسان لگتی تھیں کہ وہ مان جائے گی۔۔۔ پردہ تو پھر بھی۔

چٹان بھی شاید۔

غاشیہ سے ساری معلومات کر کے ہی وہ عفریہ تک آئی تھیں۔ لیکن عفریہ نے انہیں مایوس ہی کیا

تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی صورت عفریہ سے وہاں کو نہیں بچا سکتیں۔

پھر معصوم سی خندی کا کیا ہوگا؟

ان کی نظروں کے سامنے سوالیہ نشان پھیل چلا گیا۔

☆☆☆

”معلوم کیسے لوگ ہوتے ہیں جو سمجھتے ہیں دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے؟“ عفریہ نے

ہلے سے کہا۔

”زر پرست۔“ شیر محمد نے بے ساختہ کہا۔

”بہت مان ہوتا ہے انہیں دولت پر ماماجی۔“ عفریہ کی بھوری آنکھوں میں سوچ کے سائے بہت

گہرے ہو گئے تھے۔

”شاید۔۔۔“ شیر محمد نے طویل سانس لی۔

”ماماجی۔۔۔ اللہ میاں نے سب کو برابر کیوں نہیں بنایا؟ کیوں زر اور زمین کی اونچی دیواریں

انہوں کے درمیان کھڑی کر دی ہیں۔ خدا تو عدل کرتا ہے پھر یہاں کیوں نہیں کیا؟“ عفریہ نے گرم

پاؤں کو پھیلا کر پیروں تلے دبایا اور ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگالی۔ تب اس کی پیٹھ سے ٹھنڈک پورے وجود

میں اتر گئی۔

”ماما۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کس طرح ان ٹھنڈی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہتے ہیں۔“ عفریہ

ہلے سے ہوتے ہوئے بولی۔

”اب تو کوئی احساس ہی نہیں رہ گیا۔“ شیر محمد مسکرایا۔

”کیوں۔۔۔؟“ عقیفہ نے معصومیت سے پوچھا۔

”بس لگتا ہے اندر کی ساری چیزگاریاں بجھ گئی ہیں۔ میں تو فیصلے کا منتظر ہوں نا۔۔۔ اور جب ایک انسان کو پتا ہو کہ فیصلہ کیا ہوتا ہے تو وہ سارے احساسات سے عاری ہو جاتا ہے۔“ شیر محمد کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”آپ کو پتا ہے فیصلہ کیا ہوگا؟“ عقیفہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ شیر محمد نے سر ہلایا۔

”عمر قید اور کیا۔۔۔“

”نہیں ماما۔ میں آپ کی عمر قید برداشت نہیں کروں گی۔ سکندر ماما اپنے علم کا سارا زور لگا رہے

ہیں۔“

”وہ کتنے نقطے نکال کر لے آئے۔ مجھے عمر قید سے نہیں بچا سکتا۔“ شیر محمد کا لہجہ سچائیوں سے گندھا ہوا تھا۔

”یہ سارا آپ کا قصور ہے۔“ عقیفہ نے کہا۔

”میرا قصور؟“ شیر محمد کی آنکھوں کے سرخ زورے مزید سرخ ہو گئے۔

”ہاں۔ نا بچتا ہے۔ اور نہ ہی مقدمہ منج رُخ اختیار کرتا۔ پتا نہیں وہ کون سی مصلحت ہے جس نے آپ کی زبان بند کر رکھی ہے۔ کون سا خطرہ ہے آپ کو؟“

”میں نے اعتراف تو کیا ہے کہ چوہدری مراد حسین کا قاتل میں ہوں۔ اور کیا چاہتے ہو؟“ وہ بولا۔

”مگر آپ نے اسے قتل کیوں کیا؟“ عقیفہ نے پوچھا۔

”دیکھ عقیفی۔ میں نے تجھے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھ سے پھر کبھی یہ سوال نہ کرنا۔ آج تو پھر۔۔۔“ اس نے سر زلزل کی۔

”ماماجی۔ میرا ذہن الجھا رہا ہے۔ میرا دل آپ کو مجرم تسلیم نہیں کرتا۔ آپ کیوں نہیں کھولتے؟“

گرہ جو میری گردن میں تنگ ہوئی طلی جاتی ہے۔“ عقیفہ ہر دینے کو تھی۔

”بتائے گا فائدہ؟“ شیر محمد نے کہا۔

”نقصان بھی کیا ہے؟“

”عقیفی۔ میں نے چوہدری کے کہنے پر بہت گناہ کیے۔“

”کوئی گواہ تو نہیں نا؟“

”میں خود سب سے بڑا گواہ ہوں۔“

”یہ کوئی بات نہیں۔ مجھے تو اس قتل کی وجہ بتائیں۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ آپ نے چوہدری کے کہنے پر کتنے جرم کیے۔“

”مجھے سزا ہونے دو۔“ شیر محمد نے التجا کی۔

”کیوں؟“ عقیفہ کی آواز تیز تھی۔

”میں اسی کا مستحق ہوں۔“

”ماما۔ میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی؟“

”اب بھی تو رہی ہو؟“

”مجھے یہ آس تو ہے کہ آپ رہا ہوں گے اور۔۔۔“

”یہ آس چھوڑ دے۔“ شیر محمد اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”آسوں اور امیدوں پر تو زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ اگر دل میں کوئی آس یا خواہش نہ ہو تو زندگی بے معنی ہو جائے بالکل مجسمہ سردی جس میں کوئی حرارت اور تحریک نہ رہے۔ بھلا ایسی زندگی کس کام کی؟“

”یہ لڑکیاں بڑھ کر اتنی مشکل باتیں کیوں کرتی ہیں؟“ شیر محمد نے مسکرا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں بچائی کی محبت کی قندیلیں روشن تھیں۔

”ماما۔ آپ بات نہ بنائیں۔“ عقیفہ نے کہا۔

”اچھا تو چھوڑ دو یہ بات۔۔۔ رب جو کرے گا۔ بہتر ہی کرے گا۔“

”دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ کس نے ایسا سمجھا ہے۔“

”ہے ماما ایک غرور کی ماری عورت۔“ عقیفہ نے بتایا۔

”کون ہے وہ؟“ شیر محمد نے کہا۔

”دہاج کی ماں۔“

”دہاج۔۔۔؟“ شیر محمد کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔۔۔ ”وہی تو نہیں جو ایک دو بار تیرے

ہاتھ یہاں آیا ہے؟“

”ہاں وہی۔“ عقیفہ جلدی سے بولی۔

”اس کی ماں تیرے پاس کیوں آئی تھی؟“



ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور عفرہ کو لپٹاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔
 ”مجھے تجھ پر بہت بھروسہ ہے مجھے علم ہے تو جو بھی فیصلہ کرے گی بہت سوچ سمجھ کر اور عقل سے
 کرے گی۔ جذبات کی پٹی اتار کر ہر فیصلہ کرنا پڑے گا۔ کہ یہ عمر بڑی منہ زور ہوتی ہے۔ جا بجا پیروں تلے
 چلی مٹی آتی ہے اور بندہ پھسل جاتا ہے۔ خود کو پھسلنے نہ دینا کہ بندہ ایک بار گر جائے تو پھر وہ اٹھ بھی جائے
 مگر جوٹ ضرور لگ جاتی ہے جو سدا دکھتی رہتی ہے۔“
 ”ماما۔ آپ غلط مت سمجھیں۔“

”بس تو حجاب۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔“ شیر محمد نے اس کی پیشانی چوم لی اور عفرہ خود کو چادر میں
 لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کی کوشٹری سے باہر آ گئی۔ کہ جیل سپر ٹینڈنٹ فردوس حمید کی خصوصی اجازت سے وہ شیر محمد
 سے ان کی کوشٹری میں نہایت اطمینان سے مل لیتی تھی۔ عفرہ کو اپنے قدم نہایت بو جھل لگ رہے تھے۔
 لگ رہا تھا جیسے وہ شرمندگی کی دلدل میں اتر گئی ہو۔ دل میں ایسا درد اٹھاتا تھا کہ اس کی بوٹی بوٹی دکھتا
 رہا پھوڑا بن گئی تھی۔

ماما۔ کیا سوچتے ہوں گے؟

میں نے تو انہیں بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ اگر میں کوئی ایسی ویسی حرکت کروں تو ان پر میرا خون
 نفاق ہوگا۔

مگر میں نے کیا حرکت کی ہے؟

میں نے تو وہاں کے جذبوں کو روکنا ہے۔

اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو اپنی پوری قوت سے روکا ہے۔ جس قدر ہو سکتا تھا اس کے جذبوں
 کی خواہشوں کی تنہا کی ہے۔

میں نے کب بھلا اس کی حوصلہ افزائی کی؟

میں نے۔۔۔ ہاں میں نے تو ہاں احمد کو چاتے ہوئے بھی اس بات کا اعتراف بھی خود سے کبھی
 نہیں کیا۔

میں نے اس کے کشکول میں اپنی محبت کا گلاب نہیں ڈالا۔

کتنا مایوس کیا ہے اُسے۔

پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہاں احمد تمہاری محبت کی خوشبو میرے دل کے مکان سے اٹھ کر چہار سو پھیل گئی

ہاں۔ سب لوگ جان گئے ہیں۔

ابتدا تو عاشقہ نے کی۔۔۔ جب تو مجھے بھی علم نہ تھا کہ میں تمہیں چاہتی ہوں۔

پھر۔۔۔ پھر تمہاری ماں نے بھی جان لیا۔ آج۔ آج ماما جی نے بھی یقین کر لیا کہ ان کی پتھر
 کے وجود میں دل تمہارا نام پر دھڑکتا ہے۔

میں نے کب یہ چاہا تھا وہاں۔

ایسا تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

عفرہ سوچوں میں غرق سینے پر بازو باندھے فٹ ہاتھ پر سر جھکائے چلی جا رہی تھی۔ اسے کوئی
 دیکھ نہ سکی کہ بالکل اچانک ہی بائیک اس کے قریب آ کر ٹوڑی۔ عفرہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ نظریں اٹھا کر
 کھانٹا سامنے ہی زمین پر پاؤں جمائے آصف کا نجو بائیک پر بیٹھا تھا۔

”وہ شک میں مبتلا ہے جیسے میں اس کے بیٹے کے عشق میں مبتلا ہوں۔“ عفرہ ہنسی۔ بھلا یہ ہو سکتا
 ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جیسے میرے اندر یہ حس ہی نہیں ہے۔“ عفرہ شیر محمد سے نظریں ہڑاتے ہوئے کہہ رہی
 تھی۔ اور شیر محمد سوچوں کی عمیق گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ وہ نہیں سن رہا تھا کہ عفرہ کیا کہہ رہی ہے۔
 کیسی وضاحتیں پیش کر رہی ہے۔

”ماما۔ آپ سن رہے ہیں نا۔۔۔ میں بھلا ایسی حرکت کر سکتی ہوں؟“ عفرہ نے سوچوں میں گم
 شیر محمد کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ چونکا اور عفرہ کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔
 ”اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں ماما؟“ عفرہ کی آواز کانپنے لگی تھی۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بدلتی جا رہی ہے۔“ وہ بولا۔

”کیسے ماما؟“ عفرہ کے کچے میں حیرت تھی۔

”یہی کہ۔۔۔ اب تو جھوٹ بھی بولنے لگی ہے۔“

”بجدا ماما۔ میں کبھی بھی آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”پھر وہاں کی ماں شک میں مبتلا کیوں ہے؟“

”جانتی نہیں۔“ عفرہ نے کندھے اُچکائے۔

”دیکھ عفیٰ بیڑ۔۔۔ رائی ہوئی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ کسی بات کی بنیاد ہوتی ہے تو داستان بھی گھڑی جا
 سکتی ہے ورنہ بھلا کیا ضرورت ہوتی ہے۔ بے شک تو بہت بڑھی لکھی ہے مگر میرے تجربے تیری ڈگریوں
 سے بڑھ کر ہیں۔“

”ماما۔ آپ بھی۔۔۔ آپ بھی مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“ عفرہ کی آواز بھڑ گئی۔ اسے پتا نہیں
 کیوں خواہو اُرونا آ رہا تھا۔

”میں غلط نہیں سمجھ رہا عفیٰ۔ پر جو تم مجھے سمجھانا چاہ رہی ہو۔ وہ میری سمجھ میں کبھی بھی نہیں آ سکتا۔“
 شیر محمد نے اپنے گھٹنے کے گرد بازو باندھ لیے۔

اور بھی سپاہی نے آکر کہا۔
 ”مس۔۔۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔“ عفرہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیر محمد بھی اس کے

”کہاں پھر رہی ہو؟“

”میں۔۔۔ میں پھر رہی ہوں۔“

”ہاں بھئی۔ تم ہی سے پوچھ رہا ہوں۔“ آصف نے کہا۔

”وہ۔۔۔“ عصفیر ہنسی۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور اپنے پرانے انداز میں بولی۔

”میں ماما سے ملنے آئی تھی۔“

”ہو گئی ملاقات؟“ آصف نے پوچھا۔

”ظاہر ہے مجھے کوئی روک سکتا ہے؟“ وہ اکثر کر بولی۔

”کہا جاتا ہے تم نے؟“ آصف نے سوال کیا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ عصفیر نے الٹا اس سے سوال کیا۔

”میری چھوڑ دو تم بتاؤ۔“ آصف بولا۔

”میں نے کہیں بھی نہیں جانا۔“

”پاگل ہوئی ہو؟“

”آصف۔“ عصفیر نے اس کی بایک کے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھا دیا۔ ”مجھے جہانگیر کے مقبرے پر

لے چلو۔“

”یعنی شہر سے باہر؟“ آصف نے کہا۔

”دم گھٹ رہا ہے میرا۔ مجھے لے چلو وہاں کھل فضا میں۔ لے چلو گے؟“ عصفیر نے ہاتھی لہجے میں

کہا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں مگر۔۔۔“ آصف کہتے کہتے رک گیا۔

”مگر کیا؟“ عصفیر نے اسے دیکھا۔

”اگر وہاں نے دیکھ لیا تو؟“

”وہ دیکھ لے تو کیا ہوگا؟“ عصفیر بولی۔

”بہت کچھ ہو جائے گا۔“

”کیوں بھلا؟“ عصفیر کی سمجھ میں نہ آیا۔

”سننا ہے آج کل وہ تمہارے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔“ آصف کی آواز میں تمسخر تھا۔

”کوئی نئی بات کرو۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”کیا نہیں علم ہے؟“

”میرے علم میں یہ بات ابھی ابھی آئی ہے تمہارے ذریعے سے۔“ عصفیر نے ہنس کر کہا۔

”اچھا تو۔۔۔“ آصف نے کہنا چاہا تو اس نے آصف کی بات کاٹ دی۔

”چلو یار۔۔۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ عصفیر بولی اور اس کے۔۔۔ پیچھے بایک پر بیٹھ

گئی۔ آصف کا بنجہ نے کچھ کہے بغیر ہی بایک آگے بڑھادی۔

”جہانگیر کے مقبرے تک اُن دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی تھی۔۔۔ اور پھر مقبرے کی دنگ

اور طویل روشوں پر آصف کا بنجہ کے ساتھ چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

یہاں کبھی بادشاہوں کا کس قدر جلال تھا۔

کیا جمال تھا۔

شباب تھا۔

رونقیں تھیں۔

محفلیں جیتی تھیں۔

اور آج قبرستانوں جیسی خاموشی ہے۔ کبھی ظن سبحانی کی آمد کا اعلان بگل بجا کر کیا جاتا تھا۔ اور

جنگ کوئی پوچھنے والا بھی نہیں کہ ظن سبحانی کی قبر پر کسی نے فاتحہ بھی پڑھی ہے کہ نہیں۔

یہ ہر جلال لوگ مٹی میں مل کر فنا کیوں ہوتے ہیں؟

یہ دولت انہیں زندہ کیوں نہیں رکھتی۔

”عصفیر۔۔۔“ آصف نے اُسے پکارا۔

”ہاں۔“ عصفیر نے ہنکارا بھرا۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ آصف نے پوچھا۔

”میں جہانگیر کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ آصف دیکھو نا یہ کس قدر چاہتا تھا نور جہاں کو۔

ن کو پانے کے لیے اُس نے شیر افگن کو مروا دیا۔ اور نور جہاں نے بھی بے شک اسے چاہا۔ بے حد بے

باب پر مرنے سے پہلے اُس نے وصیت کی کہ اسے بیٹی کے ساتھ دفن کیا جائے۔ نہ کہ جہانگیر کے

ساتھ۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ محبت سے زیادہ۔۔۔ اولاد کیوں پیاری ہوتی ہے۔

”مرد کو تو اپنی محبت ہی پیاری ہوتی ہے۔ یہ تو عورت ہے جو اپنی محبت اپنے وجود کے حصوں میں

تبدیل دیتی ہے۔“ آصف نے مسکرا کر کہا۔

”شاید ایسا ہی ہے۔ عورت محبت کو چھپا سکتی ہے۔ مگر مرد ایسا نہیں کر سکتا۔“

”کیوں کرے؟“ ویسے عصفیر تم یونیورسٹی کیوں نہیں آتیں آج کل۔“ آصف نے پوچھا۔

”آفس میں کام بہت ہے۔ پھر جج پوچھو تو سیر دی اس قدر ہوتی ہے کہ صبح اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔

یہ بے سردیوں میں یونیورسٹی بند کیوں نہیں کر دی جاتی؟“

”یار تم بھی عجیب ہو رمضان میں کہتی ہو بند کر دی جائے۔ گرمیوں میں تم یونیورسٹی بند کرانے کے

لئے ہوتی ہو۔ بھلا سارا سال چھٹیاں ہوں تو پڑھائی کب ہوگی؟“

”ویسے بھی تم جیسے لوگ کہاں پڑھتے ہیں۔“ عصفیر ہنسی۔

”یہ تو نہ کہو۔“ آصف بُرا مان کر بولا۔

”فضولیات سے ہی تمہیں فرصت ملے تو۔۔۔“

”بکومت یہ بتاؤ وہاں کیا کیا معاملہ ہے؟“

”تمہیں کیا کرید ہے۔۔۔؟“

”مجھے کریدیں بلکہ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ واقعی وہاں نے تمہیں پروپوز کیا ہے؟“

”تمہیں کس نے کہا۔“ عصفیر ہانا چاہتی تھی۔

”مجھے زوہیب نے بتایا۔ جبکہ فرحت نے کہا ایسی کوئی بات نہیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ

کیا ہے۔“

”جج کیا ہے؟“ عصفیر نے یہ جملہ دہرایا۔

”ہاں۔۔۔“ آصف نے سر ہلایا۔

”آصف۔ تم مجھے کب سے چاہتے ہو۔۔۔؟“ عصفیر نے ایک دم سوال کیا۔

”تمہیں پتا ہے۔“ آصف نے کہا۔

”کب تک چاہتے رہو گے۔؟“

”جب تک اس وجود میں سانس ہے۔“ آصف اپنے دل پر ہاتھ رکھ رکھ بولا۔

”تم۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو۔؟“

”اپنے وجود کی ساری چٹائی ہے۔“

”مجھ سے شادی کرو گے۔؟“ عفریہ نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اور آصف کانچو

کو لگا جیسے برگد کا بوڑھا درخت اس پر آگرا ہو۔

”بتاؤ آصف مجھ سے شادی کرو گے آج ہی ابھی ہی۔۔“ عفریہ پوچھ رہی تھی اور آصف کانچو

سکتے کی ہی کیفیت طاری تھی۔

آصف کانچو کی آنکھوں میں حیرتوں کے بادل چھا گئے۔ اس کے تو سان و گمان میں نہ تھا کہ عفریہ

امیر ایک دم بالکل اچانک ہی وہ بات کر دے گی۔ جس کی اسے نہ جانے کب سے خواہش تھی۔ اس کی

سماعتیں یہ جملہ سننے کے لیے سینکڑوں دنوں سے منتظر تھیں۔ اور دل میں حسرتوں کے طوفان بار بار سر

اٹھاتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ عفریہ وہ کچھ کہہ دے جو وہ چاہتا ہے۔ مگر عفریہ تو وہ کچھ کہتی تھی جو آصف کانچو

کے پورے وجود کو جلا کر رکھ کر دیتا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا۔

”اگر کبھی عفریہ امیر اس کی محبت کے گلاب قبول کر لے گی تو کیا ہوگا۔؟“

کیسا دن ہوگا وہ۔؟ بہت روشن روشن آجلا آجلا سا دن۔

مگر یہ وہ پیدائش تو نہیں جیسا میں سوچا کرتا تھا۔“ آصف کانچو کے ذہن میں یہ جملہ گونجا۔

”معلوم نہیں کیوں عفریہ کی ”خواہش“ جان کر بھی آصف کانچو کے دل سے ٹھنڈی ہوا میں نہ

ٹکرائی تھیں۔

وہاں تو وہی جس کا عالم تھا۔

ٹھنک ٹھنک ہی ٹھنک تھی۔“

عفریہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بہت سے اندازے لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر

ایک دم ہی غصہ ہوئی۔ آصف نے چونک کر اسے دیکھا جو منہ پر ہاتھ رکھے بے تحاشا غصہ کر رہی تھی اور اس کی

آنکھیں پھلک رہی تھیں۔

”باگل ہو گئی ہو۔۔“ آصف نے اسے ڈپٹ کر کہا۔

”باگلوں کو سارے ہی باگل نظر آتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”میں پاگل ہوں۔؟“ آصف غصے سے بولا۔

”گزرے ڈیڑھ برس سے تو تم پاگل پن کا مظاہرہ کرتے آئے ہو۔ آج میں نے ایک بات کہہ

دی اور تمہارے وجود کی عمارت لرز اٹھی ہے۔“ عفریہ کا لہجہ خاصا چبھتا ہوا تھا۔

”ایسا نہیں ہے۔“ آصف نے کہنا چاہا تو وہ فوراً بولی۔

”جو کچھ بھی ہے آصف کانچو۔ تم مردوں کی قوم بھی خسارے کا سودا نہیں کرتی۔ اس دنیا میں

محبت کے نام پر ہمیشہ خسارے کھانے والی عورت ذات ہی رہی ہے۔ تم مرد لوگ چاہتے ہو عورت کو لوری

سے مافیادے کر سلاؤ اسے خود فریبی میں مبتلا کر دو۔ اور چاہے عورت کتنی ہی ذہین مین زندہ۔ جاگتی اور

جگاتی ہو وہ اس نشے میں دھت ہو رہی جاتی ہے اور محبت تو وہ نشہ ہے جس سے ہوش میں آنے والا پھر

اسی جو گانہیں رہتا۔ تم بھی عرصے سے مجھے مافیادینے کی پُر زور کوشش کرتے رہے ہو۔ اور میں بچتی ہی

ہی۔“

”تم غلط سمجھی ہو۔“ آصف نے کہا۔

”پھر سچ کیا ہے؟“ وہ جاننا چاہتی تھی۔

”میں کسی طرح بتاؤں۔ کم مجھے اپنی تمام تر بد تمیزوں کے باوجود بے حد پیاری ہو۔ ہمیشہ میں نے

تمہیں اپنا جانا ہے۔ تمہاری زیادیاں سب سہی ہیں۔ تم نے مجھے بھی تیر پھینکے سارے میں نے اپنے سینے پر

سے ہیں۔ مجھ جیسا فراخ دل مرد تمہیں کوئی بھی نظر نہیں آئے گا۔ یہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ۔“

آصف کانچو کا۔

”بھی تو میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”مت کرو جذباتی فیصلہ۔“ آصف نے جلدی سے کہا۔

”میرے فیصلے جذباتی نہیں ہوتے۔“ اس نے اطلاع دی۔

”سوچو۔ سوچو۔“ آصف نے مشورہ دیا۔

”کیا سوچوں۔ میری تو ساری سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔“ وہ ہونٹ کا

اچھری گوشہ دبا کر بولی۔

”کس نے تمہیں مفلوج کیا ہے۔؟“

”شاید میرے اندر کے جذبول نے۔ میرے اندر کی وہ ڈری سبھی لڑکی جو ایک مرد کا تحفظ چاہتی

ہے وہ سکون چاہتی ہے۔“ عفریہ نے بتایا۔

”تمہیں یقین ہے تمہیں سکون مل جائے گا میرا ساتھ پا کر۔“ آصف نے پوچھا۔

”بالکل۔“ عفریہ معصومیت سے ہلا کر بولی۔

”نہیں تم۔۔ اور بھی مضطرب ہو جاؤ گی۔“

”کیوں بھلا۔؟“ عفریہ نے آنکھیں پٹیائیں۔

”مجبوریوں کے تحت جوڑے گئے تعلق سوائے اضطراب اور بے چینی کے اور دے بھی کیا سکتے

ہے۔“ آصف ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ عفریہ نے کہنا چاہا۔

”تم مجھے بچہ بچہ تھی ہو۔“ آصف بولا۔

”یہ غلطی بھلا میں کر سکتی ہوں۔ وہ مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔“ مجھے پتا ہے آصف تم مجھ سے بے

دلی حساب محبت کرتے ہو۔“

”مگر تم تو نہیں کرتیں۔“ آصف نے کہا۔

”پتھر پر بھی مسلسل پانی کی بوند پڑتی رہے تو اس میں بھی سوارخ ہو جاتا ہے۔ میں تو پتھر گوشت

بست کا دل رکھنے والی لڑکی ہوں۔“

”یہ بات نہیں ہے عفریہ۔“

”پتھر کیا بات ہے۔؟“

”جہاں تک میں سمجھا ہوں تم چھپنا چاہتی ہو۔ وہاں احمد سے اور کیوں تو یہ بھی میں جانتا ہوں۔“

”کیوں بھلا۔؟“

”اس نے تمہیں پر پوز کیا ہے نا؟“ آصف نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”اور تم اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے میرا ہاتھ تھامنا چاہتی ہو۔ جب وہ راستہ بدل لے گا تو مجھے یقین ہے تم بھی مجھے جھوڑ دو گی۔“ آصف نے نہایت سچائی سے کہا۔ عفریہ کچھ نہ بولی۔ بس گھاس نوچتی رہی اور آصف کہہ رہا تھا۔

”میں بھلا کس طرح تجھے مار کر کھو سکتا ہوں۔“ آصف کے لہجے میں دھک بول رہے تھے۔

”میں تجھی نہیں۔“ عفریہ واقعی کچھ نہ سمجھی تھی۔

”مت دکھاؤ مجھے روشنیاں عفریہ امیر۔ میں اندھروں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔“ آصف

نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔

”آصف۔ تم مجھے چاہتے ہو نا؟“ عفریہ نے پوچھا۔

”یہ بھی پوچھنے کی بات ہے بھلا؟“ آصف مسکرایا۔

”انسان جسے چاہتا ہے اسے پانے کی خواہش بھی تو ہوتی ہے نا؟“ عفریہ نے پوچھا۔

”یقیناً۔۔۔ مگر یہ ضروری تو نہیں کہ ہم جسے چاہیں وہ بھی نہیں چاہے۔“ آصف نے اس کا جملہ

دہرایا۔

”ظن کر رہے ہو؟“

”حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ اور سچ یہ ہے کہ تم ”مجبوری“ کے تحت میرا ہاتھ تھامنا چاہتی ہو۔ مجھے معلوم ہے جب تمہاری وہ ”مجبوری“ ختم ہو جائے گی تو تم ایک لمحہ بھی نہیں لگاؤ گی اور مجھ سے دامن چھڑا لو گی۔“

”کتنی غلط سوچ ہے تمہاری۔“ عفریہ نے کہا۔

”سوچیں کبھی غلط نہیں ہوتیں۔“ آصف اپنی بات پراڑا ہوا تھا۔

”تم آزماؤ تو۔۔“

”آزمائش میں زندگی داؤ پر تو نہیں لگائی جاسکتی نا؟“

”تو تم انکار کرتے ہو؟“

”مجھے انکار نہیں ہے مگر کیا ضمانت ہے کہ تم نہیں بدلوں گی۔ وہاں احمد اپنی زندگی چین سے گزارنے لگے گا اور تم مجھے بیچنیوں کے کھولنے سے تھما کر اپنے راستے پر پلٹ جاؤ گی۔ میں تو مارا گیا نا۔۔“

”تمہیں یہ واہ ہے کیوں ہیں آصف؟“

”مجھے تمہاری بولڈ ٹیس ان واہموں میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ مجبوری ہے میری کہ میں تم سے

جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ آصف نے اپنے وہم کا اظہار کر دیا۔

”تمہاری مرضی آصف کا نجو۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ بس افسوس تو یہ ہے کہ تم تو میری

محبت کے دعویدار تھے اور مجھے حضور میں دیکھ کر بھی نکال نہیں رہے۔ چاہتے ہو میں ڈیلیاں لگائی رہوں۔“

عفریہ کے لہجے میں درد کھل گیا۔

”بخدا امیر ایہ مطلب نہیں ہے۔“ آصف نے کہا۔

”پھر۔۔؟“ عفریہ کی آنکھوں میں آنسو راج ہنوں کی طرح تیرنے لگے تھے۔

”میں چاہتا ہوں تم جو بھی فیصلہ کرو۔ خوب سوچ سمجھ کر کرو۔ تمہیں پتا ہے کہ میں نے تم پر زبردستی

عملہ مسلط نہیں کیا۔ تم سے کبھی تمہاری زیادتی کا شکوہ نہیں کیا کہ عفریہ امیر مجھے تم اچھی لگتی ہو۔ پیاری ہے۔“ آصف نے اطلاع دی۔

”کتنی؟“ وہ لبک کر بولی۔

”یہ کائنات بھی چھوٹی ہے اس محبت کی لمبائی جو ذاتی بتانے کے سلسلے میں۔۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری ذات سے تمہیں کوئی دکھ ہو۔“ آصف کا نجو کے لہجے میں سچائیوں کی مہک اگلی۔ اور عفریہ کے دل میں اس کا بچ آسانی جیسے کی طرح اتر رہا تھا۔

”مجھے بتاؤ تمہیں کیا مجبوری ہے عفریہ جو تم ایک دم اس بندے کا ساتھ چاہنے لگی ہو تو تمہیں کبھی

کبھی اچھا نہیں لگا۔ ہمیشہ تم نے اس کی تضحیک کی؟“

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں؟“ عفریہ ہان نہ رہی تھی۔

”ایسی ہی بات ہے۔ اگر تم وہاں احمد سے پیچھا چھڑانے کے لیے ناپسندیدہ بات کو پسند کر رہی ہو تو

دیکھو۔ بلکہ میں وہاں احمد کے سامنے کھڑا ہوں کہ کوئی تیار ہوں۔ چاہے وہ کچھ کہے اگر اس نے ضد کی تو مجھے

رو دکر ہی تم تک پہنچے گا۔ یقین کرو عفریہ یہ میرے لیے عین سعادت ہوگا۔ کہ میں تم پر قربان ہو جاؤں۔

صرے جیتے جی وہ نہیں نہیں اپنا سکے گا۔ بشرطیکہ تمہاری مرضی نہ ہو۔“ آصف نے کہا۔

”آصف۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ عفریہ نے اعتراف کیا۔

”تم سمجھو سوچو۔ پھر تم مجھ سے جو کہو گی وہی کروں گا۔“ آصف نے کہا۔

”اگر میرا فیصلہ پھر بھی یہی ہوا تو؟“

”تو میں کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ بشرطیکہ تم یہ ساتھ چند روز کا نہیں ساری عمر کا چاہو۔ یقین کرو میں تمہاری آنکھوں میں سچی ساری سوئیاں نکال لوں گا۔“

”تمہارے گھر والے مان جائیں گے؟“ عفریہ نے پوچھا۔

”نہ مانے کی وجہ؟“

”تمہارے ماں باپ اتنے کھلے ذہن کے ہیں؟“

”ہمارے ہاں فیصلے میری دادو کرتی ہیں اور میں ان کا نہایت ہی لاڈلا پوتا ہوں۔ تم کو یہ جان کر شاید خوش ہو کہ دادو سے تمہارا تعارف ہے۔“

”میرا تعارف؟“ عفریہ نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ میں نے انہیں بتا رکھا ہے کہ مجھے ایک پاگل پاگل سی لڑکی بہت اچھی لگتی ہے۔“

”انہوں نے تمہیں کچھ نہیں کہا؟“

”ناں۔“ وہ سر کو نفی انداز میں جنبش دے کر بولا۔

”کوئی اعتراض نہیں اٹھایا؟“ عفریہ کو حیرت تھی۔

”ضرورت ہی کیا تھی؟“ آصف نے کہا۔

”واقعی آصف؟“ عفریہ کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہوں۔۔ یقین کرو تم۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”میری دادو آئرش لینڈی ہیں۔“ آصف نے اطلاع دی۔

”اوہ۔۔ سچی۔۔“ عفریہ کے لب سکڑ گئے۔

”عفیرہ۔ مجھے ہمیشہ ہی تمہاری بہت فکر رہی ہے۔“
”کیوں بھلا؟“

”جو پیارے ہوں ان کی فکر کرنا جرم ہے؟“ آصف نے پیار سے پوچھا۔ اس کا لہجہ اتنا پیارا تھا کہ عفیرہ کو پہلی بار انفس ہوا کہ اتنے پیارے اور اتنے لڑکے کا ہاتھ وہ اب تک کیوں جھٹکتی آئی تھی۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہ تھی۔

”تم سوچو۔ اور پھر کل انشاء اللہ ہم ایک مضبوط بندھن میں بندھ جائیں گے۔“

”میرا فیصلہ نہیں بدلے گا آصف کا بچو۔“ عفیرہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ آصف نے صدق دل سے دعا کی۔

”فیصلے بدلنے کے لیے تو نہیں کیے جاتے؟“ عفیرہ مان کر ہی نہ دے رہی تھی۔

”چلو اب چلیں۔“ آصف نے کہا۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ عفیرہ نے کہا۔

”مجھے پتا ہے۔ چلو آج ”سوس“ میں نہیں مچھلی کھلاتا ہوں۔ ہو تم لندھی سی نا۔“ آصف کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا اور عفیرہ اپنا بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

ساری دنیا دے دے چھڑے ملاویں

تے ساڈے لئی جدائیاں رہ گئیاں

ریڈیو پر عطاء اللہ عیسیٰ جیلوی نہایت دردیلے لہجے میں گارہا تھا۔ اور توے پر روٹی ڈالٹی تباہاں کا ہاتھ ایک دم ہی رُک گیا۔

”یہ یہ بعض گیت سن کر ایسا کیوں لگتا ہے۔ جیسے یہ ہمارے دل کی آواز ہو۔“

”مفتی ہمارے در کو اپنے لفظوں میں بیان کر رہا ہو۔“

اور دل درد سے بوجھل ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے دل کا پیمانہ ابھی پھلک پڑے گا۔

تباہاں کی آنکھوں کے کٹورے پانی سے لبریز ہو گئے۔

ایک تو آج کل موسم ہی ایسا تھا۔ سردی کا سرد سرد دکھ زدہ ساموسم۔ پھر گلی لکڑیاں۔

اودھ جلا کر واکسلا سا دھواں دیتی لکڑیاں۔

خاموش۔۔۔ مسلسل ٹھہرے ہوئے دن۔ کیسا اداس سا ماحول تھا۔ شاید حسن اور اور محبت کا یہی تاثر دہوتا ہے کہ محبت اداس رہتی ہے۔

اور یہی تاثر آج کل اس کے اندر بھی اتر اہوا تھا۔ اسجد ملک کا خیال۔ جنگو بن کر اس کے آنکھن دل میں اترتا۔ مگر اسجد ملک کی بے رخی کا سوچ کر اس کا دل ڈھکی ہو جاتا۔

جس روز اس نے اسجد کو گھر سے چلے جانے کو کہا تھا کس قدر تڑپی تھی۔

روٹی تھی۔

اور اگلے ہی روز وہ اپنے پاؤں کی پروا کیے بغیر لنگڑاتی ہوئی دریا کے کنارے اس مخصوص جگہ پر چلی گئی تھی۔ جہاں سفیدے کے درختوں کے جھنڈ میں وہ اور اسجد ملتے تھے مگر سورج مغرب کی پناہوں میں لایا گیا تھا اور اسجد نہ آیا تھا۔

شاید وہ مجھ سے خفا ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ تباہاں نے سوچا تھا۔

”دادا جان کی بڑی بیوی کی اولادوں کی زندگی کی فیصلے انہوں نے ہی کیے۔ پھر میں تو ان کا ریل پوتا ہوں۔ وہ بھلا کس طرح میری خوشی پر اپنا فیصلہ مسلط کر سکتی ہیں۔ تم ملو گی نا تو تمہیں پتا چل جائے گا۔ دودھ جیسی سفید میری دادو تو کہیں سے بھی میرے جیسے جوان گھبر دپوتے کی کرینڈا نہیں لگتیں۔“ آصف بہت خوش تھا۔ ”تو تم حاوی ہو سب پر؟“

”نہیں۔ رحمت کے معاملے میں خوش نصیب ہوں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب تم مجھے کہو گی کہ تمہیں میری محبت قبول ہے۔“ آصف کا بنو نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اور یقین کرؤ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ یہ سب خواب سا لگ رہا ہے۔ مگر پھر بھی میں تم سے کہوں گا کہ تم کوئی جذباتی فیصلہ مت کرو۔ آج کا دن اور سوچو۔ رات بھر سوچو اور صبح مجھے بتا دینا۔“ آصف کا بنو نہایت رسائیت سے بول رہا تھا۔ ”بہت دیر ہو جائے گی۔“ عفیرہ نے کہا۔

”کیوں جلد چاہتی ہو؟ دیکھو عفیرہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اور قدرت فیصلہ کرتی ہے۔“

”دل فیصلے کرنے میں اس قدر جلدی کیوں بچاتا ہے؟“ عفیرہ نے پوچھا۔

”میں نہیں چاہتا کہ تم ساری عمر دازے میں گھومتی رہو۔ کہ جہاں شروع دینے ختم۔ ہر سفر کا انت ہو جانا چاہیے نا تو میں چاہتا ہوں کہ ہم نئی زندگی کا آغاز کریں تو کوئی بوجھ دل و ذہن پر نہ ہو۔ میری طرف سے مطمئن رہو عفیرہ۔ مجھے تم جب کہو گی جہاں کہو گی میں پہنچوں گا۔ تم کہو تو میں تمہارے گھر جانے کو بھی تیار ہوں۔“

”اچھا۔“ عفیرہ مسکرائی۔

”ہاں بھئی۔“

”میرے گھر جا کر شاید تم کو میں اچھی نہ لگوں۔“ عفیرہ نے کہا۔

”کیوں بھلا؟“ آصف حیرت سے بولا۔

”ہم بہت غریب لوگ ہیں آصف۔ میرا بابا غریب مزارع ہے اور۔۔۔“ عفیرہ رُکی تو آصف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”بس خاموش۔“

”کیوں؟“ عفیرہ نے اسے دیکھا۔

”محبت ان دنیاوی چیزوں سے بہت ماوراسا جذبہ ہے تم کس کی بیٹی ہو کون ہو کس خاندان سے ہو؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں عفیرہ! میر۔ مجھے تو یہ غرض ہے کہ میرا دل تمہارا تمنائی ہے۔ مجھے تم اچھی لگتی ہے اور یہ کہ۔“ وہ چپ ہوا تو عفیرہ بولی۔

”کہ۔؟“

”مجھے تم سے محبت ہے۔“ آصف کا بنو نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور عفیرہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ ایک دم ہی نظریں جھکا لیں۔ آصف ہنس دیا اور بولا۔

”لڑکی کتنی بھی بولڈ کیوں نہ بنے۔ ہوتی اندر سے وہی چھوٹی موٹی ہے۔ چھپکلی سے بھی ڈر جانے والی۔“

”جی نہیں۔ میں نہیں ڈرتی کسی سے۔“ وہ ہنسی۔

”مجھ سے تو ڈرنا پڑے گا؟“

”وقت تو آئے۔“ عفیرہ بے پروائی سے بولی۔

نے قبول کر لیا ہے۔ مقدر کا لکھا کچھ کر۔ حالات سے برسوں گزرنے کے بعد سمجھوتہ کر لیا ہے۔ پر ایسا تو نہیں ہوا۔ وہ تو پھر اسی طرح ہو گئی ہے۔“ حیات محمد کی آواز جھرجھرائے لگی تھی۔

”جانتا نہیں اماں کو کونسا دکھ ہے بابا۔؟“

”میں خوش تھا کہ وہ خوش تھی۔ اب تو پھر مجھے دکھ کر دیا ہے۔ مجھے پتا نہیں تابی، مجھے تیری ماں سے کتنی محبت ہے۔ بہت پیاری ہے مجھے۔ میں۔ میں اپنے ان ہاتھوں سے اٹھا کر لایا تھا۔ بہت معصومی شکل گوشتی سی تھی یہ۔ تیری دادی کو بھی بہت پیاری تھی پورے دو سال تک اس نے اس کے ناز اٹھائے تھے۔“

”برائیاں کہاں سے آئی تھی؟“ تابیاں پوئی۔

”مجھے تو پتہ نہیں۔ ہمیں تو دریا نے دی تھی یہ سیلاب کے دنوں میں۔ اسے کچھ یاد نہ تھا ورنہ میں ضرور اسے وہاں پہنچا دیتا جہاں اس کے اپنے رہتے تھے۔ وہ بھی یقیناً اسے تلاش پتہ پھر رہے ہوں گے۔ پتا نہیں کیا حالت ہوئی ہوگی ان بد نصیبوں کی۔ جن کی متاع سیلاب کی نظر ہو گئی۔“

”وہ اماں کو کھو کر روئے ہوں گے۔ اور آپ باکرہ روتے ہیں۔“ تابیاں نے ہولے سے کہا۔

”نہیں نہیں تابی، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے دکھ تو یہ ہے کہ کون اپنی ڈار سے دچھڑ گئی ہے۔“

”کتنی صدیاں گزر گئیں۔ وچھوڑے کا دکھ مجھے معلوم نہیں پڑ۔“ حیات محمد نے کہا تو وہ مسکرا کر رہ گئی۔

بابا۔ نہیں کیا پتہ کہ مجھے دچھوڑے کے دکھ کے علم ہو گیا ہے۔ میں نے یہ دکھ اپنے دل میں اتار کر خون میں دوڑتے محسوس کیا ہیں۔ میری روح کی گرلاہٹ کسی صورت بھی ڈار سے پھڑکی کونج کی گرلاہٹ سے مختلف نہیں ہے۔ شکر ہے دل کے شور کی خبر کسی کو نہیں ہوئی۔ ورنہ بندہ اپنے ہی جیسے بندوں سے کس قدر شرمندہ ہوتا تھا۔“

”مجھے روئی دے دے بہت بھوک لگی ہے۔“

”پہلے حقہ تو پی لو۔“

”وہ بھی پیتا ہوں گا۔“ حیات محمد نے حقے کی نے لبوں سے لگائی اور بولا۔ ”یہ تیرا بیوی کی دنوں سے پیتا نہیں۔ پتا نہیں کہ کتنی دال لے کر کھالے گئے ہیں۔“

”کہیں جانا تھا۔؟“

”کہہ رہا تھا کہ کتنی جگہ کام ہو رہا ہے وہاں جارہا ہوں۔ اب ہفتہ ہو گیا ہے آتا تو سہی۔“

”اچھا ہے بابا نہ آئے۔“ ”کیوں بھلا؟“

”اگر وہ اماں کو کم سم دیکھے گا تو دھکی ہوگا۔ اور یوں بھی بابا، مشکل سے تو بابا، اماں سے خوش ہوا ہے۔ اب جھگڑا ابھی نہیں کرتا۔“ تابیاں نے چھابی میں روئی کٹوری میں دال ڈال کر حیات محمد کے سامنے رکھ دی۔

”تو صحیح کہتی ہے۔ اچھا ہے نہ آئے وہ۔“ حیات محمد نے حقہ پرے کیا اور روٹی کھانے لگا۔ جبکہ تابیاں سوچ رہی تھی۔

”شائد اسجد بھی اپنی کینیا والوں کے ساتھ اور جگہ چلا گیا ہو۔ نہ آ کا ہو۔“

پر اسجد کے پاس تو چیپ ہے۔ وہ تو یہاں کے سوچ پھیرے بھی لگا سکتا ہے پھر۔ پھر کیوں نہیں آیا وہ۔

مصروف ہوگا۔ کام بھی تو بہت ہے اس کا۔

دل کم بخت دلیلیں دینے لگا۔ لیکن ذہن کہہ رہا تھا۔

پر اگلے روز وہ پھر گئی تھی پر مایوسیاں شاید مقدر ہو چلی تھیں۔ اسجد سے ملے پورے گیارہ روز ہو گئے تھے ورنہ ایک لمحہ کو بھی بھلا یا نہ گیا تھا بلکہ آج کل تو وہ خود کو بھولے ہوئے تھی۔

”بھلا یوں بھی کوئی ترک تعلق کرتا ہے۔ بتائے بغیر۔ جرم اتنا شدید تو نہ تھا۔ تم نے میری مجبوری ہی نہ سمجھی اور اپنا دکھ تمہیں اس قدر محسوس ہوا۔ یہ کسی محبت ہے۔ اگر اپنا تمہیں گھر میں دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟“

بابے اسجد۔ میں تو محبت کی پیٹنگ سے ایسی گری ہوں کہ کچی کرچی ہو گئی ہوں۔

تم تو مجھے کہتے تھے میں تمہاری جان ہوں۔

تمہاری زندگی ہوں۔

کوئی زندگی کے بغیر بھی زندہ رہتا ہے۔ مجھے تم سے یہ اُمید کبھی بھی نہ تھی کہ تم میرے ساتھ ایسا کرو گے۔

جبکہ حقیقت یہی ہے۔

تم شہری مرد بھلا کب ایک کے ہو کر رہتے ہو؟ شہری مرد تو ہم دیہاتی لڑکیوں کے لیے ناگ ہوتے ہیں کہ جب بھی موقع ملتا ہے ڈس لیتے ہیں اور تم نے بھی میرے دل کو ڈس لیا ہے۔ میں اپنا دکھ کس سے کہوں۔؟“

”کیسے بتاؤں کہ میرے مقدر میں جدائیاں رہ گئی ہیں۔ صرف تنہائیاں ہیں۔“

”روئی سڑ گئی ہے تابیاں۔ کن خیالوں میں بیٹھی ہے؟“ حیات محمد کی آواز پر وہ چونکی۔ تو اس کی طرف نظر ڈالی تو واقعی روئی سیاہ کٹے میں بدل کی چمکی تھی۔ اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ تابیاں نے جلدی سے وہ روئی اتار دی۔

”کہا ہو گیا ہے تجھے تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ حیات محمد نے حیرت سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں بابا۔“ تابیاں ہولے سے بولی۔

”مجھے بتا پتر۔ کیا پریشانی ہے؟“ وہ بولا۔

”کوئی نہیں، بس امتساں کی وجہ سے پریشان ہوں۔“ تابیاں نے جلدی سے بات بتائی کہ واقعی شرفاں بھی کچھ روز سے کم سم تھی۔ جب سے اسجد اس سے مل کر گیا تھا۔ گھنٹوں بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ بس ایک نام اس کے لبوں پر جم گیا تھا۔

تابیاں نے بارہا اس کے ہلے لبوں سے سنا تھا۔

”ظفری۔ ظفری۔“

اور یہ نام تو اسجد ملک کی زبان سے بھی ادا ہوا تھا اس روز جب وہ ان کے گھر آیا تھا۔

وہ اسجد سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ ”ظفری“ کون ہے؟ پھر اس نے ماں سے پوچھا تھا کہ ظفری کیوں اسے شدت سے یاد آتا ہے؟

”کس تعلق سے اس کا ظفری ہے؟“ ”کیا رشتہ ہے؟“

کوئی کڑی ضرورت نہ لگتی تھی۔ جول نہیں پار ہی تھی۔ اور تابیاں وہ کڑی تلاش چاہتی تھی۔ چاہے یہ اسجد اس سے کوئی تعلق رکھتا یا نہ رکھتا۔ اسے کوئی پروا نہ تھی۔ پروا تھی تو ماں کی۔ وہ اب اسے اس عمر میں مزید ترپے کھٹے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

”میں آپ شرفاں کی وجہ سے پریشان ہوں۔“ حیات محمد نے حقے کی چلم پر انگارے دھرنے ہوئے کہا۔ ”اچھی بھلی تو تھی۔ میں نے پہلی بار اسے خوش دیکھا تھا۔ اور میں خوش تھا کہ وہ لوٹ آئی ہے اس

بروہی اور بچھی کسی ایک جگہ کب ملتے ہیں تاہاں۔ تو بھی محبت کے نام پر دھوکا کھا بیٹھی ہے۔
ارے چلی، محبت ہے ہی نہ فریب۔ دھوکا کون بھلا کسی کا ہوا ہے۔ مسافر تھا اسجد وہ تو تیری زلفوں کی چھٹی
چھاؤں تلے ذرا سی دیر سستانے کے لئے بیٹھا تھا۔ جب ٹھکن اتر گئی تو پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا
تو کوئی اس کی منزل تو نہ تھی۔
تو تو پڑا وہی۔

تجھے ریگستان میں سایہ دار درخت تھی۔ ریتلے ٹیلوں کے بیچ ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ تھی۔ تو جان
لے کہ سب فریب ہے۔

سب مایا ہے۔ سب جھوٹ ہے۔
اس نے نہایت سچائی سے کالے پیشے میں بھرا سیال، خود کو یہ بتائے بغیر کہ اس کا ذائقہ کیسا ہے ایک
بہت ہی لمبے گھونٹ میں بہت ہی لمبی سانس کے ساتھ اندر اٹار لیا کہ اب اس کے اپنے بس میں یہی دوا تو
ہی۔

اور پتا نہیں اس سچائی کو جو محبت ہے نہ فریب اور نہ جھوٹ کب تک کڑوے گھونٹ کی طرح حلق کے
پار اتارنی تھی ٹھنڈے میٹھے پانیوں کی آس میں۔
کہ آس تو بھی بے آسرا نہیں ہوتی پھر اللہ تعالیٰ بھی خود کہتا ہے۔

لا تقنطو من رحمت اللہ
(اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے)
اور وہ بھی مایوس نہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسجد ایک بار ضرور آئے گا اور یہ یقین اسے اپنے ایمان کی
حد تک تھا۔



اُس کا ذہن بھاری ہو رہا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے حلق میں ڈھیر سارا لکڑی کا سیاہ
نواں اکٹھا ہو گیا ہو۔ اعصاب سچ رہے تھے۔
اور دل پر رنج و یاس کی ایک ناقابل بیان کی کیفیت طاری تھی۔ کچھ بھی تو اس کی سمجھ میں نہ آ رہا
تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے دل میں نئے زخموں کی کک محسوس کر رہی تھی۔ بیسیں بار بار اسے بے حال
تھے دے رہی تھیں۔ دل دکھتا ہوا پھوڑا ہوا تھا۔ ہائے غرق ہو یہ دل۔ بد بخت سارے فساد کی جڑ یہ دل
ہی تو تھا جو داؤد اٹھا چلائے ہوئے تھا۔
خود غرض کہیں کا۔

جو صرف اپنے ہی بارے میں سوچتا ہے۔ اپنی اُمیگوں، خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے
چلا چلا ہار رہا تھا۔ دہائی دے رہا تھا۔ پراس کی بھی تو عزت تھی اور وہ اپنی بے عزتی کو کبھی بھی برداشت نہ کر
سکتی تھی۔

اس کا شمار سراٹھا کر چلنے والوں میں ہوتا تھا۔ کبھی وہ سیر جھکا کر نہ چل سکتی تھی۔
وقار سے وہ جینا چاہتی تھی۔ اور دل اسے بے عزتی کی دلدل میں اتارنا چاہتا تھا۔ یہ تو وہ کسی
بہتر بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔

آصف کا بچوکی ہونے کا فیصلہ کر چکنے کے باوجود بھی وہ مضطرب اور متذبذب تھی۔
بعض فیصلے ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو ایک دم بالکل ہی اچانک کر لیے جاتے ہیں لیکن انہیں دل
نہیں کرتا خواہ ذہن کتنی ہی معقول دلیلیں دے۔

یہی حال عفیرہ امیر کے دل کا بھی تھا۔ آصف کا بچوکی اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صرف
سچی ہے۔ کہ ایسے اب اعتبار آیا تھا آصف کی محبت پر۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ اب تک وہ کیوں آصف
بچوکی کلسائی آئی تھی۔ اسے بے تماشا دکھ دیے تھے۔ اس کے خلوص اور جذلوں کا بھرپور طریقے سے
اقب اُڑایا تھا۔ بلکہ یہی نہیں دوسروں کے سامنے اسے تماشا بھی بنا دیا تھا۔ بڑی بڑی ادا کا اور کیا
رف تھا کہ اس کی خواہش جان کر آصف نے انکار نہ کیا تھا۔
کوئی حیلہ!

کوئی بہانہ اس نے نہ کیا بلکہ عفریہ کو موقع دیا تھا کہ وہ سوچ لے۔ کہ اس کے علاوہ کوئی چار نہ تھا۔ عفریہ کو اس لمحے واقعی شرمندگی ہوئی تھی۔ جب آصف کا نچوٹ اپنے دل کے پورے غلوں کے ساتھ اس کا ہاتھ تھانے کی حامی بھری تھی۔

اس کی زیادتیاں اسے یاد دلائی تھیں۔

کیا لوگوں میں معاف کر دینے کا درگزر کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ کیا دنیا میں اتنے مخلص لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ عفریہ نے کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے سے اپنی خوبصورت سی ناک ٹکادی کہ سوچیں اسے دس رہی تھیں خیالوں کے عمیق سمندر میں وہ اتر گئی تھی اور ساحل کی اسے تلاش تھی۔ اسے سوائے آصف کا نچوٹ کے اور کوئی بھی ملاح نظر نہ آ رہا تھا جو اسے نکال سکتا۔

اس کی ڈولی کسی کو کنارے پر لے آتا۔

”میں بھی تمہارا ساتھ چاہتا ہوں عفو پیاری۔“ اس کے قریب ہی نہایت گمبیر لہجے میں یہ سرگوشی ابھری تھی۔

اور اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ البتہ وہ پورے وجود سے کانپ کر رہ گئی تھی۔

یہ آواز

یہ لہجہ

اور یہ انداز بھلا وہ کیسے نہ جان پاتی۔ یہ آواز تو تنہائیوں میں بار بار اس نے سنی تھی۔ اکیلے میں خاموش فضا میں یہی آواز اس کی سماعتوں میں ٹھنڈک بن کر اتر جاتی تھی۔ وہ نظر انداز کرتی تھی۔ سر جھٹک کر اس کو ذہن سے نکالتی تھی۔ اسے پتا تھا وہاں احمد غاشیہ کمال پر مرتا ہے۔ غاشیہ کمال اس کے روم روم میں اتری ہوئی ہے اور یہ جذبہ یک طرفہ تو نہ تھا۔

جبکہ عفریہ کے اندر تو یک طرفہ چنگاری ابھری تھی۔ اور اس نے اسے بار بار بھاننے کی کوشش کی تھی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہاں کو سامنے پا کر اس کا وجود جلنے لگتا تھا۔ وہاں احمد کی قربت میں بار بار اس کا جی چاہتا ایک بار صرف ایک بار وہ وہاں سے کہہ دے۔

”آئی لو یو جی“

مگر ہر مرتبہ اس نے خواہش کے ناگ کے پھن پر ایڑی رکھ دی تھی۔ اپنی خواہشوں کو خود ہی ٹکنا کس قدر صبر آزما ہوتا ہے۔

وہ تو خود سے بھی یہ اعتراف نہ کرنا چاہتی تھی۔

لوگ کیا کہیں گے۔۔۔؟

وہاں کیا سوچے گا؟

وہ تو اسے منفرد لڑکی سمجھتا تھا جب کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو منفرد کہلاتی تھی۔۔۔ پر اسے پتا نہ تھا کہ لڑکیاں ساری۔۔۔ ایک سی ہوتی ہیں۔۔۔ خواہوں کی دنیا میں خوش رہنے والی۔

آنکھیں بند کر کے ناہوار راستوں پر چلنے والی۔

اپنے آپ میں مست رہنے والی۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو رکھنے والی لڑکی۔

تو وہاں احمد یہ طے ہے کہ تم میرے نہیں میں تمہاری ہو سکتی ہوں۔ پھر تو غاشیہ اور تمہاری ماں کا کہا سچ ہو جائے گا اور میں ساری عمر بھلا کیسے شک کے موسموں میں رہوں گی۔ میں بہاروں میں رہنا چاہتی ہوں۔ پر مجھے پتا ہے کہ وہ بہاریں میرا مقدر نہیں جن کی چاہ ہے۔ شاید کیا یقیناً آصف کا نچوٹ مجھے بے حد

بے حساب خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔ ساری بات تو دل کی خوشی کی ہوتی ہے اور جب دل ہی خوش نہ ہو تو دنیاوی خوشیاں بھی انسان انجوائے نہیں کر سکتا۔

ہائے آصف کا نچوٹ۔۔۔ تم مجھے اپنا کر کیا پاؤ گے۔؟ وہ دل جو کبھی تمہارے نام پر نہیں دھڑکا۔ اور تم اس پر ہاتھ رکھو گے۔

بھی ان آنکھوں نے تمہارے سینے نہیں دیکھے اور ان آنکھوں میں تم اپنی شبیہ تلاشو گے۔ ہاں آصف کا نچوٹ۔ میرے لبوں پر تمہارا نام بھی نہیں چلا اور تم ان۔۔۔ کی تعریف کرو گے۔۔۔ کتم جو کہتے ہو تم مجھے اتنا چاہتے ہو کہ ساری دنیا میں کسی نے کسی کو نہ چاہا ہوگا۔ شاید میں بہت خوش نصیب ہوں۔

نہیں۔۔۔ نہیں میں بھلاک خوش نصیب ہوں۔ ضروری تو نہیں کہ جو تمہیں چاہے اور پالے۔ خوش نصیب تو تم ہو۔

آصف کا نچوٹ۔

میں تو بھتی تھی میں ایسا پتھر ہوں جس پر کبھی جو تک نہیں لگ سکتی۔ پتا چلا ایسا تو نہ تھا۔

میں تو ڈھسے گئی ہوں منٹوں سینکڑوں میں۔۔۔

کس طرح جو بد رانی ظل ہمارے مجھے آ کر بے عزت کر دیا۔ مجھے لمحوں میں میری اوقات بتادی۔

”میں تم جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“

عفریہ کی سماعتوں میں یہ جملہ گونجا تو اسے لگا جیسے گرم گرم تیل اس کے کانوں میں اتار دیا گیا ہو۔

یہی بات تو غاشیہ نے بھی کہی تھی تب بھی۔ اس روز بھی وہ حساسی عفریہ بے حال ہو گئی تھی۔ دل کے درد نے بہت داویلا مچا دیا تھا۔ اور اب ظل ہمارے بے عزت کیا تھا۔ کیا غریب کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ جب چاہو بھرے بازار میں اس کی چادر نوچ لو وہ تو احتجاج کے لیے کسی عدالت میں بھی نہیں جا سکتا۔ ہر طرف انصاف کے دروازے بند ہوتے ہیں۔

یا خدا یہ تفریق کیوں کی ہے۔؟

سب برابر کیوں نہیں؟

اور۔۔۔ اور اب تو ماما شیر محمد نے بھی مجھ پر شک کیا ہے۔ وہ تو تجربوں کی بھٹی میں پک کر کند ہو گیا ہے۔ اگر میں خود ہی ماما کو نہ بتائی تو کیا تھا۔؟

مگر میرا دل تو صاف تھا۔

دل صاف۔۔۔ ہونہ۔۔۔ اس کے اندر کوئی زور سے ہنسا۔ تمہارا دل صاف نہیں تھا عفریہ امیر۔ اگر بات ہوئی تو تم بھی بھی اپنے ماما سے ذکر نہ کرتیں۔

پھر میں نے ذکر کیوں کیا۔۔۔؟ اس کے بے تحاشا خوبصورت لب پھڑکے۔ اس نے خود ہی سے بال کر ڈالا تھا۔ صرف اس لیے کہ کل کلاں کو یہی بات کسی اور ذریعے سے انہیں پتا چلے تو تم شرمندہ نہ ہو کہہ سکوکہ میں تو پہلے ہی آپ کو بتا چکی تھی۔ پر ایسی باتیں وہی کہتا ہے جو چور ہو۔

میں چور نہیں۔ عفریہ نے تڑپ کر خود سے کہا اور اس کی آواز پورے کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ کاش میں کوئی فیصلہ خود سے کر سکتی۔ کاش وہاں احمد میں اپنے دل کی تمنا پوری کر سکتی۔

اور کاش وہاں احمد تم مجھے کبھی ملے ہی نہ ہوتے۔! بہت سارے کاش اس کے سامنے ناچنے لگے بچے تھوڑوں سے اس کی جھولی بھری ہوئی تھی۔ کاش میں شہر ہی نہ آئی ہوتی۔

ہاں ماما شیر محمد مجھے گاؤں ہی میں تم رہنے دیتے۔ مجھے پڑھنے نہ دیتے۔ میری ضد نہ مانتے۔

یہ آگئی تو عذابے نا۔؟

تم قتل نہ کرتے اور میں شتر بے مہار ہو کر بار نہ نکلتی، تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید نہ ہوتے اور میں تمہاری رہائی کے لیے ماری ماری نہ پھرتی۔ تجربوں کے انگاروں سے اپنے ہاتھ کی پوریں نہ جلاتی۔۔۔ اور۔۔۔ اور ماما یہ عذاب نہ جھکتی۔ جسے محبت کہتے ہیں۔ یہ عذاب ہی تو ہے۔۔۔ دور ہر عذاب۔۔۔ جو میں جھیل رہی ہوں۔ کب تھا مجھ میں اتنا حوصلہ۔۔۔ میں تو بہت معصوم سی عفریہ امیر تھی۔ جو بھی محبت کرنے کا سوچ نہ سکتی تھی۔

جوانہنائی بھولی تھی۔

زمانے کی چلتے بازیاں نہ جانتی تھی۔ جو مردوں کو دکھ کر گھبراتی تھی۔ اور وہاں احمد جیسے مرد سے محبت کرنے کے تو وہ دوسرا جنم لیتی۔ تب بھی یہ جرأت اس میں نہ آ سکتی تھی۔۔۔ ماما۔۔۔ اس معصوم سی عفریہ کے تم ہی قاتل ہو۔ جسے آگئی کے کھولتے کڑھاؤ میں تم نے ڈال دیا ہے۔ اور آگئی کی چونک اس کا لہو چوں رہی ہے۔

میں گاؤں میں بہت خوش اور مطمئن رہتی۔ میں بھی چوہدری فیروز حسین کے خوف سے تمہارا ساتھ نہ دیتی اور تم اکیلے کھستے رہتے۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں اتنی خود غرض تو نہیں ہوں۔۔۔ عفریہ نے اپنی سوچوں کو بریک دی۔ اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے طویل سانس لے کر اپنے بستر پر آ گئی۔

تیکے کے نیچے سے گڈی کا خط نکالا۔ جو اسے کل بھی ملا تھا۔ آج کل دونوں مہینوں میں باقاعدگی سے خط و کتابت جاری تھی وہ جب بھی اداس ہوتی گڈی کو خط لکھتی۔ اسے تسلیاں دیتی۔ اپنی خوشی کا بتاتی کہ شہر میں بہت خوش ہے۔ پر آج اس کا دل چاہ رہا تھا وہ گڈی کو بتائے۔

کہ وہ خوش نہیں ہے۔

بھلا غیروں میں رہ کر کوئی خوش رہ سکتا ہے۔ اپنی زمین سے دور بھی بھلا کوئی خوش مل سکتی ہے؟ بھلا غیر بھی اپنے ہوئے ہیں۔ وہ تو صرف برچھیاں لیے ہوتے ہیں پتا بھی نہیں چلتا اور جگر میں اُن دیکھا بھلا اُتار دیتے ہیں۔

اپنی پسند کے راستے اپنا کر بھی انسان دکھی ہوتا ہے۔ وہ گڈی کو بتانا چاہتی تھی۔

میری ماں جانی میں بہت دکھی ہوں۔۔۔ اب میں تلاش رہی ہوں۔۔۔ وہ کندھا جس پر سر رکھ کر بہت ساروں کو۔ اب ضرورت محسوس ہو رہی ہے مہربان بازوؤں کی۔ اور وہ مہربان بازو گڈی تیرے ہی تو ہو سکتے ہیں۔ اپنی ماں جانی سے بہتر تو کوئی دکھ نہیں سکتا۔

بہت اچھا کیا تھا تو نے گڈی پڑھنے سے انکار کر کے۔ آج تو بھی اس کرب سے گزرتی جس سے میں گزر رہی ہوں۔ کہ لگتا ہے حق و وق صحرا میں تنہا کھڑی ہوں۔ چاروں طرف گرم ریت کے گبولے اُڑ رہے ہیں۔ اور میرے پیروں میں چھالے پڑ چکے ہیں۔

اپنی زندگی کے اہم اور بڑے فیصلے خود کرنا۔۔۔ خود کو داؤ پر لگا دینا۔ بغیر کسی کے مشورے کے۔ وہ مجھ جیسی خود لڑکیاں ہی تو ہوتی ہیں نا۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ میں تم سب سے مل بھی پاؤں گی یا نہیں۔۔۔ ویسے گڈی! آصف کا نچو اتنا اچھا اور اس قدر پیارا سا بندہ ہے نا کہ وہ مجھے کبھی بھی نہیں منع کرے گا

کہ میں اپنیوں میں نہ جاؤں۔

قطع تعلق تو میں نے خود کیا ہے۔ اس میں کسی کا کیا دوش؟ خدا کرے کہیں میرے جیسی لڑکی پیدا نہ ہو۔۔۔ اور۔۔۔ آنسوؤں کا چھند اس کے حلق میں پھنس گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا چیخ کر روئے۔

آنسوؤں میں اپنی ہنسی بہا ڈالے اور پھر۔۔۔ پھر سے وہی تین سال پہلے والی عفریہ بن جائے۔ معصوم۔۔۔ بھولی سی۔۔۔ دو قسم کی لڑکی۔

مگر اس نے تو واپسی کا کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا۔ اب وہ وہی بننا چاہتی تھی پرین نہ سکتی تھی۔۔۔ کہ آصف کا جو کچھ بھی وہ بولدی منہ پھٹ عفریہ بھاتی تھی۔ جب کہ وہاں کی کبھی یہی پسند تھی۔ پھر۔۔۔ پھر میں کیا کروں۔۔۔؟

یا خدا مجھے راستہ دکھا۔ میری راہنمائی کر۔۔۔ میں گرداب میں پھنسی ہوں۔ میرے سونے رب مجھے نکال اس پھنور سے۔۔۔ مجھے صبح فوت فیصلہ کا حوصلہ اور ہمت دے اور جو میرے لیے بہتر ہے وہ کر۔۔۔ جو بہتر نہیں وہ نہ کر۔ میں بہت دکھی ہوں۔

میرے رحمان۔ میرے رحیم! تو جانتا ہے۔ سب کچھ بتائے کہ تو اپنے بندوں کی شرک سے بھی قریب ہے۔ پھر میرے اندر کی خبر تجھے نہ ہو تو کسے ہوگی؟ مجھے سیدھی راہ برچلا۔

میں تھک گئی ہوں اللہ میاں جی۔ میری بوٹی بوٹی زخمی ہے۔ میری جھٹکن کے کانٹے نکال دے۔ پھرے وجود سے کہ تو رحیم ہے۔ کریم ہے۔

عفریہ تیکے میں منہ دیے سکتی رہی۔ اور خدائے پاک کے حضور دعائیں کرتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا رب اس کے بہت ہی قریب آ گیا ہو۔

بھی تو ترپتا مچلتا دل ایک دم ہی پرسکون ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

رات کا پچھلا پہر تھا اور وہاں ایک دم سرد ہو گئی تھیں۔ اسجد ملک کو نیند نہ آرہی تھی کہ اسے لگتا تھا پسند اس سے روٹھ چکی ہو۔ اس نے اٹھ کر کھڑکیوں سے پردے سمیٹ دیے۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ چند گھنٹے پیشتر ہی تو اہل لاہور نے پورے جوش و خروش سے بسنت کا تہوار منایا تھا۔ اور اب سوئے ہوئے تھے۔ چند گھنٹے قبل آسمان پر رنگ برنگی پتنگوں نے گوریوں کے رنگین آنکھوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔

کوئی نہایت ایسی نہ تھی جہاں پر سے گڈی نہ اڑاتی جارہی ہو۔ وہ بھی کتنی دیر تک پُرشوق نظروں سے آسمان پر اُڑتے ان رنگ برنگے کاغذ کے پرندوں کو تکتا رہا تھا۔ کہ یہ منظر اس نے برسوں بعد دیکھا تھا۔ بھلا جرمی میں ایسے مناظر کب تھے؟ اپنے دیس کی تو ہر بات ہی پیاری ہے۔

یہ دیس جہاں رسموں رواجوں کی اپنی خوبصورتی ہے۔ یہاں مٹی کی اپنی مہک ہے۔ تھل کا علاقہ بھی ہے جہاں ریت ہی ریت ہے اور اس ریتلے ٹپوں میں کھلا ایک پھول۔

”مہربانیاں۔۔۔ مہربانیاں۔“ اسجد ملک کے دل کے کشکول میں یہ نام سکے کی طرح بجاتا تھا۔ اور اس کی روح تک معطر ہو کر رہ گئی تھی۔

”ملک تم چلے جاؤ بس جلدی فوراً ہی۔“

اجد کے کانوں میں تاباں کا گھبراہٹا ہوا لہجہ اتر گیا۔ اس سے وہ کس قدر معصوم لگ رہی تھی۔ اجد اس کی بات مان کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ اسے دکھ ضرور ہوا تھا کہ تاباں نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔

پر یہ اس کا حق بھی تھا اور خوبی بھی۔ اجد نے اس بات کو پسند کیا تھا۔ کہ وہ روایات پرست لڑکا تھا۔ اسے تاباں کی مجبوری کا احساس تھا۔ دوسرے ہی روز اسے لاہور آنا پڑ گیا تھا۔ کہ خصوصی طور پر اس کا بہنوئی حمید اسے لینے آ گیا تھا۔

کیونکہ ایک دم ہی غاشیہ کی شادی کی تاریخ ٹھہر گئی تھی۔ اس نے بہت چاہا تھا کہ حمید لوٹ جائے اور وہ خود ہی آ جائے گا۔ پر حمید اسے ساتھ لے کر ہی ملا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تھا تاباں کو اطلاع دے کر جائے۔

وہ معصوم لڑکی کس قدر پریشان ہوگی۔ تمام راستہ وہ یہی سوچتا آیا تھا۔

بار بار تاباں کی ہنسی آنکھیں اس کے تصور میں آ جاتی تھیں۔ اور وہ تڑپ کر رہ جاتا۔

غاشیہ کے شادی کی مصروفیت کے دوران بھی اسے تاباں یاد آتی تھی اور بے حد یاد آتی۔ پردہ کیا کر سکتا تھا۔ اب کل ہی غاشیہ رانچ کے ہمراہ کراچی گئی تھی اور وہ واپس کھسکنا چاہتا تھا پر زہرہ جیوں کے پُر زور اصرار پر وہ مزید دو روز رک گیا تھا۔

ماں کا دل وہ نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ پر اپنے دل میں بیٹھی روتی کھستی تاباں کا خیال اسے افسردہ ضرور کر دیتا تھا جیسے اس کی ساری خوشیاں تاباں کے دم سے ہوں۔

ہاں۔ ہاں تاباں۔ میں تم بن نہیں رہ سکتا۔

یہ میں اپنے ایمان کی سچائی سے کہتا ہوں۔

اپنے دل کے سارے جذبات کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں تیرے بغیر سانس لینے کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ یہ گیارہ روز جو گزرے ہیں تجھ بن مجھے لگتا ہے گیارہ صدیاں گزر گئی ہیں۔

میں سوئی۔ میری منگی میں بہت جلد آؤں گا۔ پہلے تیرے قدموں میں آ کر حاضری دوں گا۔ اپنے دل کی ساری وارداتوں سے تجھے باخبر کر دوں گا۔ جب تجھے احساس ہوگا کہ میں تجھے کس قدر چاہتا ہوں۔ تو تو اعتباری نہیں کرنی۔

پتا نہیں کیوں بے اعتباریوں کے موسم میں رہتی ہے ثواب میں ملوں گا تو پوچھوں گا تجھ سے کہ تیری بے اعتباری کس قدر میرے دل میں چھید کر دیتی ہے۔ میں پھر بھی برداشت کرتا ہوں کہ چاہتا ہوں تجھے۔

گیارہ روز سے تجھے نہیں دیکھا تو پتا چلا ہے کہ تُو میرے لیے کیا ہے۔

میری آنکھیں پیاسی ہیں۔؟ تیرے دیدار کا شربت پی کر ہی ان کی پیاس مٹے گی۔

میری اداسی بھی تب ہی مٹے گی۔ تاباں مجھے لگتا ہے میرے ہونٹ مسکراتا بھول گئے ہیں۔

تو کیا ہے تاباں؟

ٹھنڈے پیٹھے پانی کا سرچشمہ

یا پھر بیاری بہتی ہوئی خاموش روائِ ندی۔

محبت انسان کو کیا سے کیا کر دیتی ہے۔ ظفر ماموں ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔۔

”محبت ایک بار کھو جائے تو اس کے کھو جانے کا نام کرنے کے بجائے اسے تلاش کرنا چاہیے کہ

محبت کھونے کی چیز نہیں۔ یہ تو مانے کی چیز ہے۔“

اجد کو ان کی باتیں تب سمجھ نہ آئی تھیں کہ اس نے محبت کی سہ کر محبت تو پکھا ہی نہ تھا۔ وہ ہنسا کرتا تھا ظفر عالم کی باتوں پر اور وہ کہتے تھے۔

”خدا کرے تجھے محبت نہ ہوگی سے۔“

”کیوں آپ یہ بدعادیتے ہیں۔“ اجد ہنستا۔

”جانو۔۔ یہ بدعادتیں۔“ ظفر عالم محبت سے کہتے۔

”یہ بدعادتیں۔“ وہ اپنی بات پر ڈٹا رہتا۔

”بدعادتو وہ ہوتی ہے کہ میں کہتا نہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے۔ محبت دکھ ہی دکھ ہے اجد۔ یہ انسان کو کھانا جانی ہے کھوکھلا کر دیتی ہے۔“

”میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ عدیرہ تو بہت چھوٹی تھی جب تم ہوئی تھی۔ پھر اس سے آپ کو یہ طوفانی قسم کی محبت کیسے ہو گئی تھی۔؟“

”میں نے اس کے تصور سے محبت کی تھی۔“

وہ مجھے بہت پیاری تھی اجد۔ وہ میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ لڑتی جھگڑتی تھی۔ حالانکہ میں اس سے پورے پانچ برس بڑا تھا۔ پردہ مجھے اس طرح ٹریٹ کرتی جیسے میں اس کا ہم عمر ہوں۔ جب میری اور اس کی جھگڑنا ہوتی تھی تو تم دیکھتے۔ اس کا وہ روپ میں نہیں بھلا پایا۔ مٹی سی دہن۔ بالکل شہزادی لگ رہی تھی۔

اور۔۔ پھر صرف چھ ماہ بعد ہی وہ کھو گئی تھی۔

”محبت کی جڑیں بہت ہی گہری ہوتی ہیں۔ یہ دل کی سرزمین میں کھب کر رہ جاتی ہیں۔ اور ابتدا ہی میں جس قدر یہ گہری ہوں گی اسی قدر محبت بڑھے گی۔ عدیرہ کے کھو جانے کے باوجود بھی میں اسے چاہتا رہا۔ جوں جوں وقت بڑھتا رہا اس کا تصور بھی میرے ذہن میں بڑھتا رہا۔ میں نے برسوں بعد اپنے ذہن کے خیال کے زور پر اسے بہت بڑا دیکھا بہت ہی حسین۔

پھر بتاؤ بھلا میں اسے کیسے نہ چاہوں۔ کیوں نہ تلاشوں کہ میری جب تک سانس ہے میں اسے تلاشوں گا۔ یہ میرا عہد ہے خود سے۔ اس خاموش محبت سے جو مجھے اندر اندر ہی سلگاتی ہے۔ میں اپنی تلاش ختم نہیں کر سکتا۔

ظفر عالم کا مصمم ارادہ دیکھ کر اجد نے پھر کبھی نہ کہا تھا کہ وہ عدیرہ کو بھول جائیں۔

جب بھی ظفر عالم تھا ہوتا ضرور اجد ملک سے عدیرہ کی باتیں کرتے۔ حتیٰ کہ اجد پور ہو جاتا اور اس ذکر سے دوپور نہ ہوتے تھے۔ لگتا تھا ان کا یہی ایک کام ہے۔ عدیرہ کے ذکر سے انہیں نہ جانے کیسے تقویت ملتی تھی۔ کبھی کبھی اجد کہتا تھا۔

”ماما۔ آپ ایک ہی تصور سے گھبراتے نہیں۔؟“

”تم محبت کرو گے تو پتا چلے گا کہ ایک ہی تصور میں بندہ رہے تب بھی دل نہیں بھرتا۔“ اور اجد ہنس دیتا۔

اب اسے پتا چلا تھا کہ محبت کس قدر زور آور جذبہ ہے۔ جسے دبوچتا ہے تو پھر اپنی بھی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ یہ تو وہ جذبہ ہے جو ماموں میں اترنا چلا جاتا ہے۔

محبت ایسا کنواں ہے جس میں کوئی ایک بار اتر جائے تو پھر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔

بغیر دروازوں والے گھر میں جانا کس قدر اچھا لگتا ہے اس کا احساس اب اجد کو ہوا تھا۔ وہ بھی تو

بغیر دروازے والے گھر میں اتر اتر جوتا باں کا دل تھا اور اس میں اتر کر وہ بہت خوش تھا۔

اسے لگتا جیسے یہی اس کا مقام ہو۔ یہی رہائش کی اعلیٰ ترین جگہ۔

وہ جلد از جلد تا باں کے پاس جا کر اسے اپنے دل کی وارداتوں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔

کھٹکے پر وہ ایک دم ہی چونکا۔ پلٹ کر دیکھا تو سامنے ہی آسیہ بیگم کھڑی تھیں۔ نہایت شار ہوتی

نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”تم اب تک جاگ رہے ہو یا ابھی اٹھے ہو؟“

”بس دادو خبر نہیں ہے مجھے۔“ اسجد مسکرایا اور آگے بڑھا۔

”خبر نہیں۔“ آسیہ بیگم بڑبڑائیں۔

”آپ کیوں آئی ہیں یہاں۔“ اسجد نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”نماز پڑھ کر میں باہر آئی تو تمہارے کمرے میں جتنی جلتی دیکھ کر آگئی کہ تم ہو تو بے پروا سے سوچا

شاید سوئے ہوئے ہواؤ لائٹ بند کرنا بھول گئے ہو۔“

”ایسی حالت بھی نہیں ہوئی ابھی۔“ اسجد انہیں کندھوں سے تھام کر صوفے تک لایا اور انہیں بٹھا کر

نیچے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اپنا گال ان کے گھٹنے سے ٹکاتے ہوئے بولا۔

”دادو! یہ کبھی بھی دل بے حد اداس کیوں ہوتا ہے؟“

”غناشہ کے جانے سے گھر سونا ہو گیا ہے۔ زہرہ بھی بہت اداس ہے لیکن بنیادھیاں تو ہوتی ہی پرایا

دھن میں نا۔ کب بیٹیاں سدا والدین کے ہاں رہتی ہیں۔“

”میں غناشہ کی وجہ سے اداس نہیں ہوں۔“ اسجد نے سر اٹھا کر دادی کی طرف دیکھا۔

”پھر؟“ آسیہ بیگم کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی اور پھر دوسرے لمحے ہی ان کی آنکھوں میں

چمک سی پیدا ہوئی۔ ”میں سمجھ گئی۔“

”کیا؟“ اسجد نے لہک کر پوچھا۔

”یہی کہ تجھے تنہائی اداس کر رہی ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

”نہیں دادو۔ یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”مجھ بتاؤں؟“ اسجد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”مجھے یقین ہے تُو مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گا۔“ وہ یقین سے بولیں۔

”اتنا اعتماد۔۔۔“ اسجد نے کہا۔

”بالکل۔“ انہوں نے کہا۔

”دادو۔ آپ میری بزرگ ہیں۔ میری دوست بھی تو ہیں نا۔۔۔“

”ہاں ہوں۔۔۔“ وہ سر ہلا کر بولیں۔

”پتا ہے آج میں غفلت ماموں کی کی شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔“ اسجد نے بتایا۔

”وہ کیوں؟“ آسیہ بیگم نے پوچھا۔

”میرا جی چاہ رہا ہے وہ آئیں اور میں انہیں بتاؤں کہ وہ جو کچھ کہتے تھے سچ تھا اور میں جو سمجھتا تھا وہ

بالکل جھوٹ۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”دادو۔ میں انہیں چھیڑتا تھا کہ وہ کیوں عدیرہ جیسے سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ تب وہ کہتے

تھے خدا کرے کہ تجھے کسی سے محبت نہ ہو۔“ اسجد نے سر ان کی گود میں رکھ لیا۔

”مگر تمہیں محبت ہو گئی ہے۔“

”ارے آپ کو کیسے پتا۔؟“ بے ساختہ ہی اسجد نے سر اٹھا کر کہا۔ تب اس کی نظریں آسیہ بیگم کی

مسکراتی آنکھوں سے ٹکرائیں تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

”مجھے پتا نہیں تھا۔ اب پتا چل گیا ہے۔“

”کیسے؟“ اسجد جانتا چاہتا تھا۔

”یہ راتوں کو جاگنا۔ دل کا احساس ہونا۔ یہ ساری کڑیاں ہیں اس زنجیر کی جسے محبت کہتے ہیں۔“ وہ

نہایت بے تکلفی سے بولیں تو اسجد کو شرم سی آگئی۔

”کون ہے وہ؟“ وہ اسجد کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

”دادو۔ وہ صحرائیں کھلا پھول ہے۔ بہت ہی خوشنما پھول مجھے وہ بے حد پیاری ہے دادو۔ اس

بے دور ہوں نا تو میرا دل اداس ہے۔ میں اداس ہوں۔ لگتا ہے پوری کائنات اداس ہے۔ دادو کچھ کہہ رہا

ہوں نا میں۔۔۔“

”ہاں کچھ کہہ رہے ہو۔ تم واقعی اس کو دل سے چاہتے ہو۔“

”محبت خود ایک سچائی ہے دادو۔ اور میں اس سچائی کا پیالہ منہ سے لگائے ہوئے ہوں۔ آپ میرا

ساتھ دیں گی؟“ اسجد نے نہایت آس سے پوچھا

”کیسا سا تھ؟“ ان کا ہاتھ اس کے بالوں میں چلتا ہوا رک گیا۔

”آپ میرے ساتھ چلیں گی چولستان۔“

”میں؟“ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”جی آپ۔ آپ کو پتا چلے گا کہ میرے دل کا سکون اس سر کندوں والی چھت کے مکان میں موجود

ہے۔ مجھے ”اُس جیسا ٹوٹی نہیں دکھتا۔“

گھر والوں سے مشورہ کیا ہے؟“

”کیا ضرورت تھی دادو۔ مجھے پتا ہے آپ کا ووٹ جس طرف ہو گا وہی جیتے گا اور آپ کا ووٹ

میری طرف ہونا چاہیے۔“ اسجد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”یہ زیادتی ہے۔“

”کیوں بھلا؟“

”میں اُس لڑکی کو دیکھے بغیر کس طرح تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔“ آسیہ بیگم نے مصنوعی ترشی سے

کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتا بس آپ نے میرا ساتھ دینا ہے آپ اُسے میری نظر سے دیکھیں تو آپ کو پتا

چلے گا کہ وہ میرے لیے کیا ہے۔“

”کیوں ہے؟“

”یہ مجھے بھی نہیں پتا کہ وہ کیسے اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ میرے دل کی میکیں بن گئی یقین

کر دو! میں تو اس محبت جیسی خرافات میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ آپ اُسے دیکھیں تو آپ کو لگے گا

مجھے وہ جتنی ہی میرے لیے ہے۔“

”واقعی! ہمسکرائیں۔“
 ”ہوں اس قدر اچھی ہے کہ کہیں سے بھی دیہاتی تو لگتی نہیں بے حد سیانی ہے۔“ اسجد تاباں کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور آسیہ بیگم نہایت پرشوق نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔
 کس قدر جذب کے عالم میں وہ تاباں کا ذکر کر رہا تھا۔ اُسے ہوش ہی نہ تھا۔
 آسیہ بیگم نے بے اختیار اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر گلے لگا لیا۔
 ”تو جو چاہتا ہے ویسے ہی ہوگا۔ بالکل اُسی طرح۔ میرا دوش تیرے ساتھ ہے۔“
 ”پھر آپ میرے ساتھ چلیں گی نا؟“
 ”تو بات کر لے اُس کے گھر والوں سے۔“ انہوں نے کہا۔
 ”آپ اُسے دیکھ تو لیں۔“ اسجد بولا۔
 ”میں نے اُسے دیکھ لیا ہے۔“
 ”کب؟“ اُس نے پوچھا۔
 ”تیرے لہجے میں تیری آنکھوں“ تیرے لفظوں میں اب بھلا دیکھنے کی کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔“
 وہ پیار سے بولیں۔
 ”میری سوئیٹ دادو۔“ اسجد نے آسیہ بیگم کے گلے میں بازو جمائل کر دیے۔
 ”امی اور اپا جان سے بات تو آپ کریں گی نا؟“
 ”بالکل!“ آسیہ بیگم نے کہا۔
 ”وہ نہ مانے پھر۔“
 ”کیوں نہیں مانیں گے۔“
 ”فرض کریں انہیں تاباں پسند نہ آئے۔“ اسجد بولا۔
 ”کیوں پسند نہ آئے؟“
 ”میں یہ بتا دوں کہ وہ پڑھی لکھی نہیں ہے۔“
 ”پھر کیا ہوا؟“
 ”میری خامی کہیں انہیں کھٹکتی نا؟“
 ”تمہاری ماں کون سی پڑھی لکھی تھی آخر تمہارے باپ نے گزارا کر لیا نا؟“
 ”بس انہیں منانا آپ کا کام ہے۔“ اسجد نے کہا۔
 ”تم فکر نہ کرو۔ بس یہ خیال رہے کہ تم ہی بہک نہ جاؤ۔“ آسیہ بیگم نے کہا۔
 ”میں کیوں بہکوں گا بھلا؟“ اسجد نے پوچھا۔
 ”مردوں کا کیا اعتبار۔“ وہ بولیں۔
 ”میں اُن مردوں میں سے نہیں ہوں دادو۔ جو لباس کی طرح عورت بدلتے ہیں۔“ اسجد اُن کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میری محبت کا اگر میں فلٹ ہو تا تو اب تک کتنے ہے عکس میرے دل کی دیواروں پر جھللا رہے ہوتے، میں ہوں سچا اور کھرا بندہ۔“
 ”پتا ہے مجھے۔“ انہوں نے کہا۔
 ”بس“ فتح میں چلا جاؤں گا اور آپ گھر میں بات کر لیجیے گا۔“ اسجد نے بتایا۔
 ”تم پہلے اُسکے والدین سے تو بات کرو۔“

”یہ بزرگوں کا کام ہے۔“
 ”اگر اُس کے والدین نہ مانے پھر؟“
 ”کیسے نہ مانیں گے کوئی خامی ہے مجھ میں۔“
 ”تو تو لا کھوں میں ایک ہے؟“
 ”یہ بات انہیں بھی کہہ دینا۔“ اسجد نے شرارت سے کہا تو آسیہ بیگم ہنس دیں اُن کی ہنسی میں اسجد کا قبضہ بھی شامل تھا۔

☆☆☆

”خدا خیر کرے آج کل پتا نہیں کیوں مجھے عفیہ بہت یاد آ رہی ہے۔“ سلیمہ نے امیر بخش کے پیروں پر باتے ہوئے گلو گیر آواز میں کہا۔ تو امیر بخش کچھ بھی نہ بولا۔
 ”تجھے عفو یا نہیں آتی عفو کے بابا۔“
 ”یاد۔“ امیر بخش نے طویل سانس لے کر ٹانگیں سیٹھ لیں۔ ”نیک بخت یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو بھلائے جا کے ہوں کون سا وقت ہے جب وہ مجھے یاد نہیں آتی، مجھے تو لگتا ہے ہر وقت وہ میرے ساتھ ہے بہت ہی قریب۔“
 ”ایک داری تو پھر جاتو۔“ سلیمہ نے کہا۔
 ”کہاں؟“ امیر بخش نے پوچھا۔
 ”اُسے لینے۔“ سلیمہ بولی۔
 ”کب آئی ہے وہ؟“ تجھے تو پتا ہے وہ کتنی ضدی ہے وہ تو اپنے مامے کے پیچھے ہم سب کو چھوڑے بیٹھی ہے پتا نہیں وہ بچتا بھی ہے کہ۔“
 ”خدا سے خیر منگ عفو کے بابا۔“ سلیمہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا، اُسے لگا تھا جیسے کسی نے اُس کے دل میں نشتر چھو دیا ہو۔ اُسے آس تو تھی کہ شیر محمد جی جائے گا۔
 ”جبکہ چوہدری مراد حسین کے بھائیوں کی حتی الوسع کوشش تھی کہ وہ پھانسی چڑھ جائے شاید انہیں کچھ خطرہ تھا، لیکن خطرہ کیوں محسوس کرتے تھے وہ۔“ سلیمہ بارہا سوچتی۔ شیر محمد تو زبان نہیں کھولتا۔
 ”کچھ بتاتا نہیں۔“
 ”پھر چوہدری کیوں ڈرتے ہیں یہی گتھی اُس سے کسی صورت بھی نہ سلجھتی تھی۔“
 ”تم ایک بار تو پھر جاؤ۔“ سلیمہ کی یہی رٹ تھی۔
 ”عفو کو لینے۔“ امیر بخش نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ سلیمہ نے کہا۔
 ”وہ بہت بدل گئی ہے۔“ امیر بخش نے بتایا۔
 ”کیسے بھلا؟“
 ”تو اُسے دیکھئے تا تو پتا چلے کہ وہ تین سال پہلے والی معصوم سی عفو تو رہی ہی نہیں۔“
 ”کیا ہو گیا ہے اُسے؟“ وہ جانتا چاہتی تھی۔
 ”بہت اکھڑا۔ اُن من ہو گئی ہے مردوں جیسے پکڑے پہنتی ہے۔“ امیر بخش نے کہا۔
 ”کیا کہہ رہے ہو؟“ سلیمہ حیرت سے بولی۔
 ”ہاں عفو کی ماں وہ تو کسی طور تیری دہی لگتی ہی نہیں، گلے میں دوپٹہ بھی برائے نام ہی لیتی ہے۔“

”یہ تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“
”تو کیا کر لیتی؟“

”ہائے تو نے اُسے منع بھی نہیں کیا۔“

میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا وہ تو اپنے مامے کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی حالانکہ اُسے بگاڑنے میں شیر محمد کا ہاتھ ہے سو فیصد۔“

”یہ تو ہے۔“ سلیمہ نے سر ہلایا۔

”مجھے دکھ تو یہ ہے کہ ہم اُسے نہ پڑھنے دیتے تو اچھا تھا۔ نہ اُسے تعلیم دلاتے نہ اُس کی اکھاں مٹھکتیں شہر میں بہت روشنیاں ہوتی ہیں وہ وہیانی لڑکی دے کی روشنی میں رہنے والی۔ ایسی مدھم روشنی جس سے چہرے بھی واضح نظر نہیں آتے۔ وہ شہر کی چکا چوند میں تو سارے رشتوں کو بھلا بیٹھی بھلا کوئی اس طرح بھی کرتا ہے پھر بھی وہ مری نہیں لگتی ہر وقت ہاں (دل) پر چڑھی رہتی ہے۔“

”دھیاں بھلائی کی چیز تو نہیں ہوتیں نا؟“ سلیمہ نے آہ بھر کر کہا۔

”کاش وہ صبر نہ کر لیتی۔ ہمارے پاس کچھ چین سے رہتی ابی غیروں میں اکیلی رہتی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے اُس کی جوان جہاں ہے پتیاں کیسے رہتی ہوگی۔“ سلیمہ آہ بھرتے ہوئے بولی۔

”رہتی تو وہ ہاسٹل میں ہے ساری لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں پر۔“ امیر بخش نے بتایا۔

”تو مجھے ایک واری لے چل وہاں۔“ سلیمہ نے التجا کی۔

”نہ۔ میں کیوں لے جاؤں تجھے ہمارے گاؤں کی عورتیں کبھی شہر گئی ہیں۔“ امیر بخش چمک کر بولا۔

”میں تو اپنی بیٹی کو ملنے جاؤں گی۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ امیر بخش تنک کر بولا۔

”میں اُسے لے آؤں گی۔“ سلیمہ نے کہا۔

”اگر اُس نے آنا ہوتا تو میرے ساتھ آ جاتی جو عزت ہے وہ تو رہنے دے کیا وہ بھی گوانا چاہتی ہے تو۔“ امیر بخش کا لبہ سخت تھا۔

”خدا نہ کرے کہ میں ایسا سوچوں بھی۔“

”ہم غریب ضرور ہیں پر تیرے بھائی کی طرح بے غیرت نہیں میں نے کہا تھا چوہدری کی یاری چھوڑ دے پر اُس کے تو کان پر جو بھی نہ رہتی تھی پھنسا ہے نا۔ خود تو برباد ہوا ہمیں بھی لے ڈوبا۔ کیا بگاڑا تھا ہم نے اُس کا جو ہماری بیٹی کا ستیاناس کر ڈالا۔ قسم سے سلیمہ ہو لے تیرا بھائی رہا ایک واری آ جائے جیل سے میں نے اُس کے لہو سے ہاتھ نہ رنگے تو میرا نام امیر بخش نہیں۔“ وہ پیش میں تھا۔

”تو اس کا کیا دوش؟ سلیمہ نے کہا۔

”ابھی دوش ہی نہیں عقیقہ کو اسی کی شے نہ تو اتنا ضدی کیا۔“ امیر بخش غڑایا۔

”وہ شروع ہی سے ایسی تھی۔“

”وہ ایسی نہیں تھی اُسے بگاڑا ہے اُس نے تو مان یا نہ مان آخر گڈی بھی تو ہے۔“

”گڈی کی بات اور ہے۔“ سلیمہ نے کہا۔

”نہ وہ لڑکی نہیں۔“ امیر بخش چمک کر بولا۔

”کیوں نہیں۔ پرتو میرے پیچھے کیوں پڑا ہے کیا تیرا اور میرا دکھ الگ ہے عفو کے آبا تو سمجھتا نہیں کیا مجھے غم نہیں ہے۔“ سلیمہ رونے لگی تو امیر بخش کچھ نرم پڑ گیا۔

”تجھے کیا خبر کہ میں کیسے چیکے چیکے آنسو بہاتی ہوں روتی ہوں عقیقہ کی قسمت کو۔“

”روائے بھائی کی قسمت تو امیر بخش چمک کر بولا۔“

”اُسے تو روٹھنی اُسے اپنی کرنی ملی ہے پر عقیقہ کو کس بات کی سزا مل رہی ہے وہ کیوں غیروں میں

روی ہے اوپر سے شہر میں کوئی کچن بھی نہیں عقیقہ کے اپنا اپنی عقیقہ کو بارش میں بہت ڈر لگتا تھا مینہ میں وہ

مے کیجے سے لگ کر سوتی تھی آج کل پھر بارشوں کا زور ہے اب اُسے ڈر لگتا ہوگا تو وہ کیا کرتی

ہوگی؟“

”یہی تو میں سوچتا ہوں۔“ امیر بخش نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اُس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

”خدا کرے وہ جہاں رہے سسکی رہے تو یہی دعا کیا کر۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ تو سلیمہ نے

ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر حلق سے نکلنے والی چیخ کو روکا۔ ان دونوں میاں بیوی کا دکھ تو مشترک تھا۔ لوگ

خوشیاں بانٹتے ہیں اور وہ دونوں دکھ بانٹ رہے تھے کہ شاید یہی اُن کا نصیب تھا۔

☆☆☆

عقیقہ کو لگا جیسے کہ اُس کے ارد گرد دھماکے سے ہونے لگے ہوں نہایت غیر یقینی انداز میں اُس

نے زوہیب کو دیکھا تھا۔

”کہہ دو زیو یہ جھوٹ ہے۔“

”یہ سچ ہے عفو بیاری۔ ہم، ہم ہا سٹل جا رہے ہیں کہ۔“

”جھوٹ ہے یہ بولو تم۔“ عقیقہ نے زوہیب کا گریبان دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ اور ہڈیاں

انداز میں بولی۔

”کہو یہ غلط ہے۔“

”تم نہیں کہو گے کہ یہ جھوٹ ہے۔“ وہ غڑائی۔

”تم کہا تھا شایانے پر تلی ہوئی عقیقہ۔ سویت دوست یہ سچ ہے۔“ زوہیب نے کہا۔

”وہ بالکل صحیح تھا کل تک۔“ عقیقہ نے بتایا۔

”کل اور آج میں پوری ایک شام اور رات گزری ہے اور اتنے گھنٹوں میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”وہ بھلا چکا مجھے ہاسٹل چھوڑ کر آیا تھا ہم نے سوکس میں بروسٹ پھٹکی کھائی تھی اور۔ اور عقیقہ کی

آواز بھرانے لگی۔ اُس کی گرفت بھی زوہیب کے گریبان پر ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹنے آ رہی تھی

کہہ رہی تھی۔

”وہ مجھے کہہ رہا تھا سوچ لو اچھی طرح میں کل جواب لوں گا اور بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے میں

نے بھی تو رات رب تعالیٰ سے دعا کی تھی جو میرے حق میں بہتر ہے وہ کر تو کیا یہ میرے حق میں بہتر تھا۔“

”نہیں زیو یہ اللہ میاں نے نا انصافی کی ہے یہ نہیں ہے بہتر ہاں یہ بہتر نہیں ہے۔ میں نے تو

نہائی سچائی سے یہ تمنا کی تھی کہ۔“

”تم کیا بنایاں یک رہی ہو۔ تمہارا دماغ تو صحیح ہے نا؟“ زوہیب کو اُس کی دماغی حالت پر شبہ تھا۔

”شاید میرا دماغ خراب ہے۔“ اُس کی کانپتی ہوئی ہیکلی ہیکلی آواز ابھری۔

”رہ خدا کو میرے ساتھ انصاف کرنا ہوگا سن رہے ہوتا تم؟“ وہ بے بس ہو کر چلائی۔

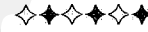
”پتلی ہو تم۔ خدا کبھی بھی بے انصافی نہیں کرتا۔“ زوہیب نے اُسے سمجھانا چاہا۔

”مگر میرے معاملے میں تو۔“ اُس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

”وہ آہستگی سے مسکرایا۔ ٹیک اٹا ایزی عفریہ۔“
 عفریہ کے چہرے پر پھیلے عجیب سے سوز نے اُسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔
 ”تم چلو گی پیاری دوست۔“

”کہاں؟“ وہ بے خیالی میں بولی۔

”آصف کو دیکھنے پتا نہیں وہ اتنی سویرے کہاں جا رہا تھا آج دھند بھی تو بہت تھی لگتا تھا زمین اور آسمان کے درمیان سفیج چادر تھی ہوئی ہے ہمیں بھی اُس نے نہیں بتایا اور باتیک لے کر نکل گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ مچھلیاں ہسپتال کے ڈاکٹر ذکا و فرحت کو جانتے ہیں اور انہوں نے اُسے فون کر کے بلا لیا اور ہمیں اطلاع مل گئی ورنہ ہم تلاشتے پھرتے۔“
 شکر ہے جان بچ گئی زبردست ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔“ زوہیب بتا رہا تھا اور عفریہ کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔



”چل رہی ہونا ہسپتال۔“ زوہیب نے پوچھا۔
 ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ عفریہ کی کانپتی ہوئی ہانگی پھیلی سی آواز ابھری۔
 ”ہاں تم۔۔۔“ زوہیب بولا۔
 ”شاید میں نہ جاسکوں۔۔۔“ وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔
 ”کیوں بھلا۔۔۔؟“

”میں کیسے وہ چمکتی آنکھیں دیکھوں جو مجھے دیکھتے ہی مشعلوں کی طرح جل اٹھتی تھیں اب۔ اب تو انکھیں موندے لیٹا ہوگا۔“ وہ خواب کے سے عالم میں بول رہی تھی۔
 ”یہ تبدیلی کیسی عفو۔“ زوہیب حیران تھا۔
 ”میں انسان ہوں۔“ عفریہ نے کہا۔
 ”وہ تو مجھے علم ہے۔“

”زوہیب۔ تمہیں پتا نہیں کہ۔“ عفریہ نے ایک ہی اوپری ہونٹ کا گوشہ دانتوں تلے دبایا۔
 ”مجھے یقین ہے تیری محبت اُسے زندہ کر دے گی۔“ زوہیب نے آہستہ سے کہا تو عفریہ کو لگا۔ اُس بجا ہی گھوم گیا ہو۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو زیو۔“
 ”جو تمہارے دل میں ہے۔“ وہ بولا۔
 ”میرے دل میں کیا ہے؟“ عفریہ نے پوچھا۔
 ”جو تم مجھ سے چھپانا چاہتی ہو۔“

”تم غلط نہ سمجھو۔“ عفریہ کا لہجہ دھیمہ تھا۔ ”مجھے دکھ تو یہ ہے کہ آصف ہمارا بہت اچھا دوست ہے قلم دوست کے لیے میری وحشت فطری تھی۔ اپنے ذہن کو صاف رکھو زیو میں چٹان ہوں۔ معلوم نہیں۔“

”مجھے تم دلیلوں سے بہلا لو مگر۔“
 ”مگر کیا۔؟“ عفریہ جاننا چاہتی تھی۔

”خود کو بھی دلیلوں سے بہلا سکو گی؟“

”پلیز چیچ دس ٹاپک“، ”عفیرہ چلائی۔“

”خیر چلنا۔ تو چلو میرے ساتھ۔“ اُس نے کہا۔

”میں بھر پسی ماؤں کی تم مجھے میرے آفس چھوڑتے جاؤ۔ راستے ہی میں تو ہے نا۔“ وہ خود کو نارمل رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھی دل کی وحشت کو وہ کی طور بھی چہرے سے ظاہر نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ حالانکہ اُس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

ہائے یہ انسان کا بھرم۔

انا خود داری۔

اپنا بھرم رکھنا کتنا مشکل ہے۔ تو اُسے آج محسوس ہوا تھا۔ وقار بلند کرنا۔ چاہے دل دو ٹکڑے ہو جائے۔ روح بار بار سولی چڑھ جائے۔ مگر بھرم کی چادر کھلے ہاتھ سے نہیں جانے دینا۔

زوہیب پارک سے اپنی بائیک نکال لایا اور کم صم سی عفیرہ کے قریب روکی۔ عفیرہ نے اپنی بے تحاشا اُداس نظروں سے اُسے دیکھا تو زوہیب کا کلیہ کانپ کر رہ گیا۔

”تو نہیں جانا چاہتی تو نہ ہی کوئی زبردستی نہیں ہے نا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”تم مجھے ہاسٹل چھوڑ دو گے؟“

”وائے ناٹ۔ مگر ابھی تو تم آفس جانا چاہ رہی تھیں۔“

زوہیب نے والیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”مجھے خود بخود نہیں کہ میں کہاں جانا چاہ رہی ہوں“ عفیرہ نے دل ہی دل میں کہا۔ مگر زوہیب سے کچھ نہ بولی اور آہستہ سے اُس کے پیچھے پیڑھٹی۔ زوہیب نے لک لگا کر بائیک آگے بڑھائی تو عفیرہ کا

دل چاہا کہ وہ زوہیب کے کندھے پر پیشانی ٹکا دے اور ایک ایک پلک سے ہزار ہزار آنسو بہائے۔ مگر وہ دل پر ضبط کا پتھر رکھے ہوئے تھی۔

”کیا۔ کیا میں اتنی بد نصیب ہوں جس کا نام ساتھ لگانا چاہوں وہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

جب۔ جب وہاں نے مجھے چاہا تو وہ بھی مسائل میں گھر گر رہ گیا۔

اب آصف کا نجو بھی۔

نہیں۔ نہیں رب پاک تو اُس روشن آنکھوں اور چمکتے چہرے والے آصف کا نجو کو میری عمر بھی لگا دے۔

نہیں ضرورت مجھے اپنی زندگی کی۔ میرے سارے منکھ اس کے نام کر دے۔“

عفیرہ کا رواں رواں دُعا گونہا۔ ”اُسے خود سمجھ نہ آ رہی تھی کہ آخر یہ کیا ایک دم ہی کیوں پلٹی ہے؟ شاید آصف کے جذبے سچے تھے۔“

اور اُس کے جذبوں کی سچائی ہی تو تھی جس نے عفیرہ کو بھکا دیا تھا۔

مدد کے لیے اُس نے آصف کا نجو کو پکارا تھا۔

شاید اُسے یقین تھا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ اور یہ یقین بے اثر نہ ہوا تھا۔

عفیرہ کو شرمندگی کی دلدل میں نہ اُترنا پڑا تھا۔ وہ ہر صورت وہاں سے بچنا چاہتی تھی۔

پیشک اُسے وہاں پسند تھا، مگر وہ اُس کی ہو کر ساری عمر لفظوں کی سنگ باری تو کسی طور بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ کبھی کبھی اپنے دل کے ٹکڑے اپنے ہی ہاتھوں کرنے پڑتے ہیں۔

عفیرہ نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی ایک دم بالکل اچانک وہاں احمد اس کے ہونٹوں سے کاٹے اب لگا دے گا۔

حیران و ششدر کر کے رکھ دے گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے وہاں کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ کہ وہ خامیوں اور رسوائیوں کے اندھے غاروں میں نہیں گرنا چاہتی تھی۔

عفیرہ کو زندگی سے پیار تھا۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ اور اُسے زندگی کے لئے آصف کا نجو کی مضبوط لمبوں کے حصار کی ضرورت تھی۔

اُسے احساس ہو گیا تھا کہ تنہا لڑکی زمانے کے گدھوں سے نہیں لڑ سکتی۔

اور لوگ بھی ایسے جتنیں چاہا جائے اُن سے بچنا تو لامحال ہی ہو جاتا ہے۔

وہ بھی وہاں احمد کو چاہتی تھی۔ پھر اُس سے خوفزدہ بھی تھی۔ مگر خوف اسے وہاں سے نہیں تھا۔ بلکہ ”زمانے“ سے خوفزدہ تھی۔

جس کے پتھر برداشت کرنے کے لئے انسان کو خود بھی پتھر بننا پڑتا ہے۔ کہیں گاہ سے جتنے بھی تیر بوڑھے جاتے ہیں اُن میں زیادہ چہرے ایسوں کے ہی ہوتے ہیں۔ پراپوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ سنگباری کریں۔ اور وہ حقیقت پسند تھی۔

حقیقت کی فوکیلی چٹانوں پر وہ ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ یہ دنیا طلسم ہوش رہا نہیں ہے۔ کہ وہ جانتی تھی۔ ہم کانٹوں سے لیس دنیا میں رہتے ہیں۔! جہاں صرف کانٹے ہی کانٹے ہیں۔

رونے والے کو زبا نہ رلاتے ہیں۔“

نیو بھی بائیک ایک جھٹکے سے رکی تو عفیرہ اپنے خیالوں کے حصار سے نکلی۔

”اُترو۔“ زوہیب اُسے بیٹھا دیکھ کر بولا۔

”بہتر۔“ نہایت ہولے سے اُس نے کہا اور اپنا بھاری بیگ سنبھالتی ہوئی بولی۔

”تمہارا شکر یہ زیو۔“

”دوستوں میں یہ تکلف نہیں ہوتا۔“ زوہیب نے یاد دلایا۔

”نہیں زوہیب جعفری۔ ہم دوستوں ہی میں تو تکلف برتنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ ریت ہے لی غیر کا شکر یہ ادا کرتے ہیں ہم۔“

”کیا مطلب؟“ زوہیب نے جانا چاہا۔

”صاف بات ہے ہم بسوں رکشوں اور تانگوں پر سفر کرتے ہیں۔ کبھی منزل پر پہنچ کر کسی بھی بندے کو راز پوریا کو جوان کا شکر یہ ادا نہیں کیا۔“

”تجاری منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ زوہیب نے مسکرا کر کہا تو عفیرہ کے لب بھی کھل اُٹھے۔

”تم میری طرف سے آصف کو ضرور پوچھ لینا۔ اگر مجھے وقت ملا تو ضرور اُس کی ہاسٹل۔“

”میرے ساتھ چلتیں تو حرج تھا۔“

”نہیں ایسی بھی بات نہیں ہے۔ بس میرا موڈ نہیں ہے۔ سخت نیند آئی ہوئی ہے۔ اب میں سوؤں۔“

”رات نہیں سوئیں۔“

”ناں۔“ عفیرہ نے بچ کہا۔

”کیوں؟“ زوہیب نے پوچھا۔

”بس نیند نہیں آئی۔“ وہ ٹالتے ہوئے بولی۔
 ”ایسا ہوتا ہے جب۔“ ایک دم زوہیب نے ہونٹ بھینچا۔
 ”جب کیا؟“

”جب انسان کسی فیصلے کی صلیب پر لٹکا ہوا ہو۔ تم بھی یقیناً رات کسی فیصلے کے کھنور میں پھنسی ہوئی تھیں۔ یہی بات ہے نا؟“ زوہیب نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”اب تم غلط بات نہ کرو۔“ وہ نظریں پھرا کر بولی۔

”خیر تم کس قدر بھی چھپاؤ۔ پر یہ یاد رکھنا عفریہ امیر کہ تم سارے گروپ کو بید عزیز ہو۔
 بہت پیاری ہو۔ اور تمہاری خوشی ہم سب کی خوشی ہے۔ جس کے فیصلے پر تم مطمئن ہو گئی ہو۔ اس پر قائم رہو۔
 میں تمہاری خوشی کے لئے دعا گو ہوں۔“

اس سے پہلے کہ عفریہ اس کو ڈالتی۔ چیخ کر اس بات کو غلط ثابت کرتی، وہ تو ہوا ہو گیا، اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی گیٹ میں گھسی پٹی گئی۔ ”بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔“
 میں اپنے دل کی وحشت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

پھر۔ پھر کبھی خبری ہو گئی۔ میرے دل کی وارداتوں کی۔ میرے خیالوں کی خبر زوہیب کو کیونکر ہوئی؟
 اُس کا دماغ تو جیسے فضا میں معلق ہو گیا تھا۔
 دل بھر بھر آ رہا تھا۔

اُسے لے تھاشا اسلٹ محسوس ہوئی تھی۔
 کہیں۔ کہیں آصف کا نچوٹے تو انہیں نہیں بتایا؟
 نہیں عفریہ۔ وہ بھلا کیسے بتا سکتا ہے؟ اُس کے دل نے پہلی بار آصف کا نجوی طرفداری کی تھی۔
 عفریہ نے دروازے کے لاک میں کی گھماکی اور کھٹ کی آواز سے دروازہ کھل گیا۔ اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

سردار سکندر خان لغاری نے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے ایک لحظہ کو شیر محمد کی طرف دیکھا
 اور ذرا سخت لہجے میں بولے۔
 ”تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری خاموشی تمہیں کس سمت لے جا رہی ہے۔ مجھے ساری خبریں ہیں۔
 موت کو یوں آسانی سے گلے نہیں لگایا جاتا شیر محمد۔“

سکندر خان کا لہجہ نتیجہ والا تھا۔
 ”میں صرف نام ہی کا شیر نہیں ہوں سکندر بھائی۔“
 ”پھر بھی سوچ آ کر کب تک زبان بند رکھے گا۔ پورے چار سال ہو گئے ہیں تجھے اس کا لکڑھڑی
 میں بند ہوئے۔ یار تجھے تو جیل سے خوف آتا تھا۔“

”بس خوف کی ایک رات ہوتی ہے وہ گور جائے تو پھر بندہ بہادر ہو جاتا ہے۔ بقول تیرے سکندر
 بھائی کہ مجھے یہاں چار سال ہو گئے ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے میں کل ہی یہاں آیا ہوں۔“
 ”فضول دلیلیں مت دے۔ یہ دلیلیں تیری جان نہیں بچا سکتیں۔“ سکندر خان نے کہا۔

”میں کب جینا چاہتا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔
 ”تجھے ضرورت ہے زندگی کی۔“

”نہیں ضرورت۔“ شیر محمد ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”سکندر بھائی مجھے بتاؤ یہ کیا قانون ہے؟ میں
 اعتراف کرتا ہوں کہ میں قاتل ہوں۔ مجھے جو سزا دینی ہے دیں۔ پھر کیوں قانون انصاف کے تقاضے
 پورے نہیں کرتا۔“

”یار تجھے میں کس طرح سمجھاؤں۔“ سکندر خان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے بال نوچ لیں۔
 ”مجھے مت سمجھائے قانون دانوں کو سمجھا۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔“
 ”قانون پھر بھی تجھے بچاؤ کی جگہ دیتا ہے۔“

”میں نہیں بچنا چاہتا نا۔“
 ”آ خر تجھے زندگی سے پیار کیوں نہیں؟“
 ”مجھے۔“ شیر محمد نے سر اٹھا کر لمحے کو چھت کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سامنے بیٹھے سکندر خان

لغاری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”میں زندہ رہ کر بھی کیا کروں گا۔ یہاں کوٹھڑی میں۔ میں زندہ تو ہوں۔ مجھے پتا ہے باہر نکلتے ہی
 چوہدری فیروز حسین مجھے چھلنی کر دے گا۔“

”اب اتنا بھی اندھیر نہیں۔“ سکندر خان نے کہا۔ ”وہ سویرے جو ہم جیسے مزارعوں کی پشتیں دیکھنے
 کو ترس گئیں۔ وہ سویرے بھی نہیں آئے گی۔ چاہے کتنی بھی حکومتیں بدل جائیں۔ بڑے لوگ بڑے ہیں اور
 چھوٹے وہی کتر۔ جو ان کے ساتھ ایک منجی پر بھی نہیں بیٹھ سکتے۔ تم بس کچھ نہ کرو۔ مت دماغ ماری کرو
 چڑھ جانے دو مجھے بھابھ۔“

”عفو کا کیا ہوگا؟“ سکندر خان نے یاد دلایا۔
 ”اب وہ بچی نہیں ہے۔“ شیر محمد نے کہا۔
 وہ بہت معصوم بچی ہے شیر محمد۔ تجھے نہیں پتا وہ مجھے کس قدر پیاری ہے وہ اس آس پر اپنوں سے دور

تنبہ ہاسٹل کے کمرے میں بڑی رفتی ہے کہ کبھی تو اس کا مارا ہوا گا اور وہ اس کے ساتھ اپنوں میں واپس
 جائے گی۔ تجھے اپنا نہیں تو اُس کا احساس کرنا چاہئے۔ تجھے علم نہیں کہ اکیلی لڑکی کا کوئی مستقبل نہیں۔ آخر
 وہ کب تک لڑکوں کا لبادہ اوڑھ کر زمانے کے گدھوں سے بچتی رہے گی۔ اُسے ایک گھر کی ضرورت ہے
 اپنا گھر۔ کہ یہ اُس کا حق ہے۔“

”میں نے اُسے اس حق سے محروم تو نہیں کیا۔“
 ”یہ محروم کرنے والی ہی بات ہے۔“
 ”کیسے بھلا۔؟“ شیر محمد نے پوچھا۔

”تو جس دھڑلے سے اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے وجہ بھی اُسی سچائی سے بتا دے۔“
 ”تم چاہتے ہو میں ننگا ہو جاؤں۔“ شیر محمد گرج کر بولا۔
 ”میرا یہ مطلب نہیں۔“ سکندر خان بھی گڑبڑا کر رہ گئے۔

”تمہارا مطلب کوئی بھی ہو۔ مگر ابھی میں زندگی کی چند سانسوں کی خاطر یہ بے غیرتی منہ پر نہیں مل
 سکتا۔ زندگی موت اوپر والے کے ہاتھ ہے۔
 عزت ذلت بھی اوپر والے کے ہاتھ ہے۔“

”یہی درست ہے مگر اپنے ہاتھوں اپنے منہ پر کا لک ملنا کہاں کی عقلمندی ہے۔“
 ”شیر محمد تو سمجھتا کیوں نہیں ہے میری بات۔۔۔۔“

”میں سمجھ گیا ہوں۔ بس تو مجھے کچھ نہ کہہ نہ پڑھ میرا مقدمہ نہیں ضرورت مجھے کسی وکیل کی۔“ شیر محمد کو بھی طیش آ گیا اور اس سے عفریہ امیر سیر نندھنٹ فردوس حمید کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔

”ارے سکندر! ماما موجود ہیں۔“ وہ چپکی آگے بڑھی اور سکندر خان نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ شیر محمد سے لپٹ گئی۔ اس نے نہایت مردہ دلی سے اس کے گال تھپتھپائے۔

عفریہ چوکی۔

”یہ تبدیلی کیسی ہے؟“ اس نے نہایت حیرانگی سے شیر محمد کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی زندگی کے گورے لباس برسوں میں پہلی بار اسے لگا تھا جیسے شیر محمد کے۔ اسے پیار کر کے رسم دنیا بھائی ہو۔

”اچھا شیر محمد میں چلتا ہوں تو سوچ لے میں پھر آؤں گا۔“ سکندر خان نے کہا۔

”ضرورت نہیں ہے سکندر خان۔“

”دیکھیں گے اوکے۔“ سکندر خان نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اور فردوس حمید کے ہمراہ باہر چلا گیا۔

کوٹھری میں صرف عفریہ اور شیر محمد رہ گئے تھے۔ شیر محمد آنکھیں موندے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جیسے اسے بھانجی کی آمد کی خبر ہی نہ ہو۔

”ماما۔“ عفریہ کی گھٹی گھٹی سے آواز حلق سے نکلی۔

”ہوں۔“ شیر محمد نے ہنکارا بھرا۔ پر دیکھا نہیں۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”مجھے کیا ہوا ہے۔“

”پھر خاموش کیوں ہو۔“

”میں کب زیادہ بولتا ہوں۔“ شیر محمد نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور عفریہ تو تھرا کر رہ گئی۔

وہ آنکھیں۔

جن میں سُرخ زورے نظر آ رہے تھے لگتا تھا رات بھر وہ سو نہ سکا ہو۔

وہ شکوہ کنائیں آنکھیں جن کے تیر عفریہ کے دل پر لگ رہے تھے۔

پر ایسا کیوں ہے؟

کیا کیا ہے میں نے؟

عفریہ نے نظریں پُڑائیں۔

”عفی۔“ شیر محمد نے ہولے سے پکارا۔

”جی ماما۔“ وہ سر جھٹکا نہ تھکائے بولی۔

”تو واپس چلی جا۔۔۔“

”کہاں۔۔۔“ عفریہ نے پوچھا۔

”گھر۔۔۔ اپنے گاؤں۔۔۔“

”آپ کے بغیر۔۔۔“ عفریہ حیران تھی۔

”ہاں۔۔۔ میرے بغیر کہ تجھے اپنوں میں جانا چاہیے۔ اکیلی نہ رہ۔۔۔“ شیر محمد نے کہا۔

”میں اکیلی کب ہوں ماما۔۔۔؟“

”مجھے کوئی دلیل نہ دے۔ بس میں چاہتا ہوں تو چلی جا۔ آئندہ یہاں کبھی نہ آنا۔“

”اما۔“ حیرت سے اس کی آواز نہ نکلی۔

”ہاں یہ میرا حکم ہے۔“

”پر میں نہیں جاسکتی۔“ عفریہ بولی۔

”وجہ۔۔۔؟“ شیر محمد غزبایا۔

”میرا عہد۔۔۔“ عفریہ نے کہنا چاہا۔

”سارے عہد ٹوٹ گئے ہیں۔ اور تو نے ہی تڑوائے ہیں وہ عہد سارے۔“

”کیسے؟“ عفریہ نے پوچھا۔

”عفو۔۔۔ تو کیا سمجھتی ہے تیرا ماما پاگل ہے۔“

”خدا نہ کرے۔“

”میں نے وہ آہٹیں سُنی ہیں۔۔۔“

”کیسی آہٹیں۔؟“ عفریہ ہانا چاہتی تھی۔

”بدنامی کی آہٹیں۔۔۔“ شیر محمد بولا۔

”آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“ عفریہ کا لہو کھولا۔

”نہیں تجھے تیرے اپنے الفاظ مجرم ثابت کر رہے ہیں۔“

”میرا کوئی قصور نہیں۔“

”میں سمجھتی نہیں۔“

”دہان احمد کی ماں تیرے پاس کیوں آئی تھی؟“ شیر محمد کا لہجہ نہایت پتھر یلا تھا۔

”میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔“

”پر وہ کچھ تو نہیں بتایا جو سچ تھا۔“

”سچ۔“ عفریہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہوں۔۔۔ میں نے تجھے کہا تھا نارائی ہوتی ہے تو پہاڑ بھی لازمی ہوتا ہے۔“

”ماما۔ اگر میرا قصور ہوتا تو میں آپ کو بتاتی۔“ عفریہ نے اپنے کانپتے ہوئے دل کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

”بعض مرتبہ مجرم خود ہی بول پڑتا ہے۔“

”ضروری تو نہیں۔۔۔ کہ میں مجرم ہوں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کو میں اپنا خون معاف کرتی ہوں آپ گھونٹ دیں گلا میرا۔“

”گلا تو میری خواہشوں کا گھٹنا ہے عفریہ۔“

”ماما۔ آپ کی سوچ غلط ہے۔“ عفریہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”خیر سچ جو بھی ہے میں تجھے کچھ نہیں کہتا۔ بس تو واپس چلی جا۔“ شیر محمد نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ عفریہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”خدا نہ کر۔“ شیر محمد نے کہا۔

”کیوں یہ میری ضد نہیں۔“

”تو جانے کی ہر قیمت پر۔“

”میں جاؤں واپس۔“

”ہاں۔“ شیر محمد نے کہا۔

”پھر ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا۔۔۔؟“

”مجھے بتائیں آپ نے چوہدری مراد حسین کو قتل کیوں کیا تھا۔“

”وہ تھا ہی اس قابل۔“

”نہیں وجہ ہوگی کوئی۔۔۔؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔۔۔ میری مجبوری ہے۔“

”تو میں بھی واپس نہیں جاسکتی یہ میری مجبوری ہے۔“ عصفیرہ نے تڑپ سے جواب دیا۔

”تجھے پتہ ہے تو کس سے بات کر رہی ہے؟“

”ہاں میں اس مامے سے بات کر رہی ہوں جس نے مجھے شعور آگئی کے ایسے سلگتے الاؤ میں ڈالا

ہے جہاں سے نہ میں نکل سکتی ہوں اور نہ ہی جل کر راکھ ہوتی ہوں۔۔۔ بتاؤ ماما میرا کیا قصور تھا۔۔۔

کیوں میرے ہاتھ میں قلم تھا ماما۔۔۔ لفظوں کی روشنی میرے ذہن میں کیوں اٹھ اٹھی۔۔۔ مجھے تو آپ نے

ہاں آپ نے کہیں کا نہیں رکھا۔ آپ مجرم ہیں۔ اُس بھولی بھالی عصفیرہ امیر کے مجرم ہیں۔ جسے میں نے

رات کی تاریکی میں قتل کر دیا تھا۔ میں نے تو اپنی حفاظت اس طرح کی ہے جیسے سچے موتی کی لوگ حفاظت

کرتے ہیں۔۔۔ پھر بھی قصور وار ہوں۔۔۔ ماما انصاف تو تم نے نہیں کیا۔۔۔ میرا جرم بچ بولنا ہے تاہم میں

نے تمہیں سچ بتا دیا اور سارے قصور میرے نکل آئے۔ کاش۔۔۔ کاش ماما آپ سوچتے کہ آپ نے کیا

بھالا میرے کلیجے کے پار کیا ہے۔۔۔ وہ کا پتی ہوئی بھیگی بھیگی آواز میں بول رہی تھی۔

”صاف کہہ دیں کہ میں یہاں نہ آیا کروں۔ میں نہیں آؤں گی دور سے آپ کو دیکھ لیا کروں گی۔

مجھے یہ تو سکون ہوگا کہ میرا ماما زندہ ہے۔ آپ کو میری ضرورت نہیں پر مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ

میرا مانا ہیں۔ میں تو نہایت فخر سے لوگوں کو بتاتی ہوں کہ میں شیر مامے کی بھانجی ہوں آپ نے تو میرا مانا

منی کر دیا ہے۔“

”عصفیرہ! تو سمجھنے کی کوشش کر۔“

”جو میں سمجھی ہوں ماما۔۔۔ بس اتنا کافی ہے۔“

”دنیا بہت ظالم ہے۔“

”میں مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہوں۔“

”تو تھک جائے گی۔“ شیر محمد نے ڈرایا۔

”میں کبھی نہیں تھکوں گی۔“

”عفو۔۔۔ میری پیاری دھی تو مان میرا کہنا۔“ شیر محمد نے بے اختیار ہی بازو پھیلا دیے اور عصفیرہ

اُن پھلے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ وہ شیر محمد کے سینے سے سر نکال کر بے تحاشہ رو رہی تھی کہ صبح ہی سے تو وہ

رونے کا بہانہ تلاش کر رہی تھی کسی مہربان کندھے کی اُسے تلاش تھی۔ کوئی پیاری دھڑکنوں والا سینہ وہ

چاہتی تھی جہاں وہ چھپا کر بے تحاشہ روئے۔

ہاسٹل میں بھی اس کا دل نہ لگا تھا تو وہ نکل آئی تھی۔ ایک دل چاہا تھا اسپتال چلی جائے ایک نظر تو

آصف کا بچو کو دیکھ لے پر دوسرے لمحے اس نے اپنے دل کی خواہش کو سختی سے چل دیا اور جیل آگئی کہ یہی تو

پناہ گاہ تھی۔۔۔ جہاں اس کا ماما تھا۔ اور اب کسی معصوم بچی کی طرح وہ شیر محمد کو سینے سے لگی رو رہی تھی اور وہ

آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ آسواں کی سُرخ آنکھوں سے نکل نکل کر عصفیرہ کے

بالوں کو بھگور رہے تھے۔

☆☆☆

”تم۔۔۔ تم بہت بڑے ہو ملک۔۔۔“ تاباں نے اسجد ملک کے سینے پر چھوٹے چھوٹے

برساتے ہوئے کہا تو اسجد ملک نے نہایت آسانی سے اس کے دونوں ہاتھ کلائی سے اپنے ہاتھوں میں جکڑ

لیے۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔

”چھوڑو مجھے۔“

”میں مارے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔“ اسجد نے کہا۔

”کیوں میں نے کیا قصور کیا ہے؟“

”میں نے کیا قصور کیا ہے جو تم آتے ہی مجھ غریب کے دل پر منگے مارنے لگیں۔

”تم غریب ہو۔“ وہ بولی۔

”بالکل۔“ اسجد بولا۔

”اتنے دن کہاں تھے؟“ تاباں نے پوچھا۔

”یہ بات نہایت سلیقے سے پہلے بھی پوچھی جاسکتی تھی۔“ اسجد نے چھیڑا۔

”اب پوچھتے میں حرج کیا ہے؟“

”حرج تو کوئی نہیں۔“

”پھر۔“ تاباں غرائی۔

”میں بدلہ لیے بغیر تو نہیں بتاؤں گا۔“

”نہ بتاؤ۔۔۔ میں چلی۔“

”کہاں؟ اسجد نے پوچھا۔

”اپنے گھر۔“ تاباں نے کہا۔

”مجھے راستہ آتا ہے تیرے گھر کا۔“

”تم آ جاؤ گے۔“ تاباں نے حیرت سے کہا۔

”تو کتنی ہی مرتبہ مجھے نکال تاباں گھر سے میں بار بار آؤں گا تو اتنی پیاری ہے نا مجھے کہ تیری یہ اتنی

بڑی گستاخی بھی میں معاف کر سکتا ہوں۔“

”پتہ ہے ملک مجھے بہت دکھ ہوا تھا جب میں نے تجھے گھر سے جانے کا کہا۔ یقین کرو۔ مجھے لگا تھا

جیسے میں نے اپنا دل نکال دیا ہو۔“

”اچھا۔“ اسجد نے بھرپور نظروں سے اُسے دیکھا۔

”تم خفا ہو گئے تھے۔“ تاباں نے پوچھا۔

”نہیں نا۔“ اسجد نے کہا۔

”سچی۔“ وہ چبکی۔

”ہوں بالکل سچی۔“

”میں تو ڈر گئی تھی۔“

”کیوں ڈرنے کی وجہ۔۔۔؟“

”تم آئے جو نہ تھے۔۔۔ پتہ ہے آج بھی تم پورے پندرہ روز بعد آئے ہو۔“

”دن گئے تھے؟“

”لگتا ہے اب تو دن ہی گئے جانا نصیب میں لکھا جا چکا ہے۔“ تاباں آہ بھر کر بولی۔

”تم ایسا کیوں سوچتی ہو۔ اب تم دن نہیں گنو کی بلکہ اب تو پل بڑی تیزی سے گزریں گے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں نے دادو سے بات کی ہے اور دادو کہتی ہیں کہ وہ تجھے بہو بنا کر لے جائیں گی۔“

”مجھے۔“ تاباں حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”بالکل تجھے کہ تو میری پسند ہے۔“

”ضروری تو نہیں کہ میں تمہارے گھر والوں کی پسند بھی ہوں۔“

”انہیں پسند کرنا پڑے گا۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”مت خواب دکھاؤ مجھے۔“ تاباں نے ہونٹ کپلا۔

”میں نے نہیں کوئی خواب نہیں دکھایا۔“ اسجد نے کہا۔

”پھر اب کیوں دکھا رہے ہوں؟“

”تیری آنکھوں نے تو عرصہ ہوا خود بخود خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے میرا کیا قصور۔۔۔“ اسجد نے شوشی سے کہا۔

”یہ نہیں یہ ہم لڑکیاں خواب کیوں دیکھتی ہیں۔“

”جہی ہم جیسے خیرادے ہوں تو ایسا ہوتا ہے۔“

”یقیناً۔۔۔“ تاباں ہنسی تو اسجد ملک کو لگا جیسے ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیاں کسی گوری کی کلائیوں میں بچا لٹی ہوں۔

تاباں کے موتیوں جیسے دانت پگھڑی جیسے گلابی ہونٹوں کے پیچھے نہایت ہی خوبصورت لگ رہے تھے ستیہاں ناک میں پہنی بڑی سی لونگ بھی اُسے ہلکھلائی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”تو کتنی پیاری ہے تاباں۔“

”بناؤ مت مجھے۔“ تاباں نے چہرے پر آئے بالوں کو ہاتھ سے پرے کیا اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔

”ملک ایک بات بتاؤ گے؟“

”کیا بات؟“ اسجد نے کہا۔

”تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو گئے نا؟“۔ انجانا سادھڑکا تھا اس کے جی کو۔

”کوئی اپنی زندگی سے بھی خفا ہو سکتا ہے؟“ اسجد نے مٹھا مٹھا لہجے میں کہا۔ تاباں کے دل میں

لذت آمیز دھڑکن بیدار ہوئی۔ اس کا چہرہ تینے لگا تھا اس نے نظریں جھکا لیں اور بولی۔

”اس روز اماں کے سامنے تو نے کسی ظفیری کا نام لیا تھا۔ وہ۔ وہ ظفیری کون ہے؟“

”میرے ماما ہیں۔ ظفر عالم۔“

”کہاں ہوتے ہیں؟“

”اُن کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ قدرت نے ان کے ساتھ بہت عجیب مذاق کیا ہے۔“

”قدرت اور مذاق۔۔۔؟“۔ تاباں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔

”ہم سب کو ان کا بہت دکھ ہے اٹھائیس برس سے وہ ملکوں ملکوں تلاش رہے ہیں اپنی۔“ اسجد کا جملہ لبوں ہی میں تھا کہ تاباں کو شادو آوازیں دیتی ہوئی آ گئی۔



بیدار ہو جاتی تھی۔

وہ تو اس کے حواسوں پر خوشبو بن کر بکھری رہتی تھی۔ اس کے خیالات میں کوئل بن کر کوئی تھی۔ وہ بے شک صحرا میں کھلا پھول تھی۔ پر اس کی خوشبو سے تو اسجد ملک کا تن من مہک رہا تھا۔ اسے اب پتا چلا تھا؟

یہ کیسا ظالم جذبہ ہوتا ہے؟

جو انسان کو اندر ہی اندر ڈھا دیتا ہے۔

جیسے مٹی کو دیوار ڈھسے جائے۔

مگر محبت کر کے کتنے آسانی راز انسان کو پتا چلتے ہیں۔

کائنات کے چھپے ہوئے رازوں کا پتا چلتا ہے۔

اور یہ جب ہی ہوتا ہے جب خلوص ہو۔

سچائی ہو۔

کیونکہ نہ ہو۔

تجھی محبت پہنچتی ہے اور محبت کی عمر بڑھتی ہے۔

وہ بھی اپنی محبت کی عمر بڑھانا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کے لیے تاباں کو اپنا کر۔ اپنے فیصلے پر اسے کوئی پچھتاوانہ تھا بلکہ خوشی تھی۔ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری تھی۔

☆☆☆

عفیرہ امیر نے کوریڈور میں قدم رکھا ہی تھا کہ اسے سامنے ہی زوہیب فرحت منیر اور وہاج احمد نظر آ گئے جو آبی سی یو کے سامنے کھڑے تھے۔ شام کے سائے ڈھل چکے تھے اور وہ یقیناً سویرے سے اسی طرح کھڑے تھے۔ وہاج احمد کو دیکھ کر عفیرہ کا دل چاہا کہ وہ پلٹ جائے پر وہ نہایت مضبوط قدموں سے آگے بڑھی۔

چھپنے کا بھلا کیا فائدہ؟ وہ تو آصف کا بچہ کوہتا کرنے آئی تھی۔ کہہ رہا کہ اسے آصف کا خیال ستانا رہا تھا۔ تب ہی تو وہ شیر محمد کے پاس سے سیدھی اسپتال آ گئی تھی۔

”کبھی طبیعت ہے اس کی؟“ عفیرہ نے فرحت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”اس کے گھر بھی اطلاع دی ہے؟“

”ہاں۔۔۔ وہاج نے فون کر دیا تھا۔ بس اس کے بھائی پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“ فرحت نے

رسٹ وائچ کی طرف دیکھا۔

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”ڈاکٹر پر امید ہیں۔ صبح سے دماغ کے دو آپریشن تو کر چکے ہیں۔ اب بھی۔“ زوہیب بہت کھرا

ہوا لگ رہا تھا۔

”خدا خیرے کرے گا۔“ عفیرہ نے ٹھنڈے ستون سے کمر نکالی۔

اور اسی وقت آبی سی یو کا دروازہ کھلا۔ سفید اور۔۔۔ آل میں ملبوس ڈاکٹر باہر نکلا تھا۔ وہ تینوں دوڑ کر اس کی سمت لپکے اور عفیرہ نے اس کا کافی میں ہلتا سرد دیکھا۔ اس کے ہاتھ وہاج اور زوہیب کے کندھے تھپک رہے تھے اور عفیرہ کو لگا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی ہو۔

”تو یہاں ہے اور تیرا بابا تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔“ وہ پھولے پھولے سانسوں کے درمیان تاباں سے کہہ رہی تھی۔ پھر اسجد پر نگاہ پڑی تو ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور تاباں سے بولی۔

”یہی تھا وہ ماؤ جس کے لیے تو اتنے دنوں سے اُداس اُداس پھر رہی تھی؟“ اس کے پوچھنے پر تاباں نے طرح شیر ماگئی۔ اور اسجد ہنس دیا پھر بولا۔

”اچھا۔۔۔ تمہیں بھی اس کی اُداسی کا پتا ہے؟“

”ہاں مجھے اس بھرنے تیرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”کیا بتایا ہے؟“

”بس بتایا کہ تو اتنا اچھا ہے اور۔۔۔“

”اور“ ملک پتا ہے یہ شادو بڑی خراب ہے۔“ تاباں اس کی بات کاٹ کر جلدی سے بولی۔ مبادا

شادو مزید کوئی بات نہ کہہ دے۔

”مجھے کہتی تھی“ پیچھی اور پردیسی کا کیا پتا جہاں دیکھا درخت وہیں بیٹھ گئے۔ پھر آگے چل

دیئے۔“

”اور تم نے کیا کہا تھا؟“ اسجد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

تاباں گڑبڑا کر رہ گئی۔

”میں۔۔۔ میں کیا کہتی؟“

”اب بھنسی ہے نا۔“ شادو ہنس کر بولی۔

”چلو بابا انتظار کر رہا ہوں گا۔“ تاباں نے شادو کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اسجد ملک

مسکرا دیا۔

جی بھر کے وہ تاباں کو نہ دیکھ سکا تھا۔ نہ ہی بات کی تھی پردل میں ٹھنڈک تو بڑی تھی۔ نہایت محبت آمیز لہریں اس کے قلب پر نازل ہونے لگی تھیں۔ تاباں کو دیکھ کر خوشگوار سی دھڑکن اس کے سینے میں

”نہیں۔“ عسفیہ کی چیخ کوریدور میں گونجی تھی پھر اسے کوئی ہوش نہ رہا تھا۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے دیکھا تھا کہ وہاں احمد نے اسے بازوؤں میں تھام لیا تھا، نیچے نہیں گرنے دیا تھا۔

☆☆☆

کبھی کبھی۔ ایسا بھی ہوتا ہے جب انسان کے سامنے سارے راستے ہوتے ہیں لیکن وہ ایک ہی راستہ اپنا لیتا ہے کیونکہ دوسرے راستوں پر چلتے ہوئے ٹھوکر دین کا زیادہ احتمال ہوتا ہے۔ چھوڑے ہوئے راستوں پر چلنا بہادری نہیں، نہ ہی یہ عورت گویا دیتا ہے۔ اگر غاشیہ کمال چاہتی تو غاشیہ رافع بننے سے پہلے ہی وہ کوئی ایسا راستہ اپنا لیتی جو اسے وہاں تک لے جاتا مگر اس وقت تو وہ جوشِ نفرت میں اس قدر غرق تھی کہ اسے کچھ بھی بھانپ نہ دے رہا تھا۔ اور دادی اماں نے جو فیصلہ کر دیا تھا اسے اس کے دل نے نہ چاہنے کے باوجود قبول کر لیا تھا۔ بے شک دل نے بہت واویلا مچایا تھا۔

روح میں کھرام اٹھا تھا۔

اور دونوں تک اندر ہی اندر کوئی بے حد اور بے حساب روتا رہا تھا۔

مگر وہ خود کو تسلیاں دیتی۔

رافع کی محبت پا کر میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔ اس کے چاہت کے سمندر میں اتروں گی تو کچھ بھی یاد نہ رہے گا۔

اور پھر وہ رافع ملک کی ہو گئی تھی۔ شہر کے معزز ترین شخص کی بہو بن کر وہ خود کو معتبر سمجھ رہی تھی۔

رافع جیسے وجہ بہ بندے کی ہو کر اس نے خود کو خوش قسمت جانا تھا۔ بہت ہی خوش سمجھتی تھی۔

پر ایسا تو نہ تھا۔

وہ جو محبت رافع سے پانا چاہتی تھی۔ اس کی تو رفق ہی رافع ملک میں نہ تھی۔ لگتا تھا ایک روباٹ شخص ہے جس میں پابندی وقت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جملہ وہ بپے تلے بولتا۔ جیسے کہ زیادہ بولا تو زبان ہوگا اور پہلے ہی روز وہ غاشیہ کے دل میں نہ اتر سکا تھا کہ اس نے غاشیہ کے درد دل پر دستک دی ہوتی تو اترتا۔ شاید وہ تو شادی اور بیوی کے مفہوم سے ہی نا آشنا تھا۔ کانٹ میں شروع ہی سے وہ بڑھا پور ڈنگ ہاؤس میں اور ہالٹز میں رہا اور صرف بڑھائی کی طرف اس نے توجہ دی۔ گل افشاں جمال نے بھی بچوں کو اپنے قریب نہ لگنے دیا۔ وہ تو اماں کی گودی خوشبو سے بھی نا آشنا تھا۔ پھر اسے کیسے پتا چلتا کہ محبت کیا ہوتی ہے کہ محبت کی پہچان ابتدا ہی میں ماں کی گودی سے پتا چلتی ہے۔ جذبوں اور احساسات کی خبر بھی اس مقدس گود سے ہوتی ہے اور رافع ملک کو یاد نہ تھا کہ اس کی ماں نے بھی اسے یا خنداں کو پیار سے گلے لگایا ہو۔ بہت زیادہ پیار آیا بھی تو بس گال تھپتھا۔ دیے۔

اور وہ اسی چیز کو پیار سمجھتا تھا کہ شاید محبت اسی طرح ہوتی ہے۔ اس نے کہیں سے محبت پائی ہوتی تو غاشیہ کو دیتا۔ وہ تو خشک صحرا تھا جو آسمان کی طرف دیکھتا ہے کہ کب اس پر بارِ رحمت برے۔ اور وہ میراب ہو۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ رافع ملک نے تو کبھی ”ابر رحمت“ کی خواہش ہی نہ کی تھی۔ وہ اپنے آپ ہی میں مست الست رہا تھا۔ اس کی تو ہر خواہش بن کہے ہی پوری ہو جاتی تھی۔

یونیورسٹی میں بھی کسی کو مل جود کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی ہلچل نہ مچتی تھی۔

کبھی اس کی خواہش نہ تھی کہ ریشم جیسی رئیس اس کے شانوں پر بھی بٹھریں۔ ملائم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی خواہش نہ تھی بل کی پٹاری میں سر نہ اٹھایا تھا۔

ایک قسم کا وہ خشک سا بندہ تھا جب جمال الدین ملک اور گل افشاں نے اسے اسٹینس جانے سے پہلے شادی جیسے بندھن میں باندھنے کی بات کی تو وہ شانے اچکا کر صرقات بولا تھا۔

”ایزولا نیک ماما“ یعنی اس کی اپنی کوئی رائے کوئی منشا نہ تھی۔

”غاشیہ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟“ جمال الدین ملک نے پوچھا تھا۔

”بابا۔ میری رائے۔“ وہ ہنسا۔ ”بس جو آپ کا جی چاہے کریں۔ میں نے بڑھنا ہے۔ کورس کرنا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں غاشیہ وہاں میری بڑھائی میں مجھے ڈسٹرب نہیں کرے گی تو ٹھیک ہے۔ آپ کا انتخاب۔“

”تمہاری رائے بھی ضروری ہے؟“

”میں نے تو اپنے مستقبل کا ہر فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے۔ اور یوں بھی والدین اولاد کے لیے کبھی بُرا نہیں سوچتے۔“ رافع کے لہجے میں ہلکی سی چھین چھین تھی جسے نہ ہی گل افشاں محسوس کر سکی اور نہ ہی جمال الدین ملک۔

سنگل کلیئر تھا۔ اس لیے رافع کی مرض کا پتا چلتے ہی فوراً چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق ان کی شادی ہو گئی تھی۔ صرف دو ہفتے بعد ہی وہ دونوں اسٹینس آگئے تھے۔ خوبصورت سے فلیٹ میں غاشیہ نے نہایت اطمینانیت محسوس کی تھی۔ رافع ملک کا ایڈمشن تو ہو چکا تھا بھی وہ تیسرے ہی روز سے یونیورسٹی جانے لگا تھا۔

سہ پہر کو وہ لوٹا اور آتے ہی سوچا۔ شام کو چائے کے بعد وی سی آر پر کوئی سائنسی فلم لگایا اور وہ دیکھتا رہتا۔ غاشیہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ رات کو کھانے کے بعد پھر اسٹڈی میں چلا جاتا اور پھر پچھلے پہر جب رات آدھی سے زیادہ بیت جاتی، کمرے میں آتا۔ غاشیہ کروٹ لیے لیٹی ہوتی اور وہ آہستہ سے سو جاتا کہ صبح اسے یونیورسٹی بھی تو جانا ہوتا تھا۔

ایسا انداز زندگی بھلا کب غاشیہ نے سوچا تھا۔

وہ جو بہت باتوں کی لڑکی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے اب کسی نے اس کی زبان کاٹ لی ہو۔ دیواروں سے باتیں کرے کرتے وہ ابھی سے تھکے لگی تھی۔

وہ رافع سے بات نہ کرتی تو بھی اس نے نہ پوچھا تھا۔

”تم خاموش کیوں ہو؟“

تب ایسے میں اسے وہاں احمد یاد آتا جو کہتا تھا۔

”غاشی۔“ تو چپ ہوئی ہے نا تو میرا دل بند ہونے لگتا ہے، تو تو بلبل ہے چپکتی رہا کر۔“

”تو تیلی ہے گھر گھر میں اڑتی رہا کر۔“

”دیکھ۔ دیکھ تو چپ نہ ہوا کرورنہ میں کبھی کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھا تو۔“

اور اس تو کے آگے وہ خاموش ہو جاتا پر اس کی بے حد خوبصورت چمکی آنکھیں بہت کچھ کہہ ڈالیں اور غاشیہ کے تو آنگن دل میں جلنے لگ بج اٹھتے تھے۔

اب وہ چاہتی تھی رافع کی نظریں ویسے ہی جملے اچھالیں۔

وہ مٹی خیز انداز میں اسے دیکھ کر مسکرائے۔ اور وہ خوشبوؤں کے حصار میں آجائے۔ پر ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ تو دھوئیں کے حصار میں تھی۔ اسی کا دم گھٹتا تھا۔

”بہت لمبا سفر ہے کیسے گزرے گا؟“ غاشیہ نے طویل سانس لے کر کھڑکی کے پٹ سے سر دکا دیا۔ اس کی آنکھوں میں می آئی تھی اور باہر برفباری ہو رہی تھی۔ باہر کی ساری ٹھنڈک اس کے پورے

وجود میں اتر آئی تھی۔ غاشیہ کو لگ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا خون منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔
میں نے کب ایسا سوچا تھا۔ رافع ملک مجھے پتا نہیں تھا کہ نئی نوبلی دلہن۔۔۔ کے مقدر میں سیاہ راتیں
بھی آتی ہیں۔ سنسان دورِ ایران دن بھی۔ جب باہر ٹھنڈک ہو اور بیڑوں تلے پختی ریت۔ اسے لگتا تھا جیسے
اس کے پیروں میں آبلے پڑ گئے ہوں۔ روح بار بار سسکتی رہتی۔ غاشیہ نہایت دلدوز نظروں سے رافع کو
دیکھتی۔

صرف ایک نظر۔

وہ پختی مسکراتی ہوئی نگاہ جس کی وہ خواہشمند تھی۔ وہ رافع کے قریب بھی ہوتی مگر مجال ہے جو کبھی
اس نے غاشیہ کی تمنا پوری کی ہو۔
کبھی جو اس کے اندر خواہشوں کی۔ اٹھتی شوریدہ سرلہروں سے باخبر ہوا ہو۔ لگتا تھا جیسے غاشیہ اس
کے لیے صرف ایک فرد ہے جس کی گھر میں موجودگی ضروری ہے۔ غاشیہ نے اپنی مصروفیات ڈھونڈ لی
تھیں۔ فلیٹ کو بجانا سنوارنا، گھر کی سینٹنگ بدلنا۔

پر کب تک؟

اور پھر آج کل اس پر اداسی کا ایسا دورہ پڑا تھا کہ اسے وہاں احمد شدت سے یاد آتا۔ اس کی باتیں
اس کے انداز یاد آتے تو پیہروں اس کے خیالوں میں گزر جاتے۔
اسے اپنی ہی غلطیاں یاد آتیں۔ سارے قصور اپنے ہی لگتے۔ وہاں اور عقیقہ معصوم اور بے گناہ
لگتے۔

کاش۔ کاش! وہ وقت لوٹ آئے۔

جب وہاں مجھ سے ملتیں کرتا تھا۔

مجھے منانا تھا۔

اپنی صفایاں پیش کرتا تھا۔

نہ مان کر میں نے کیا کیا؟

اپنا دل اور دامن ہی غالی کیا تھا؟

کیا آیتیرے ہاتھ غاشیہ؟

اسے لگتا جیسے بار بار کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔

اپنے اس سوال کا جواب خود کو بھی وہ بھی نہ دے سکتی تھی۔ اب صرف رونا ہی آتا تھا۔

وہاں احمد لگتا ہے تمہاری بددعا مجھے کھا گئی۔ ہائے وہی یوں نہ ہوتا جیسے کہ ہو گیا ہے؟ وہی مجھے
معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔ میری محبت۔ مجھے آج چلا کہ محبتوں کو ٹھکانے کا انجام کیا ہے۔ جو محبت
کو ایک بار ٹھکرادیتے ہیں پھر پاگلوں کی طرح محبت کے پیچھے بھاگتے ہیں جیسے سراب دیکھ کر بیاسا بھاگتا
ہے۔ پر اس کے ہونٹ خشک ہی رہتے ہیں۔ ان ہی کیفیات سے آج کل غاشیہ بھی گزر رہی تھی۔
نیل ہوئی تو وہ ایک دم ہی خیالوں سے چونکی تیز قدم اٹھانی ہوئی دروازے پر آئی اور ہینڈل گھما
دیا۔

”آج آپ جلدی آ گئے؟“ رافع کو دیکھ کر۔ ہمیشہ کی طرح بات کرنے میں اس نے ہی پہل

کی۔

”کیوں غلطی کی ہے؟“ وہ خوابگاہ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ اور غاشیہ خون کے گھونٹ بھر کر رہ

گئی۔

پانی کا گلاس لیے جب وہ کمرے میں آئی تو رافع ہاتھ روم سے نکل رہا تھا۔ اس نے کھڑے
کھڑے ہی پانی پیا اور پھر غاشیہ کی چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا رونے کا پیر یڈ شروع تھا؟“

”میں کیوں روؤں بھلا؟“ وہ بولی۔

”مجھے تم بے وقوف سمجھتی ہو؟“

”میں نے یہ کب کہا ہے؟“

”روٹی کیوں نہیں؟“ وہ پوچھ رہی تھا۔

”میں سوئی ہوئی تھی۔“ غاشیہ نے کہا۔

”مجھے جھوٹ سے نفرت ہے غاشیہ بیگم۔“ رافع ملک کا لہجہ ترخا ہوا تھا۔ غاشیہ پکیا کر رہ گئی۔ کتنی
زبان چلتی تھی اس کی وہاں احمد کے سامنے۔ ترخا جواب دیتی تھی اور آج رافع کے سوال کا جواب اس کے
پاس نہ تھا۔

”بتاؤ کیا بات ہے؟“ وہ کڑے تیوروں سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے۔۔۔ مجھے ایسی ابو یاد آ رہے ہیں۔“ غاشیہ کے آواز بھر اگئی۔

”واقعی؟“ رافع کا لہجہ بے یقینا تھا۔

”آپ مانتے کیوں نہیں؟“

”چلو تم بہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔ آج فون پر بات کر لیتا تا کہ اداسی دور ہو جائے۔“ رافع نے کہا۔

”جی۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

”ہاں سچ۔“ رافع کے چہرے پر اس نے پہلی بار ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی تھی پھر وہ کروٹ لے کے
لیٹ گیا اور وہ ملک ہاؤس فون کرنے کے خیال ہی سے بے حد خوش ہو رہی تھی جیسے کدھت اقلیم کی دولت مل
گئی ہو۔

برفباری بھی کچھ کم ہو چکی تھی۔ جب رافع سو کر اٹھا۔ اس کے اٹھتے ہی وہ جلدی سے کچن میں گھس
گئی۔ کہ اس وقت وہ ملک کافی پینے کا عادی تھا۔ وقت کا پابند تو وہ بے حد تھا۔ ہر کام وقت پر کرنے کا عادی
اور اس کے کام وقت پر کرنے کی عادت غاشیہ کو بھی پڑ گئی تھی۔ وہ تولیہ سے بال خشک کرتا ہوا بیڈ پر آ کر بیٹھ
گیا۔ جسم پر پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں تھیں جو سینے کے بالوں میں جمی انکی ہوئی تھیں۔ بالوں بھری کلائی
اور صحت مند ہاتھ جس کی انگلیوں کے ناخن سرخ تھے اور نہایت خوبصورتی سے تراشے ہوئے تھے۔

”کتنا خوبصورت مرد ہے یہ۔ کاش دل کا بھی اتنا ہی خوبصورت ہوتا۔“ غاشیہ نے کپ رافع کو
پکڑاتے ہوئے سوچا۔

”برش تو اٹھا دو۔“ وہ بالکل مردوں والے رعب سے بولا۔ اور وہ پھر کی طرح اٹھ کر اس کے
لیے برش لے آئی تھی۔ پھر کافی پیتے ہوئے رافع ملک نے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون کو اپنے قریب
کیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

”لو خود ہی نمبر ڈائل کر کے بات کر لو۔“

اتنی ٹھنڈ میں بھی غاشیہ کی انگلیاں سبج گئی تھیں۔

آج یہ التفات کیسا؟

یہ اتنی نرمی کیسی؟

عاشیہ کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ رافع نے کوئی نمبر بتایا اور پھر عاشیہ نے نمبر ڈائل کر دیئے اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اور آنکھوں میں نمی آ رہی تھی۔

دل باری بار اٹھا آ رہا تھا۔

تیسری ٹھنٹی پر ریسورٹ اٹھا لیا گیا۔ اور دوسری طرف سے اسیر پیش سے اس کی سماعتوں میں جو آواز اتری وہ سن کر تو اسے لگا تھا جیسے اس کا دل ہی بند ہو جائے گا۔

”ہیلو۔۔“ بس اتنا ہی عاشیہ نے سنا گیا تھا۔

پھر عاشیہ نے آہستہ سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ رافع نے پوچھا۔

”فون الٹ ہے۔“

”پھر ٹرائی کر لو۔“ وہ بولا۔

”رہنے دیں۔ پھر کبھی۔ بات کر لوں گی۔“ عاشیہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور خالی کپ اٹھا کر باہر چلی گئی۔

تو وہاں احمد اب پھر تم ”ملک ہاؤس“ میں آ گئے ہو؟

کیا لگتا ہوگا تمہیں وہاں؟

کیا میری یاد بھی آتی ہوگی؟

پھر تم کیا سوچتے ہو گے؟ کیا محسوس کرتے ہو گے؟

وہاں احمد کاں تم ملک ہاؤس نہ آیا کرو۔

اگر وہاں موجود ہو بھی تو پھر فون تو نہ اٹینڈ کیا کرو۔

تمہاری آواز تو میں آج بھی ہزاروں میں پہچان سکتی ہوں۔

یہ لہجہ۔

یہ انداز۔

اور بھلا یہ نرمی بھی میں بھول سکتی تھی۔

وجہی۔

یہ نام اس نے ہونٹوں میں بھیج لیا۔ میا دا آہ کی صورت لبوں سے نکلے اور پھر رافع کے کانوں میں اتر جائے۔ پھر تو میں شعلوں میں گھر جاؤں گی۔ انگاروں کے حصار میں آ جاؤں گی۔

میری ازدواجی زندگی آگ پر دھردی جائے گی۔

نہیں وہاں احمد مجھے آدیا ضرور پر اس طرح کہ تمہاری یاد کی خوشبو میرے دل کے گلدان سے باہر نہ نکلے۔ مجھے تمہاری یاد تقویت پہنچاتی ہے۔ آج۔ آج تمہاری یاد اور خیال نے میرے اندر توانائیاں سی

بھردی ہیں۔ مجھے تمہاری یاد کا سہارا ہے۔

”مجھے سہارا دو وہ بھی۔ میں بہت نازک تیل ہوں، کہیں رافع کا سلوک مجھے گرانہ دے۔ پھر تو میں روندی جاؤں گی۔ میری موت تم بھی شاید برداشت نہ کر سکو۔ اور نہ میں مرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ۔۔۔ بعض لوگ میچر جانے کے بعد اس قدر یاد کیوں آتے ہیں؟ پھر ان کی یاد اچھی کیوں لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے اس یاد کے گنبد میں بند پڑے رہو اور زندگی تمام ہو جائے۔ عاشیہ نے نہایت آہستہ

لے آنسو اپنے آنچل میں جذب کر لیے۔

اسے پتا چل گیا تھا کہ اب اس کی زندگی میں آنسو بہت اہم کردار ادا کریں گے۔

رو کر دل ہکا کرنے کا ہنر وہ جان گئی تھی۔ رافع کی کج ادائی نے اسے دکھی کرنا تھا اور وہاں کی یاد نے اس پر ٹھنڈا پھاہا بن کر اترتا تھا کہ زندگی بہت ہی مشکل ہے اور اسے گزارنا مشکل تر ہے۔

☆☆☆

عفیرہ امیر بے سندھ سی بند پر لپٹی ہوئی تھی زوہیب اور وہاں احمد اس کے قریب ہی تھے۔ انگریز اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ فرحت منیر آصف کا نجوی لاش کو اس کے گاؤں

پہنچانے کے انتظامات میں مصروف ہو چکا تھا۔!

یہ سب کچھ ایک دم اور اچانک ہی ہوا تھا۔

وہاں حیران تھا۔

فرحت اور زوہیب بھی پریشان سے تھے۔ انہیں یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ عفیرہ جیسی پتھر لڑکی صف کا نجوی موت کا اس طرح سے اثر لے گی؟

اور وہاں سوچ رہا تھا۔

سنو بال لڑکی۔۔۔ بھلا اس طرح بھی کوئی محبت کو چھپاتا ہے۔ تم تو سب کے سامنے آصف کا نجو کو بھلا کہتی تھیں۔ لمحوں میں اسے بے عزت کر کے رکھ دیتی تھیں۔ بھلا تم۔ اسے اس قدر اور اس

ناز سے چاہ سکتی ہو مجھے یہ بھی اب تک خواب لگ رہا ہے۔ جیسے تم ابھی اٹھو گی اور کہو گی۔

”پاگل ہوئے ہو جی۔“ میں اور آصف کا نجو جیسے دل بھینک لڑکے سے عشق کروں۔ حجت کروں۔ مگر ایسا تو نہ ہوا تھا۔

اس کی حالت تو ایک ایک لمحہ کی گواہ تھی۔ وہ سوچتا کچھ تھا اور حقیقت کچھ تھی۔ یہی تو سچ تھا۔ اور پھر اسے ہوش آ گیا۔

آہستہ آہستہ عفیرہ نے آنکھیں کھولیں۔ اُن دونوں کو سامنے پا کر عفیرہ نے ہونٹ بھیج لیے اور آنکھیں موند لیں۔

”عفو۔“ وہاں احمد نے اس کا ہاتھ اپنے گرم مگر مضبوط ہاتھ میں لے لیا۔ عفیرہ کے وجود میں کوئی باندھنچی ورنہ وہ وہاں کے ساتھ موٹر سائیکل پر چڑھتی تھی تو اس کے اندر کی دنیا میں اودھم مچ جاتا تھا۔ اپنی دھڑکنوں کی آواز وہ صاف سنتی تھی پر اب تو وہاں کو بھی لگ رہا تھا جیسے برف کی ڈلی اس کے

میں ہو۔

◆◆◆◆◆

ہولی۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ وہاج نے کہا۔

”مگر وہاج۔“ زوہیب نے کہنا چاہا تو وہاج نے ہاتھ اٹھا کر اُسے خاموش کر دیا۔

”عفیرہ چاہتی ہے تو یہ ضرور ہمارے ساتھ جائے گی۔“

وہاج کی بات پر کسی کو اعتراض نہ تھا، عفیرہ نے تفکر آمیز انداز میں کہا۔

اس وقت وہ وہاج کو اس قدر اچھی لگی کہ بے ساختہ ہی اس نے اُس کا سر تھپتھا دیا۔

اور پھر صبح کا جھپٹنا نمودار ہو چکا تھا جب پچارو اُس بڑی سی حویلی میں داخل ہوئی جس کا نام

”کانجوکل“ تھا۔ جدید و قدیم طرز کی یہ حویلی خاصی بڑی تھی مین گیٹ سے داخل ہونے کے بعد سُرخ

روش کے دونوں طرف آٹم کنوا اور خوبانی کے باغ تھے۔ آخر میں چھوٹا سا انار کا باغ بھی تھا اور

فالسوں کے بوٹے بھی اپنے پھل سے لدے ہوئے تھے۔ بیلوں سے ڈھکے کارپورج میں وہاج احمد

نے پچارو روک دی۔ اُس کی فرزند سیٹ پر عفیرہ بیٹھی تھی جس کی آنکھیں آنسو روکنے کی کوشش میں

سُرخ تھیں۔

حالانکہ فرحت اور زوہیب نے کتنا چاہا تھا کہ وہ ذرا سا سولے مگر وہ نہ مانی تھی۔ وہ دونوں

پچھے آصف کاجو کے تابوت کے پاس بیٹھے تھے جس پر سُرخ گلاب کے پھولوں کی چادر ڈالی ہوئی

تھی۔

سُرخ گلاب آصف کو کس قدر پسند تھے۔ جنون کی حد تک وہ پھولوں سے پیار کرتا تھا اور بار بار

سُرخ گلاب اُس نے عفیرہ کو بھی دیے تھے۔ اور آج ویسے ہی سُرخ گلاب اُس کے تابوت پر تھے۔

گاڑی کی آواز سن کر ملازم باہر آ گیا تھا کہ اتنی سویرے سویرے کون آ گیا ہے۔

”بڑے صاحب ہیں۔“ وہاج نے پوچھا۔

”ہاں جی۔ آپ وہاج میاں سلام صاحب۔“ نذیر وہاج کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا کہ چھٹیوں میں

آصف کاجو کے ساتھ جو دوست آئے تھے اُن میں وہاج بھی تو تھا۔

”چھوٹے صاحب نہیں آئے؟“ نذیر نے پوچھا۔

”تم سیف صاحب کو تو بلاؤ۔“ وہاج نے کہا نذیر کے پلٹنے پر بولا۔ ”ٹھہرو میں بھی ساتھ چلتا

ہوں۔“

وہاج گاڑی سے اُترا اور اندر چلا گیا۔ عفیرہ نے گردن موڑ کر اس بڑی حویلی کی جانب

دیکھا۔

تو آصف کاجو یہ گھر تھا جس میں تم مجھے لانا چاہتے تھے میرے ساتھ تم زندگی کو گزارنا چاہتے

تھے۔

اس حویلی کے حوالے سے تم نے ڈھیروں خواب دیکھے تھے۔ پر شاید تمہیں پتا نہیں کہ میں تو

بہت چھوٹے سے کچے گھر میں رہنے والی لڑکی ہوں۔ میں نے بخدا کبھی اتنے بڑے گھر اور

راہدار یوں والے برآمدوں کا خواب ہی نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھلا بن چاہے بغیر کسی خواب کے کب

میری کوئی خواہش پوری ہو سکتی تھی۔

آصف کاجو تم نے میرے لیے جو خواب دیکھے تھے نا یہ صرف تمہاری محبت تھی ورنہ اتنی بڑی

حویلی کے لائق میں نہ تھی۔ یہاں رہنے والے لوگوں کے آورش یقیناً بہت ادنیٰ ہوں گے بھلا وہاں

”عفو! تجھے پتا ہے آصف کیا کہتا تھا۔؟“ وہاج نے آہستہ سے کہا تو عفیرہ کو لگا۔ جیسے اُس

کے وجود میں حرارت آ گئی ہو۔ وہاج کہہ رہا تھا۔

”وہ کہتا تھا۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر عفیرہ نے میری محبت کو قبول کر لیا نا تو مارے خوشی کے

میرا دل بند ہو جائے گا۔ عفو تو نے اس کی محبت کو قبولیت کا شرف کیوں بخشا۔ کیوں ہم سے ایک پیارا

اور مخلص دوست جدا کر دیا ہے؟ تمہاری محبت نے اُسے مار دیا ہے عفو۔“

عفیرہ نے اپنے ہونٹوں کو تختی سے دانتوں تلے دبایا، اُس کی آنکھوں کے پیوٹوں کو جنبش

ہوئی۔ اور پھر دو آنسو موتیوں کی شکل میں آنکھوں کے کونوں سے بہہ نکلے۔

”عفو۔۔ میں نہیں چاہتا کم تم ڈھکی ہو۔۔ ہمیں سب کو تمہاری زندگی پیاری ہے۔ اتنی اچھی

دوست کو ہم کھونا نہیں چاہتے۔ تم کسی لحاظ کے بغیر ہی آصف کاجو کی موت پر آنسو بہالو۔ اپنے دل کا

بوجھ ہلکا کر لو کہ یہ تمہارا حق بھی ہے۔ اور۔۔ اور عفو تم تو چٹان ہو پھر کیوں ٹوٹ رہی ہو۔“

”وجہی۔۔ میں انسان بھی تو ہوں نا۔“ عفیرہ نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی

آنسوؤں بھری آنکھیں ابھورنگ ہو رہی تھیں جیسے کہ ابھی ابھونیک پڑے گا۔

”یقین کرو تم سب گواہ ہو میں نے بھی نہیں چاہا کہ وہ مرجائے۔۔۔“

”یہ تو کسی نے کبھی نہیں چاہا۔“

”اگر یہ سب تم مجھے پہلے کہہ دیتے تو۔۔ تو میں اُس سے کچھ بھی نہ کہتی۔ میں مجرم ہوں نا۔“

”نہیں تم مجرم نہیں ہو۔“ وہاج بولا۔

”پھر۔۔ پھر میرے دل پر بوجھ کیوں ہے؟“ عفیرہ نے پوچھا۔

”تمہارا کوئی قصور نہیں شاید آصف کی موت ایسے ہی لکھی تھی تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ ہم اُس

کی لاش کو لے کر جا رہے ہیں۔ اُس کے گھر۔“

”میں بھی چلوں گی۔“ عفیرہ بولی۔

”تمہاری طبیعت۔“ وہاج نے کہنا چاہا۔

”پلیز وجہی۔ انکار مت کرنا۔ میری اتنی بات تو مان لو۔ میں بھی جاؤں گی۔“ وہ لجاجت سے

نظر بھی آتی۔

اور جب یہاں کے باسیوں کو پتا چلتا کہ میں گاؤں جھمرہ کے ایک معمولی سے مزارعے کی باغی بٹی ہوں تو سب تمہاری پسند پر ہنستے۔ یقیناً تمہارے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی ہوگی۔

کتنے دل تمہارے نام پر دھڑکتے ہوں گے۔

کتنی آنکھیں تمہارے دیدار کی پیاسی رہتی ہوں گی۔

اور کتنے ہی کان تمہاری آہٹوں کے منتظر ہوں گے اور تمہارا دل دھڑکا بھی تو ایک معمولی لڑکی کے لئے! کتنے معصوم تھے تم۔

واقعی تمہیں میری محبت نے مارا ہے۔ وہاں سچ کہتا ہے شاید محبتیں مار ہی تو دیتی ہیں۔

مجھے بھی وہاں احمد کی محبت نے مار دیا ہے وہ محبت جسے میں نے دل کے جودان میں نہایت سنبھال کر رکھا ہے میں نے تو خود سے بھی چھپا کہ رکھی تھی اور ہمیشہ رکھوں گی میں بھلا کیسے وہاں کی ماں کا لہجہ بھول جاؤں۔

کیسے میں غاشیہ کمال کا وہ تنق صفت انداز بھلا دوں۔ نہیں۔ نہیں۔ عفریہ نے سر جھٹکا اور تبھی وہاں کے ساتھ چار بندے آ گئے۔

زوہیب اور فرحت منیر بھی جیب سے اتر گئے اور اُن آدمیوں کی مدد سے کلمہ پڑھتے ہوئے تابوت اُتارنے لگے۔ عفریہ بھی اُن کے ہمراہ اندر چلی آئی اور پھر ٹھٹھک گئی برآمدے میں سنگ مرمر کے گول ستون سے ٹیک لگائے۔

وہ کانچ جیسی آنکھوں والی گرل فُل خاتون تھیں سپید رنگت اور سنہری بال انہیں کسی اور دیس کا ہی بتا رہے تھے۔ اُن کی کانچ ایسی آنکھوں میں اُنسو تھے اور باریک گلابی لب کپکپا رہے تھے۔

تابوت اندر لے جایا جا چکا تھا اور عفریہ تھکے تھکے قدموں سے اُس خوبصورت لیدی کی طرف بڑھی اور دوسرے لمحے وہ اُن کے بوڑھے مگر مضبوط بازوؤں میں تھی۔

”گرینڈ ما میرا کوئی تصور نہیں۔“ عفریہ کی سسکیوں میں ڈوبی آواز نکلی۔

”مجھے پتا ہے عفریہ قصور تو کسی کا بھی نہیں۔ شاید اُس نے اسی طرح۔“ اُن کی آواز بھرا گئی اور عفریہ جچیں بڑھتی چارہ تھیں وہ اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

کتنی خواہشیں تھیں اُس کی کہ تم یہاں آؤ۔ مجھے کہتا تھا وہ گرینڈ ما میں ایک بار تو اُسے یہاں ضرور لاؤں گا اُسے سارا گھر پھراؤں گا اور۔ اور پھر جب وہ چلی جائے گی تا تو پھر میں پہروں۔ ایک ایک جگہ بیٹھ کر اُس کی خوشبو محسوس کروں گا۔ کتنا اچھا لگے گا نا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار تم یہاں آؤ۔

”بس ایک بار۔“ عفریہ نے پوچھا۔

”وہ تو تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں رکھنا چاہتا تھا۔ پر تم ہی شاید نہ مانتی تھیں۔“ وہ شکی انداز میں بولیں۔

”گرینڈ ما۔ دیکھیں میں مانی تو وہ چلا گیا ہے نا بے وفا۔ ہر جانی ہے نا۔ مجھے اپنی نظروں میں گرا کر دوسرے دیس چلا گیا۔ آخر کیوں کیا اُس نے اس طرح؟“ عفریہ اُن کے سینے سے سر رگڑتے ہوئے کہہ رہی تھی اور گرینڈ ما کے لب خاموش تھے جسے کہ اب کچھ بھی نہ کہیں گے۔

پھر تو پوری حویلی میں کہرام مچ گیا۔ آصف کا نجو کی ماں سینہ کو بی کر رہی تھیں۔ اُس کی

بھابیائیں بہنیں اور کزنز رو رہی تھیں۔ اور وہ بھی گرینڈ ما کا سہارا لیے اندر آ گئی جہاں بڑے ہال میں اتنی جلدی انتظام بھی مکمل ہو گیا تھا۔ سفید چاند نیاں بچھا دی گئی تھیں۔ اگر بیٹوں اور لوبان کی خوشبو سے ہال مہک رہا تھا۔

عفریہ ایک کونے میں بیٹھ گئی کسی نے بھی تو اُس کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ اور نہ ہی عفریہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسے دیکھے وہ کسی کے کسی سوال کا جواب نہ دینا چاہتی تھی۔ جلد ہی حال خواتین سے بھر گیا تھا۔ آصف کا خاندان شاید بہت بڑا تھا اور سب قریب قریب ہی رہتے تھے بھی تو سب ہی آ گئے تھے۔

اور پھر ظہر کے بعد اُسے جب آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا رہا تھا تو اُس کی بہنیں اور ماں بچھاڑیں کھا رہی تھیں اُس وقت عفریہ کا جی چاہا انہیں کہے۔

میرا دکھ بھی تم سے کم تو نہیں ہے۔ بے شک میں نے اُسے چاہا نہیں مگر میرا بھی اُس سے رشتہ تھا۔

دوستی کا رشتہ

خلوص کا رشتہ

سہارے کا تعلق

جب مجھے سہارے کی ضرورت پڑی تو میں نے بھی تو اسی کی طرف ہاتھ بڑھا یا۔ میرا بھی کچھ لگتا تھا یہ دل میں بہت سے جملے سر اُٹھاتے رہے مگر اُس نے لیوں پر چپ کا قفل لگایا ہوا تھا۔

پھر جب اُس کا منہ دکھایا جانے لگا تو گرینڈ ما اُس کے قریب آئیں اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی کے قریب لے گئیں۔ اور آہستہ سے سفید چادر ہٹا دی۔ عفریہ نے دیکھا کہ آصف کا چہرہ بالکل ایسے تھا جیسے وہ ابھی سویا ہو اور ابھی اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔ اُس کے چہرے پر نرمی اور بلایا معصومیت تھی۔ لیوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”سنو یہ کچھ کہہ رہا ہے۔“ گرینڈ ما نے سرگوشی کی۔

”جی۔“ عفریہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کہتا ہے گرینڈ ما۔ عفو کو نہ جانے دینا۔“

”اوہ تو۔“ عفریہ نے سر جھٹکا۔ اور پھر گرینڈ ما سے ہاتھ چھڑا کر اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

پھر کیا کچھ ہوتا رہا اُسے خبر نہ تھی۔

سہ پہر کے بعد کھانے کیا انتظام تھا گرینڈ ما نے بڑی مشکل سے اُسے کھانا کھلویا تھا کہ اس گھر میں وہ واحد ہی تو تھیں جو اُس سے مکمل طور پر متعارف تھیں۔

رات کو زوہیب وہاں اور فرحت واپس جا رہے تھے مگر سیف اللہ کا نجو نے انہیں روک لیا تھا۔ اور آخر انہوں نے اُس کی بات بھی مان لی تھی۔

گرینڈ ما نے عفریہ کو اپنے ساتھ ہی سلایا تھا۔ وہ کب اتنے نرم بستروں پر سونے کی عادی تھی۔ پر گرینڈ ما کے خلوص نے اُسے موہ لیا۔ وہ اُس سے آصف کی باتیں کر رہی تھیں۔

”میرا یہ پوتا انتہائی نٹ کھٹ اور شریر تھا۔ پتا ہے عفریہ یہ ضدی بھی بہت تھا۔ جب بھی کوئی فرمائش کرتا وہ جب تک پوری نہ کروا لیتا تب تک نہ خود جچیں سے بیٹھتا اور نہ بیٹھنے دیتا۔ پتا ہے

تھا۔

تمام رات اُس کا ذہن اُبھرتا اور ڈوبتا رہا تھا۔ کوئی بھی فیصلہ اُس سے نہ ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ بہت تھک چکی تھی۔ سنا جاتا تھا کہ ایک جگہ ٹھہر جانا چاہتی تھی۔
اور۔ اور شاید ”کانجول“ ہی اُس کی منزل تھا۔ گاؤں وہ جانے سکتی تھی۔
ماما شرمہ کے دل میں شک کا ناگ بیٹھا تھا۔ اور اُس ناگ نے شوکتا تھا۔ وہ کبھی بھی یہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔

اُسے کوئی راستہ نہ مل رہا تھا پھر بھی فیصلہ نہ ہو رہا تھا ایک پل کو وہ نہ سوئی تھی۔
صبح پھر ستر بچھ گئی تھی، تعزیت کے لیے لوگ آنے لگے تھے۔ عقیقہ نہ چائے کی ایک پیالی لی تھی اور ہال میں آ کر بیٹھ گئی تھی گرینڈ ما نے اُس کا اب سب سے تعارف کرایا تھا۔
”یہ آصف کی کلاس فیلو ہے۔“ سب ہی نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔
آصف کی ماں نے روتے ہوئے کہا تھا۔
”تم کیسے موقع پر آئی ہو کہ ہم تمہاری خدمت نہ کر سکے۔“
”کوئی بات نہیں آئی۔“ عقیقہ ہوئی۔
”ہم پر تو پہاڑ ٹوٹا ہے۔“
”جی۔“ عقیقہ نے سر جھکا کر کہا۔

”توڑا کس نے یہ پہاڑ؟“ جملہ تھا یا تیر جو سننا تھا ہوا آیا اور عقیقہ کے دل میں گڑھ گیا۔ اُس نے اپنا تھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا تو بالکل سانسے ہی وہ کھڑی تھی سیاہ سوٹ میں اُس کا گورا رنگ دمک رہا تھا۔ سب جھمی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئیں تھیں۔ سرخ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔
”یہ روزینہ ہے“ آصف کی ٹھیکرے کی مانگ۔ ”آصف کی ماں نے تعارف کرایا تو چھن چھن چھن بہت کچھ عقیقہ کے اندر ٹوٹ گیا۔
تو آصف کا نجو یہ ہے سیاہ مائی لباس میں ملبوس وہ بددعا جو تمہاری محبت کو کھا گئی اور سنو اب میں اس بددعا کے ساتھ ہی رہوں گی۔

”ہاں میں گرینڈ ما کا کہا مان لوں گی۔ میں ”کانجول“ میں رہوں گی۔“
وہ فیصلہ جو ساری رات نہ ہوا تھا اب بالکل اچانک اور ایک دم ہی ہو گیا تھا۔ عقیقہ جو چیخ قبول کرنا جانتی تھی یہ چیخ بھی اُس نے قبول کر لیا۔ اب تک وہ محبتوں کے سائے میں رہی تھی اب نفرتوں کے زیر سایہ بھی رہنا چاہتی تھی۔

اور اُسی روز اُس نے وہاں احمد سے کہہ دیا اب میں ”کانجول“ میں رہوں گی۔
اُس کے اس فیصلے پر جہاں گرینڈ ما بہت خوش تھیں وہیں وہاں گروپ خفا تھا پر وہاں کو پتا تھا وہ ایسی ہی سر پھری ہے جو فیصلہ کرتی ہے پھر اُس سے نہیں ہٹتی۔
اس لیے وہ اُسے ”کانجول“ چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ اور وہ گرینڈ ما کے سینے میں سر چھپا کر نجانے کیا کچھ سوچنے لگی تھی۔

رات بادل کے ایک ٹکڑے کو

چاند سے میں نے کھلتے دیکھا

مجھ کو یاد اپنی زندگی آئی

تمہارے بارے میں کیا کہتا تھا۔“
گرینڈ ما کی آنکھیں چمکیں۔
”جی کیا کہتا تھا؟“ عقیقہ نے پوچھا۔
”کہتا تھا گرینڈ ما کبھی تو میرے جذباتوں کو وہ مانے گی کبھی تو میری خواہش کی تکمیل ہوگی۔ مجھے بتائیں گرینڈ ما وہ دن کیسا ہوگا۔“
”اچھا ہی دن ہوگا۔“ میں کہتی۔

”بہت اچلا اچلا روشن روشن سادون ہوگا نا؟“ وہ پوچھتا۔
”ہاں بہت خوبصورت دن ہوگا جب تمہاری خواہشوں کی تکمیل ہوگی۔“
”گرینڈ ما۔ وہ اسی حویلی میں رہے گی نا؟ پتا ہے میں اپنی خواہگاہ کے در پیچے تلے کیا رہا ہوں گا۔ اُس میں ڈھیر سارے گلاب لگواؤں گا اور۔ اور جب وہ صبح سویرے در پیچہ کھولے گی تو گلاب اُسے جھوم جھوم کر سلام کریں گے تب وہ نہایت پیار سے مجھے جگائے گی۔ تب گرینڈ ما کتنا مزہ آئے گا۔ ہے نا؟“
”پلیز گرینڈ ما۔“ عقیقہ نے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔
”وہ تو کبھی تمہارے ذکر سے بے زار نہیں ہوتا تھا گھنٹوں میرے ساتھ وہ صرف تمہاری باتیں کرتا تھا۔“

”میں بے زار تو نہیں ہوئی“ عقیقہ جلدی سے بولی۔
”سنو عقیقہ۔ میری بیٹی وہ یہ بھی کہتا تھا میرا جی چاہتا ہے ایک بار کسی بہانے سے اُسے یہاں لے آؤں پھر آپ اُسے جس طرح بھی ممکن ہو روک لیتے گا اُسے جانے نہ دیتے گا۔ اب دیکھو وہ تمہیں لے آیا ہے۔ تم یہی رہو گی نا ہمارے پاس؟“ وہ پوچھ رہی تھیں۔
”نہیں۔ نہیں گرینڈ ما۔“ عقیقہ جلدی سے بولی۔
”کیوں؟“ گرینڈ ما نے کہا۔

”میں یہاں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔“
”تم کس قابل ہو میں جانتی ہوں۔ یہ آصف کو پتا تھا اور پھر ہیرے کی قدر۔ جو ہری جانتا ہے تم یہیں رہو۔“

”پر کیسے؟“ عقیقہ نے پوچھا۔
”میرے پاس۔ میرے ساتھ۔“
”ممکن نہیں۔“ عقیقہ کانپ کر بولی۔
”ہے ممکن۔“ تم حامی تو بھرو۔“
”آپ مجھے سوچنے تو دیں۔“ عقیقہ بولی۔

”بس تم یہیں رہو گی عقیقہ کہ یہ میری خواہش ہی نہیں آصف کی تمنا بھی تھی دیکھو وہ اپنی جان دے کر تمہیں یہاں لے آیا ہے کیسا بہانہ اُس نے سوچا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی کرتا ہے کبھی نہیں؟“

”ہاں گرینڈ ما بھلا اس طرح بھی کوئی کرتا ہے۔“ عقیقہ نے ہونٹ کا اوپری گوشہ دانتوں تلے دبایا اُس کی آنکھوں میں آنسو اُند آئے تھے وہ جو رونا نہ جانتی تھی آج بے تحاشا رونے کو جی چاہ رہا

شدت غم سے پھر میں سو نہ سکا

چنگی ہوئی چاندنی۔ لیوں اور انار کے شکوفوں کی ملی جلی خوشبو نے اس بڑی سی پُرفوں حویلی کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا اور۔۔۔ چاندنی راتوں میں شاید خوشبوئیں کچھ زیادہ ہی دل و ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

اس وقت تم ساتھ ہوتے آصف کا نجو شاید زندگی کا رخ کچھ اور ہی ہوتا۔ عفریہ امیر نے سبزے کو قدموں تلے روندتے ہوئے سوچا۔ ایک انوکھا سا درد تھا جو اس کے رگ و ریشے میں اتر گیا تھا۔

یہ بعض لوگ دور جانے کے بعد اس قدر زرد پیک کیسے آ جاتے ہیں؟

ہاں۔ آصف کا نجو تمہیں میں اپنے بہت قریب پائی ہوں۔ ان گزرے دس دنوں میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب تم مجھے ہر پل ہر ساعت یاد نہ آئے ہو۔

تمہیں میری نفرت نہ مار گئی اور محبت کے ایک دن نے ہی تمہاری جان لے لی۔

میں اس قدر سیاہ بخت تو نہیں ہوں۔

کاش! ایک بات مجھے موقع تو مل جاتا میں اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کر دیتی۔ مجھے تو یہاں آ کر پتا چلا ہے کہ تم مجھے کتنا چاہتے تھے اور یہ سچ بھی تو تھا۔

گرینڈا مانے اسے بتایا تھا کہ وہ جب بھی آتا ان سے اسی کا ذکر کرتا رہتا تھا اور بعض مرتبہ وہ ہنس کر کہتیں۔

”آ صی۔ تجھے اس کے علاوہ کوئی یاد نہیں آتا۔ آخر تیرے اور بھی تو دوست ہیں۔“

”گرینڈا مجھے وہ بے حد پیاری ہے اور جو پیارا ہو وہی یاد آتا ہے۔ اور مجھے بھی کائنات میں عفریہ جیسا کوئی نہیں دکھتا۔“ وہ نہایت بے باکی سے اپنی محبت کا اعتراف کرتا اور گرینڈا ہنس دیتیں اس کی معصوم محبت پر۔

”سنو عفریہ امیر۔ نہایت نرم مگر لہجے کی سخت آواز نے اسے مخاطب کیا تو وہ خیالوں سے نکل آئی۔ گردن ترچھی کر کے دیکھا تو اس کے قریب ہی روزینہ کھڑی تھی۔ سفید سوٹ میں وہ کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔

سیاہ لائے بال دوپٹے سے جھانک رہے تھے۔ اس کی کاجل سے خفا بادام جیسی آنکھیں جن میں نہایت ادنی رچی ہوئی تھی عفریہ پر جھی ہوئی تھیں۔ گزرے دس روز میں بار بار اس سے عفریہ کا سامنا ہوا تھا مگر اس نے عفریہ سے بات نہ کی تھی۔ بلکہ ہر بار ایک قہر آلود نظر اس پر ڈال کر گزر جاتی اور عفریہ مسکرا دیتی۔

”زہے نصیب آج مجھ پر بھی نظر کرم کر ہی ڈالی آپ نے روزینہ بیگم۔“ عفریہ نے مسکرا کر کہا۔ تب بھی روزینہ کے چہرے پر مسکراہٹ کی کوئی رے نہ اُبھری۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”کہو! میں ہمد تن گوش ہوں۔“ عفریہ سینٹ کی بیچ پر بیٹھ گئی۔ جبکہ روزینہ اب بھی کھڑی تھی۔

”بیٹھو گی نہیں؟“ عفریہ نے بے تکلفی سے کہا۔

”تم کب جاؤ گی؟“ وہ تڑخ کر بولی تھی۔

”اُدھ۔ تم چاہتی ہو میں چلی جاؤں۔“

”ہاں۔“ روزینہ نے سر ہلایا۔

”کیوں؟“ عفریہ نے مزالیتے ہوئے پوچھا۔

”میں۔ میں نجانے کیوں تمہیں یہاں برداشت نہیں کر پا رہی عفریہ امیر۔“ وہ نہایت سچائی سے بولی۔

”کوئی وجہ تو ہوگی مجھے برداشت نہ کرنے کی؟“ عفریہ مزالیتے ہوئے بولی۔ حالانکہ وہ جان گئی تھی، سب سمجھ گئی تھی کہ روزینہ کے کہنے کا مطلب کیا ہے؟ مگر بھی کبھی انجان بننے میں بھی تو مزا آتا ہے اور وہ بھی وہی مزا لے رہی تھی۔

”تمہاری یہاں موجودگی میرے دل کے زخموں کو مزید بڑھا دیتی ہے۔“

”دل کے زخم۔“ عفریہ نے آہ بھر کر کہا۔ ”تمہیں کیا معلوم روزینہ بیگم کہ زخم کہاں کہاں اور کیسے کیسے لگتے ہیں۔ تمہیں شاید یہ ڈکھ ہو کہ آصف نے تمہیں ٹھکرا دیا۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ وہ حیران تھی۔

”کچھ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں، سمجھنے کی ہوتی ہیں اور میری عقل اتنی کم بھی نہیں کہ میں کچھ نہ سمجھ پاؤں۔“ عفریہ بولی۔

”پھر تم جو کچھ بھی سمجھ سکی ہونا وہی بہت ہے۔ میں چاہتی ہوں تم یہاں سے چلی جاؤ۔“ روزینہ نے کہا۔

”ضروری ہے یہ؟ عفریہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ اس لیے کہ میں تو یہاں سے نہیں جا سکتی مگر تم تو جا سکتی ہونا۔ تم مجبور نہیں ہو عفریہ امیر، مگر میں ایسی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ جو نظر نہیں آتیں مگر بہت مضبوطی سے پہنائی گئی ہیں۔ جن سے جان نہیں چھوٹی۔ تم تو مجبور نہیں ہونا اپنی مرضی کر سکتی ہو۔“

”تم بھی کر لو اپنی مرضی۔“ عفریہ نے مشورہ دیا۔

”کہنا تاکہ“ کا نجوکل“ کی لڑکیاں اس عقوبت خانے میں مروتو سکتی ہیں پر اپنی مرضی کرنا تو درکنار اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ روزینہ کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ شاید وہ کھڑی کھڑی تھک گئی تھی۔ نہایت دھیمے سے وہ سچ کے کونے پر ٹک گئی۔

”روزینہ۔“ عفریہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تب اس نے اپنی بے حد اُداس نظریں اس کے چہرے پر ٹکادیں۔ اور بولی۔

”مجھے بتاؤ تو ایک بات۔“

”پوچھو۔“ روزینہ نے ہولے سے کہا۔

”تم بہت خوبصورت ہو۔ مجھے تو تم کسی اور دیس کی لگتی ہو پھر۔ پھر آصف نے تم جیسی لڑکی کو کیوں ٹھکرا دیا؟“

”تمہاری وجہ سے۔“ روزینہ نے بتایا۔

”میری وجہ سے۔“ عفریہ نے حیرانگی سے کہا مگر یہ حیرت اسے خود بھی مصنوعی لگی۔

”ہاں عفریہ امیر تم اسے بے حد پیاری تھیں۔“ سچی تو اس نے میرے خوابوں کو میری آنکھوں سے نوج ڈالا۔ اسے تو یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ ”کاجوکل“ میں رہنے والی یہ یتیم دیسیر لڑکی بہت بچپن سے اپنے خوابوں میں اسے ہی دیکھتی ہے۔ ہاں عفریہ وہ میری سوچ تھا، میرا خواب تھا۔ میری

میں سب کچھ جان گئی تھی۔

”تو یک طرفہ محبت نے اسے بھی نگل لیا۔“ وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی۔

”ہاں یہی بات تھی۔“ عفریہ بولی۔

”پھر تم یہاں کیوں ٹھہری ہوئی؟ اس کی لاش کے ساتھ کیوں آئی ہو؟“ روزینہ کی آنکھوں

میں پھر شک لہریں لے رہا تھا۔

”آصف ہمارا بہت اچھا دوست تھا۔ اور ہم اس کی لاش کے ساتھ آئے تو یہ ہمارا فرض تھا۔

میں تو گرینڈ ما کی وجہ سے رہ رہی ہوں کہ ان کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ اگر تم پسند نہیں کرتیں تو پھر میں چلی جاتی ہوں۔“

”چلی جاؤ تو بہتر ہے۔“ روزینہ نے ملتی انداز میں کہا۔ ”پلیز مائنڈ نہ کرنا عفریہ، بس میں نہ

جانے کیوں تمہیں یہاں برداشت نہیں کر پار رہی حالانکہ جو کچھ تم نے کہا ہے تمہارا کوئی بھی قصور نہیں

ہے۔ مگر میں اپنے دل کا کیا کروں۔ میر ذہن تمہیں یہاں دیکھ کر راضی نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دینا

کہ میں گھر آئی مہمان کو جانے کا کہہ رہی ہوں مگر تم یہ جانو عفریہ امیر کہ تم تو یہاں سے جاسکتی ہو مگر

میں یہاں سے سوائے قبر کی عمیق گہرائیوں میں اترنے کے اور نہیں جاسکتی۔ اگر خود کشی حرام نہ

ہوئی تو میں اسی روز ایسا کر لیتی جب میں نے گرینڈ ما اور آصف کا نجوی گفتگو سنی تھی اور موضوع

تمہاری ذات تھی۔ اس کے لفظ لفظ سے تمہاری محبت کا شہد یک رہا تھا۔ تمہیں پتا نہیں کہ اس روز میں

کتناروں کی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ ساری عمر میں صحرا کی دھوپ میں سایہ تلاش کرتی رہوں گی مگر

تیجی دھوپ کے علاوہ مجھے کچھ نہ ملے گا۔ وہ۔۔۔ وہ تو تمہاری محبت میں پاگل تھا۔ میں تمہیں دیکھنا

چاہتی تھی۔ کہ تم میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔“ روزینہ نے کہا۔

”پھر دیکھ لیا؟ عفریہ بولی۔

”ہاں دیکھ لیا اور سمجھ بھی لیا۔“

”کیا سمجھا؟“ عفریہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”تم اتنی حسین نہیں ہو عفریہ امیر جس قدر آصف کی آنکھوں نے تمہیں ثابت کیا۔“ روزینہ

نہایت معصومیت سے بولی۔

”سچ کہتی ہو؟“ عفریہ امیر کی بھوری آنکھیں اس کے سچ پر مسکرا دیں۔

”یہ بات ثابت ہوئی کہ حسن نظر میں ہوتا ہے۔ اور آصف بھی مجھے حسین سمجھتا تھا۔ بر میں یہ

اعتراف کرتی ہوں روزینہ کہ میں نے تم جیسی خوبصورت لڑکی اب تک نہیں دیکھی۔ یقین کرو اگر میں

لڑکا ہوتی تو تم پر عاشق ہو جاتی۔“

”میں حسین نہیں ہوں۔“ روزینہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”اگر میں حسین ہوتی تو آصف تمہاری طرف کیوں بڑھتا؟“

”بات وہیں آتی ہے کہ حسن نظر میں ہوتا ہے۔“

”ہاں۔“ روزینہ نے گردن ہلائی پھر بولی۔ ”تم کب جا رہی ہو؟“

”جب تم کہو۔“ عفریہ بولی۔

”جس قدر جلد ہو سکے تم چلی جاؤ۔“ روزینہ بیخ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور مجھے معاف ضرور کر

خواہش تھا۔ یعنی دل کے جتنے احساسات تھے صرف اسی کے لیے تھے۔ میں نے نہایت پاک محبت

کی تھی اس سے کہ میں ٹھیکرے کی مانگ بھی آصف کی۔ میری پیدائش پر اذان کے ساتھ ساتھ میری

سماعتوں میں آصف کا نجو کا نام انڈیل دیا گیا تھا۔ اور مجھے یقین ہے میں اس وقت بھی مسکرا رہی ہوں

گی۔ اس نام کو میں نے گلے کا پار بنالیا تھا۔ اور دل کی دھڑکن بھی۔ تمہیں یقین نہ آئے گا عفریہ

امیر کہ جب میں آٹھ دس برس کی تھی تو جب آصف چھٹیوں میں گھر آتا تو میں اپنے رنگ دیکھ کر خود

ہی حیران ہوتی تھی۔ مگر اس نے بھی مجھ پر التفات کی نظر نہیں ڈالی۔ یوں بھی میں بہت کم اس کے

ساینے جاتی تھی۔ اور یوں زندگی کا ایک ایک پل میں نے اس کے نام کر دیا تھا۔ مگر وہ تو اور آسمانوں

کا بچہ ہی تھا۔ میں اسے یہاں کے کسی کو نہ کھدے میں نظر نہ آئی۔ اور اس نے زندگی کے رنگوں

میں سے تمہارے نام کا رنگ حاصل کر لیا۔“ روزینہ کا لہجہ ایک بار پھر سخت ہو گیا۔

”سنو روزینہ۔“ عفریہ نے اس کے ہاتھ کو کھپکتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بھی آصف کی محبت کا

جواب محبت سے نہیں دیا۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ روزینہ کو اعتبار نہ تھا۔

”اعتبار کرو۔“ عفریہ بولی۔

”کیسے کروں اعتبار؟“ وہ بے یقین تھی۔

”اعتبار نہ کرنے کی وجہ؟“

”وہ جب بھی آتا تھا، گرینڈ ما کی جھولی میں سر رکھے تمہارا ہی ذکر کرتا رہتا تھا۔“ روزینہ نے

بتایا۔

”اور تم سنتی رہتی تھیں؟“

”جب پہلی بار میرے کانوں میں تمہارا نام پڑا تو پھر میں ٹوہ میں رہنے لگی۔ وہ گرینڈ ما سے

گھنٹوں تمہاری باتیں کرتا رہتا۔“

”تمہیں اس نے ٹھکرایا کب تھا؟“

”اپنے منہ سے اس نے یہ بات نہیں کہی تھی مگر اس کا منصوبہ تھا کہ ایک روز تمہیں یہاں لے

آئے گا اور باقاعدہ اپنی محبت پانے کا اعلان کر دے گا۔ یہ سب گرینڈ ما کی ڈھیل کا نتیجہ تھا۔ تمہاری

محبت نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔ تم۔ شہری لڑکیاں کس طرح محبت کرتی ہو عفریہ امیر کسی کو آگے

پیچھے کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ ہمیں بھی وہ سلیقہ سکھا دو۔“ روزینہ کے لفظوں کے پیچھے جذبہ لوک رہے

تھے۔ اس کی بات پر عفریہ امیر زور سے ہنس دی اور کافی دیر تک ہنستی ہی رہی۔

”محبت کا سلیقہ۔“ عفریہ کہہ کر رڑکی پھر بولی۔ ”مجھے تو خود پتا نہیں کہ محبت کا کونسا طریقہ یا

سلیقہ ہوتا ہے۔“

”پھر وہ تم پر کیوں دل و جان سے فدا تھا؟ کیا گھول کر تم نے اسے پلایا تھا؟“ روزینہ اب

بھی بے یقین سی تھی۔

”تم یقین کرو میں نے آصف کا نجو کبھی نہیں چاہا تھا۔“ عفریہ نے کہا۔

”پھر وہ تمہیں کیوں چاہتا تھا؟“

”ایک بات پوچھوں روزینہ۔ یہی سوال میں تم سے کرتی ہوں کہ وہ تمہیں نہیں چاہتا تھا، پھر تم

اسے کیوں چاہتی تھیں؟“ سوال موقع کا تھا، تلخ ضرور تھا پر سچا تھا۔ روزینہ لمحے کے ہزاروں حصے

دینا عفرہ کہ میں بہت مجبور ہر کرتھیں یہ سب کچھ کہہ رہی ہوں۔ ورنہ میں اتنی بد اخلاق نہیں ہوں۔ تم مجھے ہمیشہ یاد ہوگی۔“ روزینہ نے عفرہ کا ہاتھ تمام کر لیوں سے لگایا تو اس کی آنکھوں سے دو سرخ آنسو ڈھلکے جو عفرہ کے ہاتھ کی پشت پر کسی انگارے کی طرح پڑے تھے۔ پھر روزینہ نے ایک دم ہی عفرہ کا ہاتھ چھوڑ اپنی اور تقریباً بھاگتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گئی اور چند لمحوں بعد وہ غلام گردنوں کے پیچھے غائب ہو گئی تھی۔ عفرہ کا دل ڈکھ سے بھر گیا۔

ہائے دردوں کی ماری ڈھکی لڑکی۔

تو طے یہ ہوا عفرہ امیر کہ یہاں سے تمہارا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ تم نے چاہے آصف کا نجو کی روح کو۔ خوش کرنے کے لیے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا یا وناج احمد سے بچنے کے لیے کچھ بھی تھا؟ قدرت کو تمہارا یہ فیصلہ نہیں بھایا۔ پانڈھو رخت سفر اور نئے پڑاؤ کی تلاش کرو۔ کہ بعض لڑکیوں کے مقدر میں ”گھر“ کی خوشی نہیں ہوتی اور تم بھی ان ہی بد نصیب لڑکیوں میں سے ہو۔“ عفرہ کی آنکھوں کے فرش گیلے ہونے لگے تھے۔ اس کی آنکھوں میں دھند چھا گئی تھی۔

ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کے دکھ سے بڑھ کر کسی کا دکھ نہیں پرایا تو نہیں ہے۔ عفرہ کو تو روزینہ کا دکھ اپنے دکھ سے بڑا لگ رہا تھا۔

آصف کا نجو تمہیں میری محبت نے نہیں مارا۔

ارے تمہیں تو روزینہ جیسی خوبصورت لڑکی کی بددعا نے مارا ہے۔

مگر نہیں۔ روزینہ اتنی پیاری ہے کہ وہ کبھی بھی تمہیں بددعا نہیں دے سکتی۔

یوں بھی یہ عورت کی فطرت ہے کہ جس مرد کو چاہتی ہے اس سے نہ بھی نفرت کرتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے بددعا کرتی ہے۔ جس سے محبت کی جائے اس کے سکھ اور خیر کی دعا ہی ہر دم لیوں پر رہتی ہے۔

خدا اسے سکون دے۔

اور شاید میں جو یہاں سکھ کی تلاش میں پڑاؤ ڈال بیٹھی ہوں اب کہیں اور جانا ہوگا۔ مگر کہاں؟۔ یہ اسے بھی پتا نہیں تھا۔

عفرہ اندر چلی آئی۔ اس کا اور گرینڈ ما کا مشترکہ کمرہ تھا۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ عفرہ نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکالے۔ اور بریف کیس میں رکھنے لگی۔ گرینڈ مانے اسلام پھیرا تو عفرہ پر نظر پڑی۔ وہ حیرت سے بولیں۔

”تم کہیں جا رہی ہو؟“ ”جی گرینڈ ما۔“ ”کہاں؟“ انہوں نے کہا۔

”کوئی سوال مت کیجئے گا۔ میں یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی پلیز۔ آپ ظفر کو کہیں مجھے اسٹیشن چھوڑ آئے۔“

”ایز بولا ٹیک۔“ وہ بولیں تب عفرہ ان کے قریب آئی اور نیچے ہی بیٹھ گئی۔ پھر گرینڈ ما کے سینے سے چٹ گئی۔

”میں بہت مجبور ہو کر یہاں سے جا رہی ہوں گرینڈ ما، میری گستاخی کو معاف کر دیجئے گا۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔“ عفرہ ہولے ہولے بول رہی تھی اور گرینڈ ما کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جیل کی کال کوٹھری کی ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگائے وہ خالی خالی نظروں سے آہنی سنگلاخ گیٹ کو تکتا رہتا۔ اداسی اس کے وجود پر ٹوٹ کر برستی رہتی۔

”مجھے کیوں پابند سلاسل کیا ہوا ہے؟“ اس نے ہاتھوں اور پیروں کی بیڑیوں کو دیکھ کر سوچا۔ کہتے بے وقوف ہیں یہ قانون کے رکھوالے۔ میں نہیں جانا چاہتا، بھاگنا نہیں چاہتا۔ باہر کی دنیا میں ہے ہی کون میرا منتظر؟

”عفرہ۔“ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اور روشنی کی ایک تیز لکیر تھی جو قلب و ذہن میں سمائی ہی چلی گئی۔

”کیوں نہیں آئی اتنے دنوں سے وہ؟“

”کیا خبر گاؤں چلی گئی ہو۔“

”میں تیرے بغیر نہیں جاؤں گی ماما جانی۔“ عفرہ کا جملہ شیر محمد کی سماعتوں میں ٹھنڈک بن کر اتر ا۔ وہ جب بھی کہتی تھی شیر محمد کے قلب میں ٹھنڈک اتر جاتی تھی۔ حالانکہ وہ اسے مجبور کرتا تھا۔ اکیلی ہی وہ۔

پر تنہا آدمی تو برگ آوارہ کی طرح ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات کہ وہ لڑکی تھی جس کی عفت و عزت آگینے سے بھی نازک ہوتی ہے۔ اور۔۔۔ اور یہی عزت بچانے کی خاطر تو شیر محمد نے چوہدری مراد حسین کو قتل کر دیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ دنیا بہت چالاک ہے اور عفرہ بہت معصوم۔ کتنا بھی زمانے کے سرد و گرم سے واقف ہو پھر بھی جتنے تنور میں جا سکتی ہے۔ بس یہی خوف تھا جو شیر محمد کو جھڑپ جھری میں مبتلا کر دیتا۔ اور وہ عفرہ کو گاؤں واپس جانے کو کہتا۔ مگر وہ بھی ایک ضدی تھی، کبھی مان کر ہی نہ دیا تھا۔

”اب۔ اب شاید وہ مجھ سے ناراض ہے۔ تجھی تو اتنے دنوں سے نہیں آئی۔“

”لگی۔ بھلا مجھ سے خفا ہونے کی کیا ناک ہے؟“ عفرہ نے خیال میں شیر محمد کے لیوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

ٹو ایسی تو نہ تھی۔

شاید۔۔ شاید قصور میرا ہی ہے۔ شیر محمد نے خود سے اعتراف کیا۔

”ماما۔ میں تجھے اپنا خون معاف کرتی ہوں۔“

جب اتنی بات کر دی تھی اس نے پھر تو نے شیر محمد اس پر شک کیوں کیا؟ وہ کس قدر ڈھکی ہوئی تھی۔ تجھے ذرا بھی رحم نہ آیا اس پر شیر محمد؟ بار بار کوئی اسے اندر سے جھجھوڑ رہا تھا اور اس کے اندر مسلسل جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اپنے اندر کی جنگ سے وہ لہو لہان ہوا جا رہا تھا۔

”عفی۔ میری پیاری دھی۔ آئیں تیری آنکھوں کے سارے آنسو اپنے دامن میں جذب کر لوں۔ تو ڈھکی نہ ہو میری سوئی دھی۔ تو تو میرا مان ہے۔ میرا مان ہے میرا دل ہے میری بینائی ہے۔“ شیر محمد کو لگ رہا تھا جیسے عفرہ اس کے اندر نیچے رو رہی ہو۔

”جی جیل سپرنٹنڈنٹ فردوس حمید سپاہیوں کے ساتھ راؤنڈ پر آئے۔“

”کیسے ہو شیر محمد؟“ انہوں نے نہایت حلیم لہجے میں پوچھا تو شیر محمد خیالوں کے گرداب سے

نکل آیا۔

”دعا ہے جی؟“

”پرسوں تمہاری پیشی ہے نا؟“

”ہاں جی۔“

”پھر کچھ سوچا تم نے؟“

”میرا جواب وہی ہے جو آج سے چار سال قبل تھا۔“

”یعنی اپنی بات پر قائم ہو۔“

”ہاں جی۔“ شیر محمد نے کہا۔

”مرضی کے مالک ہو شیر محمد، لیکن کہنا یہ تھا کہ زندگی بہت قیمتی شے ہے۔ اسے یونہی ضائع نہ کرو۔ اگر تم بے گناہ ہوئے تو قانون تمہارے مدد کرے گا۔ تم زندگی کی لطافتوں سے پھر لطف اندوز ہو سکو گے۔“

باہر کی دنیا کے سارے رنگ قدرت نے اپنے بندوں کے لیے بنائے ہیں۔ اس کی رحمتوں سے انکار کفر ہے۔“

”میں کچھ بھی نہیں چاہتا اب مجھے اس کوٹھڑی سے پیار ہو گیا ہے سر۔“ شیر محمد کے لبوں پر زہر خند پھیل گیا تھا۔

”وہ تمہاری بھانجی نہیں آئی کئی روز سے؟“

”جی سر۔ میں خود بھی پریشان ہوں آج بارہ روز ہو گئے ہیں اسے۔ پتا نہیں اس کی طبیعت ٹھیک ہے یا نہیں؟“

”ہاں۔ اسے تو وہ رکنے والی نہیں۔ پارہ ہے پارہ۔“ فردوس حمید مسکرائے۔

”مہربانی ہوگی اگر آپ یونیورسٹی سے پتا کروادیں۔“ شیر محمد کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

”اچھا میں پتا کروانا ہوں۔“

”مجھے بہت فکر ہے اس کی۔“

”بھئی وہ بچی نہیں ہے۔ بہت بہادر اور منفرد ہے۔ میں تو چاہتا ہوں لڑکیاں عافیہ کی طرح بولنے ہونی چاہئیں۔“ فردوس حمید کہہ رہے تھے اور شیر محمد کے اندر خوشی چراغاں کر رہی تھی۔ اور بھی

فرش پھیل لی ٹلک ٹلک کی آواز پر فردوس حمید نے گردن ترچھی کر کے دیکھا تو کندھے پر بیگ لٹکائے ایک ہاتھ میں شاپر پکڑے وہ چل آ رہی تھی سب سے بے نیاز اپنے آپ میں مست۔

”لو بھئی تم نے یاد کیا اور وہ آگئی ہے۔“

”آگئی ہے؟“ شیر محمد نے بے تابانہ سلاخوں سے چوٹ کر پوچھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا عافیہ اسے فوراً نظر آ جائے اور پھر چند لمحوں بعد وہ اس کے سامنے تھی۔

”السلام علیکم سر“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

”وعلیکم سلام۔ کئی روز بعد آئیں تم۔“

”جی۔ ہمارے ایک کلاس فیلو کی ڈیوٹی ہو گئی تھی ہمارا گروپ اُس کی لاش لے کر اُس کے گھر گیا تھا۔“

”اوہ۔“ اُن کے ہونٹ سکڑ گئے۔

”آج صبح ہی میں لوٹی ہوں اور اب یہاں ہوں۔“

”تمہارے ماما تمہیں یاد کر رہے ہوں۔“

”شاید ان کی یاد ہی کھٹھٹ لائی ہے مجھے۔“ عافیہ مسکرائی (ورنہ میرا تو آنے کا ارادہ نہ تھا) عافیہ کا اندر چیخا جس کی آواز اُس نے دل کے گنبد ہی میں دہائی۔

فردوس حمید آگے بڑھ گئے سپاہی نے عافیہ کے لیے آہنی گیٹ کھول دیا اور وہ ہمیشہ کی طرح شیر محمد کی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ شیر محمد نے بازو پھیلا دیے اور وہ اُس کے سینے سے لگ کر بھبک بھبک کر رو دی۔

”بھلا کوئی اس طرح بھی کرتا ہے تو مجھ سے خفا کیوں ہو گئی تھی عفو۔ شیر محمد نے اُس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُس کی گیلی گیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پیشانی چوم لی۔

”آپ نے مجھ پر شک کیا تھا۔“ عافیہ نے کہا۔

”ہاں پر تو مجھے معاف کر دے۔ بس بندہ ہوں نا کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے۔ تو مجھے بہت پیاری ہے۔ میرا شک جبین ہے تو۔“ شیر محمد کا لہجہ محبتوں سے بھر پور تھا۔

”ماما میں آپ کے لیے آم لائی ہوں۔ اسے دن قسم کے ہیں۔“ وہ اب بہت ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔

”شیر محمد نہایت محبت سے اُسے دیکھنے لگا۔“

”کہاں گئی تھی اتنے دن۔“

”ماما وہ آصف کا نچو تھا جو ایک بار آپ سے ملنے بھی یہاں آیا تھا۔“ عافیہ نے آم کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں اُس کا ایکسڈنٹ ہو گیا تھا۔ اور وہ مر گیا۔“

”اوہ۔“

”پھر سب چارے تھے تو میں بھی چلی گئی۔“

”مجھے بتا کر تو جانا تھا۔“

”میں آپ سے خفا تھی تو کیسے بتاتی؟“ عافیہ نے سچائی سے کہا شیر محمد زور سے ہنس دیا۔

”اب دیکھیں صبح میں آئی اور سامان ہاسٹل میں رکھنے کے بعد فوراً چلی آئی ہوں۔ پرسوں راتخ نے ماما۔“

”ہاں ہے۔“ عافیہ کے پوچھنے پر وہ بولا۔

”پھر کیا سوچا آپ نے۔“ سکندر ماما کہہ رہے تھے یہی فیصلے کی تاریخ ہے آپ اب تو بچ کہہ

یں۔ شاید کوئی راستہ نکل آئے۔“

”دیکھ عفی! تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گی۔“ شیر محمد نے دلایا۔

”میں آپ کو موت کی دلدل میں اترتے نہیں دیکھ سکتی ماما اگر آپ کو سزائے موت ہو گئی تا میں مرنے جاؤں گی۔“ عافیہ کی آواز بھڑا گئی۔

”تو نہیں مرسکتی۔“ شیر محمد تڑپ کر بولا۔

”میں خودکشی کر لوں گی۔“ عفیرہ نے دھمکی دی۔

”اوتھوں بڑی بات۔“

”پھر آپ بتائیں ناں۔ اگر آپ اپنی مرضی کریں گے تو میں بھی وہی کروں گی جو میرا دل

چاہے گا۔“ عفیرہ خدی لہجے میں بولی۔

”آج تو تو کچھ طے کر کے آئی ہے۔“ شیر محمد مسکرایا۔

”بالکل۔“ عفیرہ نے کہا۔

”دیکھ عفو بات یہ ہے کہ عزت بہت نازک شے ہے کالج کے گلاس کی مانند ذرا سی ٹھوکر لگ جائے تو پھر گلاس کرچی کرچی ہو جاتا ہے یہی معاملہ عزت کا بھی ہوتا ہے ہاتھ لگا اور عزت گئی اور غریب آدمی کے پاس یہی ایک دولت ہی تو ہوتی ہے جسے وہ کبھی نہیں گنوا نا چاہتا۔ امیر تو دولت کی چادر سے سب کچھ چھپا سکتا ہے پر۔“ شیر محمد سانس لینے کو رکا۔ عفیرہ کچھ نہ بولی۔ بس وہ ایک دم ہی سب کچھ جان جانا چاہتی تھی اور اسے محسوس ہوا تھا جیسے شیر محمد آج اسے ہر بات بتا دے گا۔ اس لیے اس نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔

”مجھے یاد ہے عفو آج سے چار سال قبل جب تو اور میں شہر آرہے تھے۔ تجھے بی۔ اے میں داخلہ دلوانا تھا۔“ شیر محمد نے اسے دیکھا۔

”ہاں یاد ہے؟“ عفیرہ بولی۔

”تب چوہدری مراد حسین ہمیں ملا تھا گھوڑے پر آ رہا تھا۔

”ہاں۔ ہاں۔“ عفیرہ نے سر ہلایا۔

”اس نے تجھے دیکھا تھا۔“

”جتا ہے مجھے۔“ عفیرہ نے کہا۔

”بس یہ بات تھی۔“ اس نے آپ سے غلط فرمائش کی تھی۔ عفیرہ پھکاری۔

”مزید مت پوچھ مجھ سے۔ میں وہ الفاظ زبان پر نہیں لا سکتا۔ جو آرے کی طرح مجھے چھیدتے ہیں۔ میں روز زنج ہوتا ہوں، عفیرہ تجھے نہیں پتا میں روز کیسی موت مرتا ہوں۔ یہ سزائے موت میری تمام تکلیفوں سے مجھے نجات دلا سکتی ہے۔“

”ماما۔ ایک بات کہوں آپ ناراض نہ ہونا۔ آپ نے چوہدری کے اتنے کام کیے تھے کہ وہ جائز اور ناجائز کام کی تفریق ہی بھلا بیٹھا تھا۔

اس۔۔۔۔۔ میں بھلا اس کا کیا دوش قصور آپ کا تھا۔ آپ یقیناً اس کی عیاشی کا سامان لاتے تھے کہ وہ آپ سے یہ فرمائش کر بیٹھا کبھی آپ نے نہ سوچا کہ وہ عورتیں جو آپ پہلے اس کے لیے لاتے تھے وہ بھی تو کسی کی بہن بیٹی اور بھانجیاں ہوں گی۔ انسان کو اپنے گریباں پر ہاتھ پڑنے تو بت پتا چلتا ہے کہ گلا کس طرح گھٹتا ہے۔

”تو تجھے شرمندہ کر رہی ہے۔“ شیر محمد چخا۔

”میں کیا شرمندہ کروں گی آپ اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ ہیں مجھے اس وقت خوشی ہوتی جب کسی اور کی خاطر آپ چوہدری مراد حسین کو قتل کرتے اپنے پاؤں جلنے لگے تو آپ نے ٹھنڈک کا سامان پیدا کر لیا۔ اس وقت ظلم کے خلاف آپ نے احتجاج کیوں نہ کیا جب۔۔۔ جب۔۔۔ نو ماما۔ میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ میں تو آپ کو بہت بہادر سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا چوہدری کوئی بڑا

سمگلر ہوگا۔ خزیب کاروں کا سرغنہ ہوگا۔ ڈاکوؤں کو پناہ دیتا ہوگا۔ اور وہی راز آپ کے سینے میں دفن ہیں۔ ماما مجھے یہ علم نہ تھا کہ وہ عزتوں کا لیڈر تھا۔ اور آپ۔۔۔ نہیں ماما۔ میرا ماما اتنا بے غیرت اس قدر برا نہیں ہو سکتا۔

”عفی۔۔۔ تو۔“ شیر محمد اس کے لہجے پر حیران تھا۔

”اب عدالت میں آپ بیان نہیں دیں گے میں بیان دوں گی۔“

”عفیرہ۔۔۔“ شیر محمد کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”ہاں ماما۔۔۔ میں۔۔۔ میں اپنے احساس کی سماعتوں سے وہ سسکیاں سن رہی ہوں جو ان گھروں کی دیواروں میں اکھرنی ڈوبتی رہی ہیں۔ جن کی عزتیں چوہدری آپ کے ذریعے قدموں تلے روندنا رہا ہے۔ آپ کا جرم بہت بڑا ہے اور یہ سزائے موت اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔“ عفیرہ تو بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ شیر محمد حیران تھا۔

وہ جو اسے بے حساب چاہتی تھی۔ جو تھوڑی دیر پہلے کہہ رہی تھی اگر اسے سزائے موت ہوگئی تو وہ بھی خودکشی کرے گی۔ اور اب کس طرح کہہ رہی تھی کہ یہ سزا کم ہے۔ شیر محمد کا سر چکرانے لگا اور عفیرہ کہہ رہی تھی۔

”عدالت یقیناً میرے سچ کو تسلیم کرے گی۔۔۔ ماما میرا فخر آپ نے رول دیا ہے۔ اگر آپ یہ نہ بتاتے تو بہتر ہی تھا کوئی اور کہانی گھڑ لیتے۔ پر یہ سچ تو میرے دل میں چھری کی نوک بین کر گز گیا ہے۔ کہ بعض سچ سننے میں بعد برے ہوتے ہیں۔“ عفیرہ تو بالکل ہی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ شیر محمد کی سونے بچھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔

تو یہ تھی ساری تفصیل جو شیر محمد کسی کو بھی نہ بتاتا تھا۔ سردار سکندر خان لغاری نے اپنے سامنے بیٹھی عفیرہ سے ساری بات سن کر کہا۔

”جی کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔“ عفیرہ بولی۔

”یہ بہت بڑی بات ہے عفو بیٹا۔“

”نہیں سکندر ماما یہ بہت معمولی سی بات ہے۔“

”یہ عزت کا معاملہ ہے۔“

”ہونہہ غیرت عزت سب بکواس ہے جب خود پر کچھ آئے تو محسوس ہوتا ہے کہ غلاظت ہے رجب ہم کسی کو غلاظت کی دلدل میں اتاریں تو احساس نہیں ہوتا۔“ عفیرہ ہنسی سے بولی۔

”عفیرہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“

”میں اپنے ماما کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے دکھ ہے۔ اور میرے دکھ کا احساس کسی کو نہیں۔“

”تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو عفیرہ۔“

”پتا نہیں کچھ تو ہے۔ میں جو عورتوں کے حقوق کی علمبردار ہوں ان کے بارے میں مضمون لکھتی ہوں۔ دیہاتی عورتوں کے مسائل میرا پسندیدہ سبیکٹ ہے پر مجھے یہ علم نہ تھا وہاں یہ سب ہوتا۔“

”تم وہاں رہیں جو نہیں۔۔۔“

”اب میں دیں رہوں گی۔۔۔ بتا دینا ماما کو آپ۔۔۔ میں اتنا مکروہ چہرہ نہیں دیکھ سکتی۔“

رہ بولی۔

”جیل میں قاتل نے خودکشی کر لی۔“

عفیرہ نے جلدی جلدی تفصیل پڑھی۔
رپورٹر کی رپورٹ تھی۔ چار سال سے جیل میں قید گاؤں تھممرہ کا ایک قیدی شیر محمد جس پر اپنے
گاؤں کے چوہدری کو قتل کرنے کا الزام ہے کل رات ازار بند کا پھندا گلے میں ڈال کر خودکشی کر لی۔
خیال کیا جاتا ہے کہ شیر محمد مقدمے کی طوالت سے تنگ آ گیا تھا۔
عفیرہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ بہ نکلا اور اُس نے اخبار ہاتھ کے پنجے میں مروڑ ڈالا۔



”عفیرہ بیٹا۔“ انہوں نے سمجھانا چاہا۔

”نہیں سکندر ماما مجھے بہت دکھ ہے۔ آپ میرے دکھ کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مجھے کچھ نہیں
چاہیے۔ ماما کی دکانوں کا جو کرایہ آپ مجھے دیتے ہیں نا آئندہ سے وہ نہ دیا کریں۔ مجھے اُن کے
پیسوں کی ضرورت نہیں۔“

”تم جذباتی ہو رہی ہو۔“

”میں بس گاؤں چل جاؤں گی۔ میں نہیں رہ سکتی۔ اس شہر میں جہاں سوائے دکھ کے اور کچھ
بھی نہیں۔“ عفیرہ ضدی لہجے میں بولی اور پھر اسٹڈی روم سے باہر آ گئی۔ ذکیہ لغاری اُسے روکتی
رہ گئیں۔ مگر وہ تیزی سے سُرخ روٹھ عبور کر گئی تھی کہ آج اس کا ذہن اور قدم ٹھکانے پر نہ تھے۔
ساری رات وہ کمرے میں ٹپکتی رہی تھی۔

ورد سے اُس کا دل بھٹ آیا تھا۔

یہ صدمہ تو آصف کا بچو کی موت سے بھی بڑھ کر تھا جو اُس کے دل کو چھید رہا تھا۔ کہ اُس کا
ماما چوہدری کے لیے اتنا بڑا کام کرتا تھا۔
ہائے رہا تو مجھے اس وقت بہرہ کر دیتا جب ماما اپنے گناہوں کی پٹاری کھولے بیٹھا تھا۔

یار بتا، سب میں نہ سنتی تو بہتر تھا۔

عفیرہ کو کسی کل بھی چین نہ تھا۔ وہ شیر محمد کو خوب سُنا کر آئی تھی پر دل کی بھڑاس ختم نہ ہوئی
تھی۔ اندر جس ہی جس تھا۔

آج سکندر خان لغاری کو ساری تفصیل بتا دی تھی۔ عفیرہ کا خیال تھا کہ اب کیس میں کیا جان
ہے۔ پر سکندر خان کہتے تھے یہی تو پوائنٹ ہے کہ عزت کی خاطر اُس نے چوہدری مراد حسین کو قتل کر
دیا۔

”ہونہہ یہ پوائنٹ ہے۔ صبح اسی پوائنٹ پر عدالت بحث کرے گی۔“

”اوروں کی تو جیسے کوئی عزت نہیں۔“

شیر محمد کی عزت جیسے اہم تھی۔

وہ لبرل ذہن کی لڑکی اپنی سوچ کے مطابق سب باتیں سوچ رہی تھی۔
ڈائٹنگ ہال میں سویرے سویرے وہ خلاف معمول موجود تھی۔ ہاسٹل کی لڑکیاں اسے دیکھ کر
حیرت زدہ تھیں۔

”آج بھی سورج کہاں سے نکلا ہے عفیرہ۔“ امینہ حفیظ نے اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بس یار گاؤں جا رہی ہوں سوچا سب چہرے ایک نظر دیکھ لوں۔“

”عفیرہ مسکرا کر بولی اور چائے کی پیالی میں چچ ہلانے لگی۔

تبھی گل زمان اخبار لے آیا۔

”گل زمان آج اخبار پہلے میں پڑھوں گی۔“ عفیرہ نے آواز دی۔

”ضرور جی۔“ گل زمان نے روزنامہ اُسے دے دیا۔

آمنہ حفیظ سے باتیں کرتے ہوئے اُس کی نظریں اخبار پر جمی ہوئی تھیں۔

آخری صفحہ پر آخری کالم میں لکھی چھوٹی سی سُرخ نے اُس کی توجہ مبذول کروائی۔

کی رب جانے۔“

”کیا۔۔ کیا مطلب؟“ ذکیہ چونکیں۔

”شیر محمد نے جیل میں خودکشی کر لی ہے۔“ سکندر خان نے بیوی کو بتایا۔

”اوہ نہیں۔۔“ ذکیہ لغاری کو جھٹکا سا لگا۔ ”مگر کیسے کیوں؟“

”ممائی جان جب آئینہ دیکھا جائے اور اپنی ہی صورتِ مسخ نظر آئے تو پھر زندگی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور ماما شیر محمد نے بھی جب آئینہ دیکھا تو انہیں احساس ہوا کہ وہ کس قدر برے ہیں بس وہ فیصلہ جو چار برس میں نہ ہو سکا تھا ایک دم ہی ہو گیا اور یہ بہتر فیصلہ تھا۔“ عفریہ نہایت سفاکی سے بول رہی تھی۔

”سکندر۔۔ یہ عفریہ کیا کہہ رہی ہے۔ میرے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑ رہا۔“ واقعی ذکیہ لغاری کو اس کی کوئی بات سمجھ نہ آ رہی تھی، جیسی تو انہوں نے شوہر سے مدد چاہی۔

”تم نہیں سمجھو گی اصل میں عفریہ بہت ڈیپریسڈ ہے۔ یہ ذہنی طور پر شیر محمد کی موت کو قبول نہیں کر پارہی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اُس کی موت کو قبول نہیں کر پایا۔“

”آپ کو علم تھا۔“ ذکیہ نے پوچھا۔

”ہاں۔۔“ سکندر خان نے سر ہلایا۔

”پھر مجھے کیوں نہ بتایا؟“ انہوں نے شکوہ کیا۔

”ضروری تو نہیں تھا۔ میں نہیں بتا کر پریشان کرتا۔ اچھا میں عفریہ کو لے کر ہسپتال جا رہا ہوں۔“

”آپ کورٹ نہیں جائیں گے۔“ عفریہ نے پوچھا۔

”آج شیر محمد والا ہی مقدمہ اہم تھا۔ باقی تو میں نے حیدر علی سے کہہ دیا ہے ڈیل کرے گا۔“ انہوں نے کہا اور پھر عفریہ کا ہاتھ تھام کر باہر آگئے۔ سویت پی کے پھولن سے ڈھکے ہوئے پورچ میں اُن کی سیاہ چمچانی ٹیوٹا کرولا کھڑی تھی جسے باوردی ڈرائیور چلانے کے لیے بالکل مستعد تھا۔

سکندر خان نے عفریہ کے لیے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور اُس کے بیٹھے پر دروازہ بند کیا اور خود گھوم کر دوسری جانب سے آکر اُس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اُن کے بیٹھے ہی کا ربیک کی۔

”تم پریشان تو نہیں ہوئی بیٹا۔“

”نہیں تو۔ ایسا تو ہونا تھا اور میرے خیال میں ماما شیر محمد کا فیصلہ بہترین ہے خود ہی اپنی جان لینا انتہائی مشکل مرحلہ ہے۔ مگر ماما یہ مرحلہ بخوبی طے کر گئے۔ اب شاید قدرت بھی اُن کے گناہوں کو معاف کر دے۔“

”میں تجھے اس قدر سخت دل نہیں سمجھتا تھا عفری۔“ انہوں نے کہا۔

”واقعی میں سخت دل نہیں ہوں۔ میں جو پھولوں اور پتوں سے بے حد پیار کرتی ہوں اور ایسا شخص کبھی بھی پتھر نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو ماما کے افشار راز نے پتھر بنا دیا۔ شکر کریں سکندر ماما میرا دل پتھر ہوا ہے۔ میں ساری کی ساری پتھر نہیں ہو گئی۔“ عفریہ نے انگلیاں پٹختاتے ہوئے کہا۔

لبرٹی کے گول دائرے سے گزرتے ہوئے وہاں احمد ٹھک گیا۔ اُس کے پاؤں ربیک پر جا لگے تھے سامنے ہی تو عفریہ امیرہ چمچاتی کار میں اُس کے سامنے سے گزری تھی۔

”یہ۔۔۔ یہ کائنات کس سے کب آئی؟“ وہاں نے سوچا اور موٹر سائیکل اُس کے پیچھے لگا دی۔

☆☆☆

از فریقِ نفرت!

پیارے اسجد!

تمہارا خط بمعہ ایک خوبصورت سی تصویر کے ملا۔ تصویر دیکھ کر ایک لحظہ کو میں انتہائی حیران و ششدر رہ گیا۔ پتا ہے میں حیرت زدہ کیوں رہ گیا۔؟ اُس کی آنکھیں بہت مماثل ہیں اُن آنکھوں سے جن کے حصار میں میں آج بھی ہوں۔ تم نے تو عدیرہ کو نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اُسے دیکھتے تو اپنی مہر تاباں کی آنکھوں کو ایک لحظہ کے لیے دیکھ کر ضرور چونکتے۔ تم نے لکھا ہے کہ یہ تمہاری منزل ہے خدا کرے کہ تم اپنی منزل پر پہنچ جاؤ ایسے عشق کے متوالوں کو منزل پاتے دیکھ کر مجھے بے حساب خوشی ہوتی ہے۔

اور ہاں میں بھلا تمہاری شادی میں کیوں نہیں آؤں گا۔ تم ضرور کرو شادی میں ضرور آؤں گا۔ مگر واپس آنے کے لیے۔ خدا تمہاری محبتوں کے گلاب ہمیشہ تازہ رکھے۔ تاباں نے آخر تم جیسے عشق کے نافرمان کو قابول کر لیا ہے۔ مبارک باد کی مستحق ہے وہ میری جانب سے اُسے کہو کہ وہ اس حصار کو اور تنگ کرے تاکہ تم نکل ہی نہ سکو۔

بہت پیار کے ساتھ

ظفر عالم

”سن لیا ظفری ماما کا پیغام۔“ اسجد نے خط تہہ کرتے ہوئے اپنے قریب بیٹھی تاباں کو وارفتگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیسا پیغام؟“ تاباں نے پوچھا۔

”بھی انہوں نے کہا ہے کہ مجھے محبت کی ڈور میں کس کر باندھ لو۔“ اسجد نے وضاحت کی۔

”پر دیسی اور تچھی کو بھی بھلا کسی نے قید کیا ہے۔“ تاباں ہنسی۔

”میں پر دیسی ہوں۔“ اسجد نے مصنوعی تھکی سے کہا۔

”اور کیا۔۔؟“ وہ اترائی۔

”جناب اب یہی تھل ہی میرا دیس ہے کہ یہاں پر مجھے اُس جذبے سے آشنائی ہوئی جس کے بارے میں مجھے جرمنی میں بھی پتا نہ چلا۔“ اسجد نے اُس کی لمبی چوٹی چھپتے ہوئے کہا۔

”ملک! کیا ہے تم میرے بالوں کے دشمن کیوں ہو۔؟“ وہ چڑ گئی۔

”میں تو تیرا بھی دشمن ہوں۔“

”ہاں وہ دشمن مگر پیارے دشمن۔“ تاباں نے مسکرا کر اُسے دیکھا اسجد ملک کے لیے اس کی آنکھوں میں ڈھیروں پیار تھا۔ اور چہرے پر اُس کی محبت کی سُرخ پیچلی ہوئی تھی۔

کس قدر معصوم اور پیاری لڑکی ہے دنیا میں بھلا اس جیسا بھی کوئی ہو گا۔ تاباں سر نہکائے گھاس نوچنے لگی۔ مگر اس کی سوچوں کی اڑان بہت اونچی ہو گئی تھی۔

کتنی اچھی ہے اسجد ملک کی قربت۔

اور کتنا اچھا لگتا ہے اس کا ساتھ۔

اس کی محبت میں نرمیاں ہی نرمیاں ہیں۔ لطافتیں ہی لطافتیں ہیں۔

”خوبصورت یادوں سے میرے ذہن کا ہر خانہ بھرا ہوا ہے اور۔۔ اور جب اسجد ملک یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جائے گا۔ نئے راستوں پر نئی منزلوں کی جانب تو شاید اُسے میں بھی یاد بھی نہ آؤں کہ کہیں اُس نے پڑاؤ بھی ڈالا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہوتا ہوں۔۔؟“

”بس کچھ نہیں۔۔ وہ بولی۔

”یار یہ محبت نہیں۔ میں پاس ہوں اور تم سوچوں میں غرق یہ پیار کے اصول و ضوابط تو نہیں۔“

اسجد نے اُسے پیار سے سرزنش کی۔

”میری سوچ بھی تم تک محدود ہے۔“ تاہاں نے بتایا۔

”میں قریب ہوں اور میرے بارے میں سوچتی ہو۔“

”تم نے میرے ذہن کو ایک دائرے میں محدود کر دیا ہے اور تمہارے علاوہ کچھ اور سوچتا ہی

نہیں۔“ تاہاں نے اعتراف کیا۔

”اچھا۔۔۔ اسجد کی آنکھوں میں کلیاں مہکیں۔“ کیا سوچ رہی تھیں۔“

”میں وہی بات سوچ رہی تھی جو اکثر سوچتی ہوں۔“

”کیا۔۔؟“ اسجد نے پوچھا۔

”جب۔۔ جب تم یہاں سے چلے جاؤ گے تو پتا نہیں میں تمہیں یاد بھی آؤں گی کہ نہیں۔۔“

تاہاں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”بھلی ہو بالکل۔ ہزار بار کہا ہے تمہیں کہ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اور اگر گیا بھی تو تجھے

ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ اسجد محبت سے بولا۔

”پتا نہیں محبت میں اندیشے کیوں ہوتے ہیں۔“ تاہاں نے کہا۔

”تم نے فضول میں اندیشے خود پر مسلط کر لیے ہیں۔ میں نے تمہیں چاہا ہے۔ تاب اور

چاہتیں گنوانے کی چیز نہیں ہوتیں۔“

”مجھے خوف تمہاری امارت سے آتا ہے ملک۔“ تاہاں کا مومی انگلیوں والا ہاتھ اسجد ملک کے

مضبوط ہاتھوں میں واضح طور پر کانپ رہا تھا۔ اسجد ملک نے اس کے ہاتھ تھام کر کہا۔

”سارے خوف نکال دو تمہارے تصور کے بغیر تو میں آنکھیں بھی نہیں موندتا۔“ اسجد ملک

کے لہجے میں سچائیاں ہی سچائیاں تھیں۔ ”میں نے داد کو بھی تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ اسی کو بھی

پتا ہے کہ اُن کا بیٹا ”جوان“ ہو گیا ہے اور سامی کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور۔۔ اور دیکھو تا

ظفری ماما کا خط بھی تمہیں میں نے پڑھ کر سنا دیا ہے آخر اُن سے میں نے تمہارا ذکر کیا تھا نا؟“

”وہ کس فوٹو کی بات لکھی ہے انہوں نے؟“

”پچھلی بار میں نے تھنچی تھی تمہاری فوٹو۔“

”اور مجھے پتا بھی نہ چلا۔“ تاہاں نے پوچھا۔

”تُو تو اندھی ہے نا۔“

”تم نے اندھا کر دیا ہے۔“ وہ برجستہ بولی۔ ”مجھے دکھائی کیوں نہیں وہ فوٹو۔“

”اب دکھا دیتا ہوں۔“ اسجد نے جیب میں سے پاکٹ پرس نکالا اور اس کی پٹلی سطح سے تصویر کھینچ نکالی۔

”یہ دیکھو۔ تم سے بھی خوبصورت ہے تمہاری تصویر۔“ اسجد ملک نے شرارت سے کہا۔ تاہاں

تصویر دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ واقعی تصویر میں تو وہ محسوس ہی نہ ہو رہی تھی۔

”کھلا بھری۔۔ موندی موندی سی آنکھیں جیسے کوئی نشہ سا ہو۔

مُسکراتے لب۔

دائیں گال میں پڑا ہوا ڈمپل واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

”اچھی ہے نا۔؟“

”ہاں مجھ سے اچھی ہے۔“

”نہ جی تیری تصویر میں وہ بات کہاں جو تجھ میں ہے۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے۔“ تاہاں نے تصویر اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ظفری ماما کو بھی تم بے حد اچھی لگی ہے۔“ اسجد نے والہانہ نظروں سے

تصویر کو دیکھا اور پھر پرس میں رکھ لی۔

”انہوں نے بھی آنکھوں کا ذکر کیا ہے، کس کی آنکھیں ملک میرے جیسی تھیں۔“

”ہاں وہ آنکھیں میری ماموں زاد عذیرہ کی تھیں، تمہیں شاید پتا نہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ

انسانی خدوخال میں تبدیلیاں آتی ہیں پھر آنکھیں ویسی ہی کی ویسی رہتی ہیں۔ جیسی بچپن میں ہوتی

ہیں۔ اور ظفری ماما تو جہاں اچھی آنکھیں دیکھتے ہیں انہیں عذیرہ یاد آ جاتی ہے یہ نئی بات تو نہیں ہے

اسجد۔

”یہ۔ یہ ظفری تمہارے سگے ماما ہیں۔؟“

”ہاں۔ مجھے بالکل اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں؟“

”اُن کی اپنی اولاد۔؟“

”انہوں نے شادی ہی نہیں کی۔“

”وجہ۔“

”تم جیسی لڑکی کی وجہ سے۔“

”کیا مطلب؟“

”عذیرہ میری چچا زاد تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ظفری ماما تقریباً چھ سات سال کے تھے، بس

عذیرہ کے مقدّر کا فیصلہ ہوا کہ وہ ظفر عالم سے بیاہ جائے گی۔ گھر اُن کے نزدیک نزدیک ہی تھے۔

وقت جوں جوں گزرتا گیا، ظفر ماما کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ وہ اور عذیرہ ایک دوسرے کے

لیے بے ہیں۔ پھر جب عذیرہ آٹھ برس کی ہوئی تو کھو گئی۔“

”کہاں۔؟“

”پتا نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ اُن دنوں وہ اپنے نبھال سردار پور گئی ہوئی تھی۔ اور وہاں سیلاب

آیا ہوا تھا اور وہ لوگ واپس آ رہے تھے۔ سڑکوں پر پانی تھا پھر بھی چاچی جی گھر پہنچنا چاہتی تھیں۔

جس سڑک پر وہ لوگ آ رہے تھے وہ سڑک بہہ گئی۔ اور جب پانی میں غوطے کھانے لگی ڈرائیور اور

چاچی جی کو تو لوگوں نے بچا لیا اور۔۔ اور عذیرہ بہہ گئی۔“ اسجد کی آواز بھر ا گئی۔

”اوہ۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر ملک؟“

”پھر کیا ہوتا بہت تلاش کیا۔ کہاں کہاں ہمارے خاندان نے تلاش نہیں کیا عدیرہ کو مگر وہ نہ ملتی تھی اور نہ ملی۔“

”پھر ظفری ماما۔“

”وہ اُن دنوں انٹر کر چکے تھے میرے چاچا جمال نے یعنی عدیرہ کے والد نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھیج دیا۔“ یہاں بھی ہر طرف تلاش کیا انہوں نے عدیرہ کو اور باہر بھیجا وہ اُسے تلاش کرتے رہے ہیں اُن کی تو ذہنی حالت ہی مشکوک تھی۔ پھر اُن کی دوسراہٹ کی وجہ سے چند سالوں بعد مجھے اُن کے پاس بھیجا گیا۔ میں نے تعلیم مکمل کر کے نوکری بھی وہیں کر لی تاکہ ظفری ماما تنہا نہ رہیں۔“

”وہ اپنے وطن نہیں آئے؟“

”بھی نہیں آئے کہتے ہیں عدیرہ ملے گی تو جاؤں گا۔“

”اور اگر انہیں عدیرہ مل جائے پھر؟“

”کیسے؟“

”یونہی۔“

”میرے خیال میں یہ اُن کی زندگی کا خوبصورت ترین دن ہوگا۔ اور پتا نہیں ماریے خوشی کے اُن کا دل ہی بند ہو جائے لیکن تاب یہ کہاں ممکن ہے۔ اب تو حادثے کو بھی کم و بیش بیس برس گزر چکے ہیں۔ اور سوائے ظفری ماما کے ہر کوئی عدیرہ کی تلاش ختم کر چکا ہے۔ حتیٰ کہ جمال چاچو بھی۔ جنہیں عدیرہ بے حد پیاری تھی۔ وہ بھی یہ جان چکے ہیں کہ عدیرہ مر چکی ہے لیکن ایک بات ہے عدیرہ کا دکھ آج بھی ہم سب کے رگ و جان میں اتر جاتا ہے۔“

”تمہارے جمال چاچو نے تو دوسری شادی کر لی ہوگی۔“

”ظاہر ہے۔ تمہارے دوست کو سہمی کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ اب اُن کے بچے بھی جوان ہیں میری بہن عاشرہ کی شادی ان ہی کے بیٹے سے تو ہوئی ہے۔“

”تو سب مایوس ہو چکے ہیں نا؟“

”ہوں۔“

”پھر کیا فائدہ عدیرہ ملے یا نہ ملے۔“

”اگر مل جائے تو ہمارے خاندان کے لیے اُس جیسا حسین ترین دن کوئی نہ ہوگا۔ تمہیں کیا پتا ہر خوشی غمی پر وہ یاد آتی ہے اور بات یہ ہے کہ ذہن اُس کی موت کو قبول کرتا ہے مگر دوسرے لمحے ایک اور خیال بھی دل میں گونجتا ہے کیا خبر وہ زندہ ہو۔ اور یہی خیال دکھ کا سبب بنتا ہے۔ کوئی سامنے مر جائے تو اُس کا صبر آ جاتا ہے اور جب اُس نراش کا چکر چلتا رہے تو پھر صبر نہیں جبر ہی ہوتا ہے خیر چھوڑ اس سلسلے کو۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اگلے ہفتے میری دادو اور امی آئیں گی یہاں۔“

”کیوں؟“

”ایسی باتیں لڑکیاں نہیں پوچھتیں۔“

”مگر ملک تم انہیں نہ بھیجو۔“

”کیوں؟“

”میرا گھر اس قابل نہیں ہے۔“

”ہمیں جو چیز چاہیے وہ جہاں بھی ہوگی ہم نے لیٹی ہے۔“

”ملک! ہر کوئی اپنے جیسوں میں اچھا لگتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”ہاں اگر میں تمہارے ساتھ شہر چلی گئی تو میری ماں اکیلی رہ جائے گی پھر اپنا اُسے مارے گا تو کون اس کی نگر کرے گا۔ کون میری ماں کے آنسو پونچھے گا۔“ تاباں کا لہجہ دکھ کی پھوار میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ہم انہیں بھی ساتھ رکھیں گے۔“

”اپنے گھر کے ہوتے ہوئے وہ ہمارے ساتھ کب رہے گی؟“ تاباں دکھ سے ہنسی۔

”یہ تو بعد میں سوچیں گے تم پریشان نہ ہو۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں۔“ تاباں سوچ کر رہ گئی پر کچھ بولی نہیں کہ کہنے کو اُس کے پاس کیا تھا؟۔

☆☆☆

کارمیو ہسپتال کے پارکنگ لاث میں رکی تو وہاں احمد نہایت حیران ہوا۔ اس نے جلدی سے موٹر سائیکل پارک کی وہ ہر صورت عفرہ کو نظر میں رکھنا چاہتا تھا۔

وہ نہایت تھکے تھکے قدموں سے سکندر خان لغاری کے ساتھ کوریڈور میں چلی جا رہی تھی اور پھر وہ ایک جگہ ستون سے ٹیک لگا کر رک گئی۔ سکندر خان آگے بڑھ گئے۔

عفرہ نے آنکھیں موند لیں اُس کا چہرہ سُنا ہوا تھا اور اُس کے چہرے پر کوئی بھی احساس نہ تھا۔

”کیا ہوا ہے اسے۔“

”یہ تو پتا نہ تھی۔“

”کتنی تھل تھل اس میں۔۔۔ پارے کی طرح پھر۔“

”وہاں آگے بڑھا اور نہایت آہستگی سے اُس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔“

”عفو۔“

”ہوں۔“

”عفو۔“ وہاں احمد نے اُسے پھر پکارا۔

”مت آوازیں دو مجھے۔“ عفرہ کے لب کپکپائے۔ تمہاری آوازوں نے ہی تو مجھے یہ شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔“

عفرہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

”عفو ٹیک اٹ ایزی۔ مجھے بتاؤ کیا پرابلم ہے؟“ وہاں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو عفرہ نے اک دم ہی آنکھیں کھول دیں۔ نہایت حیرت سے وہ وہاں احمد کو دیکھنے لگی۔

”یہ میں ہوں وہاں۔ تم نے ”کانجو محل“ سے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔“

”کسے دیتی اطلاع؟“

”میں تمہارا دوست ہوں عفو مجھے اطلاع دیتیں۔ تم مجھ سے اپنے مسئلہ ڈسکس کر سکتی ہو۔ کیا

ہوا؟“

”تمہیں پتا نہیں ماما شیر محمد نے خودکشی کر لی ہے۔“

”اوہ نو۔۔“

”لیکن تجھے پتا تھا یہ ہوتا ہے۔“

”تم تو عفو بہت پر امید تھیں کہ وہ رہا ہو جائیں گے۔ پھر اب کیسے کہہ رہی ہو کہ ایسا ہوتا تھا۔“

”اب تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میرا ماما اپنے زمیندار کا وہ کارندہ تھا جو اُس کی ساری دلچسپیوں کا

سامان مہیا کرتا تھا۔“ عفیہہ دُکھ سے مسکرائی۔

”یہ کوئی اتنی نئی بات نہیں؟“

”جی۔۔“ مارے حیرت کے اُس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

”ہاں۔۔ یہ تو صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے۔ تم کہاں تک احتجاج کرو گی۔ یہ انوکھی بات نہیں

ہے۔“

”تمہارے لیے نہیں ہے یہ انوکھی بات مگر میرے لیے تو ہے نا۔ مجھے خود سے بھی گھن آ رہی

ہے۔ پتا ہے تمہیں میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”مت خود کو پریشان کرو۔ عفو یہ دنیا ہے میری دوست اور یہاں پر ہوتا ہی وہی کچھ ہے جو ہم

سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم بھی لائنٹ سا اس بات کو لو۔“

”ساری دنیا والے جو کچھ کریں کیا میرا ماما بھی وہی کچھ کرتا۔“ وہ تنک کر بولی۔

”نیور مائیڈ۔ ایسا ہو جاتا ہے۔“ وہ نرم لہجے میں سمجھا رہا تھا۔ ”تمہارا ذہن لبرل ہے اس لیے

اس بات نے تمہیں دھچکا پہنچایا ہے۔ تم ساری دنیا سے منفرد ہو۔ تم وہ کچھ کرتی ہو جس کے لڑکیاں

خواب دیکھتی ہیں اور وہ کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”میں غلط کام کرتی ہوں۔ بدکردار ہوں۔“

”میں نے یہ کب کہا ہے۔ تم سمجھو یہ جانو کہ اگر کوئی کہے کہ وہاں احمد تم عفیہہ کے کردار کی قسم

کھاؤ تو یقین کرو میں کچھ سوچے بغیر ہی قسم کھا سکتا ہوں۔“ وہاں احمد کے لہجے میں اُس کے لیے

ڈھیروں ڈھیر محبتیں اُٹھ آئی تھیں۔ اور کہہ رہا تھا۔ ”تم بھی یہ سوچنا بھی مت کہ تمہارے بارے میں

میں بھی غلط بھی سوچ سکتا ہوں۔ وہاں احمد نے تمہیں اپنے وجود کی تمام تر شدتوں سے چاہا ہے

عفیہہ۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ تم مجھے سارے جہاں میں سب سے زیادہ پیاری

ہو۔ چاہے تم نے مجھے شکرایا۔ میں پوچھنے کا حق تو نہیں رکھتا۔ مگر عفو مجھ میں کیا خالی تھی جو تم آصف

کا نجو کی طرف بڑھی تھیں۔“

”خامی۔ اُس نے وہاں احمد کے چہرے کی طرف دیکھا پھر ہنس دی۔“ یہ وقت ان باتوں کا

نہیں ہے وہاں۔“

”پھر کون سا وقت ہوگا۔“

”یہ تو کاتب تقدیر کو پتا کہ کون سا وقت مقرر ہے۔ میں تو گاؤں جانے کا پکا پکا ارادہ کر لیا تھا

اور آج میں چلی جاتی اگر اخبار میں ماما کی خودکشی کی خبر نہ پڑھ لیتی۔“

”گاؤں جانے کی وجہ؟“

”بس دل بھر گیا ہے۔ شہر بہت زخمی کرتا ہے وہاں۔ میرے پاؤں زخمی ہو گئے ہیں ہر سرت ہی

تو کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔“

”مجھے اجازت دو میں تمہارے پیروں کے وہ سارے کانٹے اپنے ہونٹوں سے چُن لوں گا۔“

”جذباتی باتیں اچھی ضرور لگتی ہیں۔ مگر جذبات پائیدار نہیں ہوتے وہاں۔“ عفیہہ مسکرائی۔

”تم سمجھنے کی کوشش تو کرو۔“

”کہانا کہ یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔“

”تم چاہتی ہو آصف کا نجو کی طرح میں بھی تمہارے اعتراف پر موت کو گلے لگا لوں۔“

”خدا نہ کرے۔“ عفیہہ تڑپ کر رہ گئی اور کانپتے لہجے میں بولی۔ ”موت بہت خوفناک

سلسلہ ہے وہاں۔ خدا جو ان موت کی کوئی نہ دے۔“ کا نجو محل کی آوازیں آتی ہیں۔ آصف کی ماں کی آنکھیں

اب بھی کا نجو محل کے در و دیوار سے مجھے سسکیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ آصف کی ماں کی آنکھیں

ابھی تک خشک نہیں ہوئیں۔ اور۔۔ اور روزینہ کی بھی آنکھیں کیلی رہتی ہیں۔“

”روزینہ کون ہے؟“

”روزینہ وہ بددعا ہے جو آصف کا نجو کو نگل گئی۔ وہ آصف کی منگیتر ہے اور۔۔۔ اور وہ۔۔“

عفیہہ نے ایک دم ہی ہونٹ سمجھنے لیے۔ بھلا میں یہ کیوں وہاں کو بتائے جا رہی ہوں کہ روزینہ نے

مجھے وہاں سے نکال دیا ہے بے شک اس نے التجا ہی کی تھی۔ کہ وہ چلی جائے۔ مگر یہ بات وہاں کو

بتانے کی تو کبھی بھی نہیں ہے۔

”اور کیا عفو؟“

”کچھ نہیں۔“

”تم وہاں سے کیوں آ گئیں۔ تم تو وہاں مستقل رہنے گئی تھیں۔“ وہاں بہت کچھ جاننا چاہتا

تھا۔

”میں وہاں بھلا کیسے رہتی۔ اتنی اداس جگہ میرا تو دم گھٹ رہا تھا۔ اُس اونچی اونچی دیواروں

والے محل میں جس ہی جس تھا وہاں۔ میں تو کچھ گھروں اور کھلے محلوں میں رہنے والی لڑکی ہوں۔

عقوبت خانوں میں بھلا کس طرح رہ سکتی ہوں۔“

”مستقل مزاج تو تم بہت ہو مگر۔۔“ وہاں احمد کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ سکندر خان لغاری اُن کے

قریب آ گئے تھے۔

”میں نے سارے انتظامات کر لیے ہیں لاش ایسپولینس میں رکھی جا چکی ہے تم بتاؤ کیسے جاؤ

گی۔“

”میں ایسپولینس میں جاؤں گی۔“

”باگل ہوئی ہو۔“ وہاں احمد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”تمہی کو میرے ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہا ہی چلی جاؤں گی۔“

”سر یہ تو ہے نا پاگل۔ میں پجرا رو لے آتا ہوں اُسی میں تابوت رکھوا دیتے ہیں۔“

”سُنو تو۔۔؟“

”کچھ نہیں بولو گی تم۔“ وہاں احمد نے اُسے ڈپٹ دیا۔ ”میں پندرہ منٹ میں آتا ہوں انتظار

کیجئے گا۔“ وہاں نے کچھ اور نہیں سنا اور تقریباً بھاگتا ہوا کوریڈور عبور کر گیا۔

”آپ بھی اُس کی بات مان گئے۔“

”وہ سچ کہہ رہا تھا بیٹا۔“

”پتا نہیں کون صحیح ہے۔“

”کیا تم نہیں چاہتیں کہ وہ تمہارا گھر دیکھے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ اُسے پتا ہے میں گاؤں کی ہوں بالکل پینڈو وغریب سی لڑکی جس کے گھر کا آگن کچا ہے روز صبح اور شام ہمارے گھر کے آگن میں تور جلتا ہے۔ جس کا دھواں دور تک پھیل جاتا ہے اور اب میں وہیں رہوں گی۔“

”تم وہاں نہیں رہو گی۔“

”کیوں۔؟“

”واپس آنا۔“

”میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

”تم وہاں بھی نہیں رہ سکو گی اُس ماحول میں ایڈ جسٹ نہیں ہو گی۔ کہ اب تم شہری زندگی کی عادی ہو گئی ہو۔ اور یہ راستہ تم نے خود ہی تو منتخب کیا تھا۔“

”ہاں یہ راستہ میرا منتخب کردہ ہے پتا نہیں بعض مرتبہ انسان اپنے ہی پسندیدہ راستوں پر چلنے کے باوجود وہی کیوں ہوتا ہے۔“ عفریہ کی آواز بھڑک اُٹی۔

”تم رولو عفو۔“

”کیوں۔؟“

”شیر محمد کی موت پر تم آنسو بھی نہیں بہا سکیں۔“

”نہیں۔۔ میرے آنسو اتنے ارزاں نہیں ہیں جو ایسے شخص کی موت پر بہیں جو ظالم تھا۔ چوہدری مراد حسین ظالم نہیں تھا۔ اصل ظلم تو ماما شیر محمد نے توڑا۔“ وہ بظاہر مطمئن نظر آ رہی تھی مگر اندر اُس کے بہت شور تھا۔

”ایسا ہوتا ہے زندگی بہت مشکل ہے گزارنا۔“

”کوئی مشکل نہیں ہے۔ محنت کریں تو کسی کا مہرہ بننے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے۔“ عفریہ کے لہجے میں نفی ہی نفی تھی۔ اور سکندر خان جیسا پیر ستر آف لاء بھی اُس کے سامنے چپ ہو گیا۔ کہ کچھ بھی وہ نہ کہہ سکتے تھے۔ عفریہ کی اپنی منطق تھی۔ اپنی دلیلیں تھیں۔ بھلا وہ کسی کی کیا مانتی۔ اپنی جگہ شائد وہ بھی درست تھی۔

وہ تو اُن لوگوں میں سے تھی جو ہر کسی کو خوش دیکھنا چاہتے تھے خود پر چاہے کچھ بھی گزرے۔ عفریہ کو آج تک یاد نہ تھا کہ کبھی اُس نے بارش کی دعا بھی کی ہو جب بھی کبھی ٹوٹ کے ساون برستا تو عجیب طرح کی اُداسی اُس کے دل میں اُتر جاتی تھی۔ اُس کی نظروں کے سامنے کچے گھر۔ کچی بستیاں آ جاتیں۔ اور ان ہی بستیوں میں ایک گھر اس کا بھی ہوتا وہ اپنے گھر کی سلامتی کی دعائیں مانگتی تھی۔ اُسے یاد تھا پچھلے برس جب آصف کا بچہ گرمی سے بے حال ہو گیا تھا تو کہتا تھا۔

”خدا کرے زور زور سے بارش ہو۔“

”کیوں ہو۔۔؟“

”بھئی گرمی تو ختم ہو گی جس تو کئے گا۔“

”آئندہ تم یہ بدعا نہیں کرو گے۔“

”یہ بدعا ہے۔“ آصف نے پوچھا۔

”اور کیا اس سے بڑی اور بد دعا کیا ہو گی۔؟“

”تو تم دعا مانگ لیا کرو۔“

”آصف تم نہیں سمجھ سکتے میرا تو وہ معاملہ ہے کہ

۔ میں بارش کی دعائیں کیسے مانگوں

مری بستی میں کچے گھر بہت ہیں !!

مُھول۔ برقی بارش اور بچے کیسے پیارے نہیں لگتے۔ مگر یہ کیا کہ اپنی پسند کی خاطر دوسروں کو تکلیف دی جائے وہ جو دوسروں کی تکلیف پر تڑپ اُٹتی تھی لوگ اُسے تکلیف میں دیکھ کر پتا نہیں کیسے خوش رہتے ہیں۔

دہاج احمد پیارو لے آیا تھا اور شیر محمد کا تابوت اُس میں رکھا جا چکا تھا۔ دو پولیس کا کنسیل بھی ان کے ہمراہ جا رہے تھے۔ اور پھر سپرنٹنڈنٹ فردوس حمید اُن کے قریب چلے آئے۔

”عفریہ۔ تجھے دکھ ہوا کہ۔“ انہوں نے کہنا چاہا تو عفریہ نے اُن کی بات کاٹ کر بولی۔

”دکھ کی کیا بات ہے سر۔۔“

”مجھے علم نہیں تھا کہ شیر محمد اتنی بزدلی دکھائے گا۔ تمہارا تو وہ سہارا تھا۔“

”سہارا۔“ زہر خند عفریہ کے لبوں پر پھیل گیا۔ اور آنکھیں بھگی گئیں پھر بھی اُس نے اپنے آنسوؤں پر بند باندھ لیا کہ وہ رونے والوں کو بزدل کہتی تھی اور وہ تو اپنے آپ کو بہادر سمجھتی تھی۔ دہاج احمد اور سردار سکندر خان لغاری زبردستی اُس کے ساتھ چل رہے تھے جبکہ وہ تنہا جانا چاہتی تھی۔

سردار سکندر خان لغاری پولیس جیب میں تھے۔ اپنی گاڑی انہوں نے گھر بھیج دی تھی۔ دہاج احمد نے ڈرائیور کو پیچھے تابوت کے پاس بٹھایا اور عفریہ کے لئے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

عفریہ کو وہ شام یاد آ گئی جب آصف کا بچہ کی لاش لے کر وہ لوگ ”کانجو محل“ گئے تھے تب بھی دہاج احمد نے ہی پیارو ڈرائیور کو بھیجا۔ اور اسی طرح عفریہ فرنٹ سیٹ پر اُس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اُن کے پیچھے پولیس جیب آ رہی تھی۔

”کہاں چلنا ہے؟“ شہر سے باہر نکلتے ہی دہاج احمد نے پوچھا۔

”گاؤں جھمبرہ۔“

”جھمبرہ۔“

”ہوں جانتے ہو۔“ عفریہ نے اُس کی طرف دیکھا۔

”ہاں جانتا ہوں چار سال قبل گیا تھا وہاں۔“

”کیوں گئے تھے۔؟“

”میری بھابی حرا ہے نا اُس کا بھائی قتل ہو گیا تھا۔ پھر میں اُن کے ساتھ گیا تھا۔“

”حرا۔“ عفریہ کے لب کا پنے۔

”تم جانتی ہو گی۔ اگر اُسی گاؤں کی تم ہو تو۔“

”جانتی ہوں بہت کچھ جانتی ہوں، مگر تم نہیں جانتے۔ تمہیں پتا نہیں ہے نا کچھ بھی اب بھی

وقت ہے اور تم میرے ماما کی لاش ایسی بولنس میں ہی جانے دو۔
”کیوں؟“

”تمہاری بھابی خفا ہو جائے گی وجہی۔“

”تو تو کیا چوہدری مراد حسین کے قاتل کا تابوت ہے۔“ وہاج لمبے کے ہزاروں حصے میں ہر بات سمجھ گیا۔

”ہاں۔“ عصفیرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تم نے پہلے تو مجھے کبھی نہیں بتایا۔“

”کیا نہیں بتایا۔“

”کہاں کی رہنے والی ہو کون ہو۔؟“

”صرف جگہ مقام نہیں بتایا باقی تو بتایا ہے۔ وہاج کہ میں کون ہوں؟“

”اگر تم صرف گاؤں کا نام ہی بتا دیتیں نا تو۔“

”تو کیا ہوتا۔؟“

”میں تمہارے گھر پہنچ جاتا۔“

”پھر کیا ہوتا۔؟“

”پھر۔۔۔ پھر خنداں سے میری منگنی کبھی نہ ہو سکتی۔“

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔؟“

”تمہارے والدین اور بہن بھائیوں کی منت سماجت کرتا تا کہ وہ تمہیں سمجھائیں۔ پھر تم کیسے نہ مانتیں۔“

”ہونہ۔ خوش گمانیوں سے کبھی نکل بھی آیا کرو۔“ عصفیرہ مسکرائی اور وہاج احمد نے سپیڈ تیز کر دی۔

☆☆☆

تاباں مٹی کے چولہے کے قریب بیٹھی تیکے سے راکھ گریڈ رہی تھی اور شرفاں اسے نہایت غور سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ آج کل پُپ پُپ کیوں رہتی ہے؟“

اس کے چہرے پر گلاب جھلکتے تھے وہ کیوں مر جھا گئے ہیں۔ آنکھوں کی چمک کیوں ماند ہو گئی ہے۔

”تاباں۔“ شرفاں نے بیٹی کو پکارا۔ مگر اُس نے سُنا ہی نہیں۔

”تاباں۔“ اب کے شرفاں کی آواز اونچی تھی۔

”جی امان۔“

”ماں واری کیا سوچ رہی ہے۔“

”کچھ بھی نہیں امان۔“ تاباں نے تکیا چولہے میں ہی پھینک دیا۔

”میرے پاس آ۔“

تاباں دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی ماں کے قریب ہی چٹائی پر ہی ٹپک گئی۔

”کیا بات ہے تُو کچھ اداس اداس سی ہے۔“

”نہیں تو۔“ تاباں نے طویل سانس لی۔

”میں تیری ماں ہی نہیں سمجھتی بھی ہوں مجھے بتا کیا بات ہے کیا اسجد سے لڑائی ہے۔“

”نہیں تو۔ میری بھلا کیا لڑائی ہوئی ہے۔ وہ تو کئی روز سے ملا ہی نہیں مجھے۔“

”کیوں۔؟“

”بس میرا دل نہیں چاہتا ملنے کو۔؟“

”کوئی بات کر دی ہے اُس نے۔“

”امان وہ میرے سے کیا بات کرے گا۔“ تاباں دھیسے سے مسکرا دی۔

”پھر مجھے بتا پُپ کیوں رہتی ہے۔“ شرفاں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے چہرے پر آئے بالوں کو سٹواڑتے ہوئے کہا۔

”امان مجھے خوف آنے لگا ہے۔“

”کس سے؟“

”سب سے۔ مجھے لگتا ہمارا سب کچھ چھین جائے گا۔ میں بابا اور بابا کو کھونا نہیں چاہتی۔“

”میں تیرا مطلب نہیں سمجھتی۔“

”امان فرض کرو اگر تمہارے اپنے تمہیں تلاشتے ہوئے یہاں آ جائیں تو۔“

”تو۔“ بے یقینی سے شرفاں نے بیٹی کو دیکھا۔

”تم کیا اُن کے ساتھ چلی جاؤ گی۔“

”ظاہر ہے۔“

”امان کیا تم ہمیں چھوڑ دو گی۔“

”تمہیں چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔“

”بابا اور بابا کو چھوڑ دو گی۔ جنہوں نے تمہیں اتنی محبتیں دی ہیں، انہیں پتا بھی نہ تھا کہ تم کون ہو۔ کیا ہو، پھر بھی انہوں نے تمہیں پیار کیا تمہیں سہارا دیا۔“

”بدلہ بھی تو لیا نا۔“

”دیکھو امان تم بابا کو الزام نہ دو، انہوں نے ابائے تمہاری شادی کر دی تو یہ اچھا ہی کیا۔ ورنہ

ایک جوان اور خوبصورت عورت بھلا دنیا میں کس طرح رہ سکتی ہے بابا نے تو تمہاری اور لوگوں کی

انگلیاں نہ اٹھنے دیں اور اپنے گھر کی عزت بنالیا۔ یہ ظلم نہیں ہے کیا۔ انہوں نے کہ عورت کو مرد کے

چھتر کی ضرورت ہوئی ہے۔ اس طرح تم مردوں کی گندی اور غلیظ نظروں سے تو پچی رہیں نا، ہے نا ایسا

”ہاں ہے ایسا۔“ تاباں کی ایک بات شرفاں کے ذہن پر جمی کائی صاف کر رہی تھی۔

”امان! اگر تیرے اپنے آ جائیں نا تو تُو بابا اور بابا کو نہ چھوڑنا۔“ تاباں نے نہایت سنجیدگی سے لہجے

میں کہا۔

”میرے اپنے آ ہی کب رہے ہیں؟“ شرفاں کے لب آج عرصے بعد مسکرائے تھے۔

”بس وعدہ کرو امان! تم ہمیں نہیں چھوڑ دو گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ تاباں نے اُس کا

ہاتھ تھام لیا۔

”تم ہی میرے اپنے ہوتا بی، عمراں گزر گئیں ہیں یہاں اب کون آئے گا۔ اور جو کوئی آیا بھی

تو میں اُس کے ساتھ نہیں جاؤں گی یہ وعدہ ہے۔“
”میری پیاری اماں۔“ تاباں نے ماں کے سینے سے سرٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ سوچنے لگی

”امتاں تجھے کیا پتا کہ کل تیرے اپنے یہاں آ رہے ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود۔ اسجد ملک انہیں لینے چلا گیا ہے۔ وہ ہر صورت یہاں لانا چاہتا ہے۔ جبکہ میں نے بھی ابھی تک اُسے کچھ نہیں بتایا۔ مگر اُس نے جو کہانی سنائی ہے۔ وہ ساری کی ساری تیری ہے۔“

”ظفیری۔“ یہ نام سن کر تیرا بے ہوش ہو جانا۔
یہی نام تو ہے جس کی وجہ سے مجھے کڑی ملی اور پھر خود بخود ہی ساری زنجیر بن گئی۔

”اب آنے والی کل کیسی ہوگی؟“
”تاباں نے یہ سوچتے ہوئے طویل سانس لی۔“ اب وہ خود کو آنے والی کل کے لیے تیار کر رہی تھی۔



امیدیں حسرتیں بن بن کے دل میں رہتی ہیں
میں سوچتا ہوں کہ اب اُن کو بھی کفن دے دوں

اُس کچے سے آنگن میں اب بھی کھرام بچ ہوا تھا۔ سلیمہ بی بی بھائی کا جنازہ اٹھ جانے کے بعد بھی پچھاڑیں گھارہی تھی سینہ کو بی کرتے ہوئے ٹین کر رہی تھی۔ ساری عورتوں کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ وہ مصوم عورتیں سلیمہ کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ رہی تھیں۔ کہ یہ گاؤں والوں کی روایت ہے گاؤں کے کسی ایک گھر میں موت ہو جائے تو پورے گاؤں پر اداسی چھا جاتی ہے لگتا ہے ہر گھر میں موت کا رقص جاری ہے۔

اب لگتا تھا جیسے شیر محمد گاؤں کے ہر گھر کا فرد تھا۔ جب اس آنگن سے اُس کا جنازہ اٹھا تھا تو کھرام چاٹھا۔ جس کی بازگشت اب تک جاری تھی۔ سب روئے تھے ایک دوسرے کے گلے لگ کر۔

بس نہ روئی تھی ذعفرہ امیر نہ روئی تھی۔ اور کسی نے اُس پر توجہ ہی نہ دی تھی۔ بس وہ تو یہ سوچے جا رہی تھی یہ لوگ احساس ہی سے عاری ہیں۔
یہ جو عورتیں میری ماں کے گلے لگ کر آنسو بہا رہی ہیں۔ ان میں سے کتنی ہی ماما شیر محمد کے ظلم کا شکار ہوئی ہوں گی؟

پتا نہیں وہ اپنے روندے جانے پر رو رہی ہیں یا واقعی ماما شیر محمد کی موت کا دکھ انہیں زلا رہا ہے؟۔ یا پھر امتاں کو روتے دیکھ کر اپنے اشکوں پر قابو نہیں پا رہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی ماما شیر محمد کی موت پر آنسو نہیں بہا رہی (سوائے میری ماں کے) سب اپنے اپنے اوپر کیے گئے مظالم پر آنسو بہا رہی ہیں۔

اپنی نجات کی خوشی میں اشک بہا رہی ہیں۔ کتنی پتھر ہو گئی تھی وہ۔ جو کہتی تھی۔

”ماما کو سزائے موت ہو گئی تو میں بھی مر جاؤں گی۔“ قانون نے تو شیر محمد کو موت کی سزا نہ دی

اور شیر محمد نے اپنے لیے خود قانون بنالیا۔
خود ہی دل کی عدالت میں حاضر ہوا۔

یقیناً اُس کا ضمیر جج بنا ہوگا۔

اور اُس نے اپنے لیے موت کی سزا قبول کر لی۔ اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹنا بہت مشکل اور ناممکن عمل ہے مگر اس عمل سے وہ گزر گیا۔ کوئی احساس بھی نہ کیا تھا اُس نے۔ شاید وہ ہر قسم کے احساسات سے عاری ہو گیا تھا۔ وہ عفیرہ کی نفرت برداشت نہ کر سکا۔

اور کوئی بھی ذی ہوش شخص نفرت برداشت نہیں کر سکتا۔ عفیرہ جس نے اُس کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک ماما کی محبت کی خاطر۔ اُس نے اپنے والدین اور بھائی بہنوں کو چھوڑا تھا، اپنے گاؤں جانے والا راستہ بھول گئی تھی وہ تو شیر محمد کو حق پر سمجھتی تھی۔

خوش تھی کہ اُس کا ماما غیرت مند تھا جس نے چوہدری مراد حسین جیسے درندے کو سزا دی تھی، مگر جب اُسے پتا چلا کہ یہ سزا اُس نے تب چوہدری مراد حسین کو دی جب اُس نے شیر محمد کے کلچے پر ہاتھ ڈالا۔ ورنہ وہ تو شکاری کو شکار مہیا کر کے انعام و اکرام حاصل کرتا تھا۔

عفیرہ کو اپنے ماما سے جو گھن آئی تو وہ پھر اُس کے قریب نہ گئی۔ اُسے شیر محمد سے بو آ رہی تھی اور یہ سچ ہے کہ آٹکن میں جب شیر محمد کی لاش پڑی تھی دہائی پچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی شیر محمد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مگر قریب نہ گئی تو عفیرہ نہ گئی۔

ہاں وہ نہایت خاموشی سے شیشم کے درخت کے بڑے سے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی تھی۔ آنے والیاں وہیں اُس کے گلے لگ کر رو لیتی تھیں۔ مگر وہ نہ روئی تھی۔ پھر جب جنازہ اٹھایا جانے لگا تو منزہ آئی تھی اُس کے پاس۔

”نہیں گڈی۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ منیرہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس نے انکار کر دیا۔

”تو کیوں الگ تھلگ بیٹھی ہے ماما کی تو کتنی پیاری تھی عفو۔“ منیرہ نے اس کے بکھرے ہوئے بال ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے نہایت پیار سے کہا تھا۔

”بس میرا جی نہیں چاہ رہا۔ مجھ میں سکت نہیں وہاں تک اٹھ کے جانے کی بہت تھک گئی ہوں میں۔“

”پھر ہر کسی نے عفیرہ کی منت کی تھی مگر وہ ایک ضدی تھی وہ اٹھ کر شیر محمد کے جنازے کے پاس نہ گئی۔“

”شکر کریں کہ میں لاش لے آئی ہوں اپنی مٹی تو نصیب ہو گئی ہے ایسے بے درد شخص کے لیے تو زمین بھی جگہ نہ دے۔“ وہ مٹھیاں بٹھتے ہوئے غصے سے سوچے گئی تھی۔

جنازہ کلمے کی پُرسوز لے میں اٹھایا گیا تھا اور عفیرہ نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ اُس نے نہ کسی کو تسلی دی تھی نہ ہی دلاسایا۔ بس گم سمی بیٹھی رہی تھی۔ آج اُسے یہاں اپنا آپ ہی برابا لگ رہا تھا۔

”عفو۔“ گڈی ایک پرچ میں بسکٹ اور چائے کا کپ لیے اُس کے قریب آ گئی۔

”چائے پی لے۔“

”تجھے بھوک لگی ہے گڈی۔“

”مگر روٹی تو نہیں ہے۔“

”تجھے پتا ہے میں نے پرسوں دوپہر کے بعد کچھ بھی نہیں کھایا۔“ عفیرہ کی آنکھوں میں دیرانی سی تھی۔

”کیوں؟“

”بس گڈی! شاید بعض مرتبہ انسان اس طرح ڈکھ اور غم کھانے لگتا ہے کہ بھوک پیاس مٹ جاتی ہے۔ مگر اب تو مجھے کوئی ڈکھ نہیں جسے کھاؤں۔“

”کوئی غم نہیں جو پیوں۔ مجھے روٹی لا دو۔“

”فی الحال تم یہ بسکٹ کھا لو میں روٹی کا انتظام کرتی ہوں کہیں سے تمہیں پتا تو ہے یہاں تین دن چوہا نہیں چلے گا۔“

”بس مجھے روٹی چاہیے۔“ بسکٹ کی پرچ اُس نے پرے دھکیل دی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا۔

”کیا کہہ رہی ہے یہ۔؟“ چاچی بخت وہیں آ گئی۔

”بھوک لگی ہے اسے۔“

”تم لوگوں نے بھی تو حد کی ہے کم از کم روٹی تو پوچھ لیتے روئے پیٹنے میں لگ گئے۔“

”چل میری دھی۔ میرے گھر میں کھانا ہوں تجھے روٹی۔ چاچی بخت نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ تو وہ منیرہ کی احتجاجی نظروں کو نظر انداز کرتی ہوئی چاچی بخت کے ہمراہ باہر آ گئی۔

گاؤں کے اور غریبوں کے گھر ایک سے ہوتے ہیں وہی پچی دیواروں والے مکان اور کچے آف گھنوں والے گھر۔ جہاں بے تحاشا اپنے اصل سے ہٹنے والے یونی وکھی ہوتے ہیں شاید۔

عفیرہ دیوار کے سائے میں پڑی بان کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

چاچی بخت اپنی بہو کے حوالے اُسے کر کے پھر عفیرہ کے گھر چلی گئی تھی۔

اور عفیرہ جوا تک نہ روئی تھی۔ چارپائی پر لیٹتے ہی اُس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ دل بھر بھر آنے لگا۔ اور آنسو چپکے چپکے اُس کی آنکھوں کے کونوں سے بہنے لگے بالکل بے آواز اور بے صدا۔

☆☆☆

عمر مگدیاں مگدیاں مک گئی ایسے

پینڈا پار دے در دائیں مک دا

پار دل دے اندر دندا اے

سفر اپنے ای گھر دائیں مگدا

سوہنا شاہ رگ تو وی قریب رہندا!

ڈونگا پینڈا بھر دائیں مک دا

(ترجمہ: زندگی ختم ہوتے، ہوتے ختم ہو گئی ہے، مگر محبوب کے دروازے تک جانے کا راستہ ختم نہیں ہوا، میرا محبوب تو میرے دل کے اندر رہتا ہے مگر اپنے ہی گھر کا سفر ختم نہیں ہوا۔ میرا محبوب تو میری شہ رگ سے بھی ریب ہے مگر ہجر کا لمبا سفر ختم نہیں ہوا۔

پچا رو اوئے نیچے نیچے کیے ریتلے راستوں پر پچکولے کھاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی اور دھول ہی دھول تھی۔

اجد ملک ڈرائیو کر رہا تھا فرنٹ سیٹ پر اُس کی دادی آسیہ بیگم نہایت کڑوہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ وہ قریب ہی آگئی۔

”وہ تیرا ملک ہے نا؟ دن دھاڑے ادھر ہی آ رہا ہے۔“

”کیا۔ کیا مطلب ہے؟“

”میں نے خود دیکھا ہے اُس کی جیب اپنی بستی میں آگئی ہے۔“ شادو نے انکشاف کیا تو جھج

تاباں کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بجائے۔

”تو تم وعدے کے پکے نکلے ملک۔ اس بچے سے گھر میں آ ہی گئے ہو۔ میں تو سمجھی تھی

تمہارے گھر والے نہیں مائیں گے مگر۔“ لیکن وہ وقت ان سب باتوں کے سوچنے کا تو نہیں تھا۔ وہ

دوڑی ہوئی اندر کمرے میں آئی جہاں شرفاں سوئی ہوئی تھی۔

”امناں! امناں۔“

”وہ۔۔۔ ملک آ رہا ہے ہمارے گھر۔“

”تو اس میں بھرانے کی کیا بات ہے آنے دے۔“ شرفاں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

”امناں اُسکے ساتھ اور بھی لوگ ہیں۔“

”کون لوگ ہیں؟“ اُس نے پوچھا۔

”اُس کے گھر والے۔“ تاباں نے بتایا۔

”اچھا۔۔۔ وہ اپنے گھر والوں کو لے کر آ رہا ہے۔“ شرفاں کی آواز میں لرزش تھی۔

”امناں!! ہم اس قابل ہیں کہ اُن سے رشتہ جوڑ سکیں۔“

”اُس نے قابل سمجھا ہے تو آ رہا ہے۔“ شرفاں کی تو کھلی کھلی جاری تھی۔

اُس نے بھی خواب دیکھے تھے کہ کوئی دور سے اُس کے لئے شہزادہ آئے گا جو اُسے اس صحرا

کی ”قید“ سے رہا کر جائے گا۔ وہ شہزادہ آیا ضرور۔

”مگر اُس کے لئے نہیں۔“ تاباں کے لئے اور پھر تاباں غیر تو نہ تھی اُس کی بیٹی تھی اُس کے

وجود کا حصہ تھی۔

دروازے پر جیب آ کر رُکی۔ ہارن کی آواز اُن۔ مای بیٹی نے بھی سُنی تھی۔

”تو چار پائیوں پر چادریں بچھا۔ میں انہیں لے کر آتی ہوں۔“

”بابا اور بابا تو ہیں نہیں۔“

”وہ بھی آ جائیں گے۔“ شرفاں کمرے سے نکل گئی۔ اور پھر۔

چند ساعتوں بعد ہی شرفاں اُن تین خواتین کو لیے اندر آگئی تھی۔ اسجد اُن کے ساتھ نہ تھا

شرفاں نے اُس کا تعارف کرایا۔

”یہ میری دھی ہے تاباں۔“ تاباں نے آگے بڑھ کر اُس بزرگ ہستی کے گھٹنوں کو چھو کر سلام

کیا۔

”انشاء اللہ۔“ ملکائی آسیہ نے اُس جھکی ہوئی نازک سی لڑکی کو پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور

آہستہ سے بولیں۔

”بہت تعریف کرتا رہا ہے جو تمہاری۔ تم ہو بھی تعریف کے قابل۔“

”آپ بیٹھیں نا۔“

”میں اسجد کی دادی ہوں۔ یہ والدہ اور یہ بہن ہے۔“ ملکائی آسیہ نے دوسری خواتین سے بھی

جبکہ پچھلی نشست پر اُس کی بہن آمنہ اور والدہ زہرہ بیگم تھیں رات وہ بہادپور میں ٹھہرے

تھے اور اب صبح صادق ہی وہ چولستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

اسجد ملک کے لیے یہ راستہ نیا تو نہ تھا۔ مگر آمنہ پہلی بار اس طرف آئی تھی اور سخت کوفت محسوس

کر رہی تھی۔

”تو بے جوا تمہیں اپنی پسند اس بیابان ہی میں ملنی رہ گئی تھی۔ دنیا کی اور لڑکیاں مر گئی

تھیں۔“

”مائی سوئیٹ سسر! اگر آپ اُسے دیکھ لیں تو میری پسند کی داد دیں گی۔“

”ہر عاشق یہی کہتا ہے کہ اُس کے محبوب جیسا کوئی نہیں۔“ آمنہ منہ بنا کر بولی واقعی اُسے

یہاں آنا ذرا اچھا نہ لگا تھا۔

”منوں! تم نہ آتیں پھر۔“ ملکائی آسیہ نے حلیم لہجے میں کہا۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ اتنا دشوار راستہ ہوگا۔“

”دشوار یوں کے بعد ہی تو انسان کو آسانیاں میسر ہوتی ہیں کیوں دادو۔؟“

”ہاں زندگی ہے ہی جدوجہد کا نام۔“

”تو تم ہمیشہ اسی طرح سفر کرتے ہو۔“

”بالکل جناب۔“ وہ فخر سے بولا۔

”تمہارا تو ٹھکان اُترنے کا سامان موجود ہے۔“ آمنہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی مگر ماں

اور دادو کی موجودگی کی وجہ سے کچھ بھی نہ بولی یوں بھی اسجد اُس سے چھوٹا تھا اور ایسا چھچھورا مذاق وہ

اُس سے نہ کر سکتی تھی۔

اسجد کی خوشی کی خاطر ملکائی آسیہ بھی ساتھ چل دی تھیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ کہ صحرائے

تھل کا پھول اُن کے پوتے کی پسند ہے پھر پسند تو پسند ہوتی ہے نا اب کنول کا پھول بھی تو کچھڑ میں

کھلتا ہے اور لوگ اسے پسند بھی کرتے ہیں۔ اب اُس کچھڑ کی وجہ سے نہ پسند کریں۔ مگر ایسا تو نہیں

ہو سکتا نا۔

”دادو آپ تھکی تو نہیں ہیں نا؟“

”نہیں بیٹا!۔“ انہوں نے نہایت محبت سے جواب دیا۔

”دیکھیں منوں آیا آپ جوان ہو کر تھک گئی ہیں اور دادو نہیں تھکیں۔“ اسجد نے گردن موڑ کر

آمنہ سے کہا۔

وہ اُسے ہنسانا چاہتا تھا۔ مگر آمنہ کا موڈ آف تھا۔

اور وہ بھری دوپہر بھی جب اسجد کی جیب صحرائی اُس چھوٹی سی بستی میں داخل ہوئی چھت پر

اُپلے تھاپتی شادو نے نہایت حیرت سے یہ سب دیکھا تھا۔ وہ اسجد ملک کو جانتی تھی کہ تاباں کی

رازاں جو تھی۔ مگر اسجد تو ہمیشہ دریا کے کنارے ہی آتا تھا بستی میں تو وہ کبھی نہ آیا تھا۔ شاداں اور

تاباں کے گھروں کی دیوار بھی ملی ہوئی تھی۔

”اے تاباں۔ اوتا تاباں۔“

”کیا ہے۔“ تاباں جو گندم صاف کر رہی تھی وہیں سے بولی۔

”ادھر۔۔۔“ وہ چھت پہ تقریباً لٹک ہی گئی تھی۔

اُس کا تعارف کرایا۔ تاباں اُن سے گلے لی اور پھر وہ تینوں چارپائیوں پر بیٹھ گئی تھیں۔ تاباں جلدی سے باہر آگئی۔ تو سامنے ہی چھپر تلے بڑی چارپائی کے قریب احمد گھڑا تھا۔ اُس کی پشت تاباں کی طرف تھی۔ چوڑی پشت۔ جسے دیکھ کر بارہا تاباں کا جی چاہا کہ یہاں سر نکا دے۔ آنکھیں موند لے۔ اور احمد ملک کی خوشبو اپنے اندر اُتارے۔ وہ احمد کے قریب چلی آئی۔ ”دیکھو وعدے سے ایک دن پہلے آیا ہوں۔“ وہ دارفہ نظر دے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ملک غریبوں کا مذاق نہیں اُڑاتے۔“ تاباں نے کہا۔ ”تو کیوں غلط بات سوچتی ہے۔ تو کتنی امیر ہے یہ میں جانتا ہوں۔ احمد ملک کسی عام ی لڑکی کو تو نہیں چاہ سکتا تھا۔ تو ساری دنیا میں مفرد ہے۔ تو مجھے کتنی پیاری ہے یہ بات میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اپنے احساسات تجھ تک پہنچا سکتا ہوں۔“ اُس نے تاباں کا ہاتھ تمام لیا۔ ”یہ تھیلے کا ہے کے ہیں؟“ ”ان میں فروٹ ہے اور کھانا۔“ ”کھانا۔“ احمد بولا۔ ”صبح میں نے آرڈر پر تیار کروا لیا تھا۔“ ”کیا یہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔“ تاباں کا لہجہ تلخ تھا۔ ”یہ بات نہیں ہے۔“ احمد نے کہا۔ ”ہاں تمہارے شان کے مطابق نہ ملتا۔“

”بے ٹکی بائیں مت کرو۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”میری بہن بھوک برداشت نہیں کر سکتی نا۔ اس لیے یہ لے آیا ہوں۔ شام کو تم اپنی کھڑ داری بنا دینا۔ اب جلدی سے کھانا گرم کرو کہ مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔“ ”شاد کو ٹھلا لوں۔“ تاباں نے پوچھا۔

”کیوں؟“ احمد بولا۔ ”ہاتھ بنا دے گی۔“ ”میں جو ہوں جان احمد مجھے کب کا کم۔“ ”آگ جلا لو گے۔“ ”بالکل۔“ وہ مٹی کے چولہے کے نزدیک چوکی پر بیٹھ گیا۔ ”لے آؤ گزلیاں میں ابھی آگ جلا کر دکھاتا ہوں۔“ ”تم اندر جا کر بیٹھو۔ میں سب کچھ کر لوں گی۔“ ”میں اندر نہیں جاتا۔“ ”کیوں؟“ ”مجھے شرم آتی ہے۔“

”تم کوئی لڑکی ہو۔“ ”آج کل اُلٹ زمانہ ہے۔“ احمد نے کہا تو تاباں زد سے ہنس دی اور اُسے لگا جیسے بے شمار ننھے ننھے گھٹھر ونگ اٹھے ہوں۔ پھر تاباں کام کرتی رہی اور وہ اس کے قریب ہی بیٹھا اُسے مستقبل کے سہانے خواب دکھاتا رہا اور وہ احمد ملک کی قربت میں مدھوش ہوتی رہی کہ محبوب کا قرب ہزاروں خزانوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ محبوب کی قربت کے آگے سب کچھ پیچ ہے۔

کہتے ہیں نا۔ جس نے محبت میں ہجر و فراق اور وصل کے مزے نہیں کھائے اُس نے عشق ہی نہیں کیا۔ محبت ہی نہیں کی۔ محبت جو آگ بھی ہے اور گھڑا بھی۔ عشق تو جنوں ہے۔ عشق سکون ہے۔ عشق چین ہے۔ اور یہی عشق۔ آنسو ہے۔ بے قراری ہے۔ اور دکھ ہی دکھ ہے۔ عذاب ہی عذاب ہے۔ عشق میں فراق کی سرمستیاں بھی ہیں۔ اور وصال کی ٹھنڈی ٹھنڈی سرگوشیاں بھی۔ اور تاباں بھی یہ دونوں مزے لیتی تھی۔ جب احمد اس کے قریب ہوتا تو وہ آسمانوں میں اُڑتی تھی زندگی کے ساتوں رنگ اُسے اپنے اندر اترتے محسوس ہوتے اور احمد کی دُوری سے لگتا جیسے اور گرد کے ماحول کی طرح اُس کے اندر بھی ریت کے اونچے اونچے ٹیلے پیدا ہو گئے ہوں۔ اب احمد قریب تھا تو کائنات کا ذرہ ذرہ اُسے روشن لگ رہا تھا۔

☆☆☆

ہمارے دل کا پتا ہم کو بھی نہیں تھا مگر
لگا ہیں بول ہی بڑیں خود بخود زبان کی طرح

”تم آئے میرے ساتھ وہاں احمد تمہارا شکر یہ کہ تم نے وہ دکھ بنایا جس نے میرے دل میں کوئی سوراخ نہیں کیا۔ مجھے دکھ تو یہ ہے کہ میں بہت اونچائی سے گری ہوں۔“ ”عفو۔ تو تو بہت بے وقوف ہے۔“ وہاں احمد نے اُس کے سنے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”تو خود ہی مفرد بنے قائم کرتی ہے اور پھر خود ہی فیصلے صادر کرتی ہے۔ مجھے پتا ہے تو نے شیر محمد کی موت پر کوئی آنسو نہیں بہایا۔“ ”میرے آنسو اتنے ارزاں نہیں ہیں۔“ ”تو پھر ہو گئی ہے۔“

”میں اور پتھر۔“ وہ مسکرائی۔ ”نہیں وہاں میں پتھر نہیں ہوئی۔ میں روئی ہوں کل شام اس وقت روئی ہوں جب سورج ڈوب رہا تھا۔ چہار سو اُدا سی چھائی ہوئی تھی۔ میں تب روئی ہوں۔ اگر میں نہ روئی تو یقیناً اُس دکھ سے میرا دل پھٹ جاتا جو میرے دل کی دیواروں سے چٹ کر رہ گیا ہے۔“ ”عفیرہ کے لیے سے دکھ لہو کی طرح ٹپک رہا تھا۔“

”تمہارا قصور نہیں ہے عفو۔ المیہ یہ ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ احساس ہو۔ اس حادثے کو تم نے بہت اہمیت دی ہے۔ حالانکہ یہ عام سی بات ہے۔ دیکھو نا اگر تم زیادہ سوچو گی تو اپنا نقصان ہے تمہارا۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارا مایا ظالم تھا تو پھر وہ اپنی سزا کو بھی پہنچ گیا ہے نا۔؟“ ”مسئلہ تو یہ ہے کہ میں تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ ”میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ زندگی میں ہوتا وہی کچھ ہے جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ باقاعدہ منصوبہ بندی میں کچھ بھی نہیں۔“ ”تم یوں ہی ہلکان ہو رہی ہو حالت دیکھی ہے اپنی۔“ وہاں احمد نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

”کیا ہوا میری حالت کو؟“

”تیری آنکھوں کی چمک چہرے کی سُرخ کہاں چلی گئی ہے عفو۔ ان باتوں کو دل پر نہیں لینا چاہیے پیاری لڑکی۔ ختم ہو جاؤ گی۔“ نہایت محبت سے وہ عفیرہ کو سمجھا رہا تھا۔

”اب کیا ختم ہوں گی وہاں۔ رہ ہی کیا گیا ہے۔“ ”عفیرہ کے کیوں پر دھکی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔“ ”میں ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔ بہت بلندی سے گری ہوں کچھ بھی تو نہیں بچا۔“

”سنجھا لو خود کو یہ دنیا ہے اور یہاں بہت کچھ ممکن ہے۔ تم سیٹ ہو جاؤ پتھر پہلے جیسی عفیرہ بن جاؤ ہر بات سے بے نیاز بے پروا سی تمہارا وہ لا اُپالی سا روپ بہت اچھا ہے اور مجھے یقین ہے اب جب تم شہر واپس آؤ گی تو ویسی ہی ہو گی۔“ وہاں احمد نے کہا۔

”میں اب شہر نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟“ وہ بولا۔

”بس یہیں رہوں گی اپنے اصل میں۔ دیکھا ہے میرا صل یہی ہے اور یہاں سے میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہاں سے دور ہو کر تو بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ آگہی پائی اور عذابوں کے سُرخ شعلوں میں گھر کر رہ گئی ہوں۔“

”پاکل ہوئی ہو تم نے ابھی ایگزٹم بھی دینا ہے۔“

”زندگی کے بہت بڑے امتحان سے گزری ہوں وہاں اب میں نے یہیں رہنا ہے۔“ ”تم شہر آؤ گی اور وہیں رہو گی۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔“ وہاں کے لیے میں عزم محکم جھلک رہا تھا۔

”تم کون ہوتے ہو مجھے لے جانے والے۔“ وہ بلی کو طرح غر آئی۔

”مجھ پر رُعب نہ ڈالو۔“

”ہاں اب تم میرے رُعب میں کہاں آؤ گے۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”تم نے میری اوقات جو دیکھ لی ہے۔“

”عفو۔ میں غلط بات کرتا ہوں اور نہ ہی غلط بات سُنتا ہوں۔“ وہاں احمد نے مٹھیاں بھیج

لیں۔

”سچ پر تکلف تو نہیں ہونی چاہیے۔“
 ”قسم سے اگر تم میری محبت نہ ہوئیں تو میں بتاتا ہوں کہ۔۔۔“
 ”عجب۔۔۔“ وہ ہنسی۔ ”مت بھولو کہ تم خنداں جمال کے منگیت ہو۔“
 ”بے شک۔ مگر خنداں جمال کے منگیت کے دل میں تم ہو۔ اور وہ تم سے محبت کرتا ہے۔“
 ”غاشیہ کمال سے بھی تو تم محبت کرتے تھے۔“
 ”ہاں۔ اعتراف ہے مجھے۔ مگر وہ اتنی مضبوط نہیں تھی۔ جیسا میں اپنی محبت کو دیکھنا چاہتا تھا۔ تم میں وہ سب خوبیاں ہیں جو میں اپنی پسند میں چاہتا ہوں۔“
 ”ہر مرد اپنی زندگی میں آنے والی لڑکی کو یہی بات کہتا ہے۔“ ”عفیوہ نے کہا۔
 ”میں ہر مرد نہیں ہوں۔“ وہ ترخ کر بولا۔
 ”اچھا دماغ مت چاٹو اور جاؤ۔“
 ”بہت خراب ہو۔“
 ”کیوں؟“

”مہمانوں کو اس طرح کہتے ہیں۔“
 ”آئندہ مت آنا یہاں۔“
 ”اب مجھے ضرورت بھی نہیں ہے آنے کی۔“ وہاج احمد نے غصے سے کہا اور چلا گیا۔
 ”عفیوہ مسکرا دی۔“ ”میں تمہیں کیوں کوئی آس دوں۔ کہ میں خود آس کے پنڈولوں سے گری ہوں اب یہ گاؤں ہی میری منزل ہے۔“
 اور یہ آنگن ہی میری جاء پناہ۔“
 سارے آدرش میں نے چھوڑ دیے ہیں۔
 سارے خواب نوچ پھینکے ہیں۔ آنکھوں سے۔ کہ خوابوں کی سزا بہت بڑی ہے اور سہنے کے لئے حوصلہ چاہیے۔ جواب مجھ میں نہیں۔“

☆☆☆

نہایت دلچسپ ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔ آمنہ کی بھی سفر کی ساری کوفت دور ہو گئی تھی کہ تاپاں نے اُسے دریا کی سیر بھی کرا دی تھی۔ احمد اور تاپاں کے ساتھ دریا کی ٹھنڈی مٹی پت ٹھلنا اچھا لگتا تھا۔
 وہ لوگ جب واپس آئے تو حیات محمد اور فضل دین بھی واپس آچکے تھے تاپاں کا دل چنے کی طرح کانپ کر رہ گیا تھا۔

فضل دین نے آگے بڑھ کر احمد ملک سے ہاتھ ملانا چاہا تو احمد نے اُسے گلے لگالیا۔

”صاحب۔“

”بھئی میرے چاچا ہونا۔“

”میرے نصیب۔“

”بہت اچھے ہیں۔“ حیات محمد نے کہا اور احمد کو گلے لگا کر پیار کیا۔

شاداں نے آنگن میں چھڑکاؤ کر کے چار پائیاں بچھا دی تھیں۔ کھلے آسمان تلے بیٹھنا سب

ہی کو اچھا لگ رہا تھا۔ ”دادو جانی! آپ نے بات کر لی ہے نا؟“ احمد نے ملکائی آسیہ سے پوچھا۔ تاپاں وہاں سے ہٹ گئی۔ احمد مسکرایا۔ ”دادو جانی کا ووٹ تمہارا ہی ہے۔“ ”دادو جانی۔“ شرفاں کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ اس کی نظروں کے سامنے تارے تاج رہے تھے۔ بہت سے پردے ایکدم ہی ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ اُس کے سامنے دو بچے بھاگ رہے تھے۔ ”دادو جانی بچا میں مجھے اس ظفیری کے بچے۔“ ایک بچی بھاگی ہوئی چلتی جا رہی تھی۔ اور پھر برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی خوبصورت سی خاتون کے بازوؤں میں سٹکی تھی۔ تب وہ لڑکا بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ ”اب مجھے مار کر بتاؤ۔ میں دادو جانی کی پناہ میں ہوں۔“ بچی اس لڑکے کو زبان چڑا رہی تھی۔ پھوپھو جانی میں بھی آپ کی پناہ میں آ جاؤں۔“ ”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔“ اُس خاتون نے دوسرا بازو دوا کر دیا۔ ”تم دونوں ہی میری پناہ میں ہو۔ ٹھیک۔“ ”دادو جانی آپ میری ہیں۔“ ”نہیں یہ میری ہیں۔“ لڑکا بولا۔ ”بتائیں آپ کس کی ہیں۔؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ ”میں تم دونوں کی ہوں بچو!“ ”دیکھا۔“ وہ خوشی سے بولا۔ ”نہیں دادو جانی آپ صرف میری ہیں۔“ بچی منہ بسورے کہہ رہی تھی۔ ”شرفاں پتر تو کیوں نہیں پل رہی۔“ ملکائی آسیہ نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”جی دادو جانی۔“ ”شرفاں کی آنکھوں میں دھند چھا گئی تھی۔ وہ خاتون کے جزیروں سے لوٹی تھی۔ سارے منظر واضح ہو گئے تھے۔ ”دادو جانی۔ دادو جانی۔“ ”شرفاں کے لب یہی گردان کر رہے تھے۔

”تاپاں۔ تاپاں۔“ احمد ملک نے گھبرا کر تاپاں کو آواز دے ڈالی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ تب تک احمد ملک شرفاں کو دونوں کندھوں سے تھام چکا تھا۔ اور وہ ملکائی سکینے کے چہرے پر نظریں ٹکائے کہہ رہی تھی۔ ”دادو جانی۔ آپ۔ آپ۔ دادو جانی۔“ ”کیا ہوا ہے؟“ حیات محمد اور فضل دین بھی آگے بڑھے ملکائی آسیہ بھی اپنی چار پائی سے اٹھ کر اُس کے قریب آ گئیں۔ ”کیا ہوا شرفاں پتر۔“ ”دادو جانی۔“ اس سے آگے وہ کچھ کہہ ہی نہ پا رہی تھی۔ اُس کے دماغ کی ریں تن گئی تھیں۔ ”اتنا! اپنوں کو دیکھ کر تو پھر دیسے ہو گئی ہے۔ ہاں اتناں یہ تیرے اپنے ہیں۔ پرتو نے وعدہ کیا تھا نا کہ تو ان کے ساتھ نہیں جائے گی یہیں رہے گی بابا اور لبتا کے ساتھ پھر تیری حالت غیر کیوں ہو گئی ہے۔“ ”کسی باتیں کر رہی ہو تاپاں۔“ ”احمد ملک۔ اپنے ظفیری ماما کی کہانی جو تم سناتے ہو اُس کہانی کا ایک کردار میری ماں ہے۔“ ”کیا۔!“ ”ہاں یہ ہے وہ عورت تجھے تمہارے ماما ساری دنیا میں ڈھونڈتے پھرے ہیں اور یہ میرے دادا کو کہاں ملی تھی۔ اس کی گواہ ہماری پوری بستی ہے۔“ ”تاپاں۔ ہاں۔“

”ہاں ملک! یہ آج چالیس برس کی عورت میری ماں ہے تم اس میں وہ بچی تلاش لو جو سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ وہ بچی جس کے اپنے خواب تھے اور ان خوابوں سے اس کو کبھی بھی جھٹکارا نہیں ملا۔ خوابوں کا جلتا اس نے اب تک قبول نہیں کیا۔ بیس برس ایک عمر ہوئی ہے۔ مگر یہ اپنے خوابوں میں زندہ ہے۔ ملک آپ کو نہیں بتا کہ گزشتہ دو برس تک یہ اُس انجانے شہزادے کے خواب دیکھتی رہی ہے۔ جو اسے یہاں سے آزاد کر کر لے جائے۔ مگر وہ شہزادہ نہ آیا۔ اور میری ماں نے اب اپنے خوابوں سے رہائی پائی ہی تھی کہ احمد ملک تم آ گئے۔“ ”دادو جانی۔ آپ میری ہیں نا۔“ شرفاں کی آنکھوں میں آنسو راج ہٹوں کی طرح تیر رہے تھے۔ ”عدی۔“ ”میری عدیرہ۔“ ملکائی آسیہ کو پورا وجود کاٹنے لگا تھا۔ وہ شرفاں کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ ”عد۔ یہ۔“ ”شرفاں کے لبوں سے یہ نام ٹوٹ کر بھڑکا۔“ ”ہاں تو میری عدیرہ ہے۔“ ملکائی آسیہ نے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا اور اُس کی ٹیٹ دیکھتے ہوئے کہنے ہی پیار اُس ہاتھ پر لے لے۔

”ہاں یہ عدیرہ ہے۔ زہرہ دیکھو۔ یہ دیکھو یاد ہے نا جب اسکول میں یہ کسی بچی سے لڑ پڑی تھی تو اُس نے یہاں کاٹ لیا تھا۔ پوری بولی ہی نوچ لی تھی۔ کتنا علاج کرایا تھا۔ تب ہاتھ کو آرام آیا تھا۔ اب یہی نشان ہے۔“ ”ہاں۔ ہاں پھوپھو جی۔ یہ۔ یہ عدیرہ ہی ہے۔“ زہرہ جبین نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ ”اور۔۔۔ اور تمہیں یاد ہے ظفیری روز اس کی پتی کروانے جا بیٹھ گئی تھی۔“ ”ہاں سب یاد ہے۔“ زہرہ جبین نے شرفاں کو لپٹا لیا۔ وہ اُس کا منہ چومنے لگی تھیں۔ اور اشک بھی اُن کی آنکھوں سے رواں ہو گئے تھے۔ جب حال تھا۔ اور عجیب پچویشن تھی۔ کسی نے بھی حیات محمد یا فضل دین سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ کہ وہ انہیں کب اور کسے ملی تھی۔ آپ و آپ ہی انہیں یقین آ گیا تھا۔ کہ کچھ یقین تو وحی کی مانند ہوتے ہیں جو مقدس آیات کی طرح دل پر اترتے ہیں اور انسان انہیں بغیر کسی دلیل کے مان بھی لیتا ہے۔ حیات محمد اور فضل دین ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ”بابا۔۔۔ یہ اتناں کے اپنے ہیں۔“

”تجھے سب پتا تھا؟“

”جی۔۔۔“ تاہاں نے سر جھکا کر اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

”اس کا مطلب ہے تو ”صاحب“ سے ملتی رہی ہے؟“ فضل دین کا لہجہ سارے جذبات سے عاری تھا۔

”میں انکار نہیں کروں گی اب اس بات سے۔“ تاہاں نے اب بھی سر جھکایا ہوا تھا۔

”ملک پہلے بھی ہمارے گھر آیا تھا۔ تب جب تم دونوں نہیں تھے اور امناں سے ملا تھا۔“

”پھر؟“

”پھر اس روز مجھے پتا چلا تھا کہ یہ امناں کا رشتہ دار ہے۔ امناں جس شہزادے کے خوابوں میں رہتی ہے ناں وہ اسجد کا ماما ہے جس نے اب تک شادی نہیں کی۔ اور اب بھی وہ اس لڑکی کو تلاش رہا ہے جو اس کی ٹھیکرے کی منگ تھی۔“

”تو وہ۔۔۔ وہ ہم سے شرف کو لے جائے گا؟“ فضل دین کا لہجہ دکھی تھا۔

”نہیں امناں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ یہیں رہے گی۔ کہیں بھی نہیں جائے گی اور امناں اپنے وعدوں کی پابند ضرور ہے۔“ تاہاں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”غم۔۔۔ تم ہمارے ساتھ چلو گی ناعدی۔“ ملکانی آسیہ شرفاں کا آنسوؤں سے تر چہرہ ہاتھوں میں لیے ڈبڈباتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”ناں۔۔۔ نائن۔“

”کیوں پھر؟“

”میں اس پناہ سے کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”میں بھی تیری پناہ ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ دادو جانی تم لوگوں کو میری ضرورت نہ تھی مجھے نہیں تلاش۔“

”کون کہتا ہے نہیں تلاش میری جان۔ ہم نے تو کوئی خوشی بھی تجھے یاد کیے بغیر نہیں منائی۔“

”تجھے کہاں کہاں نہیں تلاش تو الزام نہ دے۔ گواہ پورا خاندان ہے۔“

”پھر میں آپ کو ملی کیوں نہ؟“

”جب نصیب میں تھا مل گئی ہے۔ قدرت ویلے بناتی ہے۔ دیکھ اسجد تو ملک سے باہر تھا۔ وہاں اس کی کمپنی کو یہاں تیل اور پانی کا ٹھیکہ ملا۔ قدرت کی بات کہ یہاں تاہاں کو ملا اور پھر تجھے باقی سب پتا تو ہے نا؟“

”تو یہ ساری نصیب کی باتیں ہیں۔ تاہاں اسجد کا نصیب تھی اور قدرت نے یہاں تک رسائی کر دی ہے نا؟ تو ہمارے ساتھ چل۔“

”میں تم لوگوں میں نہیں رہ سکتی۔ میں عادی ہو گئی ہوں دریا کے شور کی۔ مٹی کے گھروں میں رہنے کی۔ میں آہستہ چلتی ہوں اور شہر والے تو دوڑتے ہیں۔“

”پھر تاہاں؟“

”تاہاں جو ان ہے وہ ان کا ساتھ دے سکتی ہے دادو جانی میری طرف سے اجازت ہے۔ بابا اور فضل دین سے پوچھ لیں۔“

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ حیات محمد نے فوراً کہا۔

”ملکانی جی“ میں نے شرف کو دریا سے پایا تھا۔ یقین کریں نزدیک کے سارے گاؤں سے پتا کرا یا تھا۔ مگر کسی نے نہ بتایا کہ کوئی بچی گم ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ اس کی اتنی زندگی تھی۔ سردار پور سے بستی ہوئی یہ یہاں تک آ گئی۔ مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔ اور یہ بچ گئی۔ میرے گھر کو بسنا تھا۔“ حیات محمد کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔

”اسجد۔ تم واپس جاؤ۔ اور جمال کو اطلاع دو۔ آج نورالحین ہوتی تو بہت خوش ہوتی۔“ ملکانی آسیہ کی آواز بھر آ گئی۔

”نور۔۔۔ نور۔۔۔“

”ماں تھی تمہاری۔ نہیں صدمہ برداشت کر سکتی تمہارے بچھڑ جانے کا اور۔۔۔“ ملکانی آسیہ نے ہونٹ بھیج لیے۔

”مر گئی۔“ شرفاں نے جملہ مکمل کیا۔ ”مائیں مر رہی جاتی ہیں دادو جانی۔ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ اور ابا جانی۔“ اس کی سوالیہ نظریں گڑھی میں ملکانی آسیہ کے چہرے پر۔

”خدا سلامت رکھے اس نے بہت دلاسا دیا تھا نور کو مگر وہ تو دل کو لگا گئی تھیں۔ پھر ظاہر ہے میں نے زبردستی اس کی شادی کر دی۔“ ملکانی آسیہ نے سارا الزام خود پر لے لیا۔

”بہت اچھا کیا۔“ شرفاں نے سر ہلایا۔

”اسجد جاؤ۔ ہم یہیں رہیں گے۔ تم جمال کو اطلاع دو۔“ ملکانی آسیہ نے کہا۔

”امناں۔۔۔ آپ چلی چلیں ناں۔“ اسجد نے کہنا چاہا۔

”میں۔۔۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ شرفاں نے سر ہلایا۔ ”ہاں دادو جانی میں نے تاہاں سے وعدہ کیا ہے۔ میں کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔“ وہ نہایت مصومیت سے بولی تھی اور اسجد ملک تیزی سے گھر سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

تیری یادوں سے رہائی کس طرح پاؤں میں

کس قدر مضبوط ہے حلقہ تیری زنجیر کا

اسجد ملک نے ہوٹل گرین پیلس آتے ہی پہلے تو ظفر عالم کے لیے کال بک کرائی تھی۔ وہ سب سے پہلے یہ خوشخبری انہیں سنانا چاہتا تھا اور پھر جلد ہی فرینکفرٹ کی کال مل گئی تھی۔

”ہیلو۔ اسجد اسپیکنگ۔“

”ہاں۔ بولو بیٹا۔“

”ایک گڈ نیوز ہے آپ کے لیے۔“

”تمہاری شادی کی تاریخ ٹھہر گئی ہے۔“

”اس سے بھی بڑی خبر ہے۔“

”اسجد۔ تمہیں پتا ہے کہ میں خوشی غم سے عاری ہوں۔“

”آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ جس کے لیے دنیا میں پھر رہے ہی۔ وہ یہیں ہے اپنے وطن میں۔“

”کیا۔ کیا کہہ رہے ہوں؟“

”ہاں۔ عدیہ کا پتا چل گیا ہے۔“

”سچ کہہ رہے ہوتا؟“

”میں بھلا جھوٹ کہنے کی گستاخی کر سکتا ہوں۔ مجھے ابھی پتا چلا ہے اور میں آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔“

”کسی ہے وہ؟“

”ماما جانی۔ آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا نا، محبت کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ محبت تو صرف محبت ہوتی ہے۔“

”میں پوچھ رہا ہوں وہ خیریت سے نا؟“

”جی آپ آئیں تو دیکھ لیں۔“

”بدل تو نہیں گئی؟“

”شاید تبدیلی آپ کو برداشت کرنی پڑے۔ آپ آتو جائیں نا۔“

”میں آؤں گا جلد از جلد۔ اور اسجد میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ میرے خیالوں میں بسنے والی عدیرہ ہے یا کہ نہیں؟“

”شاید وہ ویسی نہ ہو جیسی آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”وہ ویسی ہی ہوگی۔“

”آپ میرا نمبر نوٹ کر لیں اور آنے کی اطلاع اسی نمبر پر دے دیں۔ کب آئیں گے؟“

”میں ابھی سیٹ کے لیے کوشش کرتا ہوں۔“ ظفر عالم نے کہا۔ اور پھر اسجد نے انہیں فون نمبر نوٹ کرا دیا۔

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد اس نے آپریٹر کو کراچی اور لاہور کے نمبر بھی نوٹ کرا دیے۔ اور سردار پورٹل ہما سے بات کرتا وہ نہ بھولا تھا۔ سب ہی کو ”کرین پیلس“ بہادر پور کا ایڈریس اس نے دیا تھا۔

☆☆☆

حیات محمد کے کچے آنگن میں سمجھو بہار اتری ہوئی تھی۔ رات ہی جمال الدین ملک پہنچے تھے۔ کیا الدین ملک بھی آئے تھے اور شرفاں (عدیرہ) کو لپٹا کر کس قدر جمال الدین روئے تھے

ان کے وہ اشک جو برسوں سے پلکوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے وہ بے تحاشہ بنے تھے

حیات محمد اور فضل دین سے بھی وہ محبت سے ملے تھے اور ان کے دل میں کہیں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ فضل دین ایسا اجڑھنص ان کا داماد ہے۔

تاباں کو گھنٹوں سینے سے لگائے رہے تھے۔

”یہ سویرے سویرے اسجد کہاں غائب ہو گیا ہے۔“ آمنہ پوچھتی پھر رہی تھی۔

”ہمیں بھی نہیں بتایا شاید سائیٹ پر گیا ہو۔“ کمال ملک نے کہا۔

”تاباں پیاری ہے نا باباجی۔؟“ آمنہ نے تور پر روٹیاں لگائی تاباں کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ بہت پیاری ہے۔ اسجد محبت نہ کرتا تو ہمیں عدیرہ کے ملن کی خوشی کیسے حاصل ہوتی۔ قدرت بہت بڑی ہے۔ رب بہت عظیم ہے۔“ کمال الدین ملک بولے۔

”یہی اسجد آ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا اور زہری جبین کو تو اسے پہچاننے میں دقت نہ

ہوئی۔

”ظفری۔ ظفری۔ میرا بھائی۔“

”ظفر۔“ جمال ملک نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”جی جناب۔ ماما جانی کو لینے گیا تھا میں، ملتان ایئر پورٹ سے سیدھے آرہے ہیں ہم۔“ اسجد نے بتایا۔

ظفر عالم سب ہی سے مل رہے تھے مگر ان کی نظریں تو اسے تلاش رہی تھیں جسے تلاشے برسوں گزر گئے تھے مگر وہ انہیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

”چاچا فضل دین، میرا ماما مل نا آپ کی بیوی سے؟“ اسجد نے پوچھا۔ تو فضل دین کے جواب دینے سے پہلے ہی حیات محمد نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ شرفاں اندر ہے۔“

تب اسجد ملک ظفر عالم کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا تو فضل دین پہلو بدل رہ گیا تھا۔ وہ کچھ کر بھی تو نہ سکتے تھا۔

شرفاں ٹرنک میں سرگھسائے نجائے کیا تلاش کر رہی تھی۔ آہٹ پر وہ چوکی۔ اسجد کے ساتھ کوئی اور بھی کمرے میں آ گیا تھا۔

”دیکھیں تو کون آیا ہے اماں؟“ اسجد آگے بڑھا۔

”یہ۔ یہ۔“

”تم جاؤ جو۔ میں اسے خود بتاؤں گا۔ میں کون ہوں۔“ ظفر عالم کی بھاری اور ایک دم چھا جانے والی آواز ابھری۔

تب اسجد کمرے سے نکل گیا۔ شرفاں حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ظفر عالم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا تھا اور صرف ایک قدم کے فاصلے پر جا کر رُک گیا تھا۔ شرفاں کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔

”مجھے پہچانا؟“

”ظلف۔ ف۔ ری۔“ شرفاں کے لب کاپنے اور ظفر عالم کی آنکھوں کی ٹوتیز ہو گئی۔ وہ ایک دم ہی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”ہاں۔ تیرا ظفری۔ جو تجھے جاء جاء ڈھونڈتا پھرا ہے۔ تلاشتا پھرا ہے۔

سارے جگ میں پکارتا پھر رہا ہے

تجھے میری آواز سنائی نہیں دی تھی؟

تجھے میری صدا کا پتا نہ چلا تھا؟“

وہ پوچھ رہا تھا۔

”چلا تھا پتا۔ مجھے صدائیں آئی تھیں۔ مگر ظفری وہ عجیب سا شور تھا۔ مجھے صحیح آواز سنائی نہ دیتی تھیں۔“ وہ نہایت مصومیت سے بولی۔

”عدی۔ عدی۔ میں سوچا کرتا تھا جس روز تو ملی وہ دن کیسا ہوگا؟ بہت اُجلا۔ اُجلا سا بہت خوبصورت اور۔۔ اور مگر یہ کیسا ملنا ہے کہ تو میری نہیں۔ ایسا تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ یہ۔ یہ کیوں یہ

کیوں ہے؟“ ظفر عالم نیچے جھکتا ہی چلا گیا۔ اور دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر اس نے اپنا سر چارپائی

پر بیٹھی شرفاں کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”عدی۔ میں۔ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ میں۔ تو ناراض نہ ہونا، میں یہیں رہنا چاہتا ہوں تیرے ساتھ ہمیشہ کے لئے۔“ ظفر عالم کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ شرفاں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا دیں اور ظفر عالم کے دل میں ایسی ٹھنڈک اتری کہ رگوں میں دوڑتا لہو جم کر رہ گیا۔

”دادو جانی۔ دادو جانی۔ شرفاں کی چیخوں سے مشابہ آواز بمشکل نکل سکی تھی۔

سب ہی دوڑے چلے آئے تھے

اور ظفر عالم جس کی تلاش میں نگر نگر پھرا تھا۔ بستی بستی جسے پکارتا رہا تھا۔

آج اس کا سفر ختم ہو گیا تھا۔ اس کو منزل مل گئی تھی۔ اسکی تلاش ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ پرسکون ہو

گیا تھا۔

اور پھر ظفر عالم کی خواہش جو تھی وہ پوری کر دی گئی کہ وہ ہمیشہ کے لئے شرفاں کے پاس رہنا

چاہتا تھا اسے دریا کنارے قبرستان میں ابدی نیند سلا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

آج عفریہ امیر کی منگنی کی رسم ادا ہونی تھی۔ گھر میں خوب ہنگامہ تھا۔ مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ سلیمہ بھی آج خوش تھی۔ بھائی کی موت کے دو ماہ کے بعد آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

عفریہ کے لئے احمد سردار کا رشتہ آیا تھا۔ اور عفریہ نے بغیر کسی تردد کے حامی بھری تھی۔ گڈی

نے بتایا تھا۔

”ضمیر محمد کا دوست ہے اور بہت اچھا لڑکا ہے عفو آ پا، تیرا جوڑ ہے سوہنا گھرو ہے بلکل شہری

لگتا ہے۔“ گڈی نے احمد کی بے تحاشہ تعریفیں کی تھیں اور عفریہ سر جھکائے سستی رہی۔

عفریہ کو صرف اطلاع دی گئی تھی کہ احمد سردار سب کو پسند ہے۔ اور عفریہ نے سب کی پسند پر

سر جھکا دیا تھا۔

وہ تو مٹ گئی تھی۔

فنا ہو گئی تھی۔

شیر محمد کے اعتراف جرم نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

وہ اندر کمرے میں ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ آنکھیں موندے دیوار سے ٹیک لگائے۔

باہر مراٹھیں گلا جھاڑے گا رہی تھیں

میں توں سوں چوے

وے پھل میں نے توڑے

اور تب ایک دم ہی بغیر ارادے کے چو ہدري وہاں احمد اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں اتر آیا۔

”مت یاد آؤ مجھے۔“

وہاں احمد۔ تم۔ تم یاد نہ آؤ۔ مجھے اعترافات پر مجبور نہ کرو۔ میں اعتراف نہیں کرنا چاہتی کہ

میرے جیسی بولڈ لڑکی تمہیں چاہتی رہی ہے۔

اس وقت بھی جب تم غاشیہ کمال کی محبت میں پور پور ڈوبے ہوئے تھے۔

تب بھی عفریہ امیر نے تمہیں چاہا۔ جب تم نے عفریہ سے اعتراف محبت کیا اور اس نے تمہیں

دھککا دیا۔ ہاں وہاں احمد مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تب بھی تمہیں چاہا۔ جب میں نے آصف کا نجو کا محبت بھرا ہاتھ تھاما۔

وہاں احمد! اب جبکہ تم خنداں ملک کے نام کی انگوٹھی پہنے پھر رہے تب بھی تمہیں چاہنے کا جرم میں کرتی رہی ہوں۔ اور آج جبکہ میں ایک آن دیکھے شخص احمد کی بنائی جا رہی ہوں جو ضمیر محمد کا دوست ہے تب بھی میرے خیالوں کے آسمان پر تم چھا گئے ہو۔

”ہاں وہاں احمد۔ یہ محبت اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے۔ دیمک کی طرح دلوں کو چاٹ جاتی ہے

اور۔ اور“ اس کے خیالوں کا ریشم الجھ گیا۔

منیرہ آگئی تھی۔

”عفو آ پا، یہ سوٹ پہن لو۔“

”اچھا۔۔۔“ عفریہ نے ضبط کیا اور پھر لباس دیکھا۔ آتش گلابی شرارہ سوٹ تھا جس پر نہایت

خوبصورت کام کیا گیا تھا۔

”اب دیہاتوں میں بھی ایسے لباس ہوتے ہیں۔ کتنی میں ان ٹچ رہی ہوں۔“ لباس تبدیل

کرتے ہوئے عفریہ سوچ رہی تھی۔

منیرہ نے میک اپ باکس بھی لا کر رکھ دیا۔ ”تم خود میک اپ کر لو۔“

”میں نے بھی میک اپ نہیں کیا۔“

”عفو آ پا۔ لیپا پونی تو ہر لڑکی کر لیتی ہے۔ لاڈ میں کر دوں۔“ وہ بولی۔

”رہنے دو۔“

”اچھا سُرخی تو لگا لے۔ اور سرمہ بھی ڈال لے۔“

”جو حکم۔“

منیرہ کے کہنے پر اس نے ہلکا سا میک اپ کر لیا تھا۔ اس کی جھینٹاں یا سمین نے اسے زیور بھی

پہنا دیا تھا۔

”ماشاء اللہ بہت سونی ہے تو۔“ یا سمین نے اسے کہا تو عفریہ نے سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی منیرہ نے آ کر بتایا۔

”بھئی بہت بخوبی ہے احمد بھائی۔ کہتا ہے اپنی دہن کو خود انگوٹھی پہنائے گا۔“

”ہمارے ہاں روان نہیں ہے۔“ عفریہ کی بھابی نے منہ بنا کر کہا۔

”رہنے دیں روان کو۔ میں نے کہہ دیا ہے آجائے پہنا دے۔“ منیرہ نے عفریہ کا دوپٹہ

درست کیا

”نہیں عفریہ کی ساس انگوٹھی پہنائے گی۔“ بزرگ عورتوں کا فیصلہ تھا۔

تب مانا گیا۔ عفریہ کو احمد سردار کی ماں نے انگوٹھی پہنائی۔ اس کی پیشانی چومی اور بہت سی

دعائیں دیں اور پھیل پر پانچ ہزار روپے بھی رکھ دیے۔ عفریہ آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی تھی چپ

چاپ۔

”بھئی دولہا ہے یا کیا ہے۔ کہتا ہے دہن کو دکھائیں۔“

”اب ہوش آیا ہے جب رسم ہوگی۔“ کوئی سر بھری بولی تھی۔

پھر شاید دولہا کی بات مان لی گئی تھی۔ سب عورتوں کو کمرے سے نکال دیا گیا۔ عفریہ اکیلی ہی

رہ گئی اور احمد سردار کمرے میں آ گیا۔ منیرہ دروازے پر دربان بن کر کھڑی ہو گئی۔
عفیرہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی۔

”پڑھ لو میرا نام ہے نا ان لکیروں میں۔“ بھاری چھا جانے والی آواز ابھری تھی۔

عفیرہ نے آنکھیں پتھری لیں۔ ”مت یاد دلاؤ مجھے جملے۔“ اس نے ہونٹ بھی پتھری لیے۔

”یار جواب دو نا مجھے۔ تم ادھر نہیں رکھتیں۔“ احمد سردار نے اس کا ہاتھ تھما تو اس نے ایک دم

ہی جھکا ہوا سر اٹھایا۔

یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔

”وجی۔ وجہی۔“ عفیرہ کی حیرت زدہ آواز ابھری۔

”جی سرکار۔ آپ کا غلام۔“ وہاں احمد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”مگر۔ مگر وہ احمد سردار۔“

”وہ بھی میں ہوں۔ کہ سر اور خان میرے والد مرحوم کا نام ہے اور تمہیں اپنانے کے لیے یہ

کھیل کھیلا کہ انا کے زعم میں تم نے رشتے سے انکار کر کے اپنا تو بیڑہ غرق کرنا ہی تھی۔ ساتھ مجھے بھی

لے ڈوبتیں۔ انکل سکندر خان لغاری اور تمہارے گھر کے سارے لوگوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔ سب

سے بڑھ کر میری پیاری سی سالی منیرہ نے۔“

”لیکن تمہاری والدہ تو۔۔“ عفیرہ نے جاننا چاہا۔

”میں نے انہیں منوایا ہے۔ اور میری ماں بیٹے کی ضد کے آگے ہار گئیں۔ میں ماما جمال سے

خود جا کر ملا۔ انہیں بتا دیا کہ خندی کو شوہر تو مل جائے گا۔ مگر اسے وہ محبت نہ ملے گی جو ایک عورت

کی خواہش ہوتی ہے۔ پھر جمال ماما نے مام سے مل کر سارے معاملات طے کیے اور ہم آج یہاں

ہیں۔“ وہ شوق سے بولا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”عفو۔ اب تو تم شہر چلو گی نا؟“

”جہاں تم کہو گے وہاں چلوں گی وجہی۔“

”تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“

”یہ بات میں نے بغیر محبت کے تو نہیں کی اور۔۔ اور وجہی یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا

ہو سکتا ہے۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ ہم جو سوچ بھی نہیں سکتے وہ ہو جاتا ہے مگر میں نے سوچا تھا کہ کوئی بھی

راستہ ملا تو تمہیں پاؤں گا ضرور اور دیکھ لو۔“

”کیا؟“

”پتھر میں جو تک لگا دی۔“

”اگر میں پتھر ہوتی نا وجہی تو تمہاری محبت کبھی بھی میرے دل کو شق نہ کرتی۔“ عفیرہ نے وہاں

احمد کے کندھے سے سر نکا دیا اور وہاں احمد کو لگا تھا جیسے کائنات کی ساری خوبصورتی اس کی جھولی میں

آن گری ہو۔